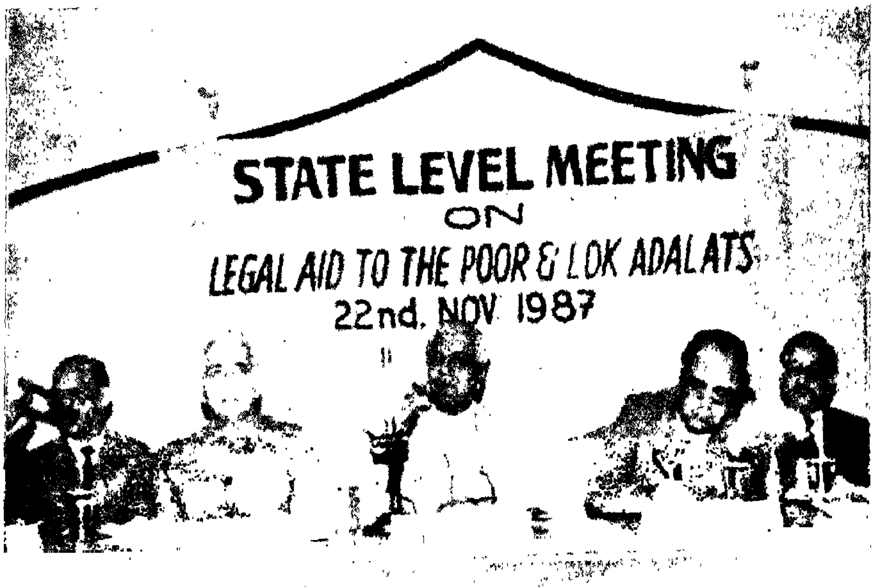
تعمیر

جنوری ۱۹۸۸ء



۲۱ نومبر ۱۹۸۷ء کو رکمنی دیوی میموریل ہال، انبالہ میں ہریانہ اُردو اکیڈمی کے زیرِ اہتمام "جنگ آزادی میں اردو کا حصّہ" کے موضوع پر ایک سمینار منعقد ہوا۔ اس موقع پر عزّت مآب سیّد مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ اکیڈمی کے سہ ماہی جریدے "جمناتٹ" کی رسمِ رونمائی ادا فرماتے ہوئے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ، عالیجناب دیوی لال ۲۲ نومبر ۱۹۸۷ء کو ہنجور میں "غریبوں کے لیے قانونی امداد اور لوک عدالت سیشن" کے موقع پر ریاستی سطح کی ایک میٹنگ سے خطاب فرماتے ہوئے۔ اُن کے دائیں جانب ہیں "سینٹرل کمیٹی فار امپلیمینٹری لیگل ایڈ اسکیم" کے ایگزیکٹو چیئرمین، سپریم کورٹ کے جج جناب رنگ ناتھ مشرا۔



آپ کا محبوب مصور ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

جنوری ۱۹۸۸ء شمارہ ۱ جلد ۱۶

مدیر اعلیٰ

این کے جین

مدیر

سلطان انجم

سرورق: پون کمار

فی شمارہ ———— پچاس پیسے

زرِ سالانہ ———— پانچ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس سی او نمبر ۱۹۱-۱۸۹ سیکٹر ۱۷ سی ۔ چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

ترتیب

SV02

حرفِ آغاز

ہریانہ اسمبلی کا چار روزہ اجلاس

گزشتہ دنوں ۲۱؍ دسمبر کو ہریانہ اسمبلی کا موسمِ سرما کا اجلاس شروع ہوا۔ اجلاس کے آغاز میں سورگیہ نیتاؤں کو شردھانجلیاں سمپنت کی گئیں اور تمام ممبران نے دو منٹ خاموش رہ کر جناب دلبیر سنگھ، جناب شیو نارائن، جناب جگجیت سنگھ پوہلو، چودھری رحیم خاں، جناب رنجیت سنگھ، جناب گردھاری لال ڈوگرہ اور ہندی کی ممتاز شاعرہ محترمہ مہادیوی ورما کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ یہ تعزیتی قرارداد یں وزیرِ پارلیمانی امور جناب ویریندر سنگھ نے پیش کیں۔ ہریانہ اسمبلی کے سپیکر جناب مہندر سنگھ چٹھا کے والدِ محترم جناب امر سنگھ چٹھا، سورگیہ پردھان منتری جناب چرن سنگھ کی صاحبزادی محترمہ سروج ورما اور وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال کے پوتے جناب سندیپ سنگھ کو بھی ممبرانِ اسمبلی نے نذرانۂ عقیدت پیش کیے۔ اس موقع پر وزیرِ اعلیٰ ہریانہ نے ازراہِ خلوص و مروّت جناب جگجیت سنگھ پوہلو کے کنبہ کی خراب مالی حالت کے پیشِ نظر سورگیہ کی طرف بقایا قرضے معاف کرنے کا اعلان فرمایا۔

چودھری دیوی لال نے اپنی حکومت کی قرضے معاف کرنے کی پالیسیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی اجازت دیں تو ہم ۱۲۰۰ کروڑ روپے کے تمام قرضے معاف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کوآپریٹو منسٹر ہریانہ نے فرمایا کہ اس سال جولائی سے اب تک حکومت نے ۱۸۱٫۴۵ کروڑ روپے کے کوآپریٹو قرضے معاف کیے اور حکومت کے اس اقدام سے ۷٫۶۹ لاکھ سے زیادہ عوام کو فائدہ پہنچا ہے۔

وزیرِ آبپاشی و بجلی ویریندر سنگھ نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اس سال اکتوبر تک ہریانہ بجلی بورڈ نے ۳۹۰ صنعتی یونٹوں میں بجلی کی چوری کا پتہ چلانے کے لیے چھاپے مارے اور قصوروار یونٹوں پر ساڑھے پندرہ لاکھ روپے جرمانہ کیا گیا۔

جناب ویریندر سنگھ نے ہریانہ کے سرکاری ملازمین کو دیہی بھتہ دینے اور سفر بھتہ و اسپیشل پے دوگنی کرنے کا اعلان کیا۔ موصوف نے فرمایا کہ ریاست کی مالی حالت بہتر ہونے کے بعد حکومت اپنے ملازمین کو مزید سہولتیں دے گی۔

تعمیر ہریانہ   ۳ جنوری ۱۹۸۹ء

اجلاس کے آخری روز وزیر زراعت ہریانہ جناب ڈاکٹر کے۔ آر پونیا نے دوران سبھا میں بتایا کہ ۳۳۴۳۰۶ افراد بڑھاپا پنشن کے مستحق پائے گئے۔ ان میں سے ۳۱ اکتوبر تک ۹۰۰۶ء لاکھ مستحق افراد کی پنشن بڑھاپا پنشن اسکیم کے تحت منظور کی جاچکی تھی۔ محض ۲۱۰ افراد کے علاوہ بقیہ تمام کو پنشن کی جون۔ جولائی ۸۷ء کی پہلی قسط ادا کی جاچکی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۶۵ سال سے کم عمر کے کسی بھی شخص کو یہ پنشن نہیں دی جائے گی۔ ۴۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کو ہریانہ اسمبلی کا یہ اجلاس حکومتِ ہریانہ کی ترقیاتی پالیسیوں پر بحث اور گذشتہ چند ماہ میں حاصل ہوئی قابلِ ذکر کامیابیوں کے جائزے کے بعد بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

آٹھ اسکول اساتذہ کو ایوارڈ

گذشتہ دنوں عزت مآب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ نے ہریانہ راج بھون میں منعقدہ اساتذہ کو "اسٹیٹ ایوارڈ" سے نوازنے کی ریاستی سطح کی ایک تقریب میں اس امر کا اظہار فرمایا کہ مستقبل میں طلباء میں سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے مذاقِ سلیم پیدا کرنے کی ضرورت خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ گورنر موصوف نے لڑکیوں کی تعلیم اور تعلیم بالغان کے پروگراموں میں توسیع پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم دے کر ہی ہم نہایت عزم اور استحکام کے ساتھ اکیسویں صدی میں قدم رکھ سکیں گے۔

عزت مآب نے "اسٹیٹ ایوارڈ" پانے والے اساتذہ کے قابلِ ذکر کاموں اور خدمات کی تعریف کرتے ہوئے دیگر اساتذہ کرام کو بھی ان انعام یافتگان کی تقلید کرنے کے لیے کہا تاکہ وہ بھی بہتر سے کارکردگی کے بعد اس ایوارڈ کے مستحق قرار پائیں۔

جناب برنی صاحب نے اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ تعلیم کے جدید طریقے عمل میں لائیں تاکہ طلباء کو تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تربیت بھی مل سکے۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر اسکولوں سے بھاگنے والوں کی اوسط مزید کم کرنے کی غرض سے اور زیادہ سہولتیں مہیا کی جانی چاہئیں۔ گورنر موصوف نے کہا کہ اساتذہ بہتر تعلیم و تربیت سے تعلیم کے فروغ میں ہاتھ بٹائیں تاکہ توہمات اور سستی جیسی برائیوں سے معاشرے کو پاک کیا جاسکے۔

گورنر ہریانہ نے پانچ پرائمری اور تین سیکنڈری اسکول ٹیچروں کو "اسٹیٹ ایوارڈ" عطا کیے اور ہر مدرس کو ۲۵۰۰ روپے، شال، سلور میڈل اور توصیفی سند سے نوازا۔

وزیرِ تعلیم ہریانہ جناب خورشید احمد نے اساتذہ سے کہا کہ وہ طلباء کی بہتر تعلیم کے لیے خود کو وقف کردیں کیونکہ یہی بچے مستقبل میں قوم کے وقار میں اضافہ کرنے اور اس ملک کی تقدیر سنوارنے میں اہم کردار نبھائیں گے۔ موصوف نے مزید فرمایا کہ ریاست کے دیہی، پسماندہ اور سرحدی علاقوں میں تعلیم کی ترقی و توسیع کے لیے اور زیادہ اقدامات کیے جائیں گے۔ ان علاقوں کے مقامی باشندوں کو متوجہ کیا جائے گا کہ وہ درس و تدریس کی تربیت حاصل کرکے

یہی خدمات اپنے علاقوں میں انجام دیں۔

پارلیمنٹری سکریٹری، ہریانہ جناب بھاگ مل نے بنے بنائے نوٹس اور مددگار کتابوں جیسے سہل طریقوں کی بجائے نصابی کتب کے ذریعے تعلیم دینے پر زور دیا۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن کے ڈائریکٹر جناب پروفیسر ستیہ بھوشن نے اساتذہ سے درخواست کی کہ وہ نئی ایجادات سے باخبر رہتے ہوئے اپنے طلباء کو تازہ ترین معلومات سے مستفید کریں۔

محکمہ تعلیم کی کمشنر محترمہ کرن اگروال نے بھی اس موقع پر خطاب فرمایا۔

مرکز کا ہریانہ سے سوتیلا برتاؤ

وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال نے مرکزی حکومت کے اس سوتیلے برتاؤ پر، جو وہ ہریانہ کے ساتھ "سوکھا راحت" فراہم کرنے کے سلسلے میں روا رکھے ہوئے ہے، نکتہ چینی کی اور کہا کہ یہ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جبکہ ہریانہ اس صدی کی بدترین قحط سالی سے دوچار ہے۔ یہ بات وزیر اعلیٰ ہریانہ نے روہتک سے ۳۴ کلومیٹر دور موضع شامن میں اپنے دو روزہ "جن جاگرن ابھیان" کے دوران ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ اس ابھیان کے آخری دن موصوف نے مہم جو بیسیوں درجن بھر میٹنگوں سے خطاب فرمایا۔

چودھری دیوی لال نے کہا کہ مرکز کے لیے یہ مناسب موقع ہے کہ وہ ہریانہ کے عوام کے جائز مطالبات کو سمجھے اور "سوکھا راحت" کے لیے ۱۴۳ کروڑ روپے کی رقم مہیا کرے کیونکہ ہریانہ اناج کا بھنڈار اور غلہ خیز خطہ ہے۔

وزیر اعلیٰ موصوف نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا کہ حالیہ انتخابات میں لوک دل نے سماجی تحفظ کی فراہمی کا وعدہ، معاشی استحکام، قرضوں کی معافی اور مستحق عوام کے لیے بڑھاپا پنشن جیسی معاشی بنیادوں پر بے مثل فتح حاصل کی ہے اور کہا کہ انتخابی منشور میں کیے گئے تمام وعدے میری حکومت نے پورے کر دیے ہیں۔ دیگر ریاستوں کے لیے بھی ہم نے ایسی برائیوں سے نجات حاصل کرنے کی مثال قائم کر دی ہے۔

چودھری دیوی لال نے نیشنلائزڈ بینکوں اور ریزرو بینک آف انڈیا جیسی فنانشیل ایجنسیوں کو متنبہ کیا کہ وہ قرض کی معافی کے سلسلے میں ریاستی حکومت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے سے باز آئیں۔ عالیجناب نے فرمایا کہ میری حکومت کی یہ پالیسی بڑے صنعتی گھرانوں کے قرضے معاف کرنے کے بجائے، جو کروڑوں روپے کے ہیں، ضرورت مندوں کو معاشی اور سماجی انصاف مہیا کرنے کے لحاظ سے سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

علاقہ کے عوام کے مطالبات کے جواب میں چودھری دیوی لال نے کہا کہ بڑھاپا پنشن منظور کرنے والی کمیٹی دوبارہ ان دیہات کا دورہ کرے گی اور جائز درخواست کنندگان سے...

...بقیہ صفحہ ۲۷ پر

سراج انور مصطفیٰ آبادی

پیامِ سالِ نو

سالِ نو کی کتاب کھلتی ہے
جگمگاتے پیام ہیں اس میں
دردِ دل کے سلام ہیں اس میں
کچھ عمل اپنے نام ہیں اس میں

کوئی عنوان انتخاب کرے
ہم میں پیدا اِک انقلاب کرے
کاش تقسیم یہ کتاب کرے

جب بھی مذہب کا کوئی کام کریں
سارے دھرموں کا احترام کریں
اونچا انسانیت کا نام کریں

بابِ انسانیت کی تنویریں
چند صفحاتِ دل کی تحریریں
علم و فن کی کچھ ایسی تصویریں

حق کی تنویر لے کے ہم اٹھیں
جو بھی تدبیر لے کے ہم اٹھیں
عزمِ تعمیر لے کے ہم اٹھیں

شمعِ منزل ہو سامنے اپنے
ماہِ کامل ہو سامنے اپنے
موجِ ساحل ہو سامنے اپنے

نور بخشیں وطن کے ذروں کو
شرم آئے فلک کے تاروں کو
تازگی دیں چمن کے پھولوں کو

بھوک، افلاس کو مٹائیں ہم
نفرتیں ساری بھول جائیں ہم
سب کو اپنے گلے لگائیں ہم

گلفشاں دشت اور دمن ہو جائیں
پھر اُجالے چمن چمن ہو جائیں
سب ترقی پہ گامزن ہو جائیں

لے کے عزمِ شباب کھلتی ہے
سالِ نو کی کتاب کھلتی ہے

تعمیر ہریانہ ۔ ۷ جنوری ۱۹۸۸ء

رام لعل

ڈال سے ٹوٹا

میرے تین بچّے ہیں — الّو، اتّو اور اُپہار۔ رات کو سونے سے پہلے مجھ سے کوئی نہ کوئی کہانی ضرور سُنتے ہیں۔ نہیں سُناتا تو میرے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں۔ تب میری بیوی انھیں خوب ڈانٹ پلاتی ہے۔ اور یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے انھیں اپنے پاس بٹھا کر کوئی نہ کوئی نئی کہانی سنا ہی دیتا ہوں۔ لیکن ہر روز ایک نئی کہانی کہاں سے لائی جائے؟ پھر کبھی انھیں سچی جھوٹی باتیں بتا کر بہلانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ فوراً بھانپ لیتے ہیں۔

"آپ ہمیں ٹرخا رہے ہیں، ڈیڈی!"

تینوں میری چھاتی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ مجھے مکّے مار مار کر کہتے ہیں —

"کہانی! کہانی! ڈیڈی، کہانی!"

ایک روز انھوں نے عجیب ضد پکڑ لی۔

"آج تو ہم بالکل سچی کہانی سنیں گے۔"

لیجئے۔ ایک نئی مصیبت!

اب میں سچّی کہانی کہاں سے لاؤں؟

اُن کی ممّی انھیں پھر ڈانٹ رہی ہیں۔

"چلو چلو۔ اب سو جاؤ۔ تمہارے ڈیڈی آج بہت تھکے ہوئے لوٹے ہیں۔ انھیں بھی سونے دو۔"

یہ سچ تھا۔ آج دفتر میں کام زیادہ کرنا پڑا تھا۔ مجھے بڑے زور کی نیند آ رہی تھی۔ لیکن بچّوں کو بھی خوش کرنا ضروری تھا۔ انھوں نے اپنی ماں کو دودھ گرم کرنے کے لئے کچن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو اتّو دھیرے سے بولا۔

"جلدی کیجئے ڈیڈی۔ ممی کے لوٹنے سے پہلے پہلے ایک زوردار کہانی ہو جائے!"

اتّو نے گھونسا تان کر کہا "بالکل سچّی ہونی چاہیئے۔ بتائے دیتا ہوں!"

اُپہار فکرمند سی ہو کر بولی — "پتہ نہیں، ہماری ممی کو کہانی سُننا کیوں اچھا نہیں لگتا؟ خود بھی تو نہیں سُناتی کبھی! جیسے کہانی کے نام سے ہی انھیں چڑ ہو!"

کہانی سے چڑ کی بات سُن کر مجھے واقعی ایک سچّی کہانی یاد آ گئی۔ سوچا، آج وہی سُنا دوں بچّوں کو۔

تینوں بچوں کو اپنے اور قریب کر لیا۔ کہا — "دو بھائی تھے۔ ایک بڑا، دوسرا چھوٹا۔

چھوٹے کا نام شنکر تھا۔ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ بڑے بھائی کا بیاہ ہو چکا تھا۔ اُسے بڑی سُندر پتنی ملی تھی۔"

"کتنی سندر ڈیڈی! جیسی ہماری ممی ہے؟" ایک بچے نے سوال کیا۔

"ہاں۔ بالکل تمھاری ممی کی طرح۔ لیکن بیچ میں مت بولو سُنو۔ بڑا بھائی ایک دفتر میں کام کرتا تھا۔ وہی کما کرلے آتا تھا۔ چھوٹا بھائی کوئی کام نہیں کرتا تھا۔"

"شنکر نا؟"

"ہاں ہاں شنکر۔ پھر بیچ میں بولے؟"

تینوں بچوں نے اپنے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ ایک دوسرے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"شنکر زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ اُسے بھی تمھاری طرح کہانیاں سُننے سُنانے کا بڑا شوق تھا۔ اُسے بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ ایک سے ایک اچھی کہانی۔ جہاں بیٹھ جاتا کہانی سُنانے لگتا۔ لوگ اُس کی زبان سے کہانیاں سُن کر بہت خوش ہوجاتے۔ جب اُس کے گھر میں ایک بھابی آگئی تو شنکر کا من کرتا اُسے بھی کہانیاں سُنایا کرے۔ لیکن اُس کی بھابی کو کہانی سُننا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ بالکل تمھاری ممی کی طرح۔ سمجھے؟ وہ جب بھی کوئی کہانی چھیڑتا تو وہ اُسے نکھٹو کہہ کر ڈانٹ دیتی تھی۔ گھر سے باہر چلے جانے کو کہہ دیتی تھی۔"

بچے بڑے دھیان سے کہانی سُن رہے تھے۔

میں نے آگے بتایا۔ "اس کی بھابی اکثر اپنے پتی سے شنکر کی شکایت کرتی۔ آپ کا بھائی تو بیچ بیچ بڑا نکھٹو ہے! کوئی کام دھام کیوں نہیں کرتا؟ اسے کسی کام پر لگائیے نا! اسے گھر میں بٹھا کر مفت کی روٹیاں کھلانا مجھے بالکل پسند نہیں۔"

"اس کا پتی اسے سمجھاتا۔ وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میرا ماں جایا۔ ابھی کوئی کام کرنے میں اس کا من نہیں لگتا تو کوئی بات نہیں۔ کبھی نہ کبھی تو کام کرے گا ہی۔ ابھی اس پر اتنی سختی مت کرو۔ ایک آدمی کو کھلانے پلانے کا خرچ تو ابھی ہم آسانی سے برداشت کر ہی سکتے ہیں۔"

لیکن اس کی پتنی نے اس کی بات نہ مانی۔ ضد پکڑ لی "شنکر کو کہیں باہر بھیج دیجیے۔ سر پر پڑے گی تبھی کچھ کرنا سیکھے گا۔"

"یہ بات شنکر نے بھی سُن لی۔ وہ کہیں آس پاس موجود تھا اُس وقت۔ اس کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ وہ فوراً گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ اس کے اس طرح اچانک چلے جانے سے اس کا بڑا بھائی بہت دکھی رہنے لگا۔ وہ شنکر سے بہت محبت کرتا۔ اس کے بغیر تو وہ ایک پل بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی تلاش کے لیے اس نے کیا کیا جتن نہ کیے۔ اخباروں میں شنکر کی فوٹو کے ساتھ اشتہار چھپوائے، ریڈیو پر اعلان کرایا، پولیس میں بھی رپورٹ لکھوائی، جگہ جگہ دیواروں پر بھی لکھوا دیا۔ "شنکر لوٹ آؤ۔ ہم سب تمھارے بغیر بہت اُداس ہیں"؛ اور تو اور ایک ہزار روپے کا انعام بھی دینے پر تیار ہوگیا — جو اُس کے بھائی کو ڈھونڈ کر لے آئے گا یا اُس کا محض پتہ ہی بتا دے گا۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ آخر بڑا بھائی مایوس ہوکر چپ ہو رہا۔ نصیب پر چھوڑ دیا۔ بھگوان کو منظور ہوا تو وہ کبھی نہ کبھی ضرور مل جائے گا۔"

اپنے دیور کے کھو جانے کے بعد اس کی بھابی کو اپنے کیے پر پشیمانی ہونے لگی۔ بہت پچھتاتی تھی۔ رو رو کر کہتی۔ "میں ہی اس کے لیے ذمہ دار ہوں۔" اُسے اتنا دکھی دیکھ کر اس کے پتی نے اُسے معاف

کر دیا۔ اُسے دلاسہ دیا۔ "شنکر کبھی واپس آگیا تو پھر اُس کے ساتھ ایسا سلوک مت کرنا۔"

اس کی پتنی نے اس کے ساتھ وعدہ کیا کہ شنکر واپس آجائے گا تو وہ اُسے اپنے بھائی کی طرح رکھے گی۔ پھر کبھی بھول کر بھی اُسے نہیں ڈانٹے گی۔"

لیکن کتنے سال بیت گئے۔ شنکر واپس نہیں آیا۔ اُس کے بھائی اور بھابی دونوں ہمیشہ بہت دُکھی رہے۔ اُسے یاد کرتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اُنھوں نے شنکر کی ساری چیزیں سنبھال سنبھال کر ایک بکس میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس کے کپڑے، اُس کی دوربین، اس کے جمع کیے ہوئے طرح طرح کے فوٹو۔ کبھی کبھی بکس کھول کر ان چیزوں کو وہ دیکھ بھی لیا کرتے۔ شنکر کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہی۔"

ابھی میں یہاں تک ہی کہانی سُنا پایا تھا کہ اچانک میری نظر اپنی پتنی پر جا ٹکی جو دروازے کے پاس ایک ٹرے میں دُودھ سے بھرے ہوئے پیالے لیے کھڑی تھی۔ بچّوں نے بھی اپنی ممّی کی طرف دیکھا اور حیران بھی ہوئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے کیونکہ اس نے بھی کہانی سُن لی تھی۔

بچّے میرے پاس سے اُٹھ کر اپنی ماں کے پاس چلے گئے۔ اُنھوں نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور اُسے اندر لے آئے۔

میری بیوی نے روتے روتے مجھ سے پوچھا۔ "آپ نے مجھے سچے دل سے معاف نہیں کیا تھا نا؟ تبھی تو بچّوں کو یہ کہانی سُنائی ہے۔ لیکن میں اب کر ہی کیا سکتی ہوں! چاہیں تو بڑی سے بڑی سزا دے دیجیے۔ میں قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میری غلطی کی یہ کہانی کسی اور کو مت سُنائیے گا۔"

اسے یوں روتا دیکھ کر میں بھی شرمندہ ہو گیا۔ مجھے واقعی ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اُسے ڈھارس دیتے ہوئے میں نے کہا۔

"میں تمھیں قصوروار سمجھتا ہوں، ایسا کبھی مت سوچنا۔ میں نے بچّوں کو یہی بتایا ہے کہ شنکر کی بھابی بہت دُکھی رہتی تھی۔ خیر ہٹاؤ۔ جو ہوا سو ہوا۔ جو کبھی میں اپنی کہانیاں سُنایا کرتا تھا۔ اب اُسی کی کہانی سنانی پڑ گئی مجھے۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ بچّوں کی آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے تھے۔ میں نے اُن کے بھی آنسو پونچھے۔ پھر سب کے ہاتھوں میں دُودھ کا ایک ایک پیالہ دے کر کہا۔ "جلدی سے پی جاؤ اور سو جاؤ۔"

سونے سے پہلے اُپہار نے میرا ہاتھ پکڑ کر بھرے ہوئے گلے سے پوچھا۔

"ڈیڈی، شنکر ہمارا انکل تھا نا!"

بچّوں نے ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا۔ میں نے انکار نہ کیا۔ کہا،

"ہاں، وہ تمھارا انکل ہی تھا۔ پر اُسے بھول جاؤ اور آج کے بعد پھر کبھی مجھ سے سچّی کہانی سنانے کے لیے مت کہنا۔ اس سے بڑی سچّی کہانی میرے پاس ہے بھی نہیں۔ جاؤ، سو جاؤ اب۔"

"انو نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "ہمارے انکل کبھی واپس نہیں آئیں گے، ڈیڈی، !

میں نے کہا۔

"نہیں کہہ سکتا۔ شاید آ ہی جائیں کبھی! میں بھی ان کا انتظار کرتا رہتا ہوں تمھاری ممی کی طرح۔"

انو لحاف کے اندر سرکتے ہوئے بولی۔

"ڈیڈی، کل ہمیں انکل کی وہ ساری چیزیں دکھلائیں گا جو آپ نے بکس میں بند کر کے رکھی ہوئی ہیں۔"

"ضرور دکھاؤں گا۔" میں نے وعدہ کیا۔ لیکن اُن کے بارے تم اپنی ممی سے کچھ بھی مت کہنا۔ ان کا من دُکھی رہتا ہے نا۔ بس اور کچھ مت پوچھو۔ سو جاؤ گڈ نائیٹ۔"

اگلے روز میں نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر اُنھیں بکس میں رکھی ہوئی شنکر کی ساری چیزیں دکھا دیں اپنی چیزوں کے ساتھ شنکر کی ایک فوٹو بھی رکھی تھی جسے بچے بڑی دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ اُس کا چہرہ بہت ہی دلکش اور بھولا بھالا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنی اَن کہی کہانیاں لہرا رہی تھیں۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم سب کا پروگرام شملہ جانے کا بنا۔ ہم ہر سال کسی نہ کسی پہاڑی یا میدانی شہر کو دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ جہاں بھی جاتے اپنی موٹر میں ہی جاتے تھے۔ موٹر سے یہ آسانی رہتی ہے جہاں ٹھہر جانے کو جی چاہتا ہے، ٹھہر جاتے ہیں۔ اُن دِنوں ہردوار میں کمبھ کا میلہ شروع ہو چکا تھا۔ لاکھوں یاتری بسوں، موٹروں اور ریل گاڑیوں میں بھرے ہوئے اُدھر ہی جا رہے تھے۔ ہر طرف بے پناہ بھیڑ تھی لوگوں کی۔

سہارن پور کے قریب پہنچ کر ہماری موٹر اچانک بگڑ گئی۔ ہم سب اُسے دھکیلتے ہوئے گرینڈ ٹرنک روڈ پر ایک پیٹرول پمپ پر لے گئے جہاں خراب ہو جانے والی گاڑیوں کی مرمت کرنے کا بھی انتظام تھا۔ موسم گرمی کا تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ لیکن سڑک کے دونوں طرف بے شمار یاتری پیدل بھی چل کر جا رہے تھے۔ ہردوار کی جانب جانے والی گاڑیاں سڑک کے بیچوں بیچ چل رہی تھیں۔

اچانک پیدل چلنے والے یاتریوں کے درمیان ہمارے بچوں کو لمبی کالی داڑھی والا جوان عمر ایک بابا دکھائی دے گیا جس نے اپنے ایک کندھے پر بچوں کا بائیسکوپ جیسا اُٹھا رکھا تھا۔ وہ بھی بچوں کو دیکھ کر رُک گیا۔ ہنس کر بولا۔

"تماشا دیکھو گے؟"

بچے مچل گئے۔ بھاگے بھاگے اپنی ممی کے پاس گئے۔ پر اُس نے بچوں کو جھڑک دیا۔ اس پر بچے میرے گرد جمع ہو گئے۔ میں پیٹرول پمپ کے منیجر کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اُن کو اجازت دے دی۔

"جاؤ جاؤ، دیکھو تماشا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ سُن بچے بابا کے پاس بھاگے بھاگے پہنچے۔ وہ ایک پیڑ کے سائے میں بائیسکوپ کا بکس اسٹینڈ پر لگا کر اُنھیں تماشا دکھانے لگا۔

بکس کے اندر ہی اندر گھومتی ہوئی رنگین تصویروں کو وہ ایک ہینڈل کے ذریعے گھما رہا تھا جنھیں دکھاتے وقت وہ مدھم سُر میں کوئی گیت بھی گاتا جا رہا تھا۔ بچے بکس کے شیشوں پر اپنی آنکھیں گاڑے کھڑے تھے۔ میں ذرا فاصلے پر اُن پر نظریں جمائے ہوئے بیٹھا تھا۔ بابا کا گانا بھی سُنتا جاتا تھا جس میں قطب مینار، لال قلعہ، پارلیمنٹ، یوم جمہوریت کا جلوس، تاج محل، بنارس کے گھاٹ، کلکتہ کا ہاوڑا برج، شیر شاہ سوری کا مزار، مہاتما بدھ کے وہاڑ وغیرہ کا ذکر تھا۔

میری بیوی نے ایک کول کارنر پر جا کر بچوں کو کولا پینے کے لیے بلایا تو وہ بھاگ کر وہاں پہنچ گئے۔ اپنی اپنی بوتل لے کر پھر بابا کے پاس لوٹ گئے۔ ایک بوتل بابا کے لیے بھی لے گئے۔ . . . .
. . . . اُس کے بعد مجھ سے بابا کو دینے کے لیے ایک روپیہ بھی لے گئے۔

لیکن بابا نے ان سے روپیہ نہ لیا۔ میری بیوی نے
بھی خود جاکر اُسے روپیہ لینے کے لیے کہا۔ تب بھی
اس نے قبول نہ کیا اور بچوں کی طرف بڑی محبت
سے دیکھتا ہوا بائیسکوپ کا بکس پھر سے کندھے
پر رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ جدھر پیدل چلنے والے یاتری
جا رہے تھے۔ جب ہم موٹر ٹھیک کرا کے شملہ کی طرف روانہ
ہوئے تو اچانک میری بیوی نے کہا: "پتہ نہیں کیوں،
اس آدمی کو دیکھ کر میرے من میں یہ بات اٹھ رہی
ہے، وہ شنکر تو نہیں تھا۔ اُسی کی مانند چوڑی
پیشانی، ویسے ہی بھولی بھالی آنکھیں، اس کے بولنے
کا ڈھنگ تک مجھے اُسی کا لگا۔ لیکن اس کی شکل
داڑھی مونچھوں کی وجہ سے اتنی بدلی ہوئی تھی کہ
یہ وشواس ہی نہ ہو سکا کہ وہ وہی ہوگا!"

یہ سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے تو اُسے
بس دُور سے ہی دیکھا تھا۔ اس کے گانے کی آواز
بھی دُور ہی سے میرے کانوں میں پہنچتی رہی تھی لیکن
میرا بھائی گایا تو نہیں کرتا تھا۔

"کیا اس نے بھی تمھیں نہیں پہچانا؟" میں
نے بیوی سے پوچھا۔

"شاید اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ تب ہی
تو وہ بچوں کی اور میری طرف بڑی دلچسپی سے دیکھتا
رہا۔ بڑے اپنے پن سے مسکراتا بھی رہا۔

انو نے ہماری باتیں سن کر کہا: "ڈیڈی، بابا
نے مجھ سے میرا نام بھی پوچھا تھا۔ انو اور اپہار سے
بھی۔ اور ہاں انھوں نے آپ کا نام بھی پوچھا تھا۔"

میں نے اچانک موٹر کو بریک لگا دی۔ "کیا
سچ! اُس نے میرا نام پوچھا تھا؟"

ہاں سچ ڈیڈی۔ انھوں نے آپ کا نام پوچھا
تھا اور وہ گانا گاتے گاتے آپ کی طرف بار بار دیکھتا
بھی رہا تھا۔" اُپہار نے انو کی بات کی تائید کرتے
ہوئے کہا۔

انو بولی: "وہ بابا تھا نا، گانا گاتے گاتے بیچ
بیچ میں رو بھی پڑتا تھا۔ میں نے اُسے اپنے آنسو
پونچھتے ہوئے دیکھا تھا۔"

یہ سُن کر میرے بھی آنسو نکل پڑے۔ "اوہ!
تم لوگ اُسے میرے پاس کیوں نہ لے آئے؟ وہ یقیناً
شنکر تھا!"

میری بیوی بولی: "مجھے تو اُسی وقت شک
ہوگیا تھا جب اُس نے روپیہ لینے سے انکار کردیا۔
پر نہ جانے کیوں میرے اندر اتنی ہمّت نہ پیدا ہو سکی
کہ اس کا نام پوچھتی۔ ایک ڈر سا تھا کہ وہ کوئی
دوسرا نہ ہو! جب وہ چلا گیا تو میرا من بے اختیار
اس کی اور کھنچنے لگا۔"

"لیکن وہ خود ہی ہمارے پاس کیوں نہ چلا
آیا جب اس نے ہمیں پہچان لیا تھا؟"

"شاید وہ اب بھی مجھ بد نصیب سے ڈرتا تھا
کہ کہیں اُسے ڈانٹ نہ دوں!" یہ کہتے کہتے میری بیوی
کی ہچکی بندھ گئی۔

ہمارے تینوں بچے جو گاڑی میں پچھلی سیٹوں
پر بیٹھے تھے اٹھ کر میرے کندھوں پر جھک گئے۔
بولے: "ڈیڈی، گاڑی گھمائیے نا! ابھی جاکر انکل کو
لے آتے ہیں۔ وہ بہت دور نہیں گئے ہوں گے۔"

میری بیوی نے بھی اصرار کیا تو میں نے
گاڑی گھما لی۔ ہم سہارن پور سے ابھی بارہ کیلومیٹر
ہی آئے تھے۔ وہ پیدل چلتے چلتے ایک آدھ کیلومیٹر
ہی آگے بڑھ سکا ہوگا۔ اسی ہردوار جانے والی
سڑک پر جدھر ہزاروں یاتری کمبھ کے میلے
میں جا رہے تھے۔

سہارن پور پہنچ کر میں نے گاڑی کو ہردوار
جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ دونوں طرف یاتریوں

کی لمبی لمبی قطاریں رواں تھیں گنگا میّا کی جے کے نعرے لگاتی ہوئیں۔ ہم بہت کم رفتار سے ایک ایک آدمی کو غور سے دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ اتنی بڑی بھیڑ میں اُسی ایک شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس کی لمبی کالی داڑھی تھی اور جس نے کاندھے پر بائیسکوپ کا بکس اٹھا رکھا تھا لیکن وہ ہمیں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ اسی طرح چلتے چلتے پندرہ بیس کیلو میٹر آگے نکل گئے۔ رُڑکی پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہاں سے پلٹ کر کتنے لوگوں سے اس کا حلیہ بتا کر پوچھا۔ اس کے بائیسکوپ کا بھی ذکر کیا لیکن مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ کوئی پیدل چل کر اتنی تیزی سے نہیں جا سکتا تھا۔

ہم شملہ جانے کا ارادہ ترک کر کے ہردوار جا پہنچے۔ وہاں ہفتہ بھر تک قیام کیا۔ صبح سے شام تک ہر جگہ گھومتے تھے۔ جہاں جہاں بھیڑ لگی ہوتی تھی اور بچوں کی تفریح کے لیے کھیل تماشے ہوتے تھے لیکن پندرہ بیس لاکھ چہروں میں ایک بھی چہرہ ویسا نہیں نظر آیا جس کی تلاش ہمیں تھی۔ ●

منظر سلطان

تجدید

قدم سنبھالو
ڈگر ڈگر میں
رو سفر میں
ہزاروں نوکیلے لال پتھر
برہنہ پاؤں میں گڑ رہے ہیں۔

بلند سورج کی
تیز کرنوں کے تن سے نکلے
ہمارے جسموں کے سائے
آپس میں لڑ رہے ہیں
جھگڑ رہے ہیں
یہ کیسا ناپاک سانحہ ہے
لہو ہمارا
لہو تمھارا
لہو کی رنگت تو ایک جیسی
چمن پہ سب کے حقوق یکساں
گلاب، کانٹے، ہرن، گلہری
یہ بات سمجھو
اے رہ نوردو، اے راہ گیرو

ابھی فرازِ فصیلِ شب پر
چراغ کوئی جلا نہیں ہے
ابھی اجالا ہے راستوں میں
ابھی یہ سورج ڈھلا نہیں ہے۔!!

فاروق شفق

کہیں اور کی بات میں کیا کہوں یہاں سر سے آندھی گذر گئی
بڑی تیز شب کو ہوا چلی مری شاخ شاخ بکھر گئی

نہ کہیں دریچہ کھُلا کوئی نہ وہ ملگجے کہیں سائے ہیں
جو اداس یادوں کی شام تھی کہیں جنگلوں میں ٹھہر گئی

کہیں ماہ و سال کی گرد میں میں چھپا ہوا تھا زمانے سے
پڑیں ننھی ننھی جو بوندیاں مری شکل جیسے نکھر گئی

ہوئیں بے چراغ حویلیاں اسی بے خیالی کی دھند میں
نہ دھیان تم نے ادھر دیا نہ ادھر ہماری نظر گئی

ہے سکوں سا دونوں کناروں پہ کہیں خار و خس کا نشاں نہیں
جو چڑھی ہوئی تھی ندی شفقؔ سنا ہے وہ رات اتر گئی

غزل

اس خرابے میں کوئی یوں تو کہاں آتا ہے
شام ہوتے ہی مگر روز دھواں آتا ہے

آنکھ ہی ہوتی ہے آندھی کی نہ منزل کوئی
زد پہ محفوظ مکاں پہلے یہاں آتا ہے

بھیگے کاغذ سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا ہے
کہنے والے کو بھی اندازِ بیاں آتا ہے

جھیل کا آئینہ شفاف ابھی ہے شاید
روز اک غول پرندوں کا یہاں آتا ہے

کر گئے لوگ کسی اور جگہ کو ہجرت
خالی آتا ہے نظر جو بھی مکاں آتا ہے

ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی

اردو ڈرامہ کے پس پردہ

اردو میں ڈرامہ ایک نوعمر اور غالبًا سب سے غیر ترقی یافتہ صنف ہے۔ اردو میں ڈراموں کا جنم کیوں اتنی تاخیر سے ہوا اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں اس کی ترقی کی رفتار سست کیوں رہی؟ اس کی وجہ تلاش کرنے کے لیے اس کی تاریخ پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ اردو اسٹیج دراصل دو بار جاں کنی کے مرحلے سے گزرا ہے۔ ایک مرتبہ تو اپنی پیدائش کے چند برسوں بعد جب کہ پرتگیزوں کے قدم ہندوستان سے اکھڑ گئے اور ان کے ہاتھوں لگایا ہوا ڈرامہ اور اسٹیج کا یہ چمن بھی باد سموم کی لپیٹ میں آگیا اور دوسری مرتبہ خاموش فلموں کے وجود میں آنے کے بعد اس پر جو برا وقت آن پڑا تھا اس سے سنبھلتے سنبھلتے تک ناطق فلموں کا رواج ہو گیا جن کے رنگ و نور اور چمک دمک نے اسٹیج کی روشنیوں کو مدھم کر دیا اور رہی سہی کسر ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ نے پوری کر دی۔ چند برسوں سے اب اردو ڈراموں اور اسٹیج کے احیا کی کوششیں کی جا رہی ہیں مگر اس کا مقابلہ فلموں اور ٹی وی پروگراموں سے ہے جو ہر اعتبار سے ایک آزاد اور خود مختار انڈسٹری یا فن ہے جن کو زبردست عوامی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ بہرحال اردو جیسی ایک جدید زبان میں ڈراموں کی طرف اگر اب بھی توجہ دی جا رہی ہے تو غنیمت ہے۔

اردو ڈراموں کے فقدان کی وجہ خود اس زبان کی ساخت و خصوصیات میں مضمر ہے اس کے پس پردہ وجہیں تلاش کرنے کے لیے اردو کی پیدائش اور دیگر زبانوں سے اس کے تعلقات پر نظر ڈالنی ہوگی۔ سنسکرت میں ڈرامہ کی صنف دیگر ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں خاص ترقی یافتہ تھی اور گو کہ اردو سنسکرت کے ساتھ طویل عرصہ تک چلتی اور بڑھتی رہی مگر دو وجوہات کی بنا پر موخر الذکر سے ڈرامے کا فن حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ ایک تو یہ سنسکرت کے مقابلے میں اردو عربی، فارسی اور ترکی زبانوں سے زیادہ متاثر ہوئی اور یہ تمام زبانیں گو کہ ترقی یافتہ ہیں مگر ان میں ڈرامہ کی صنف یا تو مفقود تھی یا ابتدائی دور میں اس کی وجہ بڑی واضح اور ٹھوس ہے۔

عربی، فارسی اور ترکی یہ سبھی مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ نقالی، رقص، موسیقی، مصوری اور اداکاری شرعی اعتبار سے قباحت اور ناپسندیدہ چیزیں تھیں اور یہ سبھی ڈرامے کے ناگزیر اجزائے ترکیبی ہیں لہٰذا ان زبانوں میں جو ڈرامے کا وجود نہیں ہوا تو اردو میں کس طرح ممکن تھا؟ سنسکرت سے غیر متاثر رہنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سنسکرت اپنے فنی عروج تک پہنچنے کے بعد اب مائل بہ زوال تھی اور سنسکرت ڈرامہ اپنے معیار سے گر چکا تھا . . . . لہٰذا ایسی زبان کا خاطر خواہ اثر اردو پر پڑنا ممکن نہیں تھا۔

ہندوستان میں تھیٹر کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ ہر علاقے کے اپنے خاص تھیٹر ہوا کرتے تھے۔ بہار اور اڑیسہ کا "تماشا" بنگال کا "جاترا" بہار، اتر پردیش کی "نوٹنکی" آندھرا پردیش کا "ودھی ناٹکم"، کرناٹک کا "بیلاٹا"، کیرالہ کا "اوٹھنی تال" وغیرہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ہندوستانی ادب میں ڈرامہ کی جڑیں کافی گہری ہیں۔

ہمارے ملک میں اسٹیج اور ڈراموں کا سلسلہ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا۔ پرتگیزوں کی آمد سے جا ملتا ہے۔ ان کے ذریعے اسٹیج کیے جانے والے ڈراموں کے تین مقاصد تبلیغ، تفریح اور مالی منفعت ہوا کرتے تھے۔ ان کے بعد انگریز آتے رہیں انہوں نے ڈرامہ کو نظریۂ تثلیث کی تبلیغ اور مشنری مقاصد کے لیے استعمال کیا نیز اس کے ذریعہ وہ دولت و ثروت اور جارحیت و ترقی پسندی کا مظاہرہ کر کے مشرقی حکمرانوں اور عام ہندوستانیوں کو متاثر و مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ پارسیوں نے بھی تبلیغ کے اس مقصد کو سامنے رکھا مگر یہی ڈرامے جب مالی منفعت کا سبب بنے تو "ہم خرما و ہم ثواب" کے مصداق اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اسی چیز نے گجراتیوں اور مرہٹوں کو ڈراموں کی طرف متوجہ کیا۔ سنسکرت کی روایت اور انگریزوں کی جدت و جدوجہد کے نتیجے میں ۱۸۵۳ء میں اردو کا پہلا ڈرامہ راجہ گوپی چند اور جلندھر، بمبئی تھیٹر میں کھیلا گیا (بحوالہ سید احتشام حسین "آجکل" ڈرامہ نمبر جنوری ۱۹۵۹ء صفحہ ۴، اور اردو ڈرامہ نگاری از قمر اعظم ہاشمی صفحہ ۱) جیسے مصنف ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ تھے کم و بیش اسی زمانے میں شاہی دربار اور عوام کی تفریح و تفنن کے خاطر ناٹک کھیلے گئے ان میں امانت کی اندر سبھا سب سے مقدم ہے۔ یہ پورے ملک میں اس قدر مشہور و مقبول ہوا کہ اس کے تتبع میں درجنوں اندر سبھائیں لکھی گئیں جن میں سے صرف مداری لال کی اندر سبھا کو بقا حاصل ہوئی باقی تمام صفحۂ قرطاس سے مٹ گئیں حالانکہ امانت کی اندر سبھا بذات خود فنی اعتبار سے (کہانی، مکالمے اور کردار) قدرے ناقص تھی مگر رقص و سرود کی بھرمار اور تفریحی عناصر نے اسے قبولیت عام بخشی۔ واجد علی شاہ کی سرپرستی نے بھی اسے حسن و عشق اور تفریح سے زیادہ قریب ــــــ........ کر دیا مختصراً یہ کہ ڈرامے کے فن میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور اسے زندگی سے قریب کرنے اور عصری زندگی کا عکاس بنانے کی سعی نہیں کی گئی۔

ابتدائی اردو ڈراموں پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ . . . . . . ان ڈرامہ نگاروں کا مقصد تبلیغ اور حصول زر تھا جس کے لیے انہیں عوام الناس کے مذاق اور مزاج کا بہت خیال رکھنا پڑتا تھا تھیٹر کا مالک یا مینیجر وہی منشی یا ڈرامہ نویس سے چاہتا تھا۔ قصہ نام کو ہوتا تھا جو محض گیتوں اور ناچ پیش کرنے کا بہانہ ہوتا تھا کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے

نہیں دیا جاتا تھا جہاں ناچ اور گانوں کی گنجائش ہو اور اس سے فائدہ نہ اٹھایا گیا ہو اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم منظوم مکالمے ہی ہوا کرتے تھے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو مقفیٰ مکالمے ہی سہی۔ نہ ڈرامائی واقعات ہوتے تھے نہ ڈرامائی حرکت و عمل اور تصادم۔ کرداروں کی سیرت کشی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی اور نہ ہی مکالمے فطری اور موثر ہوا کرتے تھے۔ ڈرامے اکثر عشق و محبت کے واقعات پر لکھے جاتے جن میں مزاح بہت بھونڈے قسم کا ہوا کرتا تھا۔ ان تمام خامیوں کے باوجود یہ ڈرامے وقت گزاری اور تفریح کا سب سے اہم ذریعہ تھے جو ہندوستان میں ابھرنے والے نئے متوسط طبقے کے افرادی وابستگی کا بڑا ذریعہ سمجھے جاتے تھے۔

امانت کے بعد خاں صاحب نوشیرواں جی مہربان جی آرام کا نام سب سے اہم ہے انہوں نے طبع زاد ڈرامے بھی لکھے اور انگریزی سے چند کے ترجمے بھی کیے اور پھر ۱۸۸۵ء سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا مولانا محمد حسین آزاد کے ذکر سے ہونی چاہئے جب "میکبتھ" کے ترجمے اور "اکبر" کی تصنیف کی طرف مائل ہوئے انہیں پورا نہ کر سکے بعد میں ان کے شاگرد رشید فراقی لکھنوی نے "اکبر" کو مکمل کیا فنی اعتبار سے مولانا کو اہمیت دینا مناسب نہیں البتہ ان کے بعد آنے والوں میں رونق بنارسی طالب بنارسی، حسین میاں ظریف، احسن لکھنوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے طبع زاد ڈرامے لکھے اور ترجمے بھی کیے، اسٹیج میں خوشگوار تبدیلیاں بھی پیدا کیں اور ڈرامے کے اسلوب میں بھی ہمواری پیدا کی ان میں ظریف کثیر التصنیف ہیں۔ حافظ عبداللہ لکھنوی بھی ساٹھ ڈراموں کے مصنف سمجھے جاتے ہیں۔ اردو ڈرامے کا تیسرا دور بھی دوم کی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے جس نے اردو ڈرامہ کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا وہ نام ہے آغا حشر کاشمیری کا۔ ان کے علاوہ اس دور کے اہم لکھنے والے احسن لکھنوی، بیتاب دہلوی، محمد عبدالعزیز، ذاتی دہلوی، افق لکھنوی اور آغا شاعر قزلباش ہیں۔ ڈرامہ کے ناقدین کی نظر میں حشر کی پوزیشن بڑی متنازعہ ہے ان کے مداح اور مخالفت کرنے والے دونوں قسم کے ناقدین ہیں۔ انہیں انڈین شیکسپیئر سے ملقب کیا گیا کیونکہ انہوں نے عوام کو شیکسپیئر کے ڈراموں سے روشناس کروایا حالانکہ خود انگریزی سے نابلد تھے۔ حشر نے اردو ڈرامہ کو کئی نئی چیزیں دیں جن سے اردو ڈرامے میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ یہ بلند ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔ رفتہ رفتہ انہوں نے منظوم اور مقفیٰ مکالموں کی تعداد کم کر دی اور اس کے بجائے روزمرہ کی صاف ستھری اور عام فہم زبان کو استعمال کرنا شروع کیا جس سے مکالمے لازماً فطری ہو گئے، کردار نگاری کا خاص خیال رکھنے لگے۔ اعتراض کرنے والے حشر کے زوردار مکالموں کو نشانہ بناتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زور بیان اور بلند آہنگی مکالموں کو غیر فطری بنا دیتی ہے یہ بات غلط نہیں مگر ڈرامہ ایک آرٹ ہے اور آرٹ میں بہت سی ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن سے فطرت محروم ہے اگر روزمرہ کی زندگی میں ادا کیے جانے والے ڈائیلاگ بالکل اسی طرح ڈراموں میں شامل کر دیئے جائیں تو سامع پر مطلوبہ تاثر پیدا نہیں ہو پائے گا۔ البتہ حشر کی پست اور سوقیانہ ظرافت سے بعض اوقات انکار نہیں کیا جا سکتا اس قسم کی ظرافت مذاق سلیم پر گراں گزرتی ہے ان سب کے باوجود ڈرامے کے تاریخی ارتقا میں حشر اور تیس برسوں پر پھیلے ہوئے ان کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں ایک عرصہ تک ڈرامہ کو ایک معیوب چیز سمجھا جاتا تھا اس لیے اکثر شرفا اپنے نام کو ڈراموں سے وابستہ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے۔ اور اس وقت تک ڈراما صرف حسن و عشق کی واردات تک محدود تھا مگر بعض سنجیدہ ادبا کی کاوشوں کے طفیل دھیرے دھیرے معاشرتی زندگی کا عکس ڈراموں میں جھلکنے لگا اور پہلی بار سیاسی سماجی موضوعات پر ڈرامے لکھے گئے گو کہ اب بھی رومانی ڈراموں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ ان میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبد الماجد دریابادی، شرر لکھنوی، دل لکھنوی، ریاض دہلوی، پنڈت کیفی قابل ذکر ڈرامہ نگار رہیں اسی دور میں ناطق فلموں نے ڈرامہ اور اسٹیج کی سرگرمیوں کو زیر کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ڈرامے اور اسٹیج میں لاتعلقی پیدا ہوگئی۔ اس دور تک اردو میں غیر ملکی زبانوں خصوصاً انگریزی سے ترجمہ اور استفادہ کی روایت پیدا ہو چلی جس کا آغاز خاں صاحب نوشیرواں جی مہرواں آرام نے کیا تھا۔ آغا حشر کے بعد سید تفضل حسین، مولانا عنایت اللہ دہلوی، مولانا عبد المجید سالک کے نام لیے جا سکتے ہیں ان کے بعد ڈاکٹر عابد حسین، شاہد احمد، ڈاکٹر تاثیر، انصار ناصری اور کسی حد تک منٹو کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

اردو ڈراما کے جدید دور کو آزادی کے بعد سے شروع کر سکتے ہیں اس کے اول مرحلہ میں قابل ذکر نام نور الٰہی محمد عمر، پریم چند، پنڈت سدرشن، کشن چند زیبا، سجاد حیدر یلدرم ہیں جن میں بعض کی تخلیقات گو کہ آزادی سے قبل منظر عام پر آئیں مگر موضوع اور تکنیک کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کو جدید دور میں شامل کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ دوسرے مرحلہ میں پروفیسر محمد مجیب، اپندر ناتھ اشک، ڈاکٹر سید عابد حسین، سید امتیاز علی تاج، اشتیاق حسین قریشی، حکیم احمد شجاع، ڈاکٹر اختر اورینوی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، عظیم بیگ چغتائی، خواجہ احمد عباس رفیع پیرزادہ، جمیل احمد محمد صادق پوری، ساغر نظامی، سجاد ظہیر عشرت رحمانی، قاسمی، کرتار سنگھ گل، حبیب تنویر کے نام آتا ہیں۔ ان تمام کے ڈراموں پر دور چہارم کے ڈراموں کے موضوعات کی چھاپ نظر آتی ہے مگر مسائل تک رسائی میں زیادہ بصیرت اور گہرے مشاہدے کی خوبیاں اور فنی پختگی نظر آتی ہے۔ اسی دور میں خاموش فلمیں بولنے لگیں اور قدرتی طور پر اسٹیج اور ڈرامہ پر اس کا اور بھی برا اثر پڑا مگر یہ خرابی اپنے پہلو میں ایک خوبی بھی ساتھ لائی۔ محض تجارتی غرض سے اردو ڈرامے کو چھپتے ہوئے سرمایہ داروں سے نجات مل گئی اور اب سنجیدہ اور باشعور ادیبوں نے اس طرف توجہ کی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اردو ڈرامہ محض سطحی مذاق و معیار کے حصار سے نکل کر فکر و فن کی راہوں پر گامزن ہو گیا جس کے اثرات جلد ہی مرتب ہوئے۔ سائنسی ترقی نے جہاں ایک طرف ریڈیو جیسی ایجادات بخشیں تو صنعتی پھیلاؤ نے انسانوں سے فرصت کے لمحات چھین لیے جس کے نتیجے میں ریڈیائی ڈرامے اور ایکانکی یا مختصر ڈرامے لکھے جانے لگے ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اس نئے رجحان TREND کا پوری طرح ساتھ دیا اور میرزا ادیب، کرشن چندر، اشک، منٹو، احمد عباس ریوتی سرن شرما، اظہار افسر راجندر سنگھ بیدی، علی عباس حسینی، فضل حق قریشی سہیل عظیم آبادی، اصغر بٹ، فیاض محمود، قدرت اللہ شہاب، انتظار حسین، ڈاکٹر محمد حسن، ہاجرہ مسرور، ناصر شمسی وغیرہ ادیبوں پر مشتمل ایک کارواں نظر آتا ہے جن کا ساتھ دیتے ہوئے یوسف ظفر، عبد العزیز

خالدہ، رفعت سروش، احمد فراز نئی پود کے بہت سے ڈرامہ نویس نظر آتے ہیں۔

ڈرامہ نگاروں کی اس طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان میں سے بیشتر بحیثیت ناول نگار یا افسانہ نویس اپنی اہمیت منوا چکے تھے لہٰذا ان کے ہاں فنی اعتبار سے کامیاب اور ناقص دونوں قسم کے ڈرامے ملتے ہیں۔ زیادہ تر ڈرامے ایسے ہیں جنہیں صرف پڑھا جاسکتا ہے کھیلا اور دیکھا نہیں جاسکتا۔ یہ ڈرامے عام طور پر ۱۹۳۰ء کے بعد کے ہیں جب کہ فلموں کے ہاتھوں اسٹیج کا زوال شروع ہوچکا تھا اور دور حاضر میں رہی سہی کسر ٹی۔ وی پر اشتہاری پروگراموں اور سیریلز نے کردی اور اردو ڈراما عصری مسائل کی پیشکش، سماجی الجھنوں اور جذباتی نفسیاتی ٹکراؤ اور افکار ونظریے کی نزاکتوں سے تہی دامن نہیں رہا انہوں نے زندگی کی تفصیلی تصویر کشی سے کبھی منہ نہیں موڑا اور اپنے عظیم مقصد کو فن اور دلچسپی کی گہری پرتوں میں چھپا کر پیش کیا اور ڈاکٹر محمد حسن کے اس قول پر عمل پیرا ہوکر دکھلا دیا کہ

"ڈرامے میں فکری گہرائی پیدا ہونی
چاہیئے اور اس میں حقیقی تجربات اور
جذبات کا عکس موجود ہونا چاہیئے"

(اردو ڈرامہ آزادی کے بعد، مطبوعہ آجکل ڈراما نمبر ۱۹۵۹ء)

ڈرامہ صرف پڑھ کر لطف اندوز ہونے کی چیز نہیں بلکہ تماشائیوں کے روبرو کھیلے جانے والا ایک مشکل آرٹ ہے اس کی پیشکش کے لیے محض کاغذ کے صفحات کافی نہیں بلکہ اسٹیج اور اس کے بیشمار لوازمات بھی ضروری ہیں۔ ڈرامہ کے علاوہ قصہ کی ہر صنف پڑھنے کے لیے ہوتی ہے مگر یہ سننے اور دیکھنے دونوں سے تعلق رکھتا ہے یہ صرف مروجہ الفاظ کے مجموعہ کا نام نہیں ہے اور عام طور پر صرف پڑھنے کے لیے نہیں لکھا جاتا بلکہ لکھنے والا اسے اسٹیج پر پیش ہوتے دیکھتا ہے یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں کرداروں کو مختلف واردات، حالات سے گھرا ابتلا یا جاتا ہے اور ان کی ذہنی وجذباتی کیفیتوں کو مختلف اعمال افعال واقوال (مکالموں) کی مدد سے ظاہر کیا جاتا ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ مکالموں کے علاوہ ڈراما کی زد میں خاموشی کے لمحات خود کلامی کے مرحلے اور محض ایکشن (حرکات) بھی آتے ہیں بقول عبدالمغنی (نقطۂ نظر)

" اس کی سب سے بڑی خصوصیت
اختصار اور ارتکاز ہے"

(مضمون ڈرامہ نگاری صفحہ ۳۵۷)

افسانہ نگار کے مقابلے میں ناول نگار کو تفصیل میں اترنے کی زیادہ آزادی ہوتی ہے لہٰذا اول الذکر کامیابی حاصل کرنے کے لیے زیادہ مہارت اور فنی چابکدستی کا ثبوت دینا پڑتا ہے مگر ڈرامے میں صرف قصہ کو اتنا مختصر رکھنا پڑتا ہے کہ چند گھنٹوں میں بغیر کسی اکتاہٹ کے تماش بین کے سامنے سارا قصہ ایک ربط وتسلسل کے ساتھ فطری ماحول میں پیش کیا جاسکے اور ساتھ ہی تماشائیوں پر وہی اثرات مرتب ہوں جو ڈراما نویس چاہتا ہے اس عمل کی کامیابی کے لیے اولاً اچھے پلاٹ کی تعمیر، کردار نگاری میں انفرادیت اور حسن اور مکالموں میں برجستگی، چستی اور موزونیت ضروری ہے نیز وحدت ثلاثہ کی بھی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ارسطو نے بوطیقا POETICS میں وحدت زمان ومکان کو لازمی نہیں قرار دیا مگر اس کی افادیت سے انکار بھی نہیں کیا ہے البتہ وحدت عمل کو مختصر افسانہ کی طرح یہاں بھی ضروری بتلایا ہے وحدت عمل کے ذریعہ ہی مطلوبہ تاثر پیدا کیا جاسکتا ہے جس سے ڈرامے کی شدت اور تاثیر میں بلاشبہ اضافہ ہوتا ہے۔ اب سے

وحدت زمان و مکان تو یہ کامیاب ڈرامے کے لیے ناگزیر نہیں شیکسپیئر کے بہت سے ڈراموں میں ان کی عدم موجودگی کے باوجود ان کی مقبولیت پر کوئی آنچ آنے نہیں پائی۔

ڈرامے کا شمار قصے کی قبیل میں ہوتا ہے لہٰذا پلاٹ از حد ضروری ہے۔ پلاٹ کے اجزا کو ایک مربوط شکل میں ایک مقررہ وقفہ کے دوران پیش کرکے سامع کے ذہن پر ایک شدید تاثر پیدا کرنے کا نام ڈراما ہے۔ ڈرامے کا ہر ہر فقرہ (ڈائیلاگ) کہانی کو آگے بڑھاتا ہے اور بقول قمر اعظم ہاشمی۔

"ناقدوں نے ایک (ناول) کو واقعات
کی اور دوسرے (ڈراما) کو کرداروں
کی کہانی کہا ہے" صفحہ ۳۳
(اردو ڈرامہ نگاری)

ڈرامہ کے پلاٹ کی تکمیل پانچ مرحلوں سے ہو کر گزرتی ہے اول تو آغاز۔ جہاں کسی حادثہ یا حادثات سے قصہ شروع ہوتا ہے اور آگے چل کر یہ پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کا سلجھنا ناممکن نظر آتا ہے اور جب ایسی حالت آجائے جہاں مسائل کا سلجھنا ناممکن نظر آئے تو اسے منتہا CLIMAX کہتے ہیں۔ ناظر واقعات کی اتھل پتھل میں گھبر سا جاتا ہے اور پھر حرکت ایک خاص سمت میں بڑھنے لگتی ہے حالات کی گرہیں ایک ایک کرکے کھلنے لگتی ہیں یہ چوتھی منزل ہے اور آخر کار واقعات ایک خاص موڑ پر اختتام کو پہنچتے ہیں۔ اس طرح ناظرین کے ذہن کو گرفت میں رکھنے اور انکی دلچسپی بندھائے رکھنے میں کشمکش کا بڑا ہاتھ ہے اختر انصاری نے تو اس کشمکش کو ڈرامے کی اصل قرار دے دیا جدید ڈرامہ میں عمل کے مقابلہ میں فکر کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔ خیالات، عقائد، نظریات، رجحانات محبت اور فرض، نیکی اور بدی شعور اور تحت الشعور آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اسی لیے بعض لوگ جدید ڈراموں کو مسائلی ڈرامے Problem Plays بھی کہتے ہیں کیونکہ ان میں قصداً سماجی مسئلوں کو پیش کیا جاتا ہے ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے دیباچہ (نئے ڈرامے) میں کہا ہے

"ہمارے ڈرامے کا یہ رجحان بڑا
قابل قدر ہے کہ آخر کار وہ سستے چٹخارے
کی گرفت سے نکل کر سنجیدہ سماجی
مسائل کی طرف رجوع ہوا ہے۔" صفحہ ۱۲

ڈرامے کے نفس موضوع کو قارئین تک پہنچانے والے کردار ہی ہوتے ہیں جو اپنے مکالموں اور اداکاری سے ہر جذبہ ہر خیال کو سامعین تک پہنچاتے ہیں۔ ڈرامے میں مکالموں سے زیادہ اعمال و افعال کی ضرورت ہے کیونکہ مکالمے اگر طویل ہو جائیں تو عمل کی گنجائش باقی نہیں رہیگی اور ڈرامہ افسانہ نما بن کر رہ جائے گا ہمارے زیادہ تر لکھنے والوں کے یہاں یہی خامی پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ ہمارے زیادہ تر ڈرامہ نویس پہلے افسانہ نگار ہیں لہٰذا وہ اسٹیج کی ضرورتوں اور مکالموں کے فنی معیار کی طرف دھیان نہیں دے پاتے اسی لیے ان کے ڈرامے کھیلنے سے زیادہ پڑھنے کی چیز بن کر رہ گئے ہیں۔ کرداروں کی پیکر تراشی اس فنکارانہ ڈھنگ سے کی جانی چاہیئے کہ ایک طرف اس کردار کی انفرادیت نمایاں ہو اور دوسری طرف پلاٹ کے ارتقا میں یہ معاون ثابت ہو۔ ان کرداروں میں زندگی کی پوری تڑپ حرکت نظر آنی چاہیے۔ انہیں مناسب مواقع پر ہنستے قہقہے لگاتے، روتے بسورتے غلطیاں کرتے دکھائی دینا چاہیے یعنی ان میں بشریت پوری طرح موجود ہونی چاہیے۔ یہ سرتاپا نیکی اور خیر کے

پتلے نظر نہیں آنے چاہئیں اور نہ ہی مجسم بدی اور شر۔ ان کرداروں میں فطری ارتقا پایا جانا چاہیئے اور انہیں تصنع سے پاک ہونا چاہیے مختصراً یہ کہ کسی ڈرامے کی کامیابی ایک حد تک عمدہ کردار نگاری پر منحصر ہے۔

کرداروں کے بعد ڈرامہ میں مکالموں کا شمار اہم اجزا میں ہوتا ہے صرف اس لیے ۔۔۔ کہ پلاٹ کی تعمیر میں اور ان کے ارتقا میں ڈرامہ نگاری کی مدد کرتے ہیں۔ ناول نگار اور افسانہ نویس کو بیانیہ انداز اختیار کرنے اور جا بجا تشریح کی بیانات کی کافی گنجائش ہوتی ہے مگر ڈرامانگار کو یہ سہولت حاصل نہیں اور نہ ہی اسے پسندیدہ تصور کیا جاتا ہے البتہ کسی ڈرامے کے پس منظر اور ابتدائی کہانی کو گوش گزار کرنے کے لیے یا کہانی کی معنویت مزید واضح کرنے کے لیے مختصر سی کامنٹری دی جا سکتی ہے مگر وہ پردہ اٹھنے سے قبل۔ گویا ڈرامہ نویس کو مکالموں کے سہارے ہی اپنی بات کو موثر انداز میں کہنا ضروری ہے اور اس کے لیے لازمی ہے کہ مکالمے جاندار اور چست ہوں اور ان سے ہر کردار کی فطرت پر روشنی پڑے نیز اختصار ان کا سب سے اہم وصف ہو ورنہ ڈرامے کی طوالت خواہ مخواہ بڑھے گی اور تاثر کی شدت کم سے کم ہوتی جائے گی۔ ڈائیلاگ میں ایک بھی لفظ زائد یا بے کار نہیں آنا چاہیے ہر کردار کی مخصوص زبان، لب و لہجہ اور کردار کی عمر، مرتبہ، فطرت، سماجی معاشی و تہذیبی ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی ان مکالموں کو دلچسپ اور فطری بنانا ضروری ہے۔

ان عناصر کے علاوہ ڈرامہ کی کامیابی کے لیے کچھ اور شرطیں ضروری ہیں مثلاً ڈرامہ کا آغاز اور انجام فطری اور چونکا دینے والا ہو۔ نقطۂ منتہا CLIMAX کی اہمیت کو پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے اور ان سب سے بڑھ کر موزوں موضوع کا انتخاب ہے۔ ڈرامے کا تھیم THEME ایسا ہو جسے حسن خوبی کے ساتھ اسٹیج پر پیش کیا جا سکے نیز اسٹیج کی تیاری میں اور متعلقہ ضروری اشیا فراہم کرنے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔

مختصر یہ کہ ڈرامہ نگاری اور پھر اس کو اسٹیج تک لا کر کامیابی سے پیش کر دینا ایک بہت ہی مشکل کام ہے جس کے لیے بڑی لگن اور مہارت تامہ کی ضرورت ہے چنانچہ اچھے لکھنے اور ناٹک آراستہ کرنے والے فنکاروں کی ہمت افزائی ہونی چاہیے تاکہ اردو ڈرامہ بھی گجراتی، مراٹھی، ہندی اور بنگالی ڈراموں کی صنف میں آ کر ایک معزز مقام حاصل کر سکے۔

قاضی حسن رضا

غزل

شہرت کی فضاؤں کو ہم خوب سمجھتے ہیں
بے پر کی اڑانوں کو ہم خوب سمجھتے ہیں

ہاں آپ سے سیکھا ہے زخموں پہ نمک کرنا
جی! آپ کی باتوں کو ہم خوب سمجھتے ہیں

احساس بریدہ ہیں، اعصاب کشیدہ ہیں
دشمن کی دعاؤں کو ہم خوب سمجھتے ہیں

تصویر برہنہ ہے، شمشیر برہنہ ہے
ان نقش نگاروں کو ہم خوب سمجھتے ہیں

ویسے تو رضاؔ صاحب شاطر ہیں عدو اپنے
شطرنج کی چالوں کو ہم خوب سمجھتے ہیں

مدن موہن خمار جیندوی

کشتیٔ ہریانہ کے اے ناخدا!

کشتیٔ ہریانہ کے اے ناخدا۔ اے پاسباں
تیری عظمت کے فسانے کہہ رہا ہے اِک جہاں
ریگزاروں کو تری ہمت نے رنگیں کر دیا
خارزاروں میں نظر آتے ہیں ہر سُو گلستاں
آئینۂ دِل میں ہے پنہاں تیری تصویرِ نَو!

آج تا حدِ نظر تعمیر ہی تعمیر ہے
یعنی ہریانہ کی دھرتی سورگ کی تصویر ہے
جو تری عظمت کی خاطر ہنس کے سُولی چڑھ گئے
اُن دلیرانِ وطن کے خواب کی تعبیر ہے
تیرے دِل میں ہو ہمیشہ جذبۂ تعمیرِ نَو!

تجھ پہ لازم ہے حفاظت آج اِس جاگیر کی
دیکھنا صُورت بگڑ جائے نہ اِس تصویر کی
جذبۂ بغض و عداوت رنجش و ذاتی عناد
راہ میں حائل نہ ہو جائیں یہ اب تعمیر کی
سونپ دی ہے تیرے ہاتھوں میں یہی جاگیرِ نَو!

اِرتقائے اہلِ ہریانہ فراواں کر دیا
اِنتہائے یاس میں جینے کا ساماں کر دیا
چھینا جھپٹی اور رِشوت غیر ممکن ہو گئی
تِیرہ و تاریک راہوں میں چراغاں کر دیا
دیکھئے چاروں طرف پھیلی ہُوئی تنویرِ نَو!

زیست کا پیغام دینا ہے دلِ رنجُور کو
دینا ہے انصاف ہر دہقان ہر مزدُور کو
رہنمائی میں تری منزل کو پانا ہے ہمیں
متحد کرنا ہے مِل کر قوتِ جمہُور کو
دیکھ لیں گے جلد اپنے خواب کی تعبیرِ نَو!

اہلِ ہریانہ کی نظریں آج تجھ پر ہیں لگیں
پھر سے یہ دھرتی بہارِ بے خزاں ہو بالیقیں
تیری ہر بستی کا ہر گھر پھر سے مثلِ تاج ہو
خطۂ ہریانہ کی دھرتی ہو جنّت کی زمیں
اَے خمار اب تیرے ہاتھوں میں ہے یہ جاگیرِ نَو!

لیلیٰ لکھنوی

یہ غم جو زندگی نے دیئے

ایک دن طلعت سے ملاقات ہونے پر باتوں باتوں میں میں نے پوچھا تھا۔ "کبھی ساجدہ کی کوئی خیر خبر ملی؟ نہ جانے کس حال میں ہے بیچاری۔"

"بس ایک بار میں نے اُسے بڑی شکستہ حالت میں برہنہ پا، برہنہ سر رواں دواں سڑکوں پر پھرتے دیکھا تھا تو میرا دل بھر آیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئی تھی۔ ناتوانی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ چلنا دشوار تھا۔ مگر اب بھی اس دیوانگی کے عالم میں عزّت کو نہیں بھولی۔ چلتے چلتے چیخ کر کہتی جاتی تھی "لوگو! تم نے سُنا کریم نے میری بچّی کو بے آبرو کر کے بڑی بے رحمی سے مار ڈالا۔ جاؤ ہوسپٹل میں دیکھ لو۔ میری عزّت خون میں نہائی پڑی ہے۔" طلعت اور میں ساجدہ کی بدنصیبی یاد کر کے دیر تک آنسو بہاتے رہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ساجدہ اور احمد غریب ضرور تھے مگر بہت ہی شریف اور خود دار لوگ تھے۔ ساجدہ چکن کے کام میں بہت ماہر تھی۔ سارا سارا دن ساریوں اور کرتوں پر بے حد نفیس کڑھائی کرتی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے اور جس کی اُجرت بھی اُسے اچھی ملتی تھی۔ احمد ایک ہوٹل میں بیرا تھا۔ اُن کی ایک چھ سال کی بڑی پیاری اور نہایت ہی ذہین بیٹی تھی عزّت، جو اپنے کلاس میں فرسٹ آتی تھی۔ اس کرائے کے چھوٹے سے مکان میں وہ تینوں بغیر کسی شکوہ و شکایت کے بسر اوقات کر رہے تھے۔ ساجدہ اور احمد نے عزّت کے مستقبل کے لیے بڑے سنہری خواب دیکھے تھے۔ اس کو اچھی تعلیم دلانے کے منصوبے بنائے تھے تاکہ وہ بڑی ہو کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔ عزّت کی زندگی گزارے اور کسی کی محتاج نہ ہو۔

ساجدہ جب آئے دن سسرال والوں کے بہوؤں کے ساتھ مظالم سنتی، نئی نویلی دلہنوں کو زندہ نذرِ آتش کر دینے کے واقعات اخباروں میں پڑھتی تو اس کا دل دہل جاتا "یا خدا! تو نے انسان سے انسانیت چھین کر اُسے حیوان کیوں بنا دیا؟ یہ ساس خود بھی تو کبھی بہو بن کر سسرال میں آئی تھیں۔ ان کی بھی تو بیٹیاں، پوتیاں اور نواسیاں ہوں گیں۔ اگر ان کے سسرال والے

جہیز کم لانے پر ان کے ساتھ بھی اسی طرح کا جارحانہ برتاؤ کریں اور انھیں زندہ جلا دیں تو کیا اُن کا دل یہ مظالم اور تشدّد گوارا کرے گا؟ یا اللہ یہ کیسی سنگدل، جابر اور لالچی عورتیں ہیں۔ یہ کیسا فتنہ انگیز پُرآشوب زمانہ ہے میرے معبود جب انسان نے درندے کا روپ اختیار کر لیا ہے، اس کے خون سے شرافت انسانیت اور محبت نیست و نابود ہو گئی ہے۔" اُس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا "بی بی میں نے طے کر لیا ہے چاہے خود تکلیفیں اٹھاؤں، فاقے کروں مگر عزّت کو بہت پڑھاؤں گی۔ اسکول میں اس کی ٹیچر مجھ سے کہتی تھیں کہ "عزّت پڑھائی میں بہت اچھی ہے اور بہت ذہین ہے۔" بی بی میں اس کی شادی بہت سوچ سمجھ کر کسی شریف گھرانے میں کروں گی جو بہو کو بیٹی سمجھیں

عزّت کو اچھی تعلیم دلانے کے خیال سے ساجدہ ابھی سے پوسٹ آفس میں اس کے لیے رقم جمع کرانے لگی تھی۔ وہ جب بھی کبھی میرے گھر آتی تو عزّت کو صاف کپڑے پہنا کر لاتی تھی۔ اور ان معمولی سوتی کپڑوں میں عزّت اس قدر پیاری لگتی کہ میں اُسے دیکھتی رہ جاتی۔ کیسی غضب کی مخمور کٹورہ جیسی آنکھیں تھیں۔ کیسا قیامت کا رنگ و روپ تھا۔ وہ ہو بہو ماں کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ میں ساجدہ سے کہتی۔ "تمھاری بیٹی تو ماشاءاللہ ہزاروں میں ایک ہے۔!"

تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی۔

"بی بی! غریب کی خوبصورتی کیا، نصیب اچھا ہونا چاہیے۔ آج کل زمانہ بڑا پُرآشوب ہے۔"

آج جب میں ساجدہ کے بارے میں سوچتی ہوں تو یہی خیال آتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتی تھی، سچ کہتی تھی کہ بیٹی کا نصیب اچھا ہونا چاہیے۔ آج کل زمانہ بڑا پُرآشوب ہے۔

ساجدہ کی بدنصیبی کی داستان اُس منحوس دن سے شروع ہو گئی جس دن احمد کی سائیکل اور جسم کو ایک ٹرک روندتا چلا گیا اور سڑک پر رات بھر اس کی لاش خون سے نہائی لاوارثوں کی طرح پڑی رہی۔ کسی نے ٹرک کا نمبر تک نوٹ نہیں کیا۔ لوگ اور ٹریفک اس کے پاس سے گذرتا رہا۔ کچھ لمحوں کے لیے لوگ رُک کر لاش کو دیکھتے اور اپنا راستہ لیتے۔ صبح پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس اس کی لاش ہسپتال لے گئی۔

گھر میں ساجدہ اور عزّت احمد کے انتظار میں بھوکی پیاسی بیٹھی رہیں۔ ہر جاننے والے سے پوچھتیں "بھیا! احمد کو کہیں دیکھا ہے؟ جانے کیا بات ہے ابھی تک گھر نہیں آئے.... نہ جانے کیسے ہیں۔" دن میں کسی محلے کے شناسا نے اطلاع دی۔

"تمھارا شوہر ٹرک سے کچل کر گذر گیا۔ لاش ہسپتال میں ہے۔ جا کر لے آؤ۔"

تو ساجدہ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہوش و حواس گم ہو گئے۔ اس کے امیدوں اور خوشیوں کے چمن پر ایسی بجلی گر گئی جس نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا۔

ہمارے معاشرے میں جوان اور خوب رُو تنہا عورت کو عزّت سے جینے نہیں دیا جاتا ہے۔ اُس کی ایک ایک حرکت ایک ایک قدم پر دنیا والے نگاہ رکھتے ہیں۔ پہرے بٹھاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بے مقصد و بے سروپا باتیں بناتے ہیں۔ طنزیہ گھٹیا اور فحش بے بنیاد الزامات لگاتے ہیں۔ گلی گلی، کوچے کوچے بھیڑیے نما انسان ایسے شکار کی تلاش میں گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں جو ان کی ہوس کا نشانہ بن جائے اور وہ اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا لیں۔

وہ ماں بیٹی روتی اور بلکتی رہیں۔ اب اُن کا

نہ کوئی وارث تھا نہ کوئی سرپرست تھا۔ چند عزیز افزا آئے، زبانی رسمی ہمدردی دکھا کے چلے گئے اور پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ وہ کس پتھر سے سر ٹکراتی، کہاں جاتی، کس سے فریاد کرتی۔ میں نے ساجدہ کو بلا کر اپنے یہاں رکھنے کی پیش کش کی تو وہ بے اختیار رو دی۔ بولی۔ "بی بی اپنا گھر جیسا بھی ہے اچھا ہے میری عزت کسی کے در پر رہنا گوارا نہیں کرے گی۔ میرے مقدر میں جو لکھا ہے اسے بھگتنا ہوگا۔ اب یہ غم اور مصائب ایک دن کے نہیں ہیں مجھے انھیں زندگی بھر جھیلنا ہے۔"

احمد کی زندگی ان ماں بیٹی کے لیے ایک سائبان کی طرح تھی جس کے تلے وہ امن و تحفظ محسوس کرتی تھیں۔ مگر اب اس کی موت کے بعد وہ جیسے ننگے سر ہو گئی تھیں۔ رات کیا آتی اس پر قیامتیں گذر جاتیں۔ ذرا سی آہٹ پر دل دہل جاتا۔ ہوش و حواس گم ہو جاتے۔ وہ چار اینٹ کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری سڑا گلا جھرجھرا دروازہ جو ایک جھٹکے میں زمین پر آرہتا اور اس پر سے تنہائی ــــ ساری ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔ وہ عزت کو کلیجے سے لگا کر دعائیں پڑھ کر اس پر دم کرتی۔ قبلے کے رُخ ہاتھ بلند کر کے بارگاہِ خداوندی میں دعائیں مانگتی کہ "اللہ ہم بیکسوں پر رحم کر۔ ہماری مشکلیں آسان کردے۔ میری بچی کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا" وہ سوچتی اب یہ زندگی کیسے گذرے گی؟ کون ہے جو ہماری سرپرستی کرے گا؟ اتنی بڑی دنیا میں میں وہ تن تنہا رہ گئی تھی۔

زندہ رہنے کے لیے ایکبار پھر کئی مہینوں بعد وہ بازار سے چکن کا کام بنانے کے لیے سامنے لانے لگی۔ جوان بیوہ کو دیکھ کر نام نہاد شریف زادے راہ چلتے اس سے چھیڑ چھاڑ پر اُتر آتے۔ بیہودہ اور فحش جملے کستے اور فقرے بازیاں کرتے۔ ان سب سے زیادہ کریم اوباش اور شہدا تھا جو بڑی بھوکی پیاسی اور للچائی نگاہوں سے ساجدہ کو دیکھتا کہ وہ شرم سے پسینے پسینے ہو جاتی۔ مگر وہ بڑے صبر سے گردن جھکائے خاموش گذر جاتی۔ لیکن ایک دن بھرے بازار میں بلند آواز سے ساجدہ سے کہا۔

"ہائے ساجدہ رانی یوں کب تک مرنے والے کا سوگ مناتی رہوگی؟ آخر ہم کس لیے ہیں۔ میرے پاس آؤ۔ تمھارے دامن کو خوشیوں سے بھر دوں گا جو احمد بھی تمھیں نہ دے سکا۔"

اس لمحے صبر کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اب اور زیادہ بیہودگی اور بے حرمتی سہنا اس کے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ یکبارگی اُس کا ہاتھ اُٹھا اور اس نے کریم کے منھ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

بازار کے لوگ ایک عورت کی جرأت پر ششدر رہ گئے کہ جس کے اس نے طمانچہ مارا تھا وہ بیحد اوباش قسم کا غنڈہ تھا اور اس سے بھڑ جانا مصیبت مول لینا تھا۔ کریم نے بہت بے دردی سے ساجدہ کی کلائی پکڑ لی اور چاہتا تھا کہ اُس کو زمین پر گرا دے مگر عین موقع پر کچھ بزرگ درمیان میں حائل ہو گئے اور بیچ بچاؤ کر دیا۔ مگر جاتے جاتے اس نے بلند آواز سے ساجدہ سے کہا۔

"یاد رکھنا میں اپنی بے عزتی کا بدلہ تجھ سے بہت جلد لوں گا جس کو تو جیتے جی کبھی نہیں بھول پائے گی۔ کریم نے کبھی کسی سے مات نہیں کھائی تو تو کیا چیز ہے۔"

اس واقعے کے بعد سے ساجدہ نے اس بازار کی طرف آنا جانا بند کر دیا۔ مگر اب اور پریشان کن اور روح فرسا خیالات اس کے ذہنی

سکون اور راتوں کی نیند کو حرام کرنے لگے ۔ وہ
گھر محلہ، بوسیدہ مکان اور دیمک لگا دروازہ
غیر محفوظ نظر آنے لگے ۔ وہ جانتی تھی کہ کریم بدمعاش
ہے ۔ بارہا مختلف جرائم کے سلسلے میں جیل جا چکا ہے
اس سے کچھ بھی ممکن تھا لیکن جن حالات سے مجبور
ہو کر اس نے کریم کے تھپڑ مارا تھا اس کی جگہ پر
کوئی بھی دوسری غیرت دار عورت ہوتی تو مجبوراً
یہی کرتی جو اس نے کیا تھا ۔ کیا اس دنیا میں بے سہارا
اور تنہا عورت کے لیے کہیں پناہ نہیں ہے ؟ کیا ان
کا کوئی معاون اور مددگار نہیں ؟ کہاں ہیں مذہب
کے امین اور پاسبان ؟ ـ کہیں کوئی نہ تھا صرف
تنہائی کا ڈراؤنا اور بھیانک سناٹا تھا اور رات کی
سیاہی ۔ !!

پھر وہی ہوا جس کا اُسے ڈر تھا ۔

ایک دن عزت اسکول سے واپس نہیں
آئی ۔ وہ اس کے انتظار میں بھوکی پیاسی بیٹھی راہ
تکتی رہی پھر گھبرا کر لرزتے قدموں سے اسکول گئی
تو دیکھا اسکول کا گیٹ بند تھا ۔ دل دہل گیا ۔ آنکھوں
تلے اندھیرا چھا گیا ۔ پھر بھی چوکیدار سے رُک رُک
کر پوچھا ۔ "میری بچی جس کو کبھی کبھی میں اسکول
چھوڑ جاتی تھی آج گھر نہیں آئی ۔"

اسے تو ایک شخص کب کا رکشے میں بٹھا کر
زبردستی لے گیا ۔"

اور ساجدہ پر قیامتِ صغریٰ گذر گئی ـــ

"ہائے کریم تو میرا انتقام ایک معصوم سے نہ لے ۔
تو مجھے قتل کر دے ۔ پیروں سے روند دے مگر
میرے جگر کے ٹکڑے کو ہاتھ نہ لگانا" وہ پاگلوں
کی طرح دوڑتی روتی پیٹتی اپنے گھر گئی ۔ وہاں سے
دو تین احمد کے جاننے والوں کو لے کر پولیس اسٹیشن
میں رپورٹ لکھوائی اور عزت کا اغوا کرنے والے
کا نام کریم لکھوایا ۔ وہی کریم جس نے شارع عام
پر اُس سے بدلہ لینے کا عہد کیا تھا ۔

وہ رات بھر تڑپتی رہی اپنا سر دیواروں
سے ٹکرا ٹکرا کر فریاد کرتی رہی ۔

دوسرے دن خون میں لتھڑی اور خاردار
جھاڑیوں کے اندر سے ایک چھ سالہ بچی کی لاش
برآمد ہوئی جس کے جسم کے کپڑے تار تار تھے
چہرے پر بلا کا کرب طاری تھا ۔ قاتل نے بڑی
بے دردی سے اس کی آبرو ریزی کر کے کسی تیز
ہتھیار سے اُس کو قتل کیا تھا ۔ لاش کی پہچان
کرتے وہ ہسپتال گئی تو عزت کی بے حرمتی دیکھ
کر اس کا کلیجہ اُمنڈ آیا ۔ "کیا یہی اس کے جگر کا ٹکڑا
تھی جس کو اس نے اتنی جانفشانی اور دکھ جھیل
کر پالا تھا ؟ اس کے مستقبل کے لیے کیا کیا سنہری خواب
دیکھے تھے ۔ اس کی تعلیم کے لیے تکلیفیں جھیل کر ایک
ایک پیسہ جمع کر رہی تھی ۔

اور آج وہ خون میں نہائی ..... برہنہ
جسم ایک بھیڑیئے درندہ نما انسان کی ہوس کا
شکار ہو گئی ...

بار بار اس نے خون سے تر بتر لاش کو
چوما ـــ بلائیں لیں اور پھر دفعتاً اُٹھی اور ـــ
ـــ بھرائی لرزتی آواز سے بولی ۔

" لوگو ! سنو تم نے ایک درندے نما انسان
نے میری بچی کو بے آبرو کر کے قتل کر دیا .....
یہ دیکھو یہ میرے ہاتھوں پر اُسی معصوم بچی
کا خون ہے ۔ یہ زخموں سے چور لاش اسی بے گناہ
کی ہے ۔ میں اپنی بچی کے قاتل کریم سے اس کی
بے حرمتی اور خون کا بدلہ لوں گی ۔"

اور وہ روتی بلکتی بے تحاشہ سڑک پر
دوڑنے لگی ۔

ہاں ساجدہ غم سے دیوانی ہو گئی تھی۔
آج بھی وہ سرگرداں و پریشان، بھوکی پیاسی کسی دیوار کے سہارے پڑی موت کا انتظار کر رہی ہے۔ اُسے یہ تک نہیں معلوم کہ کورٹ نے عزت کے قاتل کریم کو سزائے موت کا حکم دیا ہے۔ ●●

بقیہ "حرفِ آغاز" صفحہ ۶ سے آگے ...

درخواستیں وصول کرے گی۔ حکومت ایسے تمام افراد کی درخواستیں رد کر دے گی جو کسی بھی طرح اس زمرہ میں نہیں آتے مگر بڑھاپا پنشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ موصوف نے اس امر کا بھی اظہار فرمایا کہ گزشتہ مئی میں، جب ریاست میں کانگریس برسرِ اقتدار تھی، ہریانہ کو ایک خوفناک طوفان کا سامنا کرنا پڑا تھا تاہم موجودہ حکومت کی جانب سے بطور راحت ۲۰ء۱ کروڑ روپے طوفان سے متاثرہ عوام میں تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ ایسے اقدامات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہم ہریانہ کے کسانوں اور غریب عوام کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد ہیں۔

چودھری دیوی لال نے موضع کھیتی بھیروں کے لڑکیوں کے مڈل اسکول کا درجہ بڑھا کر اسے ہائی اسکول کر دینے کا اعلان کیا۔ وزیر اعلیٰ نے اس علاقے کے دیہات کی ترقی کی غرض سے برابر کی امداد کے طور پر ۵ لاکھ روپے بھی منظور کیے۔ وزیر اعلیٰ موصوف نے کام کے بدلے اناج پروگرام کے تحت جاری کئی پروگراموں کا بھی معائنہ فرمایا۔

عالیجناب دیوی لال کو ایک بار موضع کھیتی مٹو اور تین بار موضع شامن میں سکوں سے تولا گیا وزیر اعلیٰ نے برابر کی امداد کے طور پر ساری رقم ریاست کے تعمیری کاموں کے لیے واپس کر دی۔ ●

ایم۔ اے۔ نعیم راہی

غزل

جو رات کی تاریک فصیلوں سے چلا ہے
کیوں دن کے اُجالوں میں کھڑا کانپ رہا ہے
محسوس یہ ہوتا ہے وجودِ غمِ ہستی
حالات کی اس دھوپ میں جلتی سی چتا ہے
سائے کی طرف دوڑنے والوں سے یہ پوچھو
سائے پہ کہیں زیست کا احساس ہوا ہے!!
بے نام سی لذت میں بہت دیر سے گم ہوں
کیا جانیے، کیا ڈوبتی آنکھوں نے کہا ہے
کس کس سے کہوں آج کی اُفتاد کا قصہ
حالات نے دل میں کوئی نشتر سا رکھا ہے

نیاز سلطان پوری

یہ خوں جو بہہ رہا ہے

یہ خوں جو سڑکوں پہ بہہ رہا ہے
یہ خوں جو گلیوں میں بہہ چُکا ہے
یہ خوں جو ایوان میں بہے گا
یہی تو ہے ارتقاء کا ضامن
اِسی سے ہے گلستاں کی زینت
اِسی سے ہونٹوں پہ مُسکراہٹ
اِسی سے رنگینیٔ محبت
اِسی سے نقش و نگارِ عالم
یہ خوں جو کل تک نقیب تھا امن و آشتی کا
اِسے سیاسی مقامروں نے
زبان و تہذیب اور عقیدہ کا رنگ دے کر
بشر کو اِک دُوسرے کا قاتل بنا دیا ہے
دِلوں میں نفرت کا اِک سمندر اُبل رہا ہے
ہر آستیں میں بشر کی خنجر چُھپا ہُوا ہے
یہ خوں جو سڑکوں پہ بہہ رہا ہے
اِسے حفاظت کے ساتھ رکھو
بلا سبب مت اِسے بہاؤ
جو کل تمہیں خون کی ضرورت در آئے گی تو
ہر ایک در پر صدائیں دو گے
تمہاری آواز سُننے والا کوئی نہ ہوگا
مکان تو ہوں گے مکیں نہ ہوں گے
تمہیں تب اپنی حماقتوں کا پتہ چلے گا
یہ خوں جو سڑکوں پہ بہہ رہا ہے
سُہاگ ہے یہ عروسِ نو کا
یہ لاج ہے ماں کی مامتا کی
چراغ ہے یہ اندھیرے گھر کا
اِسے بہا کر اُجاڑ گلشن کو مت بناؤ
اِسے حفاظت کے ساتھ رکھو
کہ یہ علامت ہے زندگی کی

مہدی عباس حسینی

اردو اور حکومت ہند

ہندوستان میں صرف دو زبانیں ہی ایسی ہیں جنہیں کسی ریاست کی اکثریتی زبان نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کے باوجود ملک کے ہر کونے میں پڑھی، لکھی، بولی اور سمجھی جاتی ہیں یہ زبانیں ہیں، انگریزی اور اُردو۔

اردو کی ہمہ گیر اپیل کے متعدد اسباب ہیں لیکن بنیادی سبب اِس کی اصل نسل ہے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور پیار محبت سے وجود میں آئی ہے۔ تانا بانا ٹھیٹھ ہندوستانی یعنی کھڑی بولی کا ہے لیکن نقش و نگار اور بیل بوٹوں کے لئے فارسی، عربی، ترکی بلکہ پرتگالی اور انگریزی تک کے دھاگے استعمال کئے گئے ہیں۔ رسم الخط فارسی نستعلیق ہے جسے آج کل نہ فارسی استعمال کرتی ہے نہ عربی۔

اردو کی مقبولیت کا راز ایک یہ بھی ہے کہ اس نے دوسری زبانوں سے الفاظ لینے میں کبھی کوئی جھجھک محسوس نہیں کی۔ کچھ لوگ غالباً اس بدیسی عنصر سے بھڑک کر ساری زبان کو بدیسی بتانے لگتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف اردو کی اصل نسل سے ناواقف ہیں بلکہ انہیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ اردو بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے والے آج بھی ہندوستان میں ہی پائے جاتے ہیں۔

1971 کی مردم شماری میں ہندوستان میں چھ کروڑ 86 لاکھ شہریوں نے اپنی مادری زبان، اردو بتائی تھی، جبکہ اس سال کی مردم شماری میں پاکستان میں صرف 32 لاکھ 98 ہزار 454 لوگوں نے اپنی مادری زبان اردو بتائی۔

آج بھی ہندوستان میں پاکستان کی بہ نسبت اردو کے زیادہ رسالے اور اخبارات شائع ہوتے ہیں اور اردو کی زیادہ

کتابیں چھپتی ہیں۔ (البتہ پاکستان میں اردو اخباروں کی اشاعت ہندوستان سے کہیں زیادہ ہے) علاوہ ازیں ہندوستان میں پاکستان کی بہ نسبت زیادہ یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔

ہندوستان کا آئین

ہندوستان میں اردو کی بقا کا سب سے بڑا سہرا ملک کے سیکولر آئین کو جاتا ہے۔ دستورِ ہند کی آٹھویں شیڈیول میں واضح طور پر درج ہے کہ گو کہ ملک کی سرکاری زبان ہندی اور انگریزی ہوگی لیکن ملک کی چودہ زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ حاصل ہوگا اور ان میں سے ایک اردو ہے۔

یہی نہیں جب ریاستوں کی تشکیل علاقائی زبانوں کی بنیاد پر ہوئی تو فضل علی کمیشن نے اردو اور دوسری اقلیتی زبانوں کے تحفظ کیلئے تجویز کیا کہ ایک کمیشن برائے لسانی اقلیت مقرر کیا جائے جو یہ دیکھتا رہے کہ کسی زبان کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہو رہی ہے اور سال کے آخر میں ایک رپورٹ صدر جمہوریہ کو پیش کرے جس میں ان زیادتیوں کا ذکر اور ان کے مداوا کی تجاویز درج ہوں۔

چنانچہ کمیشن اب بھی کام کر رہا ہے۔

سہ لسانی فارمولا: اقلیتی زبانوں کے تحفظ کی دوسری صورت سہ لسانی فارمولا تھا۔ مرکزی سرکار نے تجویز کیا اور بیشتر ریاستی سرکاروں نے یہ مان بھی لیا کہ اول تو پرائمری درجوں میں ہر طالب علم کو اس کی مادری زبان میں علم ملنا چاہیئے اور مادری زبان وہ مانی جائے گی جو بچے کے ماں باپ بتائیں گے۔ پھر ثانوی سطح پر بچے کو تین زبانیں پڑھائی جائیں۔ علاقائی زبان، انگریزی زبان اور علاقائی زبان کے علاوہ کوئی جدید ہندوستانی زبان۔ اس تیسری زبان میں اردو یا کسی اور مادری زبان کی گنجائش نکل آتی ہے۔ البتہ مادری زبان کے لئے یہ شرط رکھی گئی ہے کہ ایک کلاس میں کم سے کم دس طالب علم یا سارے اسکول میں چالیس طالب علم اسے پڑھنا چاہیں تبھی اس کی تعلیم کا انتظام کیا جائیگا۔ لیکن اگر کوئی تعلیمی ادارہ از خود چاہے تو کسی زبان کی تعلیم کے لئے دس فی کلاس اور چالیس فیصد اسکول کی تعداد پوری نہ ہونے پر بھی انتظام کر سکتا ہے

اس کا براہ راست فائدہ اردو کو پہنچتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جس اسکول میں اردو پڑھنے والے طالب علموں کی اکثریت ہو وہاں اردو کو ذریعہ تعلیم بھی بنایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں اردو کے خاص علاقے آندھرا پردیش بہار، اتر پردیش، دہلی، جموں و کشمیر، ہماچل، مہاراشٹر، کرناٹک اور مغربی بنگال ہیں۔ اردو اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد پنجاب اور ہریانہ میں بھی پائی جاتی ہے چنانچہ اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار "ہند سماچار" جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔

وزارت تعلیم

اردو کے فروغ میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

ترقی اردو بورڈ: ترقی اردو بورڈ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی ایک صلاح کار ایجنسی ہے۔ یہ 1969 میں قائم کیا گیا۔ اس کے دفتر کا نام ترقی اردو بیورو ہے۔ بیورو، اردو میں علم و ادب سماجی سائنس اور سائنس سے متعلق کتابیں شائع کرتا ہے یہ اب تک 560 کتابیں شائع کر چکا ہے۔ این۔ سی۔ آر۔ ٹی (نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ یعنی تعلیمی تحقیق و تربیت کی قومی کونسل) کیلئے 231 کتابیں، آندھرا پردیش سرکار کے لئے 19 کتابیں (کالج اور یونیورسٹی سطح کی) آئی سی ایچ آر (انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ یعنی تاریخ میں تحقیق کی بھارتی کونسل) کے لئے 17 کتابیں قانون کمیشن کے لئے دستور ہند کی اشاعت ثانی اور آٹھ موضوعات پر اصطلاحات شائع کر چکا ہے۔ 12 جلدوں کا اردو انسائیکلوپیڈیا تیار ہو چکا ہے۔ انگریزی اردو لغت تیار ہو رہا ہے۔ بیورو کتابوں کی نمائش میں بھی حصہ لیتا ہے، پاکستان میں بھی تین نمائشیں لگا چکا ہے۔ اور ابھی تک 35 لاکھ روپے کی کتابیں بیچ چکا ہے۔ بیورو اردو کتابت، شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ سکھانے کے مرکز بھی چلاتا ہے۔ کتابت کے 13 مرکز کھلے ہوئے ہیں جن میں سے 4 عورتوں کے لئے مخصوص ہیں۔ بیورو کا ایک خاص

کام اصطلاحات سازی ہے۔

گجرال کمیشن رپورٹ :- 1972 میں وزارت تعلیم نے اردو کے مسائل اور اس کے فروغ سے متعلق ایک کمیٹی، جناب اندر کمار گجرال، سابق مرکزی وزیر کی صدارت میں مقرر کی۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ 1975 میں پیش کی جس میں 187 سفارشات تھیں۔

اس کے بعد ترقی اردو بورڈ کی ایما پر وزارت تعلیم نے پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی جس نے تجویز کیا کہ حکومت ہند اور ریاستی سرکاریں قابل قبول سفارشات کو کس طرح عملی جامہ پہنا سکتی ہیں۔ البتہ جن سفارشوں پر عمل ہو چکا ہے وہ یہ ہیں۔ ریڈیو اور دوردرشن اردو پروگرام بڑھا دیئے گئے "یوجنا" کا اردو ایڈیشن بھی شائع ہونے لگا۔ اردو ریلوے ٹائم ٹیبل ملنے لگے۔ اسٹیشنوں کے نام اردو میں لکھے جانے لگے۔ خاص خاص علاقوں میں منی آرڈر اور وی پی پی کے فارم اردو میں ملنے لگے، جموں وکشمیر اور دہلی میں مردم شماری کے فارم اور رائے دہندوں کی فہرست اردو میں ملنے لگی۔ سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز نے اردو اساتذہ کی دس ماہ کی ٹریننگ کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی :- یہ اکاڈمی ایک عرصے سے دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ ہر سال اردو کی بہترین کتاب کے مصنف کو انعام و اعزاز سے نوازتی ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ :- یہ ادارہ علاقائی زبانوں میں قومی موضوعات پر عام فہم زبان میں کتابیں شائع کرتا ہے۔ ان میں اردو کتابیں بھی شامل ہیں۔

چلڈرن بک ٹرسٹ :- یہ ادارہ خاص طور پر بچوں کیلئے کتابیں شائع کرتا ہے۔ ان میں اردو کتابیں بھی ہوتی ہیں۔

تعلیم بالغان :- وزارت کا یہ شعبہ ہر سال نئے پڑھے لکھے بالغوں کے لئے لکھی گئی کتابوں کا مقابلہ کراتا ہے جس میں اردو کتابوں پر بھی انعام ملتا ہے۔

کلچر کا محکمہ :- یہ محکمہ ہر زبان کے اعلیٰ مصنفوں کو ان کی ادبی خدمات کیلئے انعام و اکرام سے نوازتا ہے اور ان کی کتابیں شائع کرانے میں مدد دیتا ہے۔ ان میں اردو، عربی اور فارسی کے عالم بھی ہوتے ہیں۔

وزارت اطلاعات ونشریات

وزارت تعلیم کے بعد اردو کے فروغ میں سب سے زیادہ کام وزارت اطلاعات ونشریات کرتی ہے۔

رجسٹرار آف نیوز پیپرس :- اگر اردو بولنے والوں کی تعداد اور اردو اخبارات اور رسائل کی تعداد کا تناسب نکالا جائے تو محسوس ہوگا کہ غالباً اردو والے دوسری زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اخبار پڑھتے ہیں۔ لیکن دراصل ایسا نہیں، اخباروں کی تعداد زیادہ ہے اور پڑھنے والوں کی کم، لہٰذا انکی اشاعت زیادہ نہیں۔

اشاعت کے سلسلے کی پہلی کڑی یعنی اخباری کاغذ کی فراہمی کا کام رجسٹرار نیوز پیپرس کے ذریعے ہوتا ہے۔ اخباروں کو اپنا نام رکھنے، رجسٹرڈ نمبر لینے اور کاغذ حاصل کرنے کیلئے اسی دفتر سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ رجسٹرار کو وزارت اطلاعات کی ہدایت ہے کہ چھوٹے اخباروں یعنی پندرہ ہزار تک کی اشاعت والے اخباروں (اردو کے نوے فیصد اخبار اسی زمرہ میں آتے ہیں) کے ساتھ خاص رعایت رکھی جائے۔ چنانچہ اس پالیسی سے اردو والوں کو بہرحال فائدہ پہنچتا ہے۔

پریس انفارمیشن بیورو :- کاغذ کی فراہمی کے بعد صفحات کو بھرنے کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ چھوٹے اخبارات نہ تو تربیت یافتہ عملہ رکھتے ہیں، نہ نامہ نگار اور نہ خبر ایجنسیوں کے خریدار ہوتے ہیں۔ پریس انفارمیشن بیورو اردو اخباروں کو اردو میں حکومت ہند سے متعلق اطلاعات صدر، وزیراعظم اور دوسرے وزیروں کی تقریریں بشمولیت عام بجٹ، ریلوے بجٹ، انگریزی مضامین سے ترجمے، اردو میں براہ راست لکھے گئے مضامین، تقریریں اور پیلے کاغذ پر چربے مہیا کرتا ہے جو لیتھو پر چھاپے جا سکتے ہیں اور اردو کے چھوٹے اخبارات کیلئے بہت مفید ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو :- حکومت کا خبروں کا شعبہ جو ریڈیو اور ٹی وی کیلئے خبریں تیار کرتا اور پیش کرتا ہے، چھوٹے اخبارات کی سہولت کیلئے روزانہ آدھے گھنٹے کا سست رفتار کا بلیٹن

پیش کرتا ہے یعنی اس میں خبریں اتنی ٹھہر ٹھہر کر سنائی جاتی ہیں کہ سننے والا آسانی سے انہیں نقل کرسکتا ہے۔ اردو اخبار والے اس طرح تازہ ترین خبریں بغیر خبر ایجنسی پر خرچ کئے حاصل کرلیتے ہیں اس طرح اگر حکومت ہند سے متعلق معلومات پریس انفارمیشن بیورو دیتا ہے تو تازہ خبریں آل انڈیا ریڈیو۔

آل انڈیا ریڈیو روزانہ نو گھنٹے سے زیادہ کا ایک اردو پروگرام نشر کرتا ہے جسے اردو سروس کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ "اردو مجلس" پروگرام ہے اور یہ دونوں پروگرام بہت مقبول ہیں۔ ریڈیو روزانہ متعدد بلیٹن اردو خبروں کے نشر کرتا ہے جو سرینگر، جموں، جالندھر، شملہ، لکھنؤ، پٹنہ، رانچی اور حیدرآباد سے ریلے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشہور عام ودھ بھارتی پروگرام میں بھی اردو کے پروگرام وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ اردو نشریات کے خاص مرکز سری نگر، جالندھر، جموں، دلی، لکھنؤ پٹنہ، بھوپال اور حیدرآباد ہیں۔

ریڈیو نے اردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں کو ہمیشہ اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ چنانچہ آزادی کے قبل کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو وغیرہ اس سے منسلک تھے تو آزادی کے بعد جوش ملیح آبادی، روش صدیقی، ساغر نظامی، ڈاکٹر عابد حسین، عین حنفی، محمود ہاشمی وغیرہ ریڈیو کے صلاحکار ڈائرکٹر پروڈیوسر رہے۔ ساغر نظامی صاحب ریڈیو میں ڈپٹی چیف پروڈیوسر (اردو) تھے ان کے بعد جناب کمال احمد صدیقی اس عہدے پر فائز رہے ہیں۔

دوردرشن اور فلمز ڈویژن:۔ دوردرشن میں دلی جالندھر اور سری نگر سے اردو کے بہترے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں جو پاکستان میں بھی مقبول ہیں۔ فلمز ڈویژن بھی سال میں متعدد ڈاکومینٹری اردو زبان میں بناتا ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر نیوز ریل کی کمنٹری کا اردو ترجمہ کشمیر اور دیگر اردو داں علاقوں کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔

ڈی اے وی پی:۔ وزارت اطلاعات کا تیسرا محکمہ، ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی، اردو اخباروں کو اشتہارات مہیا کرتا ہے۔ یہاں پر بھی وہی پالیسی لاگو ہے یعنی چھوٹے اخبارات اور رسائل کو زیادہ رعایت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ محکمہ اردو میں پوسٹر پمفلٹ اور کتابچے وغیرہ بھی شائع کرتا ہے۔

پبلی کیشنز ڈویژن:۔ وزارت اطلاعات کا یہ محکمہ ہندوستان کا سب سے بڑا پبلشر اور تاجر کتب ہے۔ یہ سال میں سو سے زیادہ کتابیں مختلف علاقائی زبانوں میں شائع کرتا ہے۔ اس کا ایک اخبار "یوجنا" گیارہ زبانوں میں، جن میں اردو بھی شامل ہے، شائع ہوتا ہے۔ اس کا رسالہ "آج کل" 1942ء سے اردو میں مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اس وقت مسلسل شائع ہونے والے رسالوں میں قدیم ترین اردو رسالہ ہے۔ "آج کل" بہترین طباعت و کتابت کے کئی انعامات حاصل کر چکا ہے۔ پبلی کیشنز ڈویژن سال میں کئی اردو کتابیں بھی شائع کرتا ہے۔

اس مختصر سے جائزے سے واضح ہو گیا ہوگا کہ حکومت ہند نے اردو کی تعلیم، تبلیغ و ترسیل کے لئے نہ صرف ساری سہولتیں مہیا کر رکھی ہیں بلکہ وہ اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے عملی طور پر کوشاں رہتی ہے۔ اسی طرح مختلف ریاستوں میں اردو کے فروغ کیلئے جو کوششیں ہو رہی ہیں اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آج تیرہ ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں قائم ہیں۔ جن کا سارا خرچہ ریاستی سرکاریں دیتی ہیں۔ یہ اکیڈمیاں اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال، ہریانہ، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، راجستھان، آندھرا پردیش، کرناٹک، گجرات، اڑیسہ مہاراشٹر اور دہلی میں قائم ہیں۔

آج اردو ہند میں ہمیشہ سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کا ثبوت فلمی گیتوں، غزل، قوالی اور مشاعروں سے مل سکتا ہے۔ لیکن حکومت کی تمام مساعی کے باوجود اردو کا فروغ اس پر منحصر ہے کہ اردو بولنے والے اپنے بچوں کو اسکولوں میں یا گھر پر اردو پڑھاتے ہیں یا نہیں۔ اگر یہ سرا مضبوط ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں اردو کی مقبولیت اور اس کا اثر بڑھتا نہ جائے۔ (بشکریہ پی آئی بی)

کاوش پرتاپگڑھی

ہائیکو

اری منچلی ہواؤ!
کہاں دھوپ میں ہو نکلی
میرے پاؤں شعلوں پر ہیں

آج پھر فاقہ کریں گے میرے بچے
دیکھ کر مجھکو پرندے
پھڑپھڑا کر اُڑ گئے سارے شجر سے

انا کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہوں
ہمالہ بھی ذرّہ سے زیادہ نہیں ہے
خدا بخش دے دولتِ عجز مجھکو

خلا میں گیند اُچھال رہا ہوں
کہیں گرے اِس سے کیا مطلب
میرے سر پر ہیلمٹ ہے

تازہ تازہ ہوائیں آتی ہیں
زنگ آلود کھڑکیاں ہم نے
اپنے ذہنوں کی کھول دیں جب سے

گھر میں تنہائی ڈستی ہے
باہر بھیڑ میں گھٹتا ہے دم
دوراہے پہ کھڑا ہوا ہوں

بھگوان داس اعجاز

دوہے

ہوا کا رُخ ہو اُس طرف
دیں پتنگ ترتیب
خط پہنچائیں کس طرح
سوجھ گئی ترکیب

چھپ کر بیٹھا تھا یہیں
دشمن میرے قریب
اُن سے کیا باتیں ہوئیں
سب سُن گیا رقیب

قدم قدم خوش قسمتی
ثابت ہوئی نقیب
مت پوچھو کہ ہم چڑھے
کتنی بار صلیب

دیکھا ہم نے عشق میں
یہ اعجاز عجیب
جتنا دوڑے دور ہم
اُتنے ہوئے قریب

بھوک پیاس کی مار سے
مرتا روز غریب
خود تو جاگے رات بھر
سویا رہے نصیب



اگست وستمبر ۸۷ء کے شمارہ میں ڈاکٹر مظفر حنفی کا مضمون (تحریکِ آزادی اور اردو شاعری) بڑے مزے کا ہے۔ حب الوطنی اور جدوجہد آزادی کے جذبے سے سرشار ہوکر، اردو شعرا نے جو نظمیں لکھیں، وہ اردو شعروادب کا مابہ الامتیاز حصہ ہیں۔ ان میں کچھ ایسے شعرائ بھی ہیں جنھوں نے جنگِ آزادی میں عملی طور سے حصّہ لیا اور جیل کی صعوبات برداشت کیں۔ حنفی صاحب نے اپنے مضمون میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ اس بات کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ اردو زبان ایک زندہ، متمدن اور توانا زبان ہے۔ اور اس میں اتنا دم خم اور کس بل ہے کہ وقت اور ماحول کے بدلتے ہوئے ادبی، ثقافتی، سیاسی، عمرانی اور ملکی وملی تقاضوں کا پوری ہوشمندی اور استقامت سے ساتھ دے سکے۔ اس شمارے کا دوسرا قابلِ ذکر اہم مضمون جناب سلیم شہزاد کا (جدید غزل کی لفظیات) ہے۔ مقالہ نگار نے مثالوں اور حوالوں کی روشنی میں، جدید غزل کے تعلق سے لفظیات، لفظیات کے تنوع، جدّت اور غیرروایتی لسانی واسلوبی برتاؤ کے ضمن میں، جس ناقدانہ چابکدستی اور فنکارانہ ہوشمندی سے عمدہ اور مفید بحث کی ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ یوسف ناظم کا فکاہیہ (بمبئی کی برسات) رام پال، رفیع حیدر انجم اور فاطمہ ترمذی کے افسانے، کرشن کمار طور، منظر سلطان، تسنیم فاروقی کی غزلیں پسند آئیں۔

فضا ابنِ فیضی (مئو ناتھ بھنجن)

"یوم آزادی نمبر" باصرہ نواز ہوا۔

ڈاکٹر منظفر حنفی، ستیش بترا، یوسف ناظم، کرشن کمار طور، تسنیم فاروقی، جوہر بجنوری وغیرہ فنکار "تعمیرِ ہریانہ" کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہیں۔ افسانوی ادب میں "خلش کہاں سے ہوتی" اور "چبھن ختم ہوئی" نے متاثر کیا۔ "جدید غزل کی لفظیات" عمدہ اور معلوماتی مضمون ہے۔ قدیر بنارسی، ساجد حمید اور منظر سلطان کی غزلیں پسند آئیں۔

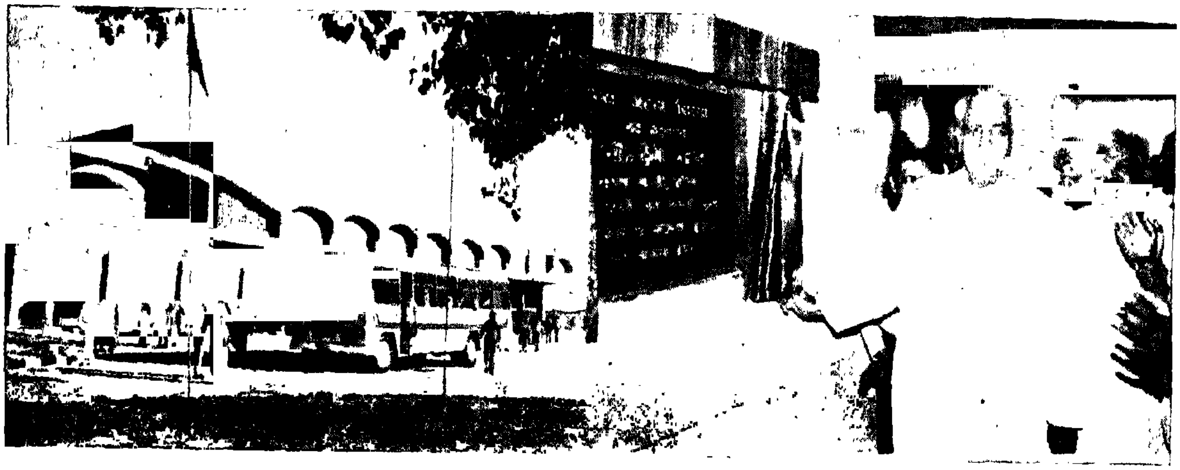
شاہد سیالوی (بلند شہر)

اردو رسائل میں موقر جریدے "تعمیرِ ہریانہ" نے کم قیمت میں معیاری اور صحت مند ادب پیش کرنے کی نظیر قائم کی ہے۔

دیگر تخلیقات کے علاوہ ڈاکٹر منظفر حنفی اور سلیم شہزاد کے مضامین بالترتیب "تحریکِ آزادی اور اردو شاعری" اور "جدید غزل کی لفظیات" نہایت پُر مغز اور معلوماتی ہیں۔ منظر سلطان کی غزلیں اور رفیع حیدر انجم کا افسانہ "شاید نہیں" حاصل شمارہ ہیں۔

فراق جلال پوری (فیض آباد)

پبلشر اور چیف ایڈیٹر این۔ کے۔ جین نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس سی او ۱۸۹-۱۹۱ سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ سے جنوری ۱۹۸۸ کے لیے شائع کیا۔ طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو ٹی چنڈی گڑھ



۳ر نومبر ۱۹۸۷ء کو سرسہ کے نئے بس اسٹینڈ کا افتتاح فرماتے ہوئے عالیجناب دیوی لال، وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۴ر نومبر ۱۹۸۷ء کو بس اسٹینڈ ڈبوالی کا افتتاح فرماتے ہوئے۔



Regd. No. NW/CH—15 Tamir-e-Haryana (Monthly) January, 1988



عالیجناب دیوی لال، وزیراعلیٰ ہریانہ، ۲۵ نومبر ۱۹۸۷ء کو رد ہتک کے حلقہ میہم میں نہایت توجہ اور ہمدردی سے دیہاتیوں کی عام شکایات کو سُنتے ہوئے۔

تعمیر

ہریانہ



مارچ ۱۹۸۸ء



وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال "سورج کنڈ کرافٹس میلہ"
کی رسم افتتاح انجام دیتے ہوئے۔

آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

مارچ ۱۹۸۸ء	شمارہ : ۳	جلد ۱۶

مدیر اعلیٰ:
ارجن داس ملک
آئی۔اے۔ایس

مدیر:
سلطان انجم

سرورق: پون کمار

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

خط وکتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱
سیکٹر ۱۷سی، چنڈی گڑھ — ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

ترتیب

حرفِ آغاز



پنجاب اینڈ ہریانہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب وی راما سوامی جناب ہری آنند برارای کو گورنر ہریانہ کے عہدے کا حلف دلاتے ہوئے۔

۲۲ فروری ۱۹۸۸ء کو ہریانہ راج بھون میں منعقدہ ایک سادہ اور پُراثر تقریب میں جناب ہری آنند براری کو پنجاب اینڈ ہریانہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب وی راما سوامی نے گورنر ہریانہ کے عہدے کا حلف دلایا۔

عزت مآب براری صاحب نے ہندی میں حلف لیا۔ حلف برداری کے بعد گورنر موصوف نے ہریانہ پولیس کی جانب سے انہیں پیش کئے گئے "گارڈ آف آنر" کا معائنہ فرمایا۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال نے اس تقریبِ سعید میں شرکت فرمائی۔ اُن کی کابینہ کے اراکین وزیر اعلیٰ موصوف کے ہمراہ تھے۔ ہریانہ، پنجاب اور چنڈی گڑھ انتظامیہ کے سینئر افسران اور دیگر معززینِ شہر بھی تقریب میں موجود تھے۔

پیغام

ہری آنند براری
گورنر ہریانہ

۲۲ فروری ۱۹۸۸ء کو گورنر ہریانہ کے عہدے کا حلف لینے کے فوراً بعد عزت مآب ہری آنند براری نے ہریانہ واسیوں کے نام مندرجہ ذیل پیغام دیا:

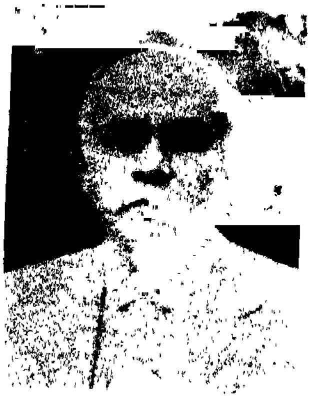
پیارے ہریانہ واسیو!

آج ہریانہ کے گورنر کے طور پر حلف لینے کے بعد پہلی بار آپ کو مخاطب کرتے ہوئے مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ ہریانہ کی مقدس سرزمین کو قدیم تہذیب و ثقافت کا مرکز ہونے کا افتخار حاصل ہے۔ یہاں کی مقدس ندی سرسوتی کے کنارے ہی رشی منیوں کے آشرموں میں بیشتر وید منتروں کی تخلیق ہوئی تھی۔

ہریانہ خواہ ملک کی چھوٹی ریاستوں میں سے ایک ہے تاہم ۱۹۶۶ء میں وجود میں آنے کے بعد گذشتہ ۲۱ برسوں کی قلیل مدت میں اس نے جو ترقی کی ہے وہ بذات خود ایک قابل تقلید مثال ہے۔ ۲۱ سال کا عرصہ کسی ریاست کی عمر کے لحاظ سے کوئی بڑا عرصہ نہیں کہا جا سکتا لیکن ترقیاتی سرگرمیوں کے سبھی شعبوں میں خواہ وہ زراعت کا میدان ہو یا صنعت کا، تعلیم کا شعبہ ہو یا صحت عامہ کی خدمات میسّر کرانے کا، سیاحت کا ہو یا روڈویز میں توسیع کا یا ان کے علاوہ دیگر شعبے، غرض ہریانہ ہر میدان میں برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔

مجھے پوری امید ہے کہ آنے والے وقت میں بھی ہریانہ کے محنتی عوام وزیر اعلیٰ چودھری دیوی لال کی رہنمائی میں شاہراہ ترقی پر اسی طرح آگے بڑھتے رہیں گے۔ انہی الفاظ کے ساتھ ہی آپ کی خوشی، خوشحالی اور ترقی کے لئے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

جے ہند



جناب ہری آنند براری
گورنر ہریانہ

مختصر سوانحی خاکہ

جناب ہری آنند براری صاحب کی ولادت یکم اپریل ۱۹۲۹ء کو ہوئی۔ آنجہانی ایچ۔ ڈی۔ براری آپ کے والدِ محترم تھے۔ محترمہ انیتا براری آپکی رفیقۂ حیات ہیں۔ آپ کی تین صاحبزادیاں ہیں جو سبھی شادی شدہ ہیں۔

کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے (معاشیات) کرنے کے بعد آپ ۱۹۵۲ء میں سینٹرل کلکتہ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں ہی آپ انڈین پولیس سروسز کے لئے منتخب ہو گئے اور جنوری ۱۹۵۵ء سے اکتوبر ۱۹۵۶ء تک مغربی بنگال میں پولیس افسر تعینات رہے۔ بعد ازاں آپ نومبر ۱۹۵۶ء میں سینٹرل گورنمنٹ میں چلے گئے۔ اور وہیں سے ۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء کو ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ٹینس کھیلنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔

باواکرشن گوپال مغموم

غزلیں

ابھی فرقہ پرستی نت نئے فتنے اٹھائے گی،
ابھی دہشت پسندی خونِ انسانی بہائے گی
ابھی افریقی باشندوں پہ گورے ظلم ڈھائیں گے
ابھی مظلومیت، شیطانیت سے مات کھائے گی
ہمیں بدنام کردے گا نفاقِ باہمی اپنا
کہانی اپنی ذلت کی لبِ عالم پہ آئے گی،
اندھیرا ہے ابھی ہر دل میں نفرت کا، عداوت کا
خدا جانے، محبت کب دلوں میں جگمگائے گی
مصائب کی بھیانک آندھیوں نے ہم کو گھیرا ہے
مگر ناپید ہے تدبیر جو ہم کو بچائے گی،
سیاست اور مذہب کو ملانے والے مت بھولیں
وطن کی سالمیت کو یہ "سازش" سہاٹ جائے گی
دلوں میں پیار کا طوفاں اُمڈ آئے گا مستی میں
ہماری بانسری مغموم! جب تانیں اُڑائے گی

پیار کی راہ میں جتنے بھی چبھے ہیں کانٹے
مجھ کو پھولوں سے بھی بڑھ کر وہ لگے ہیں کانٹے
یہ تعصب کے، تشدد کے، جنوں کے، شر کے
آج ہر راہ پہ کیسے یہ اُگے ہیں کانٹے؟
ایک تصویرِ غم و درد سے صحنِ گلشن
غنچہ و گُل کے لہو سے جو رنگے ہیں کانٹے
چند تخریب پسندوں کی بدولت، یارو!
قوم کی راہ میں تا دُور بچھے ہیں کانٹے
میرے ہونٹوں پہ مچل اٹھی ہے آہِ جاں سوز
جب کبھی پھولوں کے پلڑے میں تُلے ہیں کانٹے
کوئی نغمہ ہے، نہ نالہ ہے، نہ فریاد کی لَے
آج شاعر کے گلُو میں بھی گڑے ہیں کانٹے!
جستجو تھی مجھے نایاب گلوں کی مغموم!
مجھ کو ہر موڑ پہ ہستی کے ملے ہیں کانٹے

ستیہ پال آنند

پتھر میں پھول

من بہادر کی ساری روح جیسے سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ گئی، اس کی نظروں نے اوپر نیلے آسمان کا طواف کیا جیسے کچھ غیر مرئی سی چیز کی تلاش کر رہی ہوں دور اوپر دو مرغابیاں دریا کی طرف اڑی جا رہی تھیں تبھی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے من بہادر کی روح ایک صاف، سفید، تہہ شدہ رومال کی طرح اس کی آنکھوں سے نکلی، ایک لمحے کے لئے معلق رہی اور پھر... پھر مرغابیوں کے پیچھے اڑ گئی، جب اس نے میری طرف نظریں گھمائیں تو وہ بے جان تھیں۔

" افسوس ہے...!" اس نے کہا۔ اپنا سکاٹ بانڈ وق اپنے پاس نہیں تھا!"

شہر کے باہر بنے ہوئے نالے کے کنارے چھوٹے سے قلعے میں زندگی جاگ رہی تھی۔ لودھیوں کے زمانے کے بنے ہوئے اس قلعے میں اب کئی سرکاری دفاتر تھے۔ ایک ہوزری سکھانے کا سینٹر بھی تھا، سینٹر میں ٹریننگ لینے والے لڑکے آنے شروع ہو گئے تھے، جب پرنسپل مسٹر باسو دور سے آتے دکھائی دئیے تو من بہادر نے میری کرسی اٹھا کر برآمدے میں رکھ دی اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی باسو صاحب کی میز کے پاس لگا دی۔ مسٹر باسو نے دفتر میں آتے ہی اپنی بھاری بھرکم آواز میں پوچھا۔

" آل ویل، کلرک؟"

" یس سر!" میں نے ایک مشین کی طرح پھرتی سے جواب دیا۔

اندر سنگھ نے روزانہ کی طرح ہی کہا، " ست سری اکال جی!"

من بہادر بولا۔

" بندگی۔"

گوربخش سنگھ نے روزانہ کی طرح چق اٹھا کر دور سے ہی کہا،

" گڈ مارننگ سر!"

مسٹر باسو ڈاک دیکھنے لگے تو اندر سنگھ اور گوربخش سنگھ اپنی اپنی لاٹھیاں اٹھا کر ہوزری ٹریننگ سنٹر کے سب کمروں کی صفائی دیکھنے چلے گئے، من بہادر میرے پاس کھڑا رہا۔

" نئیں آیا، بابو جی؟ ڈاک دیکھا؟"

میں اس کے بہتے ہوئے خیالات کی لہروں کو ایسے پکڑ لیا کرتا تھا، یہ شاید اس لئے ممکن تھا کہ اپنے تین برسوں کے قیام کے دوران وہ لگ بھگ آٹھ گھنٹے روز میرے ساتھ گذارتا تھا، میں ٹائپ کرتا یا کیش بک لکھتا وہ میرے میز کے پاس سٹول پر مستعدی سے بیٹھا رہتا، کبھی کبھار ایک آدھ بات کر لیتا، فطرتاً کم گو تھا، گورکھالی تو فرفر بولتا تھا، لیکن ہندوستانی مشکل سے اس کی زبان پر چڑھتی تھی۔

مجھے علم تھا کہ وہ اپنی پنشن کے کاغذات کے بارے میں پوچھ رہا ہے، جو ہیڈ ٹریژری آفس مانڈلے برما سے آنے والے تھے اور جن کا انتظار وہ کئی برسوں سے کر رہا تھا، اس نے بیس برسوں تک آرمڈ پولس برما کی نوکری کی تھی ۱۹۷۷ء میں وہ نیپال واپس جانے کے ارادے سے کلکتہ آگیا لیکن پھر نہ جانے اپنا ارادہ بدل کر ہندوستان میں ہی رہ گیا اور گذشتہ تین برسوں سے سرکار کے اس ٹریننگ سنٹر میں چوکیدار کے طور پر کام کر رہا تھا، اس سارے وقفے کے دوران میں اس کی طرف سے درجنوں عرضیاں ٹائپ کر کے مانڈلے بھیج چکا تھا، ایک دو چٹھیوں کا جواب بھی آیا تھا، لیکن اس کی پنشن کے کاغذات ابھی تک نہیں پہنچے تھے، اس کی پنشن کا روپیہ اب بڑھ کر کئی ہزار تک جا پہنچا تھا۔ میں نے سر ہلا کر کہا۔

" ابھی میں نے ڈاک نہیں دیکھی، من بہادر"

" وہ چق اٹھا کر سیدھا اندر چلا گیا۔" ساب۔ ڈاک میں امرا کاگت نئیں ہوتا؟"

مجھے سنائی دیا۔ صاحب نے کہا" من بہادر، ساری، نہیں ہوتا!"

جب وہ باہر نکلا تو اس کے چہرے پر جھریاں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ میں نے پوچھا

" من بہادر۔ اگر روپے پیسے کی ضرورت ہو تو مجھ سے قرض لے لو۔"

اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا، جدھر مرغابیاں اڑ گئی تھیں۔ آہستہ سے بولا، " دو چار روپے ادھار.. کیا ہوتا بابو جی اس سے؟ اپنا سکاٹ باندوق ہوتا تو سالا مانڈلے والا کلرک کو گولی مار دیتا!"

میں نے پھر کہا۔ " آجائیں گے کاغذ! سرکار کا روپیہ کبھی نہیں ڈوبتا۔ جب کاغذ آجائیں گے تو اکٹھا مل جائے گا!"

وہ شک وشبہ میں مبتلا، تھوڑی دیر کے لئے میرے لفظوں سے ہمت کا خراج لینے کے لئے رک گیا، پھر بولا۔

" سو تو ہے، بابو جی۔ پر تین سال ہوئی گا!"

میں نے کہا۔ " ڈیڑھ سو روپے فی ماہ، تین برس کا پانچ ہزار چار سو بنتا ہے . . . اور تمہارا گذارہ تو ہو ہی رہا ہے۔ فکر کس بات کی ہے؟"

ٹریننگ سنٹر کی گھنٹی ٹن ٹن بج اٹھی۔ اندر سنگھ چوکیدار گھنٹی بجانے میں مصروف تھا اور گوربخش سنگھ چپراسی سٹور سے چاک نکال نکال کر لڑکوں کو دے رہا تھا۔ من بہادر نے پھر کہا۔

"آج مانڈلے والا کو پھر چٹھی لکھے گا بابو جی۔ ہاں اور کہے گا کہ اگر امرا کاگت نئیں بھیجا تو سالا سکاٹ باندوق۔"

میں نے اپنا سر ہلایا، مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ من بہادر کی ننگی، بغیر پلکوں کی، جھریوں کے تانے بانے کے بیچ میں گندے جوہڑوں کی طرح دو آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو تیر رہے تھے۔

آدھی چھٹی کے وقت گوربخش سنگھ نے مجھے بتایا کہ اپنے کوارٹر میں بیٹھا من بہادر گھر کا سارا سامان اکٹھا کر رہا ہے اور یہ کہ اس نے اپنی ساری چھوٹی موٹی چیزیں سرداری

لال کلینر کے ہاتھ ڈھائی سو روپے میں بیچ ڈالی ہیں، اب اس کے پاس صرف اپنے تن کے کپڑے، سکاٹ بندوق خنجری جسے وہ کھکری کہتا تھا اور دو چار ایسی ہی چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔ میں نے اسے بُلا بھیجا جیب سے ایک سو روپے نکال کر اسے دیئے اور کہا، "سامان مت بیچو، جب ضرورت ہو مجھ سے مانگ لینا۔ تمہاری پنشن کے کاغذات کے لئے آفیشل لیٹر لکھ دیا ہے..... اور ہاں، یہ بتاؤ کہ روپے کی اتنی اشد ضرورت کیا پڑ گئی؟"

"نہیں بتائے گا، بابوجی!" اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

میں نے کہا، "اچھا نہ بتاؤ، لیکن یہ دیکھو، فضول میں روپے خرچ نہ کرنا، تمہاری ایک اکیلی جان ہے، ڈیڑھ سو ہر ماہ تنخواہ مل جاتی ہے، صاحب کے گھر سے بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے، کبھی بیماری وغیرہ آجائے تو.... اب تم جانو اور تمہارا کام۔"

اس کے چہرے پر تاسف کے جذبات ابھرے۔ اس نے کہا، "بابوجی، آپ صاحب سے بولے گا تو ام چھٹی لے گا دو۔ دن.... انبالہ جائے گا۔"

مجھے بہت حیرت ہوئی، میں نے پوچھا، "انبالہ کیوں؟"

"نہیں بتلائے گا!"

اس نے پھر کہا۔

میں نے اس کی چھٹی منظور کرا دی۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے شکر گزار نظروں سے دیکھا اور وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا۔

"کسی دن بتلائے گا، بابوجی! یہ امارا جیون سالا کھوٹ ہے!"

ایک دم اس کے سنتے چہرے پر سیاہی سی پُت گئی اور وہ رونے لگا۔ "بابوجی، امارا لڑکی انبالہ میں بہت بیمار ہے ایک دم ٹی بی ہو گیا ہے۔ جب امارے پاس سے بھاگا تھا تو ام بولا تھا، سالا، تمہاری سکل نہیں دیکھے گا۔ گرکھا کھون ہوگا، تو نہیں دیکھے گا۔ ادھر، سو بہادر سے بولا۔ تم من بہادر کا لڑکی بھگائے گا۔ من بہادر ایک دن تمہارا کھون کریگا! پر آج وہ بوہت بیمار ہے۔ امرا ٹیک بہادر کہتا۔ انبالہ سے کھت آیا، اِتّا اِتّا کھون تھوکتا۔ اب میں جائے گا، اسے دیکھے گا اس کا علاج کرائے گا، آکھر تو لڑکی ہے!"

تھوڑی دیر کے بعد وہ اسٹیشن جانے کے لئے تیار ہو کر آیا اس کے کندھے پر کپڑے کا ایک فوجی بیگ لٹک رہا تھا، اس کے ہاتھوں میں ایک پرانی شاٹ گن تھی، جس کے دستے پر آدمی کی کھوپڑی کندہ تھی، اس نے کہا۔ "امرا سکاٹ بانڈوق آپ رکھے گا۔ بابوجی! ام واپس آکر لے گا۔ پر یہ ام کو جان ما پھک ہے!" میں نے بندوق لے لی۔ الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ باسو صاحب نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہہ دیا۔ من بہادر کی سنگل بیرل سکاٹ گن ہے۔

وہ مسکرا دیئے۔

جب وہ تین دنوں کے بعد انبالہ سے لوٹا تو اس کا چہرہ بے رونق تھا، آنکھیں اور سکڑ گئی تھیں اور چہرے کی جھریاں جیسے کسی نے ہتھوڑی اور چھینی سے کھود کھود کر اور زیادہ گہری کر دی تھیں، وہ بہت بوڑھا لگ رہا تھا آتے ہی اس نے مجھ سے شاٹ گن مانگی، میں نے الماری سے نکال کر دے دی اس نے آہستہ سے اعلان کیا: "ام شام کو کھیت جائے گا!"

شکار کا نام سنتے ہی اندر سنگھ کی آنکھیں چمک اٹھیں جب بھی من بہادر شکار سے واپس آتا تو قلعے کے درجہ چہارم کے نوکروں کے کوارٹروں میں جیسے عید کا ماحول پیدا ہو جاتا تیتر، مرغابی اور دوسرے آبی پرندوں کا شکار ممنوع ہونے

کے باوجود من بہادر کسی نہ کسی طرح چار پانچ تھیلے بھر ہی لاتا
ظالم کا نشانہ غضب کا تھا۔

میں نے پوچھا۔

"تمہاری لڑکی کا کیا حال ہے؟"

"لڑکی مر گیا۔"

اس نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا، وہ سٹول پر بیٹھ گیا، شاٹ گن اس نے اپنے گھٹنوں پر جما کر رکھ لی، زمین پر نظریں گاڑے ہوئے وہ بولا، "ایک کہانی سنیے گا، بابو جی؟"

تب ذرا سے توقف کے بعد اس نے کہا، "کھاٹ منڈو کا پاس رانا گڑھ میں من بہادر کا باپ مرا۔ من بہادر کا عورت نو بچے پیدا کر کے مر گیا۔ تب من بہادر کھیتی کرتا..... کھیت جاتا... بھیڑیں پالتا، اون بیچتا۔ من بہادر نے پانچ لڑکی کا سادی کیا۔ دو لڑکی مر گیا، ایک لڑکی کو گورا اٹھا کرے گیا۔ من بہادر نے دونوں کو مار دیا، تب من بہادر تیس اور چالیس سال کا تھا..."

اس نے انگلیوں پر گن کر مجھے سمجھایا۔

اس نے گن ہاتھ میں اٹھالی۔ "من بہادر کا چھوٹا لڑکی سو بہادر بھگا کر کھاٹ منڈو لے گیا... من بہادر ڈھونڈا، نئیں ملا۔ من بہادر نے گاؤں چھوڑ دیا، برما چلا گیا اور پولس میں نوکر ہو گیا۔ بیس سال تک نوکری کیا۔ ایک برمن سے سادی کیا وہ مر گیا۔ کوئی بچہ نئیں ہوا، پھن کلکتے واپس آیا، کلکتہ پتہ چلا۔ سو بہادر دلی ہے۔ دلی پتہ چلا، انبالہ ہے، انبالہ گیا، گھر میں گھسا۔ سو بہادر بنک میں چوکیدار تھا، وہ گھر نئیں تھا، لڑکی ام کو نئیں پہچانا۔ ام نے دیکھا وہ پرسن چت ہے، کھش ہے۔ اس کا ایک لڑکی بھی ہے — ام یہاں آگیا۔ باسو ساب ہم کو چوکیدار رکھ لیا۔ ٹھیک؟"

میں نے سر ہلایا — وہ چپ ہو گیا، اندر سنگھ چوکیدار میری کرسی کے پیچھے چپ چاپ کھڑا تھا، میں اس کی کہانی خاموشی اور انہماک سے اس کی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں سن رہا تھا۔ اس نے پھر کہا، "ٹیک بہادر رام کو بولا، سو بہادر بڑا حرامی ہے۔ امارا لڑکی کو دلی میں پہلے رنڈی بنایا، پیسہ کمایا۔ دو جگہ بیچا۔ پھر واپس بھگا لایا، جب وہ بیمار ہو گیا تو علاج نئیں کرایا، اسے مارا، کھوب مارا، ام سوچا، سو بہادر کو سکاٹ بندوق سے مارے گا، سالے کا کیمہ کیمہ کرے گا... پر امارا لڑکی بدھوا ہو جائے گا۔ تب سوچا، ابھی کچھ نئیں کرے گا۔"

"اب امرا لڑکی مر گیا ہے!" اس نے میری طرف پر معنی نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا، "تو"

اس نے شاٹ گن اٹھائی، "سو بہادر کا کھون کریگا پھر کیمہ کیمہ کرے گا، اندر سنگھ گور بخش سنگھ کو کھلائے گا!"

اندر سنگھ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے کہا، "ہوش کی دوا کرو من بہادر! تم سرکاری نوکر ہو۔ یہ برما یا نیپال نہیں ہے، ہندوستان ہے، یہاں خون کرنے والوں کو پھانسی کی سزا بھی مل سکتی ہے۔"

وہ ہنس پڑا۔ ایک کھوکھلی لیکن بھیانک ہنسی۔ بولا، "اندر سنگھ، کھیت چلے گا؟ مرگابی مارے گا تو بابو جی کے گھر بھی بھیجے گا!"

اندر سنگھ نے زندگی میں پہلی بار شکار سے منہ موڑتے ہوئے کہا۔ "نہیں من بہادر — میں نوں تو ساب کا کام کرنا ہے!"

من بہادر نے سچ مچ دوسرے دن میرے گھر ایک مرغابی بھیجی، تین چار دن تک وہ خاموش رہا۔ بلانے پر بھی سیدھے منہ جواب نہ دیتا، لیکن پھر دوبارہ اپنی خوش طبعی پر آگیا۔ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ وہ

داماد سے انتقام لینے کی بات کو بھول گیا ہے۔ ایک دن اس نے کہا،

"امارا سو بہادر اب یہاں آ گیا ہے!"

میں نے حیرانی اور اندیشے کے ملے جلے انداز میں پوچھا

"کہاں؟"

وہ بولا، "مشن سکول میں انگریز صاب کے پاس۔ امارے لڑکی کا لڑکی بھی اس کے ساتھ ہے۔ میں اسے آج دیکھنے جانا!"

میں نے سنجیدگی سے کہا، "تم اپنا سکاٹ بندوق اور کھکھری میرے پاس رکھ کر جانا!"

اس نے کہا، "نئیں رکھے گا!"

میں خاموش ہو گیا۔

دفتر میں یہ بات عام پھیل گئی کہ من بہادر ہر روز شام کو ایک بار مشن سکول جاتا ہے اور رات کو کافی دیر کے بعد واپس آتا ہے، اپنی دوستی کے لئے کبھی تو پھل اور مٹھائیاں لے جاتا ہے اور کبھی کھلونے۔

گوربخش سنگھ نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔ "من بہادر بہت خطرناک شخص ہے۔ وہ ایک موقع کی تلاش میں ہے، موقع ملتے ہی وہ شو بہادر کا خون کر دے گا اور پھر قیمہ قیمہ..."

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اندر سنگھ نے کہا، "مینوں پتہ ہوتا تو صاحب کو پہلے ہی کہہ دیتا اسے نوکر نہ رکھو جی صاحب بہادر!"

ایک دن من بہادر کی پنشن کے کاغذات آ گئے۔

من بہادر کا چہرہ کھل اٹھا، ایک بار پھر مرجھائے ہوئے پھولوں میں بہار کی رنگت آ گئی۔ جب وہ پانچ ہزار سات سو روپے کا کیش آرڈر لے کر آ گیا تو اسے دستخطوں کی شناخت دہی کے لئے گواہی کی ضرورت پڑی۔ باسو صاحب نے اسے کہا،—

"من بہادر، پوسٹ آفس کی پاس بک لے لو اور روپیہ جمع کروا دو۔ فضول خرچ نہ کرنا، ادھر بابو سے کہو وہ تمہارے روپے جمع کروا دے گا۔"

لیکن من بہادر میرے پاس نہیں آیا۔

گوربخش سنگھ سے مجھے معلوم ہوا کہ اس نے بارہ سو روپے خرچ کر کے اپنی نا تن کو سونے کی بالیاں بنوا دی ہیں اور چاندی کے موٹے موٹے کڑے خرید کر دیئے ہیں۔ سو دو سو روپے کے کپڑے بھی خرید کر لایا ہے۔ کبھی کبھی وہ بازار میں اس چھ برس کی بچی کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ لیکن شو بہادر کو اب بھی وہ دور سے دتکارتا ہے اور موقع ملنے کی تلاش میں ہے، جب وہ اس کا خون کر دے گا۔

میں نے گوربخش سنگھ سے پوچھا۔ "اور باقی کے روپے؟"

اس نے کہا۔ "وہ اس نے ٹیک بہادر کے پاس جمع کروا دیئے لیکن ٹیک بہادر نے جوئے میں ہار دیئے!"

ٹیک بہادر شہر کے گورکھوں کا چودھری تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے من بہادر کو بلا کر خوب جھاڑ پلائی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "ام کو ٹیک بہادر پر وسواس ہے، وہ رانا کا لڑکا ہوتا!"

اس بات کو ایک ماہ گزر گیا اور میں نے اپنی شادی کے لیے پندرہ دن کی چھٹی لی، جب میں واپس آیا تو سب نے مجھے مبارکباد دی، صرف من بہادر میرے پاس تک نہیں پھٹکا گوربخش سنگھ سے معلوم ہوا کہ اس کے داماد شو بہادر کو بخار آتا ہے اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اسے کبھی ٹی بی ہو گئی ہے اور اب من بہادر اسی فکر میں گھلتا جا رہا ہے کہ اگر شو بہادر بیماری سے مر گیا تو وہ اپنے انتقام کی آگ کو کیسے بجھا سکے گا۔

دو تین دن میرے سامنے وہ اپنا کام چپ چاپ مستعدی سے کرتا رہا۔ اس نے مجھے نہیں بلایا۔ وہ صبح اکثر دیر سے آتا اور شام کو دفتر بند ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ہی چلا جاتا اور پھر دیر رات تک نہ واپس آتا۔ ایک دن میں نے اسے خود ہی

بلا لیا۔

وہ میرے قریب آگیا۔

"شکار نہیں گئے؟" مجھے اور کوئی بات نہ سوجھی۔

وہ نہیں بولا۔

"تمہارا دادا کیسا ہے؟"

وہ بولا، "آپ ٹائپ کرے گا، بابو جی!"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، اس دن سے میں نے اسے بلانا چھوڑ دیا۔

جس دن تنخواہ ملی اسی دن کلاس فور ایمپلائیز یعنی چپڑاسیوں، چوکیداروں کے کوارٹروں میں چوری کی واردات ہوگئی اور چور باقی سامان کے ساتھ ساتھ من بہادر کی ایک نالی بندوق بھی اٹھا کر لے گئے۔ گوربخش سنگھ کی بیوی کے سب زیورات چلے گئے۔

اندر سنگھ کی پورے مہینے کی تنخواہ اور کپڑے بھی چوری ہوگئے۔ سب اداس تھے، لیکن من بہادر کا حال بہت برا تھا،

اس رات خود وہ دفتر کی چوکیداری کی ڈیوٹی پر تھا اس لئے سوائے جسم پر پہنے ہوئے کپڑوں کے اس کے گھر میں کچھ بھی نہیں بچا تھا، تنخواہ کے روپے میز پر پھینک دئے اور چیخنے لگا کہ اسے اس کی سکاٹ بانڈوق، واپس لا کر دی جائے نہیں تو وہ مر جائے گا، اسے لوگوں نے بہت سمجھایا، باسو صاحب نے تو یہاں تک کہا کہ وہ ان سے آٹھ سو روپے ادھار لے کر نئی شاٹ گن خرید سکتا ہے لیکن وہ مٹی میں لوٹنے لگا۔ بڑا دردناک منظر تھا۔ ایک طرف حوالدار کی چارپائی بچھی ہوئی تھی، جس پر بیٹھ کر وہ مختلف لوگوں کے بیانات قلمبند کر رہا تھا، دو تین سپاہی کھڑے تھے، ایک طرف میری اور باسو صاحب کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور من بہادر شور مچاتا ہوا زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، آنسوؤں کی وجہ سے اس کے چہرے پر گیلی مٹی کی تہہ جم گئی تھی، کھکھری کمر سے کھل کر ایک طرف پڑی تھی اور وہ آدھی گورکھالی، آدھی برمی زبان اور آدھی ہندی میں چیخے چلا جا رہا تھا۔ آخر میں حوالدار نے دونوں سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے اسے پکڑ کر اٹھا دیا، اندر سنگھ پانی لے آیا۔ اسے پانی پلایا گیا، تو حوالدار نے اس سے پوچھا، تمہاری بندوق کون سا میک تھی؟"

وہ بولا، "یہ امارا لائسنس بتائے گا یا ادھر بابو جی سے پوچھے گا، یہ بانڈوق ام کو کپتان ویکفیلڈ بہادر نے انعام میں دیا تھا۔۔۔" پھر یکدم آگے بڑھ کر اس نے حوالدار کے پاؤں پکڑ لیے۔ "کوتوال ساب، امارا سکاٹ بانڈوق مل جائے، ام کو کچھ اور نہیں چاہیئے! ام اس کو بارہ سال جان ماپھک رکھا ہے!"

اتنے میں سرداری لال بھاگتا ہوا آیا۔ وہ دور سے ہی کچھ چلا رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں من بہادر کی شاٹ گن تھی۔

اس نے دور سے ہی کہا، "من بہادر کی بندوق ادھر گھاس میں پڑی تھی، شاید چوروں نے بھاگتے ہوئے پھینک دی!"

حوالدار اور سپاہی تو اس طرف چوروں کے پاؤں کے نشانات دیکھنے چلے گئے لیکن من بہادر کی حالت دیکھنے کے قابل تھی،

اس نے بندوق سرداری لال کے ہاتھ سے چھین لی اور ایک دو لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے ناچنے لگا، سب دوسرے بھی ہنس رہے تھے میری آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو آگئے۔ من بہادر ہنستے ہنستے پھر رونے لگا، پھر اس نے بندوق کو رائفل کی طرح کندھے پر رکھا، لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے مارچ کیا، پھر باسو صاحب

کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایڑیاں ملا کر "پریزنٹ آرمز" کیا۔ اسی طرح مجھے بھی سیلوٹ کیا اور پھر اپنے کوارٹر کی طرف بھاگ گیا حوالدار کے بلانے پر بھی وہ نہ آیا۔ وہ اپنی گن صاف کرنے میں مصروف تھا۔ ایک پُل تھرو اور تیل کی شیشی اپنے پاس رکھ کر اپنی بندوق صاف کرتے ہوئے وہ کوئی برمی یا نیپالی گانا گا رہا تھا۔

اس دن وہ پھر نسکار کو گیا۔

دوسرے دن گوربخش سنگھ نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے لائیسنس پر چالیس گولیاں خرید کر لایا ہے۔

گوربخش سنگھ کی بیوی نے مسز باسو کو بھی یہ بات بتائی اور ساتھ ہی کہا کہ وہ ایک نئی کھکھری بھی خرید کر لایا ہے اس کا ارادہ بشو بہادر کو کھکھری سے قتل کرنے کا ہے کیوں کہ شاٹ گن کے کارتوس سے چھرے جسم میں پھیل جاتے ہیں اور اس طرح بشو بہادر بیان دینے کے لئے زیادہ دیر تک زندہ رہ سکتا ہے۔

مسز باسو نے اُسے بُلوایا۔

من بہادر نے کہا، "میم صاحب! ام تمرا وپھادار کھادم ہے، ام بیس برس مُلس میں نوکری کیا۔ امرے ساب کو کبھی کوئی کمپلین نئیں ملا۔ آپ کو بھی کوئی کمپلین نئیں ملے گا۔ بس!"

مزے کی بات یہ تھی کہ گورکھا برادری کے سبھی لوگ اس کے ارادے کو جانتے تھے لیکن اس پر بھی کسی نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

ٹیک بہادر کو ایک دن میں نے دیکھا، وہ من بہادر کی کوٹھری میں چارپائی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ من بہادر گلاس ہاتھ میں لئے اس کے پاؤں کے پاس بیٹھا تھا اور وہ دونوں گورکھالی میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے من بہادر پچاس برس کا ناٹے قد کا گورکھا تھا، اس کی ٹوپی میں مور کے پر لگے ہوئے تھے اور اس کے کپڑے بھی صاف اور قیمتی تھے۔

میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ادھر چلا گیا، من بہادر نے مجھے آتے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا، ٹیک بہادر چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا۔ من بہادر کے منہ پر ناراضگی کی لکیریں اُبھر آئیں۔

میں نے کہا، "من بہادر، اندر سنگھ کہتا تھا کہ کوارٹروں میں پانی ٹپکتا ہے۔ کہو تمہاری چھت بھی ٹپکتی ہے؟"

وہ دروازے میں میرا راستہ روکے ہوئے کھڑا رہا، پھر بولا،

"نئیں، بابوجی!"

"تو مرمت کروانے کی ضرورت نہیں ہے؟"

وہ پہلے چپ رہا، پھر نظر نیچی کئے ہوئے اس نے فیصلہ کن آواز میں کہا۔

"تم دیکھ جائے گا بابوجی!"

مجھے اپنی بے عزتی ہوتی دیکھ کر بہت غصہ آیا، وہ تھوڑی دیر کے بعد دفتر میں حاضر ہوا،

میں نے سختی سے پوچھا، "تمہارے کوارٹر میں دوسرا شخص کون تھا آج؟"

وہ بولا،

"ٹیک بہادر، بابوجی!"

میں نے کہا، "وہ آج کے بعد دفتر یا دفتر سے ملحقہ کوارٹروں کی حد میں قدم نہیں رکھے گا۔ سمجھے؟"

وہ چپ رہا۔ صرف سر ہلا دیا اور پھر بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے واپس چلا گیا۔

اس دن کے بعد وہ میرے سامنے بہت کم آتا۔

جب میں دفتر میں پہنچتا تو وہ میز وغیرہ چپ چاپ صاف کر دیتا

وقت پر ٹریننگ سنٹر کی گھنٹی بجا دیتا، کبھی کبھی میرے سامنے نہ آنے کی غرض سے وہ اپنی دن کی ڈیوٹی اندر سنگھ سے بدل لیتا اور رات کو پہرہ دیتا۔ گور بخش سنگھ سے مجھے پتہ چلا کہ اس کا داماد بہت بیمار ہے۔ اور انگریز مشنری نے اسے سول ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ من بہادر اپنی چھ برس کی دوہتی کو قلعے میں اپنے کوارٹر میں ہی لے آیا ہے۔ ایک دن وہ شیر بہادر کو دیکھنے ہسپتال گیا، لیکن شیر بہادر اسے آتا دیکھ کر ڈر کے مارے بے ہوش ہو گیا، اس دن کے بعد وہ ہسپتال نہیں گیا۔

اس کی خاموشی قلعے بھر میں کئی قسم کی افواہوں کا عنوان بن گئی۔

وہ رات کی ڈیوٹی دیتا اور دن بھر اپنی دوہتی کو خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتا، کبھی کبھی اسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر قلعے کی سیر کرواتا، کبھی بائلر کی آگ دکھاتا، کبھی گھوڑا بنتا اور کبھی کبھی بنگالی کی دکان پر مٹھائی کھلانے کے لئے لے جاتا۔ اندر سنگھ نے ایک دن کہا کہ اب اس نے داماد کو مار دینے کا خیال دل سے نکال دیا ہے لیکن اس کے دوسرے دن ہی سرداری لال نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا کہ لوگوں نے من بہادر کو رات کے وقت بھی ہسپتال کے آس پاس چکر کاٹتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایک دن شام کو وہ لڑکی کو ساتھ لے کر ہسپتال چلا گیا۔ قلعے والے دوسرے لوگوں نے کہا کہ اس کی دوہتی اپنے باپ کو یاد کر کے بہت روتی تھی، من بہادر سے اس کا رونا نہیں دیکھا گیا اور وہ اسے اپنے باپ سے ملانے لے گیا ہے، جب وہ دونوں ہسپتال سے واپس آئے تو چھوٹی بچی اور زیادہ رو رہی تھی، من بہادر نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا، تھوڑی دیر کے بعد بچی کا رونا بند ہو گیا۔ اندر سنگھ کو کچھ اور شک ہوا، اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، جب دروازہ کھلا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی من بہادر کے کندھے پر سوار ہے اور من بہادر ناچ ناچ کر بچی کا دل بہلا رہا ہے۔

کچھ مہینے گذرنے کے بعد گرمیوں کا موسم آ گیا۔ ایک دن صبح ہی وہ میرے پاس آیا "بابو جی، ساب بولا، ام کو سو روپے پیشگی ملے گا۔"

میرے پاس ٹریننگ سکول کی فیسوں کے پانچسو روپے تھے جو میں نے اسی دن جمع کروائے تھے، میں نے کہا "ایڈوانس نہیں مل سکتا... لیکن تمہیں اتنے روپوں کی ضرورت کیا پڑ گئی ہے؟"

وہ بولا،

"میں نئیں بتائے گا۔"

میں نے بھی روکھے پن سے جواب دیا، "جاؤ صاحب سے کہہ دو کہ روپیہ نہیں ملے گا۔"

وہ کچھ دیر میری طرف ٹکر ٹکر دیکھتا رہا، پھر سر جھکائے چپ چاپ چلا گیا۔

وہ شام کو ڈیوٹی پر نہیں آیا۔ اندر سنگھ سے معلوم ہوا کہ ہسپتال چلا گیا ہے۔ سپروائزر نے سرداری لال کی ڈیوٹی لگا دی اور رجسٹر میں من بہادر کے نام کے سامنے غیر حاضری لگا دی۔

دوسرے دن صبح ہی ڈاکٹر کی ایک چٹ آئی کہ من بہادر چوکیدار ہسپتال میں داخل ہے۔ مسٹر باسو حیران رہ گئے۔ انہوں نے پتہ لگانے کے لئے مجھے ہسپتال بھیجا۔

میں پہنچا تو ڈیوٹی ڈاکٹر نے مجھے کہا، "آپ جنرل وارڈ نمبر چار میں چلے جائیے، وہ بہت کمزور ہو گیا ہے، اسے خون نہیں دینا چاہیئے تھا!"

"خون کیوں دیا اس نے؟" میں نے پوچھا۔

غزلیں

ظہیر غازیپوری

پوچھو تو، ارتقائے نظر مانگتے ہیں لوگ
یا خوابِ خوابِ اذنِ سفر مانگتے ہیں لوگ

جذبوں میں اشتعال رہے، خون گرم ہو
اخبار میں بس ایسی خبر مانگتے ہیں لوگ

خواہش کی حد نہیں، نہ سہی، یہ سوال ہے،
کیا ماورائے شمس و قمر مانگتے ہیں لوگ

ماضی کی شعلگی نے کیا تھا جنھیں قلم،
اس عہد میں وہ دستِ ہنر مانگتے ہیں لوگ

جب سیم و زر میں تلنے لگے ہیں دل و نظر
کیوں بے حسی سے بھوس کا گھر مانگتے ہیں لوگ

ذہنوں سے کیا خمار کی چادر اُتر گئی
"گھر مانگتے ہیں، راہ گزر مانگتے ہیں لوگ"

مصلوب حسرتوں کا کرشمہ ہے یہ ظہیر
اونچی اڑان بھرنے کو پَر مانگتے ہیں لوگ

عسرت میں کٹی عمر، رہے خاک بسر سے
ہم شیش محل کے لئے پھر بھی نہیں ترسے

آئینۂ احساس منوّر نظر آیا،
محسوس کیا جب تجھے شاعر کی نظر سے!

جاگ اٹھے قلم سے مرے افکار ہزاروں
روشن ہوئی دنیائے ادب میرے ہنر سے

آزار، جفا، درد، ستم، یاس، اذیت
کیا کیا نکل آئے ہیں نوادر مرے گھر سے

وہ کیسے تراشیں گے کوئی پیکرِ معنیٰ
واقف ہی نہیں لفظ کے جو زیر و زبر سے

صحرا کا بلاوا نہ ابھی آئے تو اچھا،
دیکھا ہے کسی نے مجھے خوش تاب نظر سے

امسال بھی برسات ہوئی دشت و جبل پر
"امسال بھی ساون میں ہم اک بوند کو ترسے"

"کوئی اور گور کھا مریض تھا، مر رہا تھا بیچارہ اور اس کے گروپ کا خون کہیں نہیں مل رہا تھا، جب یہ بوڑھا آیا تو اس کا گروپ میچ کر گیا.... لیکن ایک تو یہ بوڑھا تھا دوسرے پہلے ہی بڑا کمزور تھا... میں نے بہت منع کیا لیکن یہ نہیں مانا۔ رونے لگا اور زمین پر لیٹ کر چیخنے لگا کہ مریض کو بچانے کے لئے اس کا خون لیں.... ٹھہریئے میں آپ کو دوسرے مریض کا نام بتاتا ہوں....؛" اس نے ایک رجسٹر دیکھ کر کہا "شو بہادر.... اس کے پھیپھڑے کا اپریشن ہوا ہے؛"

میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔" وہ ایک سو پچیس روپے کے انجکشن اور دوسری دوائیاں بھی لایا تھا۔- وہاٹ اے سیکرے فائیس!"

من بہادر کے پاس پہنچا تو اس نے کہا،" بابوجی، ام اپنا سکاٹ بانڈ وق بیچا! اپنا گھڑی بھی بیچ دیا۔ آپ نے پیسگی نئیں دیا تو روپیہ اور کوئی نہیں تھا، پھن ڈاکٹر بابو بولا، کھون نمرا نئیں لے گا۔ ام نے کہا، ام کھون ضرور دے گا نئیں تو رو رو کر مر جائے گا تو ڈاکٹر بابو مان گیا... ام سے اپنی لڑکی کا رونا نئیں دیکھا گیا۔ ام سو بہادر کو بچا لیا، لڑکی کے لیے.... آپ باسو ساب کو امرا بندگی بولے گا اور امری چھٹی لکھے گا تین دن کی!"

غزلیں

دلنشیں ایسا ہی کچھ حسنِ بیاں تھا یارو
ہر فسانے پر حقیقت کا گماں تھا یارو
آگ بھڑکے گی تو گھر اپنے بھی جل جائیں گے
تم کو اس بات کا احساس کہاں تھا یارو
عمر بھر جو ہوا محظوظ مرے نغموں سے
نالۂ درد مرا اُس پر گراں تھا یارو
جیسے اس دُنیا سے کچھ اس کا تعلق ہی نہیں
قافلہ وقت کا چپ چاپ رواں تھا یارو
وہ جو ہر بات پہ بے وجہ تڑپ اُٹھتا تھا
زخم گہرا کوئی اُس دل میں نہاں تھا یارو
میرے بچ جانے کی صورت ہی کہاں تھی کوئی
میرے حق میں مرے قاتل کا بیاں تھا یارو
اپنے غم سے تو میں تاثیرؔ سنبھل بھی جاتا
وقت بھی ساتھ میرے نوحہ کناں تھا یارو

اہلِ نظر کو اس محفل میں پیش کوئی سوغات کریں
اپنے شعروں کی صورت میں حاضر ہم جذبات کریں
ہم میں ایک یہی خوبی ہے بس اتنی فنکاری ہے
بات کریں جب اپنے من کی سب کے من کی بات کریں
آپ نے بھی تو دیکھے ہوں گے ہم بھی کچھ کو جانتے ہیں
یعنی ایسے دیوانے جو بات کی خاطر بات کریں
رات کے سناٹے میں دیکھا تارے ہم پر ہنستے ہیں
سوچا تھا یہ تنہائی سے جا کر دل کی بات کریں
رات کی تاریکی بھی یوں تو ہم کو بہت ڈراتی ہے
دن آتا ہے تو کہتے ہیں جیسے بھی ہو رات کریں
ٹوٹ کے برسے بادل کوئی اس دل کے ویرانے میں
پیار کا ایسا طوفاں اٹھے سب کچھ جس کے ہات کریں
تم تاثیرؔ جہاں سے آئے وہ تھے اور طرح کے لوگ
یہ ہیں مہانگر کے باسی بے مطلب کیوں بات کریں

آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر

ڈاکٹر ارتضیٰ رضوی

فراق کی غزل گوئی

فراق وہ قدآور شاعر ہیں جو اپنے ہم عصر بڑے شعراء کے درمیان ایک اہم و منفرد حیثیت رکھتے ہیں، ایک ممتاز و برگزیدہ مقام کے حامل ہیں اور ایک بلند و بالا درجے پر فائز بھی۔

اچھی اور اعلیٰ شاعری کا انحصار و دار و مدار حیات وفن کی اعلیٰ قدروں کو جاننے اور کائنات کو پہچاننے پر ہے۔ فراق کا کلام اس حقیقت کا غماز ہے۔ فراق کی شاعری میں زندگی کے تمام نشیب و فراز کا بیان اور کائنات کی لامحدود معنویت کے نئے جلوے ملتے ہیں۔ حیات و کائنات کی ہم آہنگی ان کے کلام میں نمایاں ہے:

غمِ حیات وہی دورِ کائنات وہی
جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے

اے فراق آفاق ہے کوئی طلسم اندر طلسم
ہے ہر اک خواب اک حقیقت، ہر حقیقت ایک خواب

میتھیو آرنلڈ کا قول ہے کہ "شاعری زندگی کی تنقید ہے۔" فراق اس مقولے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں زندگی کے حقائق کی تصویریں مختلف صورتوں میں مختلف مقامات پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ آپ بھی ان تصاویر کے آب و رنگ کو دیکھئے:

ابھی جبین بشر منتظر سی ہے گویا
کہ آدمی ابھی فطرت کا شاہکار نہیں

رکی رکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

خیال کو بے اثر نہ جانو عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں
کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا

فراق اساسی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ انھوں نے خصوصی طور سے غزل پر توجہ دی ہے۔ ان کا قول ہے کہ "غزل شاعری نہیں عطرِ شاعری ہے۔" اس لئے ان کا غزل کی جانب خصوصی توجہ دینا ایک فطری بات ہے۔ بہر نوع،

فراق نے غزل کی کلاسیکی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں اضافے کئے۔ یہ اضافہ ان کی جدت طراز طبیعت کی وجہ سے ہوا۔ جس نے ان کے کلام میں اچھوتا پن اور تازگی لادی۔ واقعہ یہ ہے کہ فراق کے یہاں نئی زندگی کو دیکھنے کے لئے نیا احساس پایا جاتا ہے، یہی نیا پن تو فراق کی شاعری کا امتیاز خاص ہے، وہ اپنے انداز و آہنگ میں منفرد و یگانہ ہیں۔ ان کے یہاں مانگے کا اجالا نہیں۔ فراق کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ حقائق حیات بے نقاب ہو رہے ہیں، راز پر سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے اور زندگی کی تمام تہیں کھلتی جا رہی ہیں۔ وضاحت کے لئے ان شعری نقوش پر نظر ڈالئے:

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گذری ہے
اتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

جینا جو آ گیا تو اجل بھی حیات ہے
اور یوں تو عمر خضر بھی کیا، بے ثبات ہے

اک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

ذرا غور سے دیکھئے تو، یہ تغزل کے کیسے دل آویز نمونے ہیں۔ اس میں جذبے کی گہرائیاں ہیں جو کائناتی وسعتوں کی غمازی کر رہے ہیں۔ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ فراق نے غزل کو نئی معنوی جہتوں سے روشناس کرایا ہے ان کے یہاں محدود معنوی دائرے نہیں۔ یہاں تو حیات و کائنات کی لامحدود معنویت جلوہ فگن ہے۔ حسن و عشق کا موضوع غزل کے وجود کے وقت ہی سے اس کے دامن سے لپٹا ہوا ہے لیکن روشن دماغ، بلند فکر اور روشن طبع شعرا اس میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔ فراق کو اس فنِ غزل گوئی میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ کافی مہارت رکھتے ہیں، پامال اور فرسودہ مضمون کو کچھ اس انداز سے باندھتے ہیں کہ اس میں نئی روح پڑ جاتی ہے اور نئی جان آ جاتی ہے۔

فراق ایک زبردست قسم کا حسیاتی مزاج رکھتے ہیں ان کے جمالیاتی حس میں نزاکت و رعنائی ہے جس کے سبب وہ حسن میں اس کے صد رنگ جلوے دیکھتے ہیں۔ کچھ آپ بھی دیکھئے:

جھپک جھپک سی گئی ہے بہارِ لالہ و گل
تری نگاہ سے چنگاریاں سی کچھ جو اڑیں

شاید کچھ اس میں شوخیٔ بیگانگی بھی ہے
ربطِ نہاں وہ آج بڑھائے ہوئے سے ہیں

سر سے پا تک حسن ہے سازِ نمو رازِ نمو
آ رہا ہے ایک کمسن پر دبے پاؤں شباب

ان اشعار میں محسوساتی و حسیاتی رنگ کی گہرائی ایک نیا پن لئے ہوتے ہے۔ یہ نیا پن اور تازگی ہی فراق کی غزل گوئی کی جان ہے، جو ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے اور اردو کے کسی شاعر نے محبوب کو غزل کے روپ میں سج سجا کر پیش نہیں کیا تھا۔ یہ فراق ہی کا حصہ تھا۔

مری ہر غزل کی یہ آرزو تجھے سج سجا کے نکالئے
مری فکر ہو ترا آئینہ، مرے نغمے ہوں ترے پیرہن

لمساتی کیف اور جسمانی قربت کا احساس فراق کی غزلوں میں جابجا ملتا ہے۔ اس میں ایک اچھوتا پن اور انوکھا پن پایا جاتا ہے، جو اردو شاعری کے لئے ایک نئی چیز

اور ایک نئی بات ہے۔ فراق کا یہ رنگ بھی ملاحظہ ہو:

کفِ پا سے تا سرِ نازنیں کئی آنکھیں کھلتی جھپکتی ہیں
کہ تمام مسکنِ آہواں ہے رمِ خمار ترا بدن

پیکر یہ لہکتا ہے کہ گلزارِ ارم ہے
یہ عضو چہکتا ہے کہ ہے صوتِ ہزاراں
یہ موجِ تبسم ہے کہ پگھلے ہوئے کوندے
شبنم زدہ غنچے لبِ لعلیں سے پشیماں
ان پتلیوں میں جیسے ہرن مائلِ رم ہو
وحشت بھری آنکھیں ہیں کہ اک دشتِ غزالاں
اک عالمِ شب تاب ہے بل کھائی لٹوں میں
راتوں کا کوئی بن ہے کہ ہے کاکلِ پیچاں
ہر جنبشِ اعضا میں چھلک جاتے ہیں صد جام
ہر گردشِ دیدہ میں کئی گردشِ دوراں
خمیازۂ پیکر میں چٹک جاتے ہیں غنچے
رنگینیٔ قامت چمنستاں چمنستاں

فراق نے محبوب کے خط و خال اور رنگ و روپ کو حد درجہ حسین انداز سے متشکل کیا ہے۔ انھوں نے ایسی غزلوں کی تخلیق کر کے اپنی زبردست تخلیقی قوت اور اختراعی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ کچھ معترضین و ناقدین ایسی غزلوں کو پڑھ کر فراق پر جنس زدگی اور تعیش پسندی کا الزام عاید کرتے ہیں۔ ان کی شاعری پر فحاشی اور عریانیت کا الزام لگاتے ہیں جو ایک غیر منصفانہ رویہ ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے گفتگو کرنا ہے، تو پھر غزل میں عورت کے خد و خال کا ذکر کرنا، اس کے رنگ و روپ کو پیش کرنا حقیقت نگاری اور ناقابلِ تردید واقعیت ہے یہ شاعری کی منجملہ خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔

فراق کے تحت الشعور میں عورت دیوی کا روپ بھی ہے۔ اس میں مذہبی تقدس و پاکیزگی کا رنگ ہے۔ عورت کے اعضا کے بیانات سے اس کی عفت و ناموس پر حرف نہیں آتا۔ ہمارے وہ نقاد جو فراق کو برا ٹھہراتے ہیں، ان کے کلام پر انگشت نمائی کرتے ہیں اسی نظر سے عورت کو دیکھیں تو ان کے الزامات کی وہ دیوار خود بخود گر جائے گی ان غزلوں میں ایک حقیقت شناس معشوق کے سراپا کی نقاشی اور اس کی پیکر تراشی دیکھ کر محظوظ اور متکیف ہوتا ہے اور فن کار کے فن کی داد دیتا ہے۔ ایسی تصویریں تو وہی فنکار پیش کر سکتا ہے جس کے شعور میں پختگی اور رچاؤ ہو، جس کے احساسِ فن میں لطافت و پاکیزگی ہو، جس کے تجربات و مشاہدات میں باریکی ہو اور جو ایک مخصوص زاویۂ نگاہ رکھتا ہو۔ بلاشبہ، یہ ساری خوبیاں فراق جیسے بلند پایہ اور عظیم المرتبت شاعر کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

فراق کی طبیعت رومانی ہے۔ اور وہ رومان پسند شاعر ہیں اس لیے ان کے کلام میں گہری رومانیت ملتی ہے ان کے یہاں رومانی احساسات ہیں، رومانی تصویریں ہیں اور رومانی الفاظ کی بھی کثرت ہے۔ فراق کی غنائی اور جمالیاتی شاعری ان کے کلام میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے حسن کے مختلف خارجی پہلو ان کے بیانات میں آئے ہیں ایک ندرت، جدت، انوکھاپن، نیاپن اور اچھوتاپن لیے ہوئے۔

اس میں نیا احساس اور نیا شعور کارفرما ہوتا ہے جو قاری کے دلوں کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ؂

دل کے آئینے میں اس طرح اترتی ہے نگاہ
جیسے پانی میں لچک جائے کرن کیا کہنا

لب نگار ہیں یا شعلۂ نوائے بہار
سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطلبِ رنگیں

قلوب نور کے سانچوں میں ڈھلتے جاتے ہیں
چراغ تیرے تبسم سے جلتے جلتے ہیں

قامت ہے کہ کہسار پہ چڑھتا ہوا دن ہے
جوبن ہے کہ چشمۂ خورشید میں طوفاں

یہ حقیقت ہے کہ ہر بڑے شاعر کی طرح فراق میں بھی تبدیلی آئی۔ ان کی شاعری بھی اپنی ترقی کی راہ کی طرف گامزن ہوئی۔ اس نے بھی تدریجی ارتقار کے منازل و مراحل کو طے کیا اور حیات و کائنات کے تمام حقائق کو اپنے میں سمو لیا ہے چنانچہ آپ بیتی، جگ بیتی بنی، غمِ جاناں غمِ دوراں ہوا، انفرادیت اجتماعیت سے گلے ملی، حیات سے کائنات کی طرف سفر ہوا اور عشرت سے عرفان کی منزل پر جا پہنچی۔

فراق کی شاعری کے اس موڑ میں ان کی جنسی محرومیوں اور ناکامیوں کا بہت بڑا ہاتھ کار فرما ہے جس نے ان کی طبیعت کو مہمیز کیا۔ اب آپ ذرا بدلا ہوا رنگِ شاعری دیکھئے جس میں تخیل کی باریکیاں ہیں!

چمکتے درد، کھلے چہرے، مسکراتے اشک
سجائی جائے گی اب طرزِ نو سے بزمِ حیات

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دہر
کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج

کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا
کون ہے صبحِ ازل سے خراماں

چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے
آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

ان اشعار سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ فراق کی شاعری کے اس موڑ نے جو جنسی محرومیوں اور ناکامیوں کا پیدا کردہ ہے، اسے کائناتی و آفاقی بنا دیا ہے۔ وہ آفاقیت و عالمگیریت سے ہمکنار ہوگئی۔

فراق کی شاعری کا ایک اہم عنصر احساس غم بھی ہے۔ فراق کی جنسی محرومیوں اور ناکامیوں نے ان کی شاعری کا رُخ موڑ دیا تھا۔ چنانچہ انھیں محرومیوں نے فراق کے خواب کو حقیقت میں بدلا اور نشاط کو الم میں۔ یہی الم کی گھٹا ان کے افقِ شاعری پر جا بجا چھائی نظر آتی ہے۔

غزل وہ صنفِ شاعری ہے جس میں جذبہ و اثر کو دخل ہے۔ اس میں داخلی اور احساسی رنگ کا وجود لازمی ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل، غزل گو کی خواہشوں، محرومیوں اور ذاتی الجھنوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ فراق کے یہاں ہمیں یہ جذبہ و اثر ملتا ہے۔ جب کوئی داخلی یا خارجی عنصر شاعر کے احساس کو مشتعل کرتا ہے تو اس کا ردِ عمل شعر کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے، اس میں غم کی لہر ہوتی ہے....
فراق کا احساسِ غم فانی کی طرح نہیں جہاں شدید کرب

الم ہے۔ فراق کے یہاں تو سلگنے والی کیفیت اور شدید سوز وگداز ہے۔ اس حیثیت سے فراق میر سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ ضبطِ غم کا جو انداز فراق کے یہاں ملتا ہے وہ میر کے انداز سے ملتا جلتا ہے ؎

سوزِ نہاں میں وہ قرار، قلبِ تپاں میں وہ صفا
شعلہ تو تھا تڑپ نہ تھی، آگ تو تھی دھواں نہ تھا

فراق اپنے مجموعۂ مضامین "اندازے" میں ایک مقام پر رقمطراز ہیں "سب سے بڑی شاعری وہ ہے جس میں ناقابلِ برداشت شدتِ احساس سکون کی شکل اختیار کرلے۔"
چنانچہ فراق کے قول کے مطابق ان کے یہاں اضطراب اور ہیجان میں سکون وطمانیت بھی موجود ہے جو واقعی بڑی اور اونچی شاعری کی پہچان ہے ؎

جسے ڈس لیا ہے زمانے نے کوئی زندگی ہے یہ زندگی
یہ سوادِ شام اجل اجل، یہ ضیاءِ صبح کفن کفن

زمانے کے ڈسنے، سوادِ شام کی اجل نمائی اور ضیاءِ صبح کی کفن پیرائی سے شدتِ غم کا احساس ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اس سے گھبراتے نہیں، خوفزدگی کا شکار نہیں ہوتے اور نہ زندگی سے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ وہ غم کو حریفِ زندہ دلی تصور کرتے ہیں ؎

فراق غم بھی ہے میرا حریف زندہ دلی
فسردگی میں بھی یاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

فراق غم کو اوڑھنا بچھونا نہیں بناتے۔ وہ غم میں رہ کر بھی اپنا کام نکالنا جانتے ہیں۔ ان کے پاس بلند حوصلہ ہے، وہ زندہ رہنے کی تمنا اور زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں زندگی کا منفی رجحان نہیں، وہ رجائیت کے قائل ہیں ؎

مرے ہی سینے میں ہر صبح تھرتھراتی ہے
شبِ سیاہ کی زنجیر توڑ سکتا ہوں

فراق اک نالۂ بیتاب کب تک یاس ومجبوری
نقابِ شامِ غم اٹھے سحر بیدار ہو جائے

یہ سکوتِ ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

یہ غالب کے رجائی انداز کی بازگشت ہے کیونکہ فراق بھی سکوتِ ناز اور دل کی رگوں کے ٹوٹتے وقت شکستِ ساز کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ حوصلہ انہیں غالب ہی سے ملا جان پڑتا ہے۔ غالب کے یہاں غم وقتی اور لمحاتی طور پر آتا ہے ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

وہ غم کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ وہ جانتے ہیں کہ چمن میں بجلی گری ہے، آشیانے جل گئے ہیں، تاہم وہ اپنے آشیانے کے جل جانے کا تصور پیدا ہونے نہیں دیتے ؎

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم،
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

بہرکیف! فراق کے یہاں غم کے بیانات میں بھی شعری حسن ولطافت ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ فن کی وہی پختگی، رچاؤ اور بالیدگی ہے جو دوسرے موضوعات کے اشعار میں نمایاں ہے۔

فراق کی شاعری کا ایک اور نمایاں وصف جو انہیں اردو شعراء میں منفرد وممتاز کرتا ہے، وہ ہے ہندو دیو مالا کی رمز آشنائی۔ فراق کو ہندو فلسفہ ومذہب سے پورے طور پر واقفیت ہے بلکہ اس پر عبور حاصل ہے۔ چنانچہ انھوں نے عشق ومحبت کا جو تصور پیش کیا اس میں ہندو فلسفہ کی پوری جھلک ملتی ہے۔ فراق کے

یہاں جو مذہبی تقدس کا رنگ ہے وہ بمنزلہ عبادت ہے فراق کو آریائی تہذیب اور سنسکرت ادب سے گہرا شغف رہا۔ چنانچہ انھوں نے آریائی تہذیب کی جمال آرائی سے اپنی شاعری کو حسن و لطافت بخشا اور اسے آئینہ جمال بنادیا۔

یہ ان کی شاعری کا ایک انوکھا پن ہے۔ مختصراً یہ کہ فراق نے ہندو دیومالا، آریائی تہذیب اور سنسکرت ادب سے استفادہ کرکے اردو غزل گوئی کو معنوی حیثیت سے وسعت دی، دامن شاعری کو وسیع ترکیا اور ساتھ ہی ساتھ تنوع سے ہمکنار کیا۔

فراق کے یہاں صرف خیال و معنی کے صد رنگ جلوے ہی نہیں بلکہ فن کی بھی جلوہ نمائیاں ہیں۔ اس اعتبار سے بھی ان کے کلام میں بڑی گہرائی ہے، وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلیں ایک خاص انوکھاپن نیاپن اور اچھوتا پن لئے ہوئے ہیں۔ ان میں نیا رنگ و آہنگ ملتا ہے، ان کے یہاں نئی علامتیں اور نئے اشارے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، تراکیب کے اختراع اور الفاظ کی موزونیت میں ایک خاص ندرت و جدت نظر آتی ہے بطور مثال چند اشعار پیش ہیں ؎

ہوئی واردات سحر بیاں تو گلوں کا سینہ دھڑک اٹھا
یہ چلی کہ تیغ نسیم نے کئی ہاتھ اچھال دیا لہو

تجھے پا کے خود کو میں پاؤں گا کہ تجھی میں کھویا ہوا ہوں میں
یہ تری تلاش ہے اس لئے کہ مجھے ہے اپنی ہی جستجو

ہر ایک سانس ہے تجدید یاد ایام
گذر گیا وہ زمانہ جسے گذرنا تھا

فراق کے اسلوب میں اچھوتی دلکشی اور بہلے جانے والی کیفیت ہے۔ اور پھر اس کے رچاؤ اور رنگینی میں تو آپ کو ایک خاص قسم کی سادگی و بے ساختگی کے ساتھ ساتھ روانی بھی ملے گی۔

فراق نے مختلف انواع و اقسام کے معنوی گہر اور فن کے لولوئے آبدار سے دامن شاعری کو بھر دیا ہے جس سے اس کے سرمائے میں اضافہ ہوا ہے اور وہ قیمتی و بیش بہا ہو گئی۔

انھوں نے جدید غزل کے موجودہ روپ کو جو آب و رنگ دیا اور جس انداز سے اس کی جمال آرائی کی وہ انھیں کا حصہ تھی۔

فراق نے اردو شاعری خصوصاً غزل کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے اردو ادب اپنے اس عظیم محسن کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔ ●●

ماہنامہ "تعمیر ہریانہ" (اردو) ملکیت وغیرہ کے متعلق تفصیلات
(فارم-۴، ضابطہ-۸) کے مطابق

مقام اشاعت: محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ، ایس سی او ۱۸۹-۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ۔ ۱۶۰۰۱۷

وقفہ اشاعت: ماہانہ۔

پرنٹر، پبلشر و مدیر اعلیٰ کا نام: ارجن داس ملک آئی۔اے۔ایس
ڈائرکٹر محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ، چنڈی گڑھ

قومیت: ہندوستانی۔

ملکیت: ہریانہ گورنمنٹ

میں ارجن داس ملک یہ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

چنڈی گڑھ
یکم مارچ ۱۹۸۸ء

دستخط
(ارجن داس ملک)

ڈاکٹر اظہار الحسن

پیاس

لاجو سترہ اٹھارہ سال کی سیڑھی پر کھڑی تھی۔ پیشانی پر بندھی لال پٹی، گردن میں پھنسی چاندی کی ہنسلی، پنڈلیوں تک جھولتا گھاگرا، بازوؤں سے ناگن کی طرح لپٹی ہوئی جوشن ... ان سب چیزوں نے اسے کچھ زیادہ ہی پرکشش بنا دیا تھا۔ کاجل بھری جنگلی ہرن جیسی آنکھوں سے وہ جسے بھی دیکھ لیتی، ایک لمحہ کو وہ آنکھیں جھپکانا بھول جاتا۔

اس دن جب میں اس کے ڈیرے پر پہنچا تو رگھو حسب معمول چلم کے گہرے گہرے کش لگا رہا تھا۔ اچانک اسے بہت زور کی کھانسی آئی اور کھانستے کھانستے نڈھال ہو گیا۔ لاجو، نزدیک ہی بیٹھی تھی وہ لپک کر پانی کا کٹورا بھر لائی اور رگھو سے بولی ”باپو! اب تیرا شریر اس قابل نہ ہے کہ تو اتنی چلم پیئے۔ چلم کے دھوئیں نے تجھے چھلنی تو کر دیا ہے باپو۔“

”اب تو مجھے چھلنی کہنے لگی۔“ رگھو نے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”سانس تو تیرے سینے میں پڑتا نہیں ہے، اور تو ہے کہ چلم .... لاجو نے منھ بسورتے ہوئے کہا۔

”اچھا بک بک بند کر ....“ اور اس کے ہاتھ سے کٹورا لے کر پانی پینے لگا۔

”دیکھ باپو۔ اب بھی مان جا۔ اور تمباکو پینا بند کر دے نہیں تو ....“

”اری چپ۔ چلی ہے مجھے اپدیش دینے۔“

”لاجو ... ٹھیک ہی کہتی ہے رگھو۔ یہ دھواں یہ تمباکو تمھارے لیے بہت نقصان دہ ہے۔“ میں نے نرم لہجے میں رگھو کو سمجھایا۔

”ارے بابو جی۔ ساری عمر کا ساتھ ہے اس چلم کا۔ اب آکھر (آخر) میں کیا چھوٹے گی۔ جوانی میں تو اس چلم نے مجا دیا اور بڑھاپے میں کشٹ دے رہی ہے تو کیا اسے چھوڑ دوں؟“ رگھو نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"چھوڑنے کو کس نے کہا۔ کم تو کر سکتے ہو۔"

"ہاں کم کر دوں گا مگر بالکل چھوڑنے کی بات مت کرنا..." رگھو نے لاجو کو گھورتے ہوئے کہا۔

دن بھر پرانے لوہے کو گرم کر کر کے شام تک پیٹتے پیٹتے، رگھو کی ہر روز ایسی ہی حالت ہو جاتی تھی۔ صبح ہوتے ہی بھٹی سے دھواں اٹھنے لگتا اور لوہے کو پگھلا کر گھریلو استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں بنائی جاتیں۔ شام کو تیار شدہ چیزیں فروخت کرنے کی فکر ہوتی۔ یوں محنت مزدوری کر کے وہ خانہ بدوش اتنا کما لیتے کہ پیٹ کا جہنم سرد ہو جاتا۔ یہ پیشہ اس قبیلے کا بہت پرانا ہے۔ خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے کرتے ان لوگوں کی پشتیں بیت گئی ہیں۔ ان لوگوں نے کبھی چھت کے نیچے اپنی راتیں اور برساتیں نہیں گذاریں۔ ان کے بچے انہی پرانے خیموں میں پیدا ہوتے ہیں، سڑکوں کی دھول کھا کر لڑتے جھگڑتے جوان ہوتے ہیں اور لوہا پیٹتے پیٹتے جوانی کا پسینہ بہا کر بوڑھے ہو کر کھانستے کھانستے مر جاتے ہیں۔

لاجو نے بھی سڑک کے کنارے جنم لیا تھا۔ خاک مٹی دھول کھا کر جوان ہوئی تھی مگر اس کی جوانی جنگل میں اُگے ہوئے خودرو پھولوں ایسی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ خوبصورتی دولت مندوں اور امیروں کی میراث نہیں ہے۔

میری کوٹھی کے سامنے خاصا وسیع و عریض میدان ہے جو عام طور پر خالی پڑا رہتا ہے۔ گرمی شروع ہوتے ہی خانہ بدوش اپنا ڈیرہ جما دیتے ہیں اور برسات کی پہلی پھوار تک رہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لوگ کسی دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ ان خانہ بدوشوں کے ڈیرے میرے میدان میں لگے ہوئے تھے۔ شام کو ٹہلتے ٹہلتے کبھی کبھی میری نظر ان ڈیروں کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی اور پھر میں ٹہلنے لگتا تھا مگر ایک دفعہ میری نظریں ایک ڈیرہ پر جم کر رہ گئیں۔

رگھو آگ کی طرح سرخ سرخ لوہے کے ٹکڑے کو اپنی سڑانسی سے جکڑے ہوئے تھا اور لاجو اپنی پوری طاقت سے اس پر گھن برسا رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر بندھی لال پٹی پسینے میں تر تھی۔ ہتھوڑا چلاتے وقت یہ اندازا ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ ایک نازک اندام دوشیزہ ہے۔ تین چار کلو کا ہتھوڑا جسے وہ لوگ گھن کہتے ہیں ہیں۔ وہ سر سے اونچا اٹھا کر پوری طاقت سے جب لال لال گرم لوہے پر مارتی تو لوہا سہم کر رہ جاتا اور رگھو پھرتی سے اس کا رخ بدل دیتا۔ دور سے دیکھ کر میری دلچسپی بڑھی اور میں بھٹی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام لاجو ہے اور اس بوڑھے کا نام رگھو۔ پچاس ساٹھ افراد پر مشتمل یہ قبیلہ ایک عام سا قبیلہ تھا، جیسے خانہ بدوشوں کے ہوتے ہیں مگر لاجو میں نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ جب بھی میرے سامنے آتی میرے ذہن میں ان گنت افسانوں کے پلاٹ برساتی کیڑوں کی طرح کلبلانے لگتے۔ اب ہر شام میرے قدم رگھو کے خیمہ کی طرف اٹھنے لگے اور بے مقصد کی یہ چہل قدمی، بامقصد بنتی جا رہی تھی۔ انسان بھی عجیب خود غرضی کا پتلا ہوتا ہے۔ جہاں بھی اور جب بھی اسے موقع ملتا ہے غرض خودرو پودے کی طرح اُگنے لگتی ہے۔

رگھو نے مجھے بتایا تھا کہ لاجو اس کی اکلوتی بیٹی تھی اور چونکہ ماں کی گود کی ٹھنڈک کبھی اسے نصیب نہیں ہوئی اس لیے ماں اور باپ دونوں کا پیار اُس نے اس کو دے کر پروان چڑھایا ہے۔

رگھو نے اپنی جوانی کی آگ کو لوہا گرم کرنے والی بھٹی میں جھونک دیا تھا اور اپنا پورا پیار لاجو پر نچھاور کر دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ضدی، الھڑ اور من مانی کرنے والی بن گئی تھی۔ اس کی ضد اور الھڑپن کو باپ نے کبھی برائی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا بلکہ پیار اور محبت کے خانے میں ہی رکھا تھا۔ پیار کی نظر تو پیار ہی دیکھتی ہے نفرت اور غصہ تو اس نظر سے بہت دور رہتا ہے۔ لاجو اس کی نظر میں ایک ایسی معصوم بچی تھی جس کی ہر خطا معصومیت کی ادا سمجھ کر ٹالی جا سکتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے اس سے پوچھا۔

"رگھو، تمھارے یہاں تو شادی کم عمر میں ہی کر دی جاتی ہے۔ پھر یہ لاجو...."

"ہاں بابوجی"۔ اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کر دی جاتی ہے۔ میں بھی فکر میں ہوں۔ کوئی اچھا بر ملے تو لاجو کے ہاتھ پیلے کر دوں مگر..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر حقہ گڑگڑایا اور دھواں اگلتے ہوئے بولا "بابوجی۔ لاجو میری بیٹی ہی نہیں، بیٹا بھی ہے۔ وہ میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہے۔ اسے خود سے جدا کرنے کو دل تو نہیں چاہتا مگر بیٹی تو پرایا دھن ہوتی ہے۔ ہم تو اس دھن کے رکھوالے ہیں بابوجی۔ ایک نہ ایک دن تو یہ دھن کسی دھن وان کو سپرد کرنا ہی ہوگا۔" کہتے ہوئے رگھو کی آنکھوں سے دو قطرے پھسل کر اس کے چہرے کی سلوٹوں میں گم ہو گئے۔

"یہ تو دنیا کا دستور ہے رگھو۔ ماں باپ کو چین کی نیند بھی اس وقت آتی ہے جب یہ دھن کسی کے سپرد ہو جاتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا۔

اسی دوران لاجو آگئی اور بات چیت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ واقعی لاجو کے بعد رگھو کتنا تنہا تنہا اکیلا رہ جائے گا۔ وہ بغیر کسی سہارے کے اپنا بڑھاپا کس طرح گذارے گا۔ خدا کسی کو اکیلا نہ رکھے اور وہ بھی بڑھاپے میں۔ تنہا بوڑھے درخت کو تو کوئی بھی تیز ہوا کا جھونکا اکھاڑ کر پھینک سکتا ہے۔ اگر یہی بوڑھا درخت دوسرے جوان درختوں سے گھرا ہو تو آندھیوں کا مقابلہ بھی بڑی آسانی سے کر سکتا ہے۔ گھنے جنگلوں کے مقابلے میں چٹیل میدان میں کھڑا درخت جلدی گر جاتا ہے۔

یوں ہی دن گذرتے گئے اور ایک دن یہ قبیلہ اپنے ڈیرے اٹھا کر چلا گیا اور میدان پھر سنسان ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے جاگتی رہنے والی جگہ قبرستان کی طرح خاموش ہو گئی۔

پھر برسات کی رم جھم شروع ہو گئی۔ سیلاب برپا کرنے والے دریا چڑھ کر اترے۔ خنک خنک ہواؤں کے دوش پر سردی نے دستک دی۔ بہتے ہوئے آبشار منجمد ہو گئے اور پھر سورج کی کرنیں آگ برسانے لگیں۔ گرمی بڑھی تو پھر یہ قبیلہ اس میدان میں اتر آیا۔ رگھو اپنی گاڑی کے بیل کھولنے سے پہلے ہی مجھے سلام کرنے آیا اور اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے بہت خوشی ہوئی۔ "لاجو کیسی ہے؟" رگھو کو دیکھتے ہی میں نے سوال کیا۔

"بہت مزے میں ہے سرکار۔ وہ بیل کھول کر سامان ٹھیک ٹھاک کر رہی ہے۔" تھوڑی دیر بیٹھ کر رگھو چلا گیا۔

حسب معمول شام کو میں چہل قدمی کے لیے باہر نکلا تو ایک سال پرانی عادت عود کر آئی اور میرے قدم رگھو کے ڈیرے کی سمت بڑھنے لگے۔ جب قریب

پہنچا تو دیکھا کہ ایک نوجوان رگھو کے پاس بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ لاجو بھی قریب ہی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی یہ سب لوگ کھڑے ہو گئے اور ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ اس نوجوان نے میرے پیر چھوئے۔ میں نے سوچا کہ لاجو کی شادی ہو گئی ہے اور یہ نوجوان اس کا شوہر ہے مگر لاجو میں بیاہتا عورتوں والی کوئی بات نہ دیکھ کر مجھے فوراً ہی اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اس قبیلے کی شادی شدہ عورتیں بہت شوخ لباس پہنتی ہیں اور خوب بن سنور کر رہتی ہیں۔ ماتھے پر چوڑی سی بندیا لگاتی ہیں مگر لاجو میں ایسی کوئی تبدیلی نہ تھی۔

"بابوجی۔ یہ شنکرا ہے۔ لاجو بٹیا کا منگیتر۔" رگھو نے جلدی سے بتایا۔

لاجو نے میرے چہرے کو اس طرح دیکھا جیسے میرے تاثرات سے میری پسندیدگی یا ناپسندیدگی معلوم کرنا چاہتی ہو۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور میں نے شنکرا کو لاجو کے پتی کی حیثیت سے دیکھا۔ کسرتی جسم والا وہ نوجوان مجھے نہایت مناسب لگا۔ درمیانہ قد، چوڑی چھاتی، محنتی جسم اور ہتھوڑے جیسے مضبوط ہاتھ والا یہ نوجوان لاجو جیسی لڑکی کے لیے بہت موزوں تھا۔

دوسرے دن صبح سے ہی ان لوگوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور خاموش و ویران میدان میں زندگی گنگنانے لگی۔ اب میں نے دیکھا کہ گھن چلانے کا کام زیادہ تر شنکرا کرنے لگا تھا اور تیار شدہ چیزیں فروخت کرنے کے لیے شنکرا اور لاجو دونوں ساتھ ساتھ جاتے تھے۔

ایک دن جب شنکرا اور لاجو دونوں بازار گئے ہوئے تھے تو میں ٹہلتا ہوا رگھو کے پاس پہنچا۔ وہ اب بہت خوش رہنے لگا تھا۔ میں نے اس سے شنکرا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ شنکرا کا دوسرا سگا اس دنیا میں نہیں ہے۔ محنتی لڑکا ہے اور لاجو کو خوش رکھے گا۔"

"چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔ بیاہ کے بعد بھی لاجو تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔"

"یہ سب بھگوان کی کرپا ہے بابوجی۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اب رگھو کی تندرستی بھی پہلے سے بہتر ہو گئی تھی اور کھانسی کی شدت بھی ختم ہو گئی تھی۔ اور لاجو تو جنگلی ہرنی کی طرح کودتی پھاندتی نظر آنے لگی تھی۔ کئی بار میں نے سوچا کہ بغیر شادی کے وہ شنکرا کے ساتھ کیوں رہتی ہے۔ رگھو نے ابھی تک اس کا بیاہ کیوں نہیں کیا مگر ایک رات اس کا جواب مجھے مل گیا۔

میں ڈیرے کے قریب پہنچا تو شنکرا کی آواز سن کر رک گیا۔

"لاجو۔ اب تو میں تیرے باپو سے کہہ دوں گا کہ اب جلدی سے وہ ہم دونوں کے پھیرے کرا دے۔ اب کب تک تو ملنے آجائے گی؟؟"

"دیکھ شنکرا۔ جب تک ہر طرح سے میں تجھے نہیں پرکھ لوں گی، بیاہ نہ کروں گی۔" لاجو نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"اری بھاگوان، اب چھ مہینے میں بھی نہ آجا پائی، کیا بھٹی میں تپا کر دیکھے گی۔ چل تو یہ بھی کر لے۔" شنکر جذبات میں بول رہا تھا۔

"ابھی صبر کر صبر۔ کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے شنکرا۔" لاجو نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"مگر زیادہ صبر کرتے کرتے کبھی کبھی پھل سڑ بھی جاوے

ہے لاجو۔ اس کا تجھے دھیان نہ ہے شاید۔"

"ارے یہ مرد کی جات بڑی کجات ہووے ہے۔ ایک تھالی سے تو اس کا جی نہ بھرتا۔"

لاجو نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تو تو ایسے کہہ رہی ہے جیسے ...." شنکرا نے برجستہ جواب دیا۔

"وہ اپنی بسنتی ہے نا، اس کے مرد نے کیا کیا۔ یہی تو دوسری عورت سے جا ملا اور جب دکھی بسنتی نے اسے لوٹا تو ڈنڈا لے کر اس کی پٹائی کر ڈالی۔ بھگوان کسم اگر میرا مرد ایسا کرے تو میں اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں۔" لاجو نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

دونوں میں اس قسم کی باتیں چلتی رہیں اور میں واپس لوٹ آیا۔

دن بہ دن لاجو اور شنکر کے پریم کی ڈور مضبوط ہوتی گئی۔ پہلے کے مقابلے میں یہ کنبہ زیادہ خوشحال ہو گیا تھا۔ اب اس کی بھٹی کے کوئلے پہلے سے زیادہ آگ اگلنے لگے تھے۔ اور ہوا پھینکنے والی دھونکنی کی سانسیں زیادہ تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ پرانے لوہے کی ڈھیری زیادہ اونچی ہونے لگی تھی اور تیار شدہ مال زیادہ تیزی سے بکنے لگا تھا۔ لاجو گھر کی دیکھ بھال کرنے لگی تھی اور شنکرا بھٹی کا ہتھوڑا بن چکا تھا۔

ایک رات رگھو کو بخار ہو گیا۔ لاجو میرے پاس دوڑی آئی اور بولی "بابوجی کوئی جوار کی گولی دے دو بابو کو بہت تیز جوار چڑھ گیا ہے۔"

میرے پاس سردرد، زکام، بخار وغیرہ کی گولیاں موجود رہتی تھیں۔ میں نے گولی دی اور لاجو کے ساتھ رگھو کو دیکھنے آیا۔ شنکرا رگھو کا سر دبا رہا تھا۔ دوا کھانے کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی اور میں واپس لوٹ آیا۔

صبح ہوتے ہی میں رگھو کا حال معلوم کرنے پہنچا۔ رگھو اب خاصا بہتر نظر آ رہا تھا۔ "اب تمھاری طبیعت کیسی ہے رگھو۔"

"آپ کی کرپا سے ٹھیک ہوں بابوجی۔ بڑھاپے میں کیا ٹھیک اور کیا کھراب۔ دیا تو تیل سے جلتا ہے۔ جب تیل ہی ختم ہو جائے تو بتی کہاں تک جلے گی۔"

"باپو" لاجو نے پیار بھرے غصہ سے کہا۔ "تجھ سے کتنی بار کہا ہے کہ اچھی اچھی باتیں کیا کر...."

"اری تو تو پاگل ہے...." کہتے ہوئے نہ جانے کیوں رگھو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

دوسرے دن صبح حسب معمول رگھو بھٹی پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ لوہا پیٹتے پیٹتے اس کا جسم بھی لوہا ہو گیا تھا جو بخار کی آگ سے کبھی ٹھنڈا اور کبھی گرم ہو جاتا تھا۔ جسم کی نشوونما جس ماحول اور آب و ہوا میں ہوتی ہے وہ اس کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔

وقت کا کارواں چلتا رہا۔ پھر وہ دن آیا جب یہ بنجارے کوچ کر گئے اور میدان پھر خاموشی کی چادر لپیٹ کر سو گیا۔

ایک دن مجھے یوں ہی خیال آیا کہ اب تو لاجو کی شادی ہو گئی ہوگی اور رگھو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا ہوگا۔ یہ برفیلی سردیاں تو بوڑھوں کے لیے اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ یوں ہی مجھے رگھو کا خیال آنے لگا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس روز مجھے بھی کچھ زیادہ ہی سردی لگ رہی تھی۔

پھر کیلنڈر نے پلٹا کھایا اور سنسان میدان میں زندگی نے آنکھیں کھول لیں۔ بنجاروں کا قافلہ لوٹ

آیا تھا مگر رگھو مجھے سلام کرنے نہیں آیا۔ کیا رگھو نہیں آیا۔ کیا وہ لاجو کے ساتھ کہیں اور ... کئی خیال آئے اور گذر گئے۔

شام کو میں ان لوگوں کے ڈیرے کے پاس گیا اور ایک بنجارے سے پوچھا۔

"کیا رگھو نہیں آیا؟"

"آیا سرکار .... بیمار ہے۔ اندر پڑا ہے ڈیرے میں۔ اِدھر" اس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

میں رگھو کے ڈیرے کی طرف گیا تو دیکھا وہ واقعی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ وہ تنہا تھا اور لاجو یا شنکرا وہاں کوئی نہیں تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اشارہ سے منع کر دیا۔

"لیٹے رہو۔ رگھو، کیسی طبیعت ہے تمھاری؟"

میری زبان سے ہمدردی کے الفاظ سن کر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

"ارے ارے! بھئی کیا ہوا ...." میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "لاجو اور شنکر کہاں ہیں؟"

میرے اس سوال پر رگھو نے اپنی دھندلائی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیسے وہ انھیں تلاش کر رہا ہو۔ "...لاجو اب کبھی نہیں ملے گی مجھے۔ بابوجی" اس نے ٹوٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ کیا لاجو شنکرا کے ساتھ ...."

"ہاں بابوجی، شنکرا کے ساتھ ہی سمجھو۔ اگر شنکرا اس کے جیون میں نہ آتا تو وہ آج اس انجام تک نہ پہنچتی۔"

"کیوں۔ کیا ہوا لاجو کو ....؟ کیا شنکرا نے اسے۔"

"لاجو کو عمر قید ہو گئی بابوجی!"

"عمر قید! لاجو کو؟ عمر قید..... !" میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔

"ہاں بابوجی عمر قید.... یہ تو آپ کو معلوم ہی تھا کہ شنکرا لاجو کا منگیتر تھا اور دونوں میں پریم بھی تھا۔

یہ بات پچھلی سردیوں کی ہے۔ ہم لوگ الہ آباد میں تھے ہمارے ساتھ ہی کچھ دور پر ایک ڈیرہ اور بھی تھا ہم بنجارے لوگ سردیاں زیادہ تر الہ آباد میں ہی کاٹتے ہیں۔ دوسرے ڈیرے کی ایک لڑکی سے شنکرا کی آنکھ لڑ گئی اور شنکرا نے اس کے ڈیرے میں آنا جانا شروع کر دیا۔ لاجو اور شنکرا میں کئی بار اس بات پر جھگڑا بھی ہوا مگر شنکرا کہتا تھا کہ اس کا کسی لڑکی سے میل جول نہیں ہے۔ اس کا اس لڑکی سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ ادھر میں نے بھی لاجو کو سمجھایا کہ یہ تیرا بھرم ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مگر لاجو کو اس پر کوئی وشواس نہ آیا۔ استری کی نظر بہت تیز ہوتی ہے بابوجی۔ اس کو ایسے معاملوں میں بہت کم دھوکا ہوتا ہے۔ ایک بات اور تھی۔ ایک عورت جو اس لڑکی کے پاس رہتی تھی۔ شنکرا کی ساری باتیں لاجو کو بتاتی رہتی تھی۔ ایک رات جب شنکرا اس سے مل کر آیا تو لاجو بھی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ ڈیرے پر آکر لاجو اور شنکرا میں رات گئے تک جھگڑا ہوتا رہا۔ شنکرا نے وعدہ کیا کہ وہ اب کبھی اس ڈیرے کی طرف جھانکے گا بھی نہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک رات شنکرا ڈیرے سے غائب تھا۔ آدھی رات کے لگ بھگ وہی عورت آئی اور لاجو کو بتایا کہ شنکرا اس لڑکی کے ساتھ ہے بس لاجو غصّہ سے دیوانی ہو گئی اور چھرا لے کر اس کے ساتھ چل دی۔

غزلیں

مھیندر پرتاپ چاند

جھکا نہ کچھ بھی نگاہوں کو، ملتجی کے سوا
جھکا یہ سر نہ کہیں، ان کے نقشِ پا کے سوا
ہزار منّتیں کیں، لاکھ ہاتھ پھیلائے
مگر نہ کچھ بھی ملا زخمِ التجا کے سوا!
یہی ہوس ہے کہ سارا جہاں ہو زیرِ نگیں
جہاں میں کچھ بھی نہیں اور اس ہوا کے سوا
لبوں پہ حرفِ وفا ہے، دلوں میں بیر مگر
کہوں میں کیا اسے یاروں کی اِک ادا کے سوا؟
عزیز کیوں نہ ہو اے چاند مجھ کو یہ دولت؟
بچا ہی کیا ہے مرے پاس اب انا کے سوا؟

یعقوب بدایونی

قطرہ بھی کیا ہے چیز کہ دریا کہیں جسے
وحدت کا راز وہ ہے، تماشا کہیں جسے
ہر نقشِ رہگذار پہ جھکنے لگی جبیں
اب تک ہے خام ذوقِ تماشا کہیں جسے
صد رشکِ آفتاب نے چمکا دیا ہمیں
موجِ تجلّیات، سراپا کہیں جسے
مہرِ سکوت صبحِ صداقت پہ لگ گئی
ڈھونڈیں کہاں وہ نور اجالا کہیں جسے
کیا دور ہے کہ خواب ہوئی اپنی زندگی
مانگی ہوئی ہے جان، تقاضا کہیں جسے
مانگے ہے مجھ سے جزیۂ یک عرصۂ حیات
ہر آرزو کہ جانِ تمنّا کہیں جسے
محسوس کر رہا ہوں کہ مشکل کا ہے سفر
یعقوب ابتدائے تمنّا کہیں جسے

وہاں جاکر لاجو نے جو کچھ دیکھا وہ اسے برداشت نہ کر سکی اور اس نے شنکرا کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ شنکرا کا سارا خون زمین پر بہ گیا اور وہ مر گیا۔ لاجو کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔ مقدمہ چلا۔ لاجو نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا اور اسے عمر قید کی سزا ہو گئی۔

میں تو لٹ گیا بابوجی۔ برباد ہو گیا۔" رگھو بری طرح رو رہا تھا جیسے میلے میں بچھڑا ہوا بچہ اپنے ماں باپ کے لیے روتا ہے.... رگھو خاموش ہو گیا اور میری نگاہوں میں لاجو کا مسکراتا ہوا چہرہ گھوم گیا۔

●●

اسعد بدایونی

یہ دھرتی
یہ لوگ

مرے وطن کی حسیں زمیں میں بہت سے امکان ہیں نمو کے
مرا یہ دعویٰ یونہی نہیں ہے
یقیں نہ آئے تو دیکھ لیجے
یہ سبز و شاداب کھیتیاں ہیں
یہ میٹھے پانی کی ندیاں ہیں
یہ اجلے اجلے حسیں مکانوں کی بستیاں ہیں
یہ بستیاں، جن کے رہنے والوں کے دِل
محبت کی داستاں ہیں، مگر نگاہوں میں بجلیاں ہیں
وطن کے دشمن اِدھر نہ دیکھیں

ذرا ادھر بھی نظر اُٹھائیں
یہ کارخانوں کی چمنیاں ہیں
جوان کے منہ سے نکل رہا ہے۔ دھواں نہیں ہے
عظیم محنت کشوں کے سینوں کی گرمیاں ہیں
یہ دُور حدِ نگاہ تک جو چمک رہی ہیں
یہ ریل گاڑی کی پٹریاں ہیں
جنھوں نے سارے وطن کی دوری سمیٹ لی ہے
کسی بدن میں رگوں کے اک جال کی طرح ہیں
تمام خطوں کی رازداں ہیں
اِدھر بھی دیکھیں
یہ سرحدیں ہیں، جری جوانوں کی ٹکڑیاں ہیں
کہ جن کو دیکھنے سے دشمنوں کے حواس گم ہوں
یہ آسمانوں کے ہم سفر ہیں
سمندروں کے دلوں پہ ان کے قدم پڑے ہیں
وطن کی خاطر سدا لڑیں گے، سدا لڑے ہیں
مرا وطن اک چمن ہے جس میں ہزار رنگوں کے پھول اپنی بہار
سب کو دکھا رہے ہیں، ہواؤں میں مسکرا رہے ہیں
مجھے یقیں ہے، کہ میرے پیارے وطن کی مٹی کا ذرہ ذرہ
زر و جواہر سے کم نہیں ہے مِرے گلستاں میں جو بہاریں ہیں
دائمی ہیں، انھیں خزاؤں کا غم نہیں ہے
مِرے وطن کی حسیں زمیں میں بہت سے امکان ہیں نمو کے
مرا یہ دعویٰ یونہی نہیں ہے، مرا یہ دعویٰ یونہی نہیں ہے

مطبوعات

نام کتاب ——— "رباب سخن"۔ مجموعۂ غزلیات

مصنف ——— مہندر سنگھ آزاد گورداس پوری۔

ناشر ——— آزاد گورداس پوری

تقسیم کار ——— مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۰

قیمت ——— بیس روپے

اردو غزل ایک قدیم ترین۔ محبوب اور ہردلعزیز صنفِ سخن ہے۔ کیونکہ یہ حقیقی نیز مجازی عشق و محبت کے لطیف ترین جذبات کی ترجمان ہے اور مجلسی ارتباط کا یکتا ادبی ذریعہ۔ جس نے رومان کو بازاری سطح سے اٹھاکر جمالیاتی مقام تک پہنچا دیا ہے۔ تاہم معاشی، سماجی اور سیاسی تغیرات کی روشنی میں غزل کا مزاج بھی بتدریج انقلاب پذیر ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ دورِ حال کی غزل کا متقدمین کی غزل سے موازنہ کیا جائے تو موضوعاتی اعتبار سے ان کے درمیان ایک وسیع خلیج کا احساس ہوگا۔ شاید یہ عمل ناگزیر بھی ہے۔ دریں حالات اگر غزل کا کوئی ایسا مجموعہ اُردو شاعری کے افق پر کبھی نمودار ہوجائے جس میں اصلی اور بنیادی غزل کی چاشنی ہو تو وہ اردو غزل کی دنیا میں نشاطِ ثانیہ کا اثر رکھتا ہے۔

آزاد گورداسپوری کی تصنیف "ربابِ سخن" بھی ان صفات کی حامل ہے۔ یہ مجموعہ ۱۱۲ صفحات اور ۹۸ غزلیات پر مشتمل ہے جس میں شاعر نے اپنی جمالیاتی قوتِ تخلیق سے کام لے کر رومانی کیفیتوں کا دلکش پیرایہ میں اظہار کیا ہے اور عشق و محبت سے وابستہ راز و نیاز ہجر و وصال، یاس و امید، وفا جفا، گل و بلبل، بہار و خزاں لب و رخسار، چشم و ابرو، دیوانگی فرزانگی وغیرہ کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان مضامین کی ازلی قدامت اور روایت کے باوصف قاری کے دل پر ان کی تازگی کا احساس ہوتا ہے اور شعر کا ہر لفظ تارِ رباب کی طرح بجتا نظر آتا ہے، آزاد کے اشعار میں خاص طرفگی لذت اور غضب کی موسیقیت اور نغمگی ہے۔ حسین و جمیل الفاظ، تراکیب اور استعارات کے استعمال کی موزونیت کا یہ عالم ہے کہ کسی رد و بدل کا امکان خارج از بحث ہے زبان میں نہایت درجہ شائستگی اور پاکیزگی ہے جو بااوقات عشقیہ شاعری میں جذبات کی رو میں بہتی نظر آتی ہے۔

آزاد کی غزل میں مسلّمہ روایت کے ساتھ ساتھ ان کی انفرادیت کا عنصر بھی واضح طور پر موجود ہے انھوں نے اپنی تخلیقات میں طویل اور مختصر بحروں کے علاوہ تازہ اور نادر مگر دلکش ردیفوں کا بھی مؤثر استعمال کیا ہے

ان کی غزل ٹھوس، مضبوط اور محاسنِ شاعری کی آئینہ دار ہے۔ ان کا کلام معیاری بھی ہے اور سہلِ الممتنع بھی، جو ان کی قادرالکلامی پر دال ہے۔ کہیں کہیں خودداری، تصوف اور شاعرانہ مگر واجب تعلی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ استادِ سخن ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی کے الفاظ میں:

"وہ جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ متروکاتِ شعری و زبان کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ بندش کے لحاظ سے شعر عموماً ٹھوس اور اور مضبوط ہوتا ہے، پاکیزہ کلامی اور خوش بیانی ان کی طبعِ سلیم کا خاص جوہر ہیں، مشقِ سخن بھی اچھی اور پاکیزہ ہے۔"

"ربابِ سخن" سے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمایئے

پہلا شعر ان کی ابتدائی غزل کا مطلع ہے ... جو زندگی اور حقیقی محبت کی دولت کی باہمی اہمیت کا دلکش اظہار ہے یہ ان کی لمبی بحر کی غزلوں کا بھی ایک نادر اور پرمعنی نمونہ ہے۔

اے جنوں اسکی کوشش برابر رہے عمر بھر دولتِ مفلسی کم نہ ہو
آگ الفت کی دل میں بھڑکتی رہے داغ جلتے رہیں روشنی کم نہ ہو

پائمالِ ستم اپنی رودادِ غم جس سے کہنی تھی اس سے چھپاتے رہے
اور دیوانگی کا اثر دیکھئے جا کے سارے جہاں کو سناتے رہے

وہ ظاہر ہے مگر پھر بھی نہاں ہے
نہ جانے کون سی شئے درمیاں ہے

کس طرح ستمگر کو پیکرِ وفا کہہ دوں
جور کو روا کہہ دوں درد کو دوا کہہ دوں
ختم کر نصیحت کو جا معاف کر ناصح
یہ نہ ہو کہ اب میں بھی کچھ برا بھلا کہہ دوں

بلایا تو ہے اپنی محفل میں اس نے مگر وہم سے ہوں پریشاں پریشاں
ملاقات کا شوق بھی اس قدر ہے چلا جا رہا ہوں ہراساں ہراساں

"ربابِ سخن" چند ماہ پہلے پوری سج دھج کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ گٹ اپ، کتابت، طباعت نہایت ہی دیدہ زیب ہے، یہ مجموعہ خالص اردو غزل کی دنیا میں ایک گرانقدر اضافہ ہے اور ہر اہلِ ذوق کے دل و دماغ کے لیے سامانِ ضیافت مہیا کرتا ہے۔

(ہردیال شوق)

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ارجن داس ملک، نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس سی او ۱۸۹-۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ سے مارچ ۸۸ء کے لیے شائع کیا۔ طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو ٹی چنڈی گڑھ



چودھری دیوی لال وزیرِ اعلیٰ ہریانہ کی خدمت میں "وزیرِ اعلیٰ سوکھا راحت فنڈ" کے لئے ۱،۲۴،۸۲۸ روپے کا چیک پیش کرتے ہوئے راجیہ منتری پشوپالن جناب عظمت خاں۔

نائب وزیرِ اعلیٰ ہریانہ جناب بنارسی داس گپتا "انتراچل یواپترکار پریشد" کی جانب سے پریشد کے دوسرے سالانہ اجلاس کے موقع پر چنڈی گڑھ میں "وِیر پرتاپ" کے مدیرِ اعلیٰ جناب ویریندر کو خلعت اور یادگاری تحفہ سے نوازتے ہوئے۔





چودھری دیوی لال وزیرِ اعلیٰ ہریانہ "سپرو ہاؤس" نئی دہلی میں "نیشنل یونین آف جرنلسٹس" (انڈیا) کی ساتویں دوسالہ کانفرنس سے خطاب فرماتے ہوئے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال چنڈی گڑھ میں ہریانہ کے مختلف حصّوں سے آئے بیوپاریوں کے ایک عظیم اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے۔



اپریل ۱۹۸۸ء

تعمیر

ہریانہ





گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند برار ۲۰ مارچ ۱۹۸۸ء کو [illegible] پروگرام
ایشیا سینٹر چنڈی گڑھ [illegible] تقریب کے موقع پر [illegible] عطا کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۱۹ مارچ ۱۹۸۸ء کو انبالہ میں شمع روشن کر کے نشام بہار
ٹرسٹ کے ہند و پاک مشاعرہ کا افتتاح فرماتے ہوئے۔



آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

اپریل ۱۹۸۸	شمارہ : ۴	جلد ۱۶

مدیر اعلیٰ: ارجن داس ملک
آئی۔اے۔ایس

مدیر: سلطان انجم

سرورق: پون ابرول

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۹-۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ — ۱۶۰۰۱۷

ترتیب

آیئے ناخواندگی کی تاریکی کو دُور کرنے کا عہد کریں



آج کے سائنسی اور تکنیکی عہد میں تعلیم ہی ملک کو تعمیر و ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اس بات کے مدِّ نظر حکومت نے ریاست کے نوجوانوں کے تعاون سے ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے تعلیم کو عام کرنے کی مہم شروع کی ہے تاکہ ہر مرد و زن کو پڑھ لکھ جانے کا موقع میسر کرایا جا سکے۔ تعلیم کے فروغ کی اس عوامی تحریک کا مقصد جہاں لوگوں میں بیداری لانا ہے وہیں ملک کے ترقیاتی کاموں میں ان کے تعاون کو بڑھاوا دے کر ان کے معیار زندگی میں سدھار لانا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خواتین کو اپنے سماجی حقوق حاصل کرنے کی بھی ترغیب دینی ہے۔

اسی لیے سبھی طلبا، نوجوان اور سماجی خدمت میں مصروف اداروں سے میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہر انپڑھ کو تعلیم کا دان دے کر تعلیم کو عام کرنے کے اس مہان یگیہ میں اپنی آہوتی ڈالنے کے لیے آگے آئیں اور متحد ہو کر یہ کوشش کریں کہ کوئی بھی شخص انپڑھ نہ رہے۔

دیوی لال
وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

حرفِ آغاز

ہریانہ میں بزرگوں، بیواؤں، معذوروں کے لیے

پنشن کی اسکیمیں

ہریانہ سرکار نے حال ہی میں بزرگوں کے لیے ایک نئی پنشن اسکیم شروع کی ہے۔ اس اسکیم کے تحت ۶۵ سال یا اس سے زیادہ عمر کے ہریانہ کے ضعیفوں کو بڑھاپا پنشن دی جاتی ہے بشرطیکہ وہ انکم ٹیکس نہ دیتے ہوں اور کسی دوسرے ذریعے سے پنشن حاصل نہ کر رہے ہوں۔ میاں بیوی، دونوں ہی الگ الگ اس پنشن کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب تک ۶ لاکھ ۵۰ ہزار سے زیادہ افراد کو یہ پنشن دی جا چکی ہے۔ ہریانہ ملک کی پہلی ریاست ہے جہاں بڑھاپا پنشن اسکیم شروع کی گئی ہے۔

سرکار غریب، بے سہارا اور غیر شادی شدہ خواتین کو بھی پنشن دیتی ہے۔ ایسی شادی شدہ خواتین کو بھی پنشن دی جاتی ہے جن کے شوہروں نے انھیں چھوڑ دیا ہو یا وہ جسمانی یا دماغی طور پر بیمار ہونے کی وجہ سے اپنی روزی روٹی کمانے کے قابل نہ ہوں۔ سرکار اُن معذوروں کو جن کی اپنی کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور والدین بیٹوں، نواسوں وغیرہ میں سے کوئی بھی اُن کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے، کو بھی پنشن دیتی ہے۔ بیواؤں/معذوروں کی پنشن حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ درخواست کنندہ کی آمدنی ۵۰ روپے ماہانہ سے کم ہو۔ اپاہج ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا ضروری ہوگا۔

ایک جانچ پڑتال کمیٹی اپریل، مئی اور جون میں ہر گاؤں اور ہر قصبے کا دورہ کرے گی جو بڑھاپا پنشن، بیوہ پنشن اور اپاہجوں کی پنشن کے خواہشمند افراد کے مستحق ہونے کی جانچ گاؤں والوں کے سامنے کر کے موقع پر ہی پنشن منظور کرے گی۔ یہ کمیٹی اُن بزرگوں کو بھی جو پچھلی مہم کے دوران بڑھاپا پنشن سے محروم رہ گئے تھے، مستحق ہونے کی جانچ کر کے ۱۷ جون ۱۹۸۷ء سے ہی پنشن منظور کرے گی۔

یہ کمیٹی نئی درخواستوں کی جانچ پڑتال کرنے کے ساتھ ساتھ پہلے سے پنشن پانے والے افراد کی اہلیت کے بارے میں بھی جانچ پڑتال کرے گی۔ اس لیے پہلے سے پنشن حاصل کر رہے سبھی افراد کو اس کمیٹی کے روبرو پیش ہونا ہوگا۔ اگر کوئی پنشن پانے والا اس کمیٹی کے سامنے پیش نہیں ہوگا تو اس کی پنشن کی ادائیگی روکی جا سکتی ہے۔

گاؤں میں جانچ پڑتال کمیٹی کے دورے کی تاریخ، وقت اور قیام کی اطلاع گاؤں کے سرپنچ کو بھیج دی جائے گی۔ شہروں/قصبوں کے بارے میں یہ اطلاع میونسپلٹی کے دفتر سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

کرتار سنگھ دگل

لایکا

سری نگر کشمیر میں کسی فیشنیبل ہوٹل کا ایک ـــــ
کمرہ۔ اس کمرے میں ادھیڑ عمر کی ایک نہ اتنی خوبصورت
نہ اتنی بدصورت جرنلسٹ کتابوں، کاغذوں، ٹائپ رائیٹر
وغیرہ کو پھیلائے الجھی الجھی لگ رہی ہے۔ کمرے کے ایک
جانب ایک ریڈیو سیٹ رکھا ہے۔ جس میں سے آواز
آتی ہے ـــ

یہ آل انڈیا ریڈیو ہے، رات کے نو بجے ہیں ـــ
اب آپ سماچار سنیئے:

جرنلسٹ: رات کے نو بج گئے!
کشمیر کی یخ ٹھنڈی رات کے نو۔
اور موتیا ابھی تک نہیں آئی۔
اِدھر اُدھر سوتا لگ چکا ہے،
باہر برف گرنا بند ہو گئی ہے۔
جب برف گرتی ہے
کیسی چاروں طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔
اس سے تو بارش اچھی ہے ـــ
ایک شور مچا رہتا ہے ـــ
برف میں تو اکیلا پن کھانے کو آتا ہے۔
ہوٹل کا نامراد اکیلا پن!
اور ہوٹل بھی کشمیر کا
لوگ آتے ہیں، جاتے ہیں
ہوٹل میں چاہے کوئی کتنی دیر ٹھہرے۔
پرائے کا پرایا ہوتا ہے
کیسے دھیرے دھیرے برف گر رہی ہے۔
جیسے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہو۔
یہ کھسر پسر کرنا مجھے زہر لگتا ہے،
کشمیر میں لوگ کانا پھوسی اتنی کیوں کرتے ہیں۔
خاص طور پر پرائے لوگ۔
باہر سے سیر کرنے کے لیے آتے ہیں۔
یہاں آن کر کھسر پھسر کرنے لگ جاتے ہیں۔
ہیں! یہ موتیا تو نہیں باہر
آہستہ آہستہ قدم جیسے کوئی چل رہا ہو۔
نہیں موتیا نہیں! برف ہے!
برف دھیرے دھیرے قدموں سے میرے کمرے کی طرف
بڑھ رہی ہے
جرنلسٹ: آج میرا دل کیوں اس طرح بیٹھ سا رہا ہے؟
شاید اس لیے کہ رات ہے۔
باہر برف گر رہی ہے۔

اور میں اکیلی ہوں۔
میں ایک ہندوستانی جرنلسٹ۔
چاہے کتنی پڑھ گئی ہوں
ہوں تو ایک بھارتیہ استری!
کشمیر آنے سے پہلے گاؤں گئی
اور وہاں سے موتیا کو باندھ لائی۔
اپنے ساتھ کے لیے
ایک نظر میں نے موتیا کو دیکھا۔
اور اس سے میرا عشق ہو گیا
میں جس نے اپنی ساری جوانی گذار لی ہے۔
پریم کے بندھن ڈالے بنا۔
ایک نظر اور اس لڑکی نے
جیسے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔
موٹی موٹی کالی کالی آنکھیں
گوری چٹی، اونچی لمبی
جیسے کسی نے ایک ایک انگ اس کا گھڑ گھڑ کے بنایا ہو۔
گز گز لمبے بال۔
ریشم کے لچھوں جیسے نرم اور لمبے
اور بھولی، جیسے منھ میں زبان نہ ہو۔
الہڑ
سویا سویا ایک خمار! پلکوں کے نیچے ڈھکا ہوا
اور میں اسے ساتھ لے آئی
جیسے سونی راہوں میں
کوئی گیت گنگنانے لگتا ہے
جیسے اندھیری رات میں کسی کے جوڑے پر
جگنو آ بیٹھے،
جیسے کسی کی چنری کے پلو کے ساتھ گھنگھرو
بندھے ہوں۔
جرنلسٹ: برف کیسے ہولے ہولے پڑ رہی ہے!
جیسے رات اپنی ہو۔

میں اتنے میں اپنا ڈسپیچ ختم کر لوں۔
ایک مختصر ٹائپ کی تھی
کہ موتیا کو وہ لینے آ گیا
اور پھر میں اسے سجانے لگ گئی۔
اس لڑکی کے بال کتنے لمبے ہیں
چوٹی گوندھتے بانہیں تھک تھک جاتی ہیں
میں نے پھر موتیا کے بارے سوچنا شروع کر دیا ہے!
مجھے تو اپنا ڈسپیچ ختم کرنا ہے۔
جرنلسٹ: میری انگلیاں ٹھٹھر رہی ہیں
برف کیسے پڑ رہی ہے!
ایک سُر، ایک تال
چپہ چپہ جم گئی ہے، اِدھر اُدھر
اور یہ موتیا ابھی تک نہیں آئی
کل نو بجے لوٹی تھی۔
پرسوں پونے نو بجے
اترسوں ساڑھے آٹھ بجے
اس سے پہلے دن آٹھ بجے
شام کی گئی اب نو بج گئے ہیں
چار دن ہی تو ہوئے ہیں
چار دن، اور یہ لڑکی
کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہے!
کوئی اُڑنا چاہے تو کئی آسمان خالی پڑے ہیں۔
جرنلسٹ: میں نے پھر موتیا کے بارے میں سوچنا شروع
کر دیا ہے!
مجھے تو اپنا ڈسپیچ ختم کرنا ہے۔
انگلیاں ہیں کہ چلتی ہی نہیں۔
کتنی ٹھنڈ ہے!
برف کے گالے، برف کی پونیاں
پریم کی کتنی حسین تاریں کاتی جاتی ہیں کشمیر میں!
آگے پیچھے برف کی اُجلی اُجلی خاموشی۔

اور دور جہلم کی اٹھلاتی لہروں کا نغمہ
دن رات، دن رات
ناچتی گاتی
بڑھتی چلی جاتی ہیں۔
جہلم کی یہ لہریں رکتی نہیں
برف کی ٹھنڈ انھیں باندھ نہیں سکتی
کشمیر کا جادو انھیں اسیر نہیں کر سکتا
رات سونے کے لیے کہتی ہے۔
اور یہ چلتی چلی جاتی ہیں۔
جرنلسٹ: رات کتنی ہو گئی ہے۔!
اور موتیا نہیں آئی ابھی تک
ایک بار کسی نے مٹی کا ایک بھانڈا خریدا
اور یہ پرکھنے کے لیے
کہ کچا ہے کہ پکا ہے۔
اس نے برتن کو دھرتی پر دے مارا
برتن ٹوٹ گیا
سر پر پانی کا گھڑا اٹھائے آرہی تھی۔
جب پہلی بار گاؤں میں میں نے موتیا کو دیکھا
جیسے سچا موتی ہو
لمبی گردن
سر پر گھڑا
اس کا حسن سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔
مسکانیں بکھیرتی
میرے پاس سے گذری۔
سورج مکھی کے پھول کی طرح
میری نظر اس کے ساتھ گھومتی گئی
جب تک وہ گلی کا موڑ نہ مڑ گئی
میری آنکھیں
اس کی کمر سے نیچے تک لٹک رہی موٹی بھاری
چوٹی کو دیکھتی رہیں۔

کیسے سنبھالتی ہے یہ اتنے سندر بال!
میں سوچتی رہی سوچتی رہی
اور پھر مجھے پتہ چلا
موتیا تو ہماری پڑوسن ہے
تائی جوالی کی پوتی
جرنلسٹ: میں نے پھر اس لڑکی کے بارے میں سوچنا
شروع کر دیا ہے۔
مجھے تو ڈسپیچ ختم کرنا ہے۔
صبح سویرے ڈاک نکل جائے گی
انگلیاں تو انگلیاں
ٹائپ کے حروف بھی جیسے جم گئے ہوں
مشین کہتی ہے، مجھے ہاتھ مت لگاؤ
کشمیر کی ٹھنڈ
برف
رات
ہوٹل کا کمرہ
اور ایک اکیلی عورت
جس نے اپنا ڈسپیچ ختم نہیں کیا
اندر خالی
باہر خالی
ویرانی جیسی ویرانی ہے۔
جرنلسٹ: کیسے کئی لوگ
اپنے ویرانے کو آباد کر لیتے ہیں؟
پرائے باغ میں
گھڑی کی گھڑی کے لیے ٹہل آنا کیسا
اور اپنے آنگن میں باغیچہ لگوا لینا کیسا
پڑوسی کی امرائی کے نیچے بیٹھ آئے
اپنے آنگن کا سونا پن
کاٹ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے
کئی بار پھول کہیں کھلتے ہیں، مہک کہیں آتی ہے،

کئی بار پہاڑ کے باغیچے میں کھلے پھولوں کو
توڑ کر کئی اپنے بالوں میں سجا لیتے ہیں
جرنلسٹ: اس دن موتیا کے جوڑے میں
گلاب کی ایک کلی توڑ کر میں نے لگائی تھی۔
لال گلاب کی ایک کلی۔
لال گلاب کی ایک کلی
جواہر لال نے ایک بار شیخ عبداللہ کو بھینٹ کی تھی۔
اور شیخ عبداللہ نے کہا تھا
باپو کا خون بیکار نہیں جائے گا
میں سوچتی ہوں
اگلا ڈسپیچ میرا
ایک ملاقات ہو سکتا ہے۔
مقبول شروانی کی روح
لوٹ کر آتی ہے۔
"کیوں میرا خون بیکار گیا؟"
بار بار وہ پوچھتی ہے
"جس نعرے کے لیے میں نے جان دے دی
اس نعرے کا کیا ہوا؟
جب نیچے سے کبھی اور اور طرح کی آوازیں میں
سنتا ہوں
جنت میں میرے ساتھی۔
میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگتے ہیں۔
کوئی کسی اصول کے لیے جان دے دے۔
اور جن کے کہے پر وہ اپنا لہو گرائے
وہ شش و پنج میں پڑ جائیں۔
سچائی بھی کبھی بدلتی ہے؟
چاند بھی کبھی میلا ہوتا ہے؟"
جرنلسٹ: ہوں نہ میں ہندوستانی
کل کے ڈسپیچ کی فکر کر رہی تھی
اور آج کا ڈسپیچ میرا یوں کا یوں دھرا ہے۔

ڈسپیچ ختم نہیں ہوا
موتیا لوٹی نہیں
اور برف ویسی کی ویسی گر رہی ہے۔
مجھے یوں لگتا ہے
جب تک موتیا لوٹے گی نہیں۔
برف رکے گی نہیں
میرا ڈسپیچ ختم نہیں ہوگا
جرنلسٹ: موتیا کو کوئی دیکھے
گاؤں سے نکلے ابھی چار دن نہیں ہوئے
اور یہ لڑکی کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہے
یہیں بیٹھے تھے اس شام
میں اور میرا امریکن پردیسی
بیٹھے چائے پی رہے تھے
کہ سامنے کمرے میں سے وہ نکلی
سوئی سوئی اُٹھی کے پھولے ہوئے الجھے
ہوئے بال
کندھوں پر چُنری ڈالے
اس کی چوٹیاں چھاتیوں پر اونچی نیچی ہوتیں
اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہی تھیں۔
الکسائی، السائی۔
جیسے کسی کی باہوں میں آ گرے گی
میں اس پر خفا ہونے والی تھی
دوپہر کی سوئی، اب وقت کون سا ہو گیا تھا۔
اور اُس نے آگ بھی نہیں سلگائی تھی
نہ روٹی ٹک کی کوئی فکر کی تھی۔
چائے بھی میں نے ہوٹل سے منگوائی تھی۔
آخر کشمیر اُسے میں سونے کے لیے کیا اٹھا لائی تھی!
نوکر کو لاڈ کرو تو اُسے اپنی حیثیت نہیں بھول
جانا چاہیے۔
ابھی بول میرے منہ میں ہی تھے

کہ میرا امریکن پڑوسی مجھ سے پوچھنے لگا۔
"کون ہے یہ؟"
اور اس کا منہ پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا
اور اُس کی آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں
یہ پری کون سے آسمان سے اُتری ہے
مجھے فوراً ایک شرارت سُوجھی
میں نے کہا۔" میرے چچا کی بیٹی ہے۔ میرے ساتھ سیر کرنے آئی ہے۔"
اور پھر میرے پڑوسی کی نظریں
جیسے اس لڑکی میں گڑ گئی ہوں
ایک نظر اور جیسے اس پر جادو ہو گیا ہو۔
کچھ دیر بعد مجھے ایک اور چھیڑ سُوجھی۔
"اگر تمھارا جی چاہے
تو آج کی شام تم اسے کلب لے جا سکتے ہو۔"
امریکن کھِل سا گیا۔
اٹھ کر ناچنے ہی تو لگا۔
میں نے کہا۔" پر یہ تیری زبان نہیں جانتی۔"
اس کی اسے پرواہ نہیں تھی۔
"جوانی کی بولی ایک ہی ہوتی ہے،
محبت کی زبان پورب میں پچھم میں ایک ہی ہے۔"
امریکن ایک نشے میں بول رہا تھا۔
مجھے اور شرارت سُوجھی۔
بس ایک تجربہ کرنے کے لیے۔
بس ایک تماشہ دیکھنے کے لیے۔
میں اندر جا کر موتیا کو سجانے لگی۔
اور دُلہن بنا کر میں نے کہا۔" ایک گھنٹہ تک لوٹ آنا"
وہ تین گھنٹے لگا کر آئے
اگلے دن لینے والا لینے کے لیے وقت سے کہیں پہلے آگیا۔
چھوڑنے کے لیے پھر اُسے دیر ہو گئی،
میں اندر ہی اندر ہنس رہی تھی۔
وہ دن، اگلا دن، اُس سے اگلا دن اور آج کا دن
سارا سارا دن میں موتیا کے بارے میں سوچتی رہتی۔
نت نئے کپڑوں میں سجا کر اُسے شام کو بھیجتی۔
جرنلسٹ: برف ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔
دھیرے دھیرے اُترتی آرہی ہے۔
جیسے انتظار کر رہی ہو۔
کہ آج کی رات جن کو گھر پہنچنا ہے، وہ پہنچ جائیں۔
اور پھر یہ ٹوٹ کے آن پڑے۔
جیسے انتظار کر رہی ہو۔
جیسے اپنا ڈسپیچ ختم کرنا ہے وہ ختم کرلے۔
اور پھر یہ لپیٹ لے ساری کی ساری وادی کو اپنی سفیدی میں۔
رات کی تاریکی میں برف کی سفیدی کتنی ٹھنڈی ہوتی ہے۔
رات کا اندھیرا بڑھ رہا ہے،
برف کی سفیدی پھیلتی جا رہی ہے۔
اور موتیا ابھی نہیں آئی۔
جرنلسٹ: یہ لڑکی کیسے اُڑی جا رہی ہے۔
اوپر ہی اوپر
ایک تجربہ تھا یہ دیکھنے کے لیے
کہ جب کسی کے پَر لگا دیے جائیں
تو کوئی کتنا اونچا اُڑ سکتا ہے۔
چاہے یہ پر مانگے کے ہی کیوں نہ ہوں۔
اور پھر اوپر اڑ کر آیا آپ کو یہ بھی تو بتا سکتا ہے
کہ اتنا اوپر اُڑ کر کسی کو کیسا لگتا ہے
دور بہت دور
اوپر ہوا کس طرح کی ہے،

دور بہت دور
اوپر دھوپ کیسی ہے۔
خاص کر ان کے لیے
جو خود کبھی اُڑے نہ ہوں
میں جیسے مرد ذات سے ساری عمر ایک خوف
آتا رہا ہے۔
اڑان بھرنے کے نام پر میرا دل بیٹھ بیٹھ جاتا رہا
ہے،
جرنلسٹ: میں بھی کن خیالوں میں کھو گئی ہوں۔
مجھے اپنا ڈسپیچ ختم کرنا ہے۔
برف اب تیز ہو رہی ہے شاید
نہیں برف انتظار کر رہی ہے۔
جیسے منزل پر پہنچنا ہے وہ پہنچ جائے
کئی راہ تلوار کی دھار سے بھی تیکھے ہوتے ہیں
گاندھی کا راستہ اس طرح کا تھا
مجھے بھی کیا سوجھی!
موتیا کی دادی نے ساری عمر ہماری خدمت
کی ہے۔
بیچاری کے ماں باپ
ابھی یہ گودی میں ہی تھی کہ گذر گئے۔
اور تائی جوالی نے اسے پالا
جونک سی ہوتی تھی
اور اب کیسی نکلی ہے
اُس کا قد، اُس کا بُت، اُس کا رنگ، اس
کی چال
اور اس کے بال ——
الجھے ہوں تب بھی سندر
سنورے ہوں تب بھی سندر
کھلے ہوں تب بھی سُندر
گندے ہوں تب بھی سُندر

لمبے۔ گھنے۔ اور کالے——
جرنلسٹ: میں موتیا کے بارے میں سوچتی رہوں گی۔
اور میرا ڈسپیچ کبھی ختم نہ ہوگا
عجیب سا نجھ پیدا کر لی ہے
میں نے بھی اس لڑکی کے ساتھ
پر آج اتنی دیر کیوں کر رہی ہے یہ؟
آخر کیسے گذار دیتے ہیں یہ ساری ساری شام
لڑکا لڑکی کی زبان نہیں سمجھتا
لڑکی لڑکے کی زبان نہیں سمجھتی
کسی تیسرے کو درمیان میں رکھ کر یہ تو
نہیں کہا جا سکتا ہے۔
مجھے تیرے دانت موتیوں کے دانوں جیسے
لگتے ہیں۔
آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی کیسے کہہ سکتا
ہے
تیرے بالوں کی سیاہ کالی رات میں
میں اپنا راستہ بھٹک گیا ہوں
جرنلسٹ: لیکن، موتیا اگر بول بھی سکتی
تو کون سے اس نے ہونٹ ہلانے تھے
اس لڑکی کے تو منہ میں جیسے زبان نہ ہو۔
چپ چاپ معصوم فاختہ جیسی
اُس دن اس کی چوٹی اس سے سنبھل نہیں
رہی تھی۔
اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے
ہوا تیز تھی
اِدھر سے بالوں کو سنبھالتی، اُدھر سے الجھ جاتے
اُدھر سے قابو کرتی، اِدھر الجھ پڑتے
جرنلسٹ: شاید کوئی آ رہا ہے
رات کے اندھیرے میں
جل رہے سگریٹ کی ایک چ[illegible]

کوئی بیرا ہوگا۔
کیسے کش پر کش لگا رہا ہے۔
بیرا ہے۔
نٹ کھٹ نوجوان بہاڑیا
نہیں!
یہ تو کوئی لڑکی ہے۔
مجھے ڈھونڈتی آئی ہوگی
شاید کوئی جرنلسٹ ہے۔
پر اس وقت؟
نہیں نہیں یہ تو موتیا ہے۔
موتیا کیسے ہوسکتی ہے؟
شلوار قمیض تو اس کی ہے۔
موتیا ہے۔
کٹے ہوئے بال!
سگریٹ پی رہی ہے!
لڑکھڑا رہے قدم!
موتیا ہے۔
شراب میں بدمست!
چپہ چپہ بال!
ہونٹوں میں سگریٹ لٹکائے ــــ
(موتیا کمرے میں آئی ہے)

جرنلسٹ: موتیا!
تیرے گزگز لمبے بال کہاں ہیں؟
(موتیا چپ ہے)
موتیا!
تم نے یہ سگریٹ کب سے پینا شروع کیا ہے؟
(موتیا چپ ہے)
موتیا!
تیرے منھ میں سے یہ بدبو کیسی آرہی ہے؟
(موتیا چپ ہے)

حامدی کاشمیری

غزل

نمو یاب اب کوئی خواہش نہ ہوگی
زمینوں پر کہیں بارش نہ ہوگی

چھپا لو روح میں ان تتلیوں کو
اب ان کرنوں کی پیدائش نہ ہوگی

پگھل جائیں گے سب کے استخواں تک
سلگتی آگ میں تابش نہ ہوگی

نوا سے میری گونجیں گے کہستاں
لبِ خاموش میں لرزش نہ ہوگی

بڑھے گی جس قدر ساحل سے دوری
ہوا و موج کی یورش نہ ہوگی

موتیا!
تم بولتی کیوں نہیں! تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟
سمجھے۔
(جرنلسٹ چپ ہے۔ موتیا چپ ہے۔ ایک ــــ طرف رکھے ریڈیو سے آواز آتی ہے)
یہ آل انڈیا ریڈیو ہے
ماسکو سے ابھی ابھی سماچار ملا ہے کہ لائیکا مر گئی۔
سپوتنک میں بیٹھی، آکاش بہا ڑ رہی
لائیکا مر چکی ہے
سماچار سماپت ہوئے۔

●●

ڈاکٹر نریش

بشن داس کے تبادلے

بشن داس ولد بھولا ناتھ کی بدولت گاؤں والوں کو دو بار مفت کا گڑ کھانے کو ملا تھا۔ پہلی بار تب' جب وہ پانچ بہنوں کے بعد پیدا ہوا۔ اور دوسری بار تب' جب اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ گڑ بانٹتے ہوئے اس کی والدہ نے اس کے لیے سینکڑوں دعائیں جمع کی تھیں۔ لاکھوں پر قلم ہو تیرے بیٹے کا، راج گدی پر بیٹھے ری تیرا لشنا، کیسر کی بارش ہو رہی تیرے بیٹے کے سر پر' راج بھاگ ملے تیرے بیٹے کو وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان میں کوئی ایک دعا بھی قبول نہ ہوئی تھی اور بیچارے بشن داس کے سر پر کیسر کے بجائے بے روزگاری کی خاک برستی رہی تھی۔ دکھی ہو کر غریب نے ٹائپ سیکھ لیا اور رضا رب الاسباب کی' یہی ٹائپ کی مشین اس کے روزگار کا وسیلہ بنی۔

گذشتہ تیس برس سے بیچارہ بشن داس ٹائپسٹ ہے۔ لوہا کوٹ کر روٹی کمانا غریب کی قسمت میں لکھا ہوا تھا اور اس نے بالآخر مقدر کے اس فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ خداوند اقدس نے روزی روٹی کے لیے بشن داس کی فریاد سنی تو دست غیب سے اس کے لیے ملازمت کا انتظام کر دیا۔ وہ ایک بہت بڑی سرکاری لائبریری میں ملازم ہو گیا۔ لائبریرین کے پرسنل اسٹاف میں اسے میز کرسی اور لوہا کوٹنے کی مشین مل گئی اور وہ وہاں بیٹھ کر دن بھر انگلیاں چلانے لگا۔

ملازمت شروع ہوئے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک دن اچانک اس کا تبادلہ ہو گیا۔ تبادلے کا یہ منحوس بادل اچانک ہی اس کے سر پر گھر آیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ لائبریرین صاحب کا پی۔ اے۔ چھٹی پر تھا اور انھوں نے ایک ضروری خط لکھوانے کے لیے بشن داس کو طلب کر لیا۔ لائبریرین اپنی عادت سے مجبور فر فر انگریزی بولنے لگا اور بیچارے بشن داس کا قلم اس کی زبان کا ہمسر نہ ہو سکا۔ کچھوے اور خرگوش کی دوڑ تھی اور خرگوش جیت رہا تھا۔ پانچ سات جملے بول کر لائبریرین کو اپنی بات

کا سلسلہ ٹوٹتا ہوا دکھائی دیا تو انھوں نے پوچھا۔

"کیا لکھا ہے؟"

"جی، ڈیر مسٹر سندرم۔" اس نے انکساری سے جواب دیا۔

"کیا؟ تم کر کیا رہے ہو؟ شارٹ ہینڈ میں نہیں لکھ رہے ہو کیا؟"

"جی لکھتا ہوں۔"

کہہ کر اس نے میز پر رکھی ہوئی کاپی اپنی چھاتی کے قریب کرلی اور اپنی کہنی پیٹ کے اندر گھسالی۔

لائبریرین صاحب سمجھ گئے کہ لشن داس کو شارٹ ہینڈ تو کجا، شارٹ ہینڈ کے معنی تک معلوم نہیں ہیں غصے سے بولے

"چلے آتے ہیں منھ اٹھا کر ... مرو اب، لانگ ہینڈ ہی میں لکھو۔"

بغیر کوئی جواب دیئے لشن داس نے یتیمانہ انداز سے صاحب کی طرف دیکھا اور کاپی کو میز پر آگے کی طرف سرکا کر اپنا بازو لمبا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صاحب نے اسے وہ خط ڈکٹیٹ نہ کرایا اور اس کے تبادلے کا کاغذ ٹائپ ہو گیا۔

اس تبادلے سے لشن داس کچھ ایسا پریشان نہیں ہوا چونکہ نہ اس کے کام کی نوعیت ہی تبدیل ہوئی تھی۔ نہ ماحول ہی تبدیل ہوا تھا۔ صرف مقام ہی بدلا تھا۔ اب وہ ایک دوسری لائبریری میں تھا جو پہلے والی سے بھی زیادہ بڑی تھی۔ یہاں کے لائبریرین نے ایک روز اسے ایک خط ٹائپ کرنے کے لیے دیا۔ خط سرکاری تھا اور لائبریرین صاحب نے شارٹ ہینڈ یا لانگ ہینڈ کے چکر میں نہ پڑ کر پورا خط اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا۔ لشن داس صرف ٹائپ کرنے تک کا ہی گناہگار تھا۔ خط مقامی ٹریننگ کالج کے پرنسپل کے نام تھا جس نے امتحانات کے سلسلے میں بیس "لانگ ٹیبل" منگوائے تھے۔ اس خط کے جواب میں لائبریرین نے لکھا تھا کہ "اول تو یہ کہ ہماری لائبریری میں صرف پانچ لانگ ٹیبلز ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کو اٹھانے سے ہم اخبار رسالے کس پر رکھیں گے۔ اس لیے ہمارے طلبا کو بڑی دقت ہوگی۔ لہٰذا آپ ہم سے بیس "شارٹ ٹیبلز" منگا لیجیے۔"

خط کو پڑھتے ہی پرنسپل کا خون کھول اٹھا تھا۔ اس نے لائبریرین کا خط، زوردار شکایتی خط کے ساتھ محکمہ تعلیم کے کمشنر کو بھجوا دیا۔ کمشنر نے لائبریرین سے ایکسپلینیشن مانگا تو نزلہ گرا بیچارے لشن داس پر اور اس کا تبادلہ بطور سزا، کر دیا گیا۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ لائبریرین کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط اس کی تحویل میں تھا ورنہ ممکن ہے اس کا تبادلہ اپنے گاؤں کا ہی ہو گیا ہوتا۔

نئے دفتر میں نئے صاحب نے اسے جو سیٹ دی، اس کا تعلق پرنٹنگ سے تھا۔ اور اس پر حکم یہ کہ صاحب سے پوچھے بغیر پتّا تک نہ ہلے۔ بیچارہ لشن داس اب دن بھر ایک پرنٹنگ پریس سے دوسری پرنٹنگ پریس میں دھکے کھانے لگا۔ ایک روز بہت ارجنٹ کاغذ چھپ رہے تھے اور صاحب نے اسے بُلا کر پوچھا۔

"لشن داس، میٹر کب تک چھپ جائے گا؟"

"سر، پریس والوں نے "گیلی پروف" بھجوائے تھے۔ وہ میں پڑھ چکا ہوں۔ اب فائنل پروف آئے ہیں، وہ پڑھ رہا ہوں۔"

"تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا؟" صاحب غرایا۔

"سرکار پرنٹنگ پر پیسہ خرچ کرتی ہے۔ پریس والوں کی کیا مجال کہ "گیلے پروف" بھیجیں۔ ان کو میری طرف سے وارن کر دو کہ آئندہ سوکھے پروف بھیجیں۔ اب جو وہ گیلے پروف بھیجیں تو مجھ سے کہنا، میں انھیں بلیک لسٹ کر دوں گا۔ گیلے پروفوں پر غلطیاں کس قلم سے لگیں گی؟"

غزل

مظفر حنفی

آلامِ روزگار سے فرصت نہیں ملی
آئینے سے بھی ہم کو محبت نہیں ملی

مسرور ہوں بساطِ تمنّا لپیٹ کر
اچھّا ہوا خلوص کی قیمت نہیں ملی

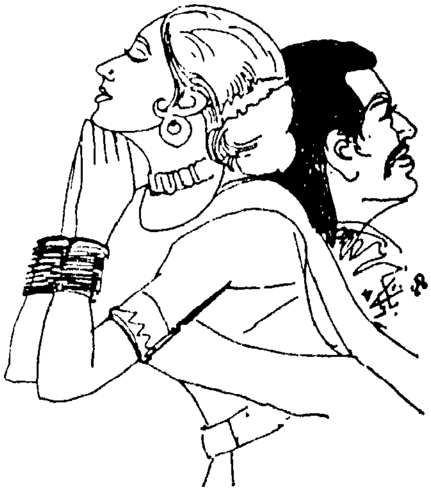
جب سے خلا نورد ہوئے، سرد ہے بدن
اِک سانس بھر کہیں سے حرارت نہیں ملی

کیا ظلم ہے کہ میرا رجز پڑھ گئے عدو
مجھ کو مدافعت کی اجازت نہیں ملی

وہ گاؤں تھا کہ ہاتھ سے جاتی رہی زمیں
یہ شہر ہے کہ سر کے لیے چھت نہیں ملی

کاوش تو خوب کی ہے مظفر کے رنگ میں
لیکن ہمارے شعر کو شہرت نہیں ملی
شیر

(شیر/شعر بطور تجربہ)



بشن داس کے پچھلے تجربات تلخ تھے اس لیے وہ 'یس سر' کہہ کر باہر نکل آیا۔

اگلے روز پھر طلبی ہوئی۔ پھر وہی سوال پوچھا گیا۔

اس نے کہا۔

"سر کمپوزنگ ہو چکی ہے، پروف پڑھ کر غلطیاں بھی لگوا چکا ہوں لیکن پریس والے کہتے ہیں کہ میں نے جو ڈیزائن ان کو دیا ہے اس کا 'ہاف ٹون' بلاک نہیں بن سکتا۔"

"گدھے ہیں پریس والے۔ ان کو ذرا بھی عقل نہیں ہے۔ اب میں ہی ہر بات کو دیکھتا رہوں گا؟ فوراً جاؤ اور ان احمقوں سے کہو کہ اگر ہاف ٹون نہیں بنتا تو "فُل ٹون" بنوا لیں۔ کل کام آج شام تک مکمل ہو جانا چاہیے۔"

اور چونکہ اس بار بشن داس نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی غلطی کا خمیازہ نہیں بھگتے گا، اس لیے وہ 'یس سر' کہہ کر صاحب کے کمرے سے نکلا اور سائیکل اٹھا کر پریس والوں کو صاحب کا آرڈر سنانے چل دیا۔ صاحب کے ہر حکم کو حرفِ آخر سمجھنے کا اس کا فیصلہ اسے راستے بھر اطمینان دلاتا رہا کہ اب اس کا تبادلہ نہیں ہوگا۔

ابراہیم یوسف

قصۂ گل بکاؤلی اور اُردو ڈراما

گل بکاؤلی کا قصہ اردو میں ایک مقبول داستان ہے جس کو سب سے پہلے عزت اللہ بنگالی نے ۱۱۳۴ھ میں فارسی میں لکھا تھا پھر ۱۲۱۷ھ میں نہال چند لاہوری نے اردو میں ترجمہ کیا اور مذہبِ عشق نام رکھا۔ اس داستان کا فرانسیسی اور انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ ہندوستانی زبانوں میں ہندی، بنگالی، پنجابی اور پشتو میں بھی یہ داستان ترجمہ کی گئی۔ اردو میں متعدد ڈرامے اور مثنویاں لکھی گئیں ان میں مثنوی گلزار نسیم کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

گل بکاؤلی کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ یہ آنکھوں کے جملہ امراض کے لیے مفید ہے بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس کے لگانے سے کھوئی ہوئی بصارت تک واپس آجاتی ہے — اس پھول کے بارے میں محمود نیازی "تلمیحات" میں لکھتے ہیں کہ "اس پھول کا نام ہلدنہ بتایا جاتا ہے۔ یہ ہلدی کے مانند زرد اور خوشبودار ہوتا ہے۔" لیکن حیات اللہ انصاری صاحب اپنے مضمون" اصلی گل بکاؤلی"[1] میں لکھتے ہیں کہ "میں اس وقت گل بکاؤلی کو دیکھ رہا ہوں جسے میں خود پیڑ سے توڑ کر لایا ہوں .... یہ گل بکاؤلی تخیل کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ سچا پھول ہے جو سائز میں موگرے کے پھول کے برابر ہے۔ اس کی پتّیاں گول ہیں لیکن بیچ بیچ میں چند نوکیلی پتیاں بھی ہیں۔ سب پتّیاں موگرے کے پھول کی پتیوں سے پتلی ہیں۔ پھول سفید ہے لیکن بیچ میں ذرا سا زعفرانی پن بھی ہے۔" یہی وہ پھول ہے جس کی بُنیاد پر سارا قصہ گل بکاؤلی وجود میں آیا ہے۔

اس پھول کے بارے میں ایک دلچسپ روایت بیان کی جاتی ہے جس کو جناب محمد یعقوب لکھنوی نے "گلدستہ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی" میں سید محمد اسمٰعیل نے

---

[1] ماہنامہ "آجکل" دہلی۔ نومبر ۱۹۸۶ء : ص ۱۰

"تاریخ طلسم بکاؤلی"[1] میں، مولوی سید احمد دہلوی نے "فرہنگ آصفیہ" میں محمود نیازی نے "تلمیحات" میں گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون "قصہ گل بکاؤلی"[2] میں بیان کیا ہے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے "گلدستہ حیرت معروف بہ تاریخ بکاؤلی" میں دیے گئے قصہ کو اپنے ایک مضمون میں اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ یہ مضمون ہماری زبان علی گڑھ یکم اپریل ۱۹۶۰ء کے شمارے میں چھپا ہے جس کا کچھ حصہ جناب عنایت اللہ انصاری نے اپنے مضمون "اصلی گل بکاؤلی" میں نقل فرمایا ہے۔ ان تمام بیانات سے جو قصہ ابھر کر سامنے آیا ہے وہ اس طرح ہے:

راجہ کرن جو جٹ کے دو لڑکے تھے۔ شاستر جوگ اور راج بھوج۔ کرن جوٹ نے اپنی سلطنت دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ راج بھوج کو جو علاقہ ملا اس میں گھنے جنگلات تھے جن کے درمیان ایک وسیع تالاب تھا۔ اس تالاب کے بیچ میں اس نے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ یہاں راج بھوج کے یہاں ایک بہت حسین و جمیل لڑکی پیدا ہوئی جس کو پھولوں سے بہت پیار تھا۔ اس کے باغ میں صدہا قسم کے پھول تھے۔ ایک جوگی اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گیا اس نے راج کماری سے کہا کہ اگر وہ تمام عمر شادی نہ کرنے کا وعدہ کرے تو وہ ایک ایسا پودا لا کر دے سکتا ہے جو خوبصورتی اور خوشبو میں لاثانی ہے۔ یہ پودا ایک جادوگر کے باغ میں لگا ہے۔ راجکماری نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی مرضی سے شادی نہیں کرے گی۔ جوگی نے وہ پودا لا کر اس کے باغ میں لگا دیا جب راجکماری جوان ہوئی اور اس کے حسن کے چرچے ہوئے تو اس کے پیغام آنے لگے اور راج بھوج نے اس کی شادی طے کر دی۔ بارات دھوم دھام سے آئی۔ جب جوگی کو اس کا علم ہوا تو اس نے راجکماری کو بد دعا دی۔ راجکماری جو ایک حوض میں نہا رہی تھی، پانی بن کر بہہ گئی۔ اس کے ساتھ جوگی بھی پانی بن کر بہہ گیا[3]۔

---

[1] تاریخ بکاؤلی کے نام سے اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھوپال کی مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں موجود ہے۔ تمہید میں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ کتاب پہلی مرتبہ "تاریخ طلسم بکاؤلی" کے نام سے مطبع گلزار محمدی میں چھپی، دوسری مرتبہ سٹیم پریس لاہور سے "سیر بکاؤلی" کے نام سے، تیسری مرتبہ عزیزی پریس آگرہ سے "تحقیقات طلسم بکاؤلی" کے نام سے اور اب چوتھی مرتبہ "تاریخ طلسم بکاؤلی" کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔ قلمی نسخہ کے سرورق پر صرف تاریخ بکاؤلی لکھا ہے۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ ہر ایڈیشن میں ضروری اضافے کیے گئے ہیں۔

[2] ماہنامہ "آجکل" دہلی۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء

[3] سید محمد اسمٰعیل نے "تاریخ طلسم بکاؤلی" میں ایک اور روایت بیان کی ہے۔ جو اس علاقہ میں مشہور ہے کہ سون بھدر کالو رولیس کا راجا تھا اور ایک بڑا جادوگر تھا اور ہزاروں جادوگر اس کے ماتحت تھے۔ وہ بکاؤلی پر عاشق ہو گیا اور جادوگروں کے ذریعہ راجہ سیکل جوگ کو شادی کا پیغام بھیجا جو راجا نے منظور کر لیا اور بکاؤلی کی شادی... سون بھدر سے ہو گئی۔ بکاؤلی بید عبادت گذار تھی اور دن رات عبادت میں مصروف رہتی تھی۔ سون بھدر کا تعلق بکاؤلی کی ایک خدمتگار جھیلا سے ہو گیا۔ بکاؤلی کو جب پتہ چلا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اور جب جھیلا اور سون بھدر ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے تو بکاؤلی نے غصہ میں ایک لات جھیلا کو ماری اور وہ پانی بن کر ایک نالے کی شکل میں بہنے لگی جو جھیلا نالا کہلاتا ہے۔ سون بھدر نے بھاگنا چاہا مگر بکاؤلی نے ایک لات اسے بھی رسید کر دی اور وہ بھی پانی بن کر سون ندی کی شکل میں بہنے لگا۔ جب بکاؤلی کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو اسے بہت افسوس ہوا اور اس نے دعا کی

اس روایت کو سب نے ہی تقریباً اسی طرح لکھا ہے۔ جناب مسعود حسن رضوی نے جو اقتباس دیا ہے۔ اس میں جوگی کا نام سوہن سچھورا درج ہے۔ گوپی چند نارنگ نے سوہن بھدر لکھا ہے۔ سید محمد اسمٰعیل نے "تاریخ طلسم بکاؤلی" میں سوہن بھدر لکھا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے "اردو مثنوی شمالی ہند میں" میں سوہن بھدر لکھا ہے۔ بکاؤلی کے باپ کا نام سب نے راج بھوج لکھا ہے لیکن سید محمد اسمٰعیل "تاریخ طلسم بکاؤلی" میں لکھتے ہیں کہ "کرن جوت کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام شاستر جوگ اور دوسرے کا نام سیکل جوگ تھا۔ بعض سیکل جوگ کو راج بھوج بھی کہتے ہیں۔ یہ ان کی غلطی ہے"۔ مسعود حسن رضوی صاحب نے راجکماری کا کوئی نام نہیں لکھا بلکہ لکھا ہے کہ "بعد میں بکاؤلی کے نام سے موسوم ہوئی"۔ جناب گوپی چند نارنگ نے بھی کوئی نام نہیں لکھا۔ فرماتے ہیں کہ "پھول کی رعایت سے راجکماری بھی بکاؤلی کے نام سے پکاری جانے لگی"۔ محمود نیازی لکھتے ہیں کہ راجکماری کا "اصلی نام نربدال تھا کیونکہ یہ پائل پیدا ہوئی تھی چونکہ دریائے نربدا بھی الٹا بہتا ہے اس لیے اسی دریا کے نام پر اس کا نام رکھا گیا لیکن وہ مشہور بکاؤلی کے نام سے ہوئی۔ صاحب فرہنگ آصفیہ بھی راجکماری کا نام نربدال بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جوگی نے بد دعا دی تھی کہ بکاؤلی پانی ہو کر بہہ جائے۔ اسی روز سے یہ پانی ایک دریا کی شکل میں بہہ رہا ہے اور راجکماری کے نام کی وجہ سے دریائے نربدا کہلاتا ہے لیکن گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ "دیوا پران میں اسے شوجی کی جٹاؤں سے نکلتے ہوئے بتایا گیا ہے"۔ پروفیسر گیان چند جین اپنے ایک مراسلے مطبوعہ ماہنامہ "آجکل" دہلی بابت ماہ فروری ۸۷ء میں لکھتے ہیں "...۔ سید محمد اسمٰعیل باشندۂ بھوپال کی تاریخ طلسم بکاؤلی ہے۔ اس میں بکاؤلی کے نام کی وجہ تسمیہ دی ہے۔ ایک روز نربدال عرف ماہیب٭ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی ماں نے کہا "یہ تو بک اولی معلوم ہوتی ہے"۔ سنسکرت میں بک کے معنی ہیں بگلا اور اولی کے معنی ہیں قطار۔ اسی دن سے نربدال کو بکاؤلی ہی کہنے لگے"۔

جس طرح گل بکاؤلی اور نربدال کے بارے میں بہت سی روایتیں مشہور ہیں اسی طرح راجہ بھوج کے بنوائے ہوئے قلعے کے بارے میں بھی روایتیں مشہور ہیں محمود نیازی "تلمیحات" میں قلعہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "نسیم نے جو قصہ نظم کیا ہے اس کے کردار تو ضرور فرضی ہیں لیکن واقعہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ بکاؤلی کا باغ اور قلعہ بہت دنوں تک موجود رہا۔ اب بھی اس کے آثار امر کنٹک

کہ وہ بھی پانی ہو کر بہہ جائے۔ چنانچہ وہ نربدا کی شکل میں بہنے لگی۔ ان دونوں روایتوں میں پہلی ہی زیادہ معروف اور مقبول ہے۔

٭ تاریخ طلسم بکاؤلی میں ماہیب نام کی بھی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے کہ "علم نجوم میں آٹھواں مہینہ زحل کا ہے اور از بس منحوس اور سیاہ رنگ کا ہے۔ اس واسطے آٹھویں مہینہ کا مولد زندہ نہیں رہتا اور طب کی رو سے بھی آٹھویں مہینے کا مولود کہ اس میں پوری طرح قوت تولید پیدا نہیں ہوتی۔ زندہ نہیں رہتا۔ انھیں وجوہات سے اس بچی کے زندہ رہنے کی امید نہ تھی۔ علاوہ اس کے یہ لڑکی پایل پیدا ہوئی تھی مگر لڑکی بہ افضال الٰہی زندہ رہی۔ اس واسطے راجہ سیکل جوگ نے اس لڑکی کا نام ماہیب رکھا۔ اس وقت کی زبان میں ماہیب امانت خدا کو کہتے تھے"۔

کے جنگلوں میں موجود ہیں۔ یہ جنگل ناگپور کمشنری کے ضلع منڈلا کی تحصیل رام گڈھ میں ہیں (یہ علاقہ اب مدھیہ پردیش میں ہے) اس کے وسط میں ایک دلدل ہے اور دلدل کے بیچ میں بکاؤلی کا قلعہ ہے جو بارہ کوس سے نظر آتا ہے۔ وہاں رات وہاں سے اس طرح دھواں اٹھتا رہتا ہے جیسے آگ لگ گئی ہو۔۔۔

۱۲۶۶ھ میں ناگ پور کے چیف کمشنر (مسٹر ٹمپل) نے وہاں پہنچنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں محکمہ جنگلات کے داروغہ قدرت علی نے اس جنگل کا نقشہ مع بکاؤلی کے باغ، حوض، قلعہ اور دوسری عمارتوں کے تیار کیا تھا۔ یہ نقشہ "گلدستہ حیرت" نامی کتاب میں موجود ہے۔" پروفیسر مسعود حسن رضوی نے گلدستہ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی" کا جو خلاصہ دیا ہے اس سے بھی چیف کمشنر مسٹر ٹمپل کی مہم کی تصدیق ہوتی ہے اور اس میں داروغہ قدرت علی کا بنایا ہوا نقشہ بھی موجود ہے جسے جناب حیات اللہ انصاری نے اپنے مضمون کے ساتھ شائع فرمادیا ہے۔ جناب گوپی چند نارنگ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ" حال ہی میں محمد عبداللہ قریشی نے گل بکاؤلی کی تاریخی اصلیت کے بارے میں ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یہ قصہ ایک سچے واقعہ پر مبنی ہے۔

پچاس برس پہلے ایک طلسم بکاؤلی ایکسپلورنگ ایسوسی ایشن قائم کی گئی تھی۔ اس نے بڑی چھان بین کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ یہ محض فرضی نہیں ہے۔ قلعہ بکاؤلی ہوشنگ آباد اور امرکنٹک کے علاقہ میں تھا۔ یہ علاقہ اس وقت کوسوں لمبی اور گہری دلدل میں گھرا ہوا ہے بکاؤلی کے تالاب، مندر اور فوارہ شکستہ حالت میں پائے گئے ہیں۔ اس علاقہ میں ایک بوسیدہ عمارت لکھا پتریا کا محل کہلاتی ہے۔ غالباً یہ دلبر بیسوا کا مکان تھا جہاں اس نے چاروں شہزادوں کو مات دی تھی۔"

طلسم بکاؤلی ایکسپلورنگ ایسوسی ایشن ۱۹۱۰ء کے آس پاس قائم ہوئی تھی۔ سید محمد اسمٰعیل نے بھی علاقہ کا دورہ کرنے کے بعد ۱۹۱۱ء کے آس پاس ہی تاریخ طلسم بکاؤلی لکھی ہے۔ جناب حیات اللہ انصاری نے اس نقشے کو سنی سنائی باتوں پر تیار کیا ہوا بتلاتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۶ء میں دو مرتبہ اس علاقہ کا دورہ کیا تاکہ وہ قصہ کی صحیح نوعیت معلوم کرسکیں۔ انھوں نے امرکنٹک سے نکلنے والے دریاؤں کو اور وہاں بنے قدیم منادر کو دیکھا لیکن انھیں دلدل کہیں نظر نہ آئی بلکہ ان کے نزدیک یہاں کی مٹی کی جو ساخت ہے اس میں دلدل کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ جناب حیات اللہ انصاری صاحب نے جس زمانہ میں اس علاقہ کا دورہ کیا تھا اس سے سو سال پہلے یہ نقشہ تیار کیا گیا تھا۔ ان سو سالوں میں ان

ل پتریا کے محل کے بارے میں سید محمد اسمٰعیل صاحب نے تاریخ طلسم بکاؤلی میں لکھا ہے کہ" یہ قصبہ (رام گڑھ) باغ و حوض بکاؤلی و دلدل کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں ملتا ہے۔ اس قصبہ کے قریب ایک بہت عالیشان محل ہے جس کی چھتیں لداؤ کی ہیں اور عمارت پتھر و چونہ گچھ کی ہے اور عمارت کچھ ایسی بھونڈی ہے کہ دیکھنے سے دل بستگی نہیں ہوتی۔ اس محل کے صدہا کمرے ٹوٹے پھوٹے ایسے ویران پڑے ہیں کہ ان میں تناور درخت پیدا ہوگئے ہیں بعض کمرے جو سالم ہیں ان میں کچہری تحصیل کی ہوتی ہے۔ بعض میں اہلکارانِ تحصیل مقیم ہیں اور بعض کمروں کو درست و مرمت کراکے ڈاک بنگلہ قائم کیا ہے جن میں باغ بکاؤلی کے لیے جانے والے یوروپین مسافر فروکش ہوتے ہیں۔"

نشانات کا مٹ جانا عین ممکن ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک حکومتِ مدھیہ پردیش امرکنٹک کے علاقہ میں کام کرنے والے اپنے ملازمین کو BAD CLIMATE ALLOWANCE دیا کرتی تھی اور یہاں کی خراب آب وہوا اسی دلدل کے باعث ہے۔ اس دلدل کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس کو سحر زدہ کر دیا گیا ہے تاکہ دشمن قلعہ تک نہ پہنچ سکے یہ بات مشہور ہے کہ قلعہ کے ریاضی دانوں، انجینیروں اور نجومیوں نے ساحروں اور دیوتاؤں کی مدد سے اسے تعمیر کیا تھا۔ جناب حیات اللہ انصاری نے وہ پھول حاصل کر لیا تھا جس پر سارے قصّہ کی بنیاد ہے اور جو آج بھی آنکھوں کے علاج میں کام آتا ہے۔ وہ تاج الملوک اور پری بکاؤلی کے قصّہ کو تو قبول نہیں کرتے مگر اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ ممکن ہے کسی راجا کی آنکھیں خراب ہو گئی ہوں اور اس کا کوئی بیٹا اس پھول کی تلاش میں گیا ہو، ناقابلِ عبور جنگلات کو پار کیا ہو اور ہزاروں مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد پھول حاصل کیا ہو اور واپسی میں کسی آدی باسی لڑکی کو بھی ساتھ لے آیا ہو اور اسی واقعہ پر گل بکاؤلی کا سارا قصّہ تعمیر ہوا ہو۔ بہرحال واقعہ کا تعلق کسی آدی باسی سردار کی لڑکی سے ہو یا پری سے، داستان میں کسی نہ کسی حد تک سچائی ضرور موجود ہے۔

گلِ بکاؤلی داستان بہت مشہور ہے۔ "مذہبِ عشق" میں بیان کیے گیے قصّہ کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ زین الملوک کے یہاں جب پانچواں لڑکا پیدا ہوتا ہے تو اس کا نام تاج الملوک رکھا جاتا ہے — نجومی بادشاہ کو آگاہ کرتے ہیں کہ اس شہزادہ پر نظر پڑتے ہی بادشاہ بصارت سے محروم ہو جائے گا۔ تاج الملوک کی الگ پرورش کی جاتی ہے۔ لیکن اتفاقاً ایک روز بادشاہ کی نظر اس پر پڑ جاتی ہے اور وہ بادشاہ اندھا ہو جاتا ہے۔ بادشاہ کے باقی چاروں بیٹے گلِ بکاؤلی کی تلاش میں نکلتے ہیں اور دلبر بیسوا سے چوسر میں سب کچھ ہار کر اس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ تاج الملوک بھی گلِ بکاؤلی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ دلبر بیسوا کو چوسر میں ہرا کر اپنے بھائیوں کو اس کی قید سے چھڑاتا ہے اور حمالہ دیونی[ء] کی مدد سے گل بکاؤلی حاصل کرتا ہے۔ واپسی میں چاروں بھائیوں سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ بزور تاج الملوک سے پھول چھین لیتے ہیں اور اپنے باپ کے سامنے دعویٰ کرتے ہیں کہ پھول انھوں نے ہی حاصل کیا ہے — پھول آنکھوں سے لگایا جاتا ہے اور بادشاہ کی بینائی واپس

[ء] تاریخ طلسم بکاؤلی میں حمالہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "جس روز بکاؤلی پیدا ہوئی اسی روز کنڈا کھڑک کے یہاں بھی لڑکی پیدا ہوئی (کنڈا کھڑک راجہ بھوج کا وزیر، بہت بڑا ساحر اور ریاضی دان تھا) اگرچہ صورت شکل میں وہ بکاؤلی کے ہم پلّہ نہ تھی لیکن مصاحبت کے لائق ضرور تھی۔ کنڈا کھڑک نے اپنی بیٹی کا نام جبالہ رکھا۔ اس وقت کی زبان میں جبالہ چودھویں رات کے چاند کو کہتے تھے — جب سیکل جوگ کو اس نام کی اطلاع ہوئی تو سیکل جوگ کو تو اس بات کا خیال نہ ہوا مگر رانی اس بات کو سن کر متعجب ہوئی کہ راجہ کی بیٹی کا نام تو ماہیب ہو اور راج منتری (وزیر) کی لڑکی کا نام جبالہ ہو۔ کنڈا کھڑ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنی لڑکی کا نام حمالہ رکھ دیا۔ حمالہ بدصورت کو کہتے ہیں — عزت اللہ بنگالی نے قصّہ گلِ بکاؤلی میں دیونی اور اس کے جو واقعات لکھے ہیں وہ بالکل قیاس سے باہر ہیں۔"

آجاتی ہے۔ بکاؤلی کو جب پھول کے غائب ہونے کا علم ہوتا ہے تو وہ چور کی تلاش میں نکلتی ہے اور مردانہ بھیس بدل کر زین الملوک کی وزیر بن جاتی ہے۔ تاج الملوک حمالہ دیونی کی مدد سے گلشن نگارین نام کا شہر آباد کرتا ہے اور زین الملوک کو اپنے محل میں دعوت کرتا ہے۔ یہاں بکاؤلی کو پتہ چل جاتا ہے کہ اصل چور تاج الملوک ہے بکاؤلی اس کی بہادری کی تو قایل تھی ہی اس کا حسن دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ دونوں دادِ عیش دینے لگتے ہیں۔ اس کا پتہ بکاؤلی کی ماں جمیلہ کو چل جاتا ہے۔ وہ بکاؤلی کو قید کروا لیتی ہے اور تاج الملوک کو ایک سحر زدہ جنگل میں پھنکوا دیتی ہے۔ تاج الملوک ہزاروں مصیبتیں جھیل کر سحر زدہ جنگل سے نکلتا ہے اور اسی کے ساتھ بکاؤلی کی چچازاد بہن روح افزا پری کو بھی ایک دیو کے چنگل سے آزاد کراتا ہے اور پھر روح افزا پری کی سفارش پر بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی ہو جاتی ہے اور گلشن نگارین میں آکر رہنے لگتے ہیں۔ بکاؤلی جو اندر لوک کی پری تھی راجہ اندر کے دربار میں ناچنے گانے جایا کرتی تھی۔ ایک دن تاج الملوک بھی جوگی بن کر بکاؤلی کے ساتھ اندر کے دربار میں چلا جاتا ہے۔ اس دن بکاؤلی بہت عمدہ گاتی ناچتی ہے۔ راجہ اندر خوش ہو کر منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ بکاؤلی تاج الملوک کے ساتھ رہنے کی اجازت مانگتی ہے۔ اس پر راجہ اندر بہت ناراض ہو کر اسے آدھی پتھر کی بنا کر ایک مندر میں قید کر دیتا ہے۔ تاج الملوک بکاؤلی کی تلاش میں چتر سین کی حکومت میں جا نکلتا ہے۔ چتر سین کی لڑکی چتراوت اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ تاج الملوک رات کو اس مندر میں جاتا ہے تو وہ اس مندر کو کھدوا ڈالتی ہے۔ مندر کی جگہ پر سرسوں پیدا ہوتی ہے۔ جس کا تیل کھانے پر ایک کسان کی بیوی حاملہ ہوتی ہے اور وقت مقررہ پر ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے جو بکاؤلی ہے۔ بکاؤلی کے جوان ہونے پر اس کی ملاقات تاج الملوک سے ہوتی ہے۔ اور پھر وہ دونوں ساتھ رہنے لگتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر بیتاب علی پوری

میرا ہریانہ

میرے ہریانے کا ہر فرد و بشر بیباک ہے
بچہ بچہ ہے قوی، پھرتیلا ہے، چالاک ہے
اس کی مٹی میں رچی ہے بھینی سی الفت کی بُو
میرے ہریانے کی مٹی نفرتوں سے پاک ہے
پیٹھ دکھلاتے نہیں ہیں نوجواں اور شیر نر
جنگ کے میدان میں ہر نوجواں سفاک ہے
صاف گو ہیں لوگ ہریانہ کے، ہے سب پر عیاں
جو نہ مانے دوستو، منہ میں اسی کے خاک ہے
اے دلِ بیتاب! تو حق بات کہنے سے نہ ڈر
ہند کے صوبوں میں "ہریانہ" مرا اک ناک ہے

نورجہاں صدیقی

تجربہ

میں اپنی بوڑھی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ حیرانی سے پلک جھپک کر مجھے ایک ٹک تکے جا رہا تھا۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں کتاب کے اوراق مجھ پر متبسم تھے۔ عینک کے موٹے شیشوں سے جھانکتی میری آنکھیں غور سے اس کی گردش کرتی ہوئی انگلی کو دیکھ رہی تھیں جس سے وہ لاپرواہی سے میز پر پڑے گلوب کو گھما رہا تھا۔ کھڑکیوں کے دبیز پردے کبھی کبھی ہوا کی تیز سرسراہٹ سے متحرک ہو جاتے۔ شوکیس میں رکھی جاپانی گڑیا نیلی آنکھوں پہ جھکی سنہری گھنی پلکیں جھپکا کر کسی غیر سمعی رائم کے بول گنگنا رہی تھی۔

وال کلاک نے بارہ بجائے۔ میری انگلیاں بے اختیار اس کی سرد انگلیوں سے ٹکرا گئیں۔ مجھے لگا۔ زمین کی گردش رُک گئی ہے۔ اگلا لمحہ، اگلے سال کا پیش خیمہ تھا۔ وہ لمحہ وہی تھا جس میں مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ ایک ایسا فیصلہ جو کسی کی اندھیری دنیا کو روشنی دے سکتا تھا۔ کسی کی بے معنی زندگی میں حسن کے چار چاند لگا سکتا تھا۔ ایک ساعت کے لیے میری نگاہ ایکوریم پر مرکوز ہو گئی، جہاں رنگ برنگی مچھلیاں شیشے کے سمندر میں مقید، بجلی کے کرنٹ کو زندگی جان کر نیم تاریک ماحول کو ٹٹول رہی تھیں۔

اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی دوبارہ گلوب سے کھیلنے لگی تھی۔ زمین آسمان کی دوری اس کی انگلی کے گرد ناچ رہی تھی۔ رنگ بدلتی دنیا اس کی شفاف آنکھوں میں بنا کسی تاثر کے رواں دواں تھی۔ ایک بار پھر مجھے خواہش ہوئی اس کی آنکھوں میں کچھ ٹٹولنے کی۔ میں بے اختیار اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنا چاہتا تھا.... مگر سردی کی ایک تیز لہر نے میرے بڑھتے ہاتھوں کو یخ کر دیا۔ میرے سامنے مخملی صوفے کے ساتھ والی دیوار پر بنی تصویر ان کہے الفاظ سے اپنی کہانی دہرانے لگی جس میں ایک دوشیزہ گھڑے سے کسی شہزادے کو پانی پلا رہی تھی۔ شہزادہ ایک ہاتھ سے اوک بنائے، پانی پینے کے لیے سرنگوں تھا مگر اپنی پر اشتیاق نظروں سے محبت کا پیغام بھی دے رہا تھا۔ گھڑے کا پانی زمین پر گر رہا تھا۔

میرے عمر رسیدہ چہرے کی بوڑھی لکیروں پر ایک خوشنما لہر سی جاگ اٹھی۔

"کس قدر خوبصورت لفظ ہے احساس کی ترجمانی کرنے والا چھوٹا سا لفظ 'محبت'۔ وہ شہزادہ اپنی محبت کا یقین دلا کر اس البیلی کو اپنے دیس لے گیا ہوگا اور بس پھر ایک نئی زندگی نے جنم لیا ہوگا۔ زندگی نے

پھر کسی زندہ کہانی کا رُخ اختیار کیا ہوگا۔ وقت کی پگڈنڈی پر پھوٹتیں عمر کی کچی پکی کونپلیں آج کائنات پر یوں ہی تو محیط ہو گئی ہیں۔"

میری کشادہ پیشانی پر دو سوال اُبھرے —

"کائنات؟" "زندگی؟" ہاں۔ کائنات کی تکمیل کے لیے زندگی ضروری ہے اور زندگی کے لیے کسی کائنات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کسی یاد کو دستک دیتے ہوئے میری نظر کے سامنے ان گنت چہرے چھا گئے۔ زندگی کو صدا دیتے، زندگی کو بلاتے، رومانی منظر میرے سرد خون میں ایک لمحے کے لیے امنگ سی جگا گئے۔ چنبیلی کے ننھے ننھے سفید پھول کسی کے گلابی ہاتھوں میں سجے اور اُن ہاتھوں کو تھامے ایک نوجوان میری یادداشت کو جھنجھوڑ گیا۔

ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرک گیا۔ میں یوں ہی کھڑکی کے پاس آکر پردہ ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ زرد زرد چاندنی رات کی سُرمئی چادر میں قدرت کے حسین ستارے سجا رہی تھی۔ جیسے کوئی سترہ سالہ لڑکی اپنی چُنری میں کروشیے سے بنے پھول ٹانک رہی ہو۔ سردی کی لہر مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں چُبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے سرعت سے کھڑکی کا پردہ گرا دیا اور گاؤن کی بیلٹ کمر کے گرد لپیٹتا اپنی میز پر آکر بیٹھ گیا۔ روم ہیٹر کی گلابی شعاعیں اس کے سفید چہرے پر بھی پڑ رہی تھیں۔ میں نے غور سے اس کی جانب دیکھا۔

"پُرکشش چہرہ ستواں ناک۔ گہری نیلی آنکھیں۔ گلابی اُبھرے ہونٹ۔ سیاہ گھنگھریالے بال۔" وہ یقیناً کسی مصور کا شاہکار لگ رہا تھا۔ کمرے کی نیم تاریک خاموشی میں کسی پُراسرار دنیا سے آیا کوئی دیوتا۔ میرے کانوں میں کہیں دور سے آتی، وقت کی بازگشت سنائی دی۔

"نیلی آنکھیں، سیاہ گھنگریالے بال۔ یہ دونوں خوبیاں اگر ایک شخص میں یکجا ہو جائیں تو وہ شخصیت یقیناً عروجِ جنوں سے آسمان کی قدرت کو للکارے گی۔"

"ہاں! کیوں نہیں! آسمان تو اس کی آنکھوں میں ہوگا اور جنون اس کی سیاہ چھلّے دار زلفوں میں۔" دوسری صدا آئی۔ پھر ایک قہقہہ۔

"تم لوگوں کو ابھی یہ بات ناقابلِ یقین لگے گی۔ مگر ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے، قدرتی حرارت و ماحول دے کر ہم کوئی بھی نسل بنا سکتے ہیں۔" یہ میری آواز تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! کہتے جائیے۔ ہم سُن رہے ہیں۔" کئی ملے جلے قہقہے بازگشت کے بھنور میں گونجے۔

تبھی ایک آواز سے میرے شعور کو بیداری سی مل گئی۔ میرا ہاتھ گلوب کو گھماتا گھماتا انجانے میں پاس ہی رکھی ریک سے ٹکرا گیا تھا۔ ساتھ ہی ایک البم اس کے دوسرے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ میں نے جھک کر وہ البم اٹھا لی۔ اسی البم میں تو میری زندگی ساکت و جامد کھڑی تھی۔ میرے فیصلے کی منتظر۔ یہ تصویریں میری بیٹی کی تھیں — ان تصویروں میں وہ عمر کی مختلف منزلوں پہ ہنس کر، رو کر، دستک دے رہی تھی۔ ان تصویروں میں اس کا ہر انداز تھا۔ خوشی کا، حیرت کا، انتظار کا، خوف کا۔ ہر رُخ سے وہ کسی مصور کا خیال لگ رہی تھی —

آخری تصویر میں وہ ایک خوبصورت دوشیزہ تھی — دُلہن بنی، پھولوں سے لدی، آنے والے، چونکا دینے والے لمحات سے ڈری ڈری، سہمی سہمی۔

اور یہ .....

میرے ہاتھ بے اختیار ریک میں رکھی دوسری البم کی جانب بڑھ گئے۔ یہ بھی ایک بچے کی تصویروں کی البم ہے۔ فرق ہے صرف عمر کی منزلوں کا۔

اس بچے کی عمر کی منزلیں، ٹیسٹ ٹیوب سے لے کر انکیوبیٹر

ـ کیمرے میں مقید ہیں۔ یہی تو وہ مدارج ہیں جنھوں نے مجھے شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے زیرِ تجربہ بچہ کس نوعیت کا ہوگا۔ ضروری نہیں تھا کہ میری خواہش کی طرح اس کی آنکھیں نیلی اور زلفیں سیاہ ہوں۔ دراصل میں مسٹر تھامسن کی عقل و فہم کا دلدادہ تھا۔ دوسری طرف میں مسز تھامسن کے سانولے حُسن سے بھی مرعوب تھا۔ ان دونوں نے سماج سے بغاوت کرکے پیار کی انوکھی مثال قائم کی تھی۔

میرے اصرار پر وہ دونوں میرے تجربے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ان کے لیے میرا تجربہ ان کی زندگی کے سونے پن اور بے انتہا دولت کو وارث عطا کرنے کے لیے ذریعہ اُمّید بن گیا تھا۔ امید کے دھاگے اگرچہ کچے ریشم کی مانند ہوتے ہیں مگر کسی کے لیے چند لمحے ہی سہی، جینے کا آسرا ضرور بن جاتے ہیں۔ وہ دونوں مسلسل دو سال تک میرے زیرِ تجربہ اپنی خوشیوں کا محل تعمیر کرتے رہے۔ یہ ان کی دعاؤں کا اثر تھا یا میری کوشش۔ میرا تجربہ کامیاب رہا تھا۔ INVITRO-FERTILIZATION کے ذریعہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی میری کامیابی کا ضامن بن گیا تھا۔

میرے روبرو بیٹھا نیلی آنکھوں، سیاہ زلفوں والا نوجوان میرا ہی کامیاب تجربہ تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کے ہاتھ میں، میں نے خوشی خوشی اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ دیا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پھولوں سے بہت پیار کرتی ہے، اسے آسمان کی نیلگوں رنگت سے جذباتی محبت ہے اور وہ .... وہ ایک گمنام شاعر سے محبت کرتی ہے — چونکہ میری عملی زندگی، جذبے جیسی لغویات سے پاک تھی۔ اس لیے میں نے دلائل کی لمبی تقریر سے اپنی بیٹی کو خاموش کردیا تھا۔ میری بیٹی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس ایک بار ...... آخری بار .... اس پاگل شاعر سے ملنے کی اجازت طلب کی تھی۔

تب ایسی ہی چاندنی میں .... میں نے اپنی خوابگاہ سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ میری بیٹی کے گلابی ہاتھوں میں سفید سفید چنبیلی کے پھول جگمگا رہے تھے اور وہ شاعرانہ ہاتھوں کو تھامے۔ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ حتیٰ کہ تاروں کی آنکھ مچولی، صبح کی منڈیر پر جاکر سو گئی۔ اسی صبح میں نے کورٹ میں اپنی بیٹی اور اپنے تجربہ کی شادی کی رسم ادا کرادی تھی۔

میری آنکھوں کے گوشوں میں دو قطرے اُبھرے اس وقت کو یاد کرکے جب شادی کے فوراً بعد مسٹر تھامسن ہارٹ اٹیک سے فوت ہوگئے تھے۔ لیکن ان کے بیٹے کو ذرا بھی تاسف نہیں ہوا تھا۔ اس وقت مجھے فخر ہوا تھا اس کے EMOTIONAL DEVELOPMENT پر۔ میرے نزدیک وہ ایک میچور انسان تھا۔ میری بیٹی .... وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔ اپنے احساسات کو آنسوؤں میں مدغم کرنے کا اسے ایک سہارا مل گیا تھا۔ لیکن آج ....! شادی کے سات برس بعد میری بیٹی نے مجھے اپنے بے حس روبوٹ نما انسان سے متعارف کرایا تھا۔ اس کی مختصر تحریر سے میرے خوابیدہ جذبات کے سوتے اُبل پڑے تھے۔

"ڈیڈ.... آپ کا تجربہ .... بہت کامیاب ہے۔ آپ کی عملی دنیا میں۔ مگر آپ کی جذباتی بیٹی کے لیے نہیں۔ یہ بے حس انسان آج تک مجھے 'ماں' نہیں بنا سکا۔ ڈیڈ! خدارا یہ تجربہ میرے لیے بھی دہرائیے۔ اپنی بیٹی کے لیے۔ کیونکہ ... وہ ضرورت بن گیا ہے۔ آپ کی بیٹی کو خوشی دینے کے لیے بس یہی ایک واحد سہارا رہ گیا ہے۔"

☆

خوشتر مکرانوی

غزلیں

ایسے سنار کو دکھا دینا
جسم کو آگ میں سمادینا
اس کے تن میں پرند پلتے ہیں
بوڑھے برگد کو بھی دعا دینا
بونے بچے بڑھیں تری جانب
ٹہنیوں کو ذرا جھکا دینا
تتلیوں کے جسوم خوشتر ہیں
خشک پتے ہرے بنا دینا



سُونے باغوں کی طرف دیکھا کرو
کاغذی پھولوں کو اب بیچا کرو
میٹھے چشموں کو زمینیں پی گئیں
بادلوں کو دھوپ میں ترسا کرو
یہ پھلوں کی شکل شاید دھار لیں
پیڑ پر رنگیں قطن پھینکا کرو
مجھ میں ہیں دریا، سمندر بیکراں
پت جھڑ دا! مجھ سے نہیں الجھا کرو
کتنا خوشتر ہے نظام زندگی؟
موسموں کے روپ سے پوچھا کرو

ایم مبین

کفّارہ

"دیکھیے گوپال پرشاد جی آپ نے مجھ سے پچیس ہزار روپیہ بیٹی کی شادی کے لیے قرض لیا تھا۔"

اندر سے آتی آواز سن کر وہ دروازے میں ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

"جی ہاں۔" یہ اس کے سسر پرشاد جی کی آواز تھی۔

"شادی کو ایک سال ہو گیا۔ آپ نے ابھی تک نہ تو میرا قرض واپس کیا اور نہ ہی سود ادا کیا۔ اصل اور سود ملا کر کل قرض تیس ہزار روپیہ ہو گیا ہے۔ اب آپ یہ مکان میرے ہاتھوں پچاس ہزار روپے میں فروخت کر رہے ہیں اس طرح میری طرف آپ کا بیس ہزار روپیہ نکلتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کو وہ بیس ہزار روپیہ لے لیجیے اور یہ مکان میرے نام کر دیجیے اور ساتھ ہی مکان خالی بھی کر دیجیے۔۔"

"ٹھیک ہے لالہ جی! جیسا آپ کہہ رہے ہیں ویسا ہی ہو گا۔ میں یہ مکان آپ کے نام کر دوں گا اور مکان بھی خالی کر دوں گا۔"

"مکان کی خریداری کے وقت مجھے مکان کا قبضہ چاہیے۔ میں اس وقت یہ بہانہ نہیں سنوں گا کہ لالہ جی ہمیں اسی مکان میں رہنے دیجیے۔ اس مکان سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے۔؟"

"بھگوان نے چاہا تو ایسی کوئی بات نہیں ہو گی لالہ جی۔ میں ابھی سے شہر میں کوئی کرائے کا مکان تلاش کر رہا ہوں۔ ۲۵ تاریخ سے قبل میں اسی مکان میں منتقل ہو جاؤں گا۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں..."

"اچھا لالہ جی..."

لالہ جی کو چھوڑنے کے لیے اس کے سسر گوپال پرشاد جی گھر کے دروازے تک آئے۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ چونک پڑے۔

"ارے منوج بیٹے تم؟"

"ہاں چاچا جی!" اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے بس ابھی چلا آ رہا ہے۔

"تم کب آئے؟"

"بس چلا آ رہا ہوں۔ ایک دورے پر ادھر آیا تھا۔ سوچا آپ لوگوں سے ہی ملتا چلوں...." اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"لالہ جی یہ میرے داماد منوج ہیں۔" گوپال پرشاد جی نے لالہ سے اس کا تعارف کرایا۔

"نمستے۔" اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑے...

"نمستے۔" لالہ نے جواب دیا۔ "آشا کے پتی دیو ــــ اچھا اچھا..."

لالہ تیزی سے باہر چلا گیا۔ وہ اندر آیا تو گوپال پرشاد جی اس سے پوچھنے لگے۔

"آشا کیسی ہے؟ اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟"۔

"آشا بالکل ٹھیک ہے۔ اور بالکل اچانک دورے پہ اس طرف آنا ہوا۔ تو آپ لوگوں سے ملنے کے لیے آ گیا۔ اگر یہ دورہ پہلے سے طے ہوتا تو آشا کو ضرور ساتھ میں لاتا۔"

پھر اس کی سسرال کے تمام افراد جمع ہو گئے اور وہ ان سے باتیں کرنے میں لگ گیا۔ بظاہر وہ ان سے باتیں کر رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں لالہ جی اور گوپال پرشاد جی کی باتیں گونج رہی تھیں۔

"آپ نے اپنی بیٹی کی شادی میں لیے قرض کے ۲۵ ہزار روپے ابھی تک ادا نہیں کیے۔ سود کے ساتھ وہ تیس ہزار روپے ہو گئے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ آپ کہتے ہیں تو پچاس ہزار روپے میں میں یہ مکان خرید لیتا ہوں۔ ۲۵ تاریخ کو خریداری کے وقت میں باقی پیسے آپ کو دے دوں گا۔ لیکن آپ کو یہ مکان خالی کرنا پڑے گا۔"

اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔

تو گوپال پرشاد جی یہ مکان فروخت کر رہے ہیں۔ ۲۵ تاریخ کو انھیں یہ مکان خالی کرنا پڑے گا۔ وہ کرائے کا مکان لے کر کہیں اور رہنے لگیں گے۔ کیا اتنے سارے لوگ کرائے کے چھوٹے سے مکان میں اس طرح رہ سکیں گے جس طرح یہاں رہتے ہیں۔ لیکن گوپال پرشاد جی آخر مکان فروخت کیوں کر رہے ہیں؟ کیونکہ انھیں آشا کی شادی پر لیا گیا قرض چکانا ہے۔ پھر شادی اتنی دھوم دھام سے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ سادگی سے شادی کر دیتے۔ اور ویسے بھی تو شادی میں اتنا خرچ تو نہیں ہوا جس کے لیے قرض لینے کی ضرورت محسوس ہو....

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے جہیز کا سامان گھومنے لگا۔ اسکوٹر، ریفریجریٹر، ٹی وی.. اور بہت سا قیمتی سامان۔ اسی سامان پر ہی کم سے کم تیس ہزار روپے خرچ ہوتے ہوں گے۔

"لیکن میں نے تو جہیز میں اتنا قیمتی سامان نہیں مانگا تھا۔۔۔ گوپال پرشاد جی نے اتنا جہیز کیوں دیا؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ چند گھنٹے ہی سسرال میں رک سکا۔ اس کا زیادہ دیر وہاں رکنے کا ارادہ تھا بھی نہیں۔ اور اس نے گوپال پرشاد جی اور لالہ جی کے درمیان جو گفتگو سنی تھی۔ اس نے اسے اور بھی زیادہ بے چین کر دیا تھا۔ اس کے بعد تو ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس گھر میں رکنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"میں پھر کبھی آشا کے ساتھ آؤں گا تو دو چار دن رک جاؤں گا۔" کہہ کر وہ کسی طرح سسرال والوں سے جان چھڑا کر واپس شہر آ گیا۔

لیکن راستے بھر وہی باتیں اس کے ذہن میں چکراتی رہی۔

یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ شادی میں اچھا جہیز دینے کے لیے گوپال پرشاد جی نے لالہ سے قرض لیا تھا لیکن اس کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انھوں نے آخر اتنا جہیز قرض لے کر کیوں دیا۔ جب کہ اس نے اپنے طور پر تو کسی بھی چیز کی مانگ نہیں کی تھی ۔۔۔ اس کے لیے تو آشا ہی سب سے بڑا جہیز تھی۔ پہلی ہی نظر میں اسے آشا پسند آ گئی تھی اور اسے محسوس ہوا تھا آشا اس کی بہترین شریک حیات ثابت ہو سکتی ہے۔

اور شادی کے بعد آشا نے یہ ثابت بھی کر دکھایا تھا۔ اس نے اسے اتنا پیار دیا تھا کہ اس پیار کو پا کر وہ ساری دنیا کو بھول گیا تھا۔ وہ بھی آشا کو دل و جان سے چاہنے لگا تھا۔ دونوں کی زندگی بڑی خوش و خرم گذر رہی تھی۔

دونوں کے درمیان اتنی اچھی ذہنی ہم آہنگی تھی

کہ کبھی کوئی مسئلہ یا تضاد اٹھ کھڑا۔۔۔ ہوتا تھا تو دونوں اپنی ذہنی ہم آہنگی کا استعمال کر کے اسے دور کر دیتے تھے۔ آشا کی شکل میں اسے جیسے جنت مل گئی تھی۔ اس کو زندگی میں اور چاہیے بھی کیا تھا؟

لیکن آج کی باتوں نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو آشا نے سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"کیا گھر گئے تھے؟"

"ہاں۔" اس نے مردہ لہجے میں جواب دیا۔

"گھر میں سب کیسے ہیں؟" اس کی ہاں سنتے ہی آشا کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا تھا۔

"ٹھیک ہیں۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا تو اس کی بیزاری کو محسوس کر کے آشا چونک پڑی۔

"کیا بات ہے آپ کچھ اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے ہیں؟"

"آں۔" آشا کی بات کا کیا جواب دے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"کیا بات ہے کچھ مجھے بھی تو بتلایئے؟"

"سن کر تمہارے دل کو ٹھیس نہیں لگے گی۔"

"ایسی کون سی بات ہے جس کو سن کر میرے دل کو ٹھیس لگے؟" آشا اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"تمہارے پتا جی اپنا آبائی مکان فروخت کر رہے ہیں۔۔۔"

اس کی بات سن کر آشا کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہیں ابھرا۔۔۔ جیسے اسے اس بات کا پہلے سے علم رہا ہو۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا آشا۔ میں نے تو اپنے طور پر جہیز کے لیے کسی بھی چیز کی مانگ نہیں کی تھی۔ پھر تمہارے پتا جی کو اتنی ساری چیزیں قرض لے کر جہیز میں دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

آشا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کے چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بات اس سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے آشا کی طرف دیکھا۔

"میرے جواب سے آپ کے دل کو ٹھیس لگ سکتی ہے۔"

"بے خوف ہو کر جو کہنا چاہو صاف صاف کہہ دو۔۔۔۔ میں تمہارے منہ سے سچائی سننا چاہتا ہوں۔"

"یہ سچ ہے کہ آپ نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا مجھے جہیز نہیں چاہیے جو کچھ آپ لوگ دیں گے میں اسے قبول کر لوں گا۔ میری طرف سے کسی بھی چیز کی کوئی مانگ نہیں ہے۔ لیکن آپ کے ماتا پتا نے میرے گھر والوں سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔۔۔

"منوج نادان ہے۔ آپ اس کی باتوں میں نہ آئیے۔ ہم جہیز میں اسکوٹر، ریفریجریٹر اور ٹی۔وی چاہتے ہیں۔ اگر آپ لوگ یہ چیزیں جہیز میں دینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ہم یہ رشتہ توڑ دیں گے۔۔۔ منوج سے کوئی بہانہ کر لیں گے۔ اگر آپ لوگ جہیز میں یہ چیزیں دینے کے لیے تیار ہیں تو اچھی بات ہے۔ شادی وقت مقررہ پر ہو جائے گی۔ لیکن خبردار منوج کو اس کی خبر نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نے آپ لوگوں سے جہیز میں یہ چیزیں مانگی ہیں، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ آپ منوج سے یہی کہیں کہ آپ اپنی حیثیت کے مطابق اپنی مرضی سے یہ چیزیں جہیز میں دے رہے ہیں۔"

آپ کے ماں باپ کی رشتہ توڑنے کی دھمکی سے ڈر کر میرے گھر والوں نے طے کیا کہ وہ وہ تمام چیزیں جہیز میں دیں گے جن کی آپ کے ماں باپ مانگ کر رہے ہیں اور آپ کو اس بات کی خبر بھی نہیں ہونے دیں گے کہ یہ آپ کے والدین کی مانگیں ہیں۔ ایسا ہی ظاہر کریں گے کہ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی حیثیت کے مطابق یہ ساری چیزیں دے رہے ہیں۔ اتنی قیمتی چیزیں خریدنے کے لیے پیسے

تو نہیں تھے۔ لیکن جہیز میں اگر یہ سب چیزیں نہیں دی گئیں تو رشتہ ٹوٹ سکتا تھا۔ اس سے مجبوراً پتاجی نے ہمارا آبائی گھر لالہ جی کے پاس رہن رکھ کر پچیس ہزار روپے قرض لیے اور جہیز کی مانگ کی چیزیں جہیز میں دیں۔ اب جو قرض لالہ جی سے لیا گیا تھا اس کی ادائیگی کی تو کوئی صورت نہیں تھی۔ لالہ جی کے تقاضے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ مجبوراً پتاجی اور گھر والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنا آبائی گھر لالہ جی کو فروخت کر کے اس قرض سے نجات حاصل کر لیں گے۔"

آشا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

آشا کی باتیں سُن کر اس کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔

اس نئے انکشاف کو سن کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

اس نے لاکھ کہا کہ وہ جہیز نہیں لینا چاہتا لیکن اس کے گھر والوں نے ۔ ۔ ۔ گوپال پرشاد جی پر دباؤ ڈال کر جہیز حاصل کیا تھا!

اگر وہ ناجائز دباؤ ڈال کر منہ مانگا جہیز نہیں لیتے تو گوپال پرشاد جی کو اپنا گھر رہن رکھ کر قرض لینے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ اور آج ان پر گھر سے بے گھر ہونے کی نوبت نہیں آتی۔

انجانے میں اس کو بتائے بنا اس کے گھر والوں نے جو ایک گناہ کر دیا تھا اس گناہ کے بوجھ تلے وہ خود کو دبا محسوس کر رہا تھا۔ اس گناہ کا احساس اسے کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈس رہا تھا۔

"نہیں آشا نہیں۔" اچانک وہ بڑبڑایا۔ "تمہارے والدین کا آبائی گھر نہیں بکے گا۔ میرے گھر والوں نے جو ایک عظیم گناہ، جہیز لے کر کیا ہے میں اس گناہ کا کفارہ ادا کروں گا۔"

دوسرے دن اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی اسکوٹر، ریفریجریٹر اور ٹی۔وی فروخت کر دیا۔ اس کے بعد جو نقدی تھی بنک سے وہ نکالی۔ کچھ پیسے پھر بھی کم پڑ رہے تھے تو اس نے آشا کے زیور فروخت کر ڈالے۔ اس طرح اس کے پاس کل تیس ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔

وہ ان پیسوں کو لے کر سیدھا سسرال پہنچا اور وہ پیسے اس نے اپنے سسر کے ہاتھ میں رکھ دیے۔

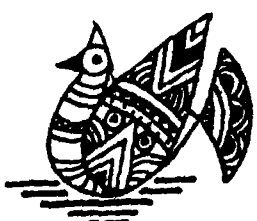
"یہ کیا؟" ان پیسوں کو دیکھ کر گوپال پرشاد جی کانپ اٹھے۔

"لالہ جی کا وہ قرض ادا کر دیجیے جو آپ نے آشا کی شادی میں جہیز دینے کے لیے لیا تھا اور ان سے صاف کہہ دیجیے کہ آپ اپنا مکان فروخت نہیں کرنا چاہتے۔"

"لیکن بیٹے یہ تمہارے پیسے؟ تمہیں اس بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے چاچا جی۔ جو کچھ ہونے جا رہا ہے سب میری وجہ سے ہونے والا ہے۔ میرے گھر والوں نے جو عظیم گناہ کیا ہے میں اس کے ذریعہ اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے آپ مجھے میرے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا موقع دیں گے چاچا جی۔"

"ممنون بیٹے۔" گوپال پرشاد جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "کاش آج کے دور میں ہر نوجوان تمہاری طرح سوچے تو ...کسی گوپال پرشاد کا گھر بکنے کی نوبت ہی نہ آئے...."



تنویر اختر رومانی

بجھتے چراغ آنکھوں کے

جادوگر کے گرد محلّے کے تقریباً تمام بچے دائرہ بناکر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف بڑے لڑکے اور مرد حضرات کھڑے تھے اور دوسری طرف ایک مکان کے لمبے، کھلے برآمدے میں عورتوں اور جوان لڑکیوں کی بھیڑ تھی۔ اس بھیڑ میں وہ بھی جادوگر کے کمال بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ عورتوں کی بھیڑ میں وہ شاید سب سے نمایاں تھی۔ اس کی بڑی بڑی، کھوئی ہوئی سی آنکھوں میں کئی ایک کیفیات تیر رہی تھیں۔ جُھکی جُھکی سی خوابیدہ آنکھیں اور چہرے پر نہ جانے کون سے کرب کی شکنیں عجیب سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے جوانی کی دہلیز کو، ایک مدت ہوئی، پھلانگ لیا ہے۔ ۳۴۔ ۳۵ برس کا سن ایک بھرپور عورت ہونے کی علامت ہے۔

جادوگر کئی ایک کھیل دکھا چکا تھا۔ اب وہ رٹے ہوئے جملے دہرا رہا تھا۔

"مہربان... قدردان.... مادؤ اور بہنو!.....

اب دیکھیے یہ آخری کھیل"۔ اتنا کہہ کر اس نے چادر پر بکھرے ..ٍمان میں سے ایک بڑا سا مخصوص ڈبّہ اٹھایا۔ ڈبّے کا ڈھکن کھول کر اس نے سب کو دکھا کر کہا۔" دیکھیے!.. ... ڈبّہ بالکل خالی ہے.... ہے نہ بھائی صاحب؟"۔ اس نے ڈبّہ ایک صاحب کی آنکھوں کے قریب لاکر کہا۔ اس آدمی نے جادوگر کی تائید کی۔

پھر جادوگر.. ڈبّہ کا ڈھکن بند کرکے اس پر ایک بڑا سا کپڑا ڈال کر منتر پڑھنے لگا۔ چند ثانیے کے بعد ہی اس نے ڈبّے کا ڈھکن ہٹاکر اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک خرگوش تھا۔

تمام بچے تالیاں پیٹنے لگے۔

عورتوں کی بھیڑ میں وہ بھی جادوگر کے کمال بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس جادو سے اس کے چہرے پر کوئی تغیّر نہیں ہوا۔ آنکھیں ویسی ہی خوابیدہ سی تھیں اور چہرے پر انجان کرب کی لکیریں بدستور موجود تھیں۔

ادھر جادوگر کہہ رہا تھا۔ "مہربان .... قدردان.. ... مادؤ اور بہنو!! .... دنیا میں اوپر والے نے ہر ایک کا جوڑا بنایا ہے .... اس خرگوش کا بھی ...." اتنا کہہ کر اس نے خرگوش کو ڈبّے میں بند کرکے سابقہ عمل دہرایا۔ دوبارہ ڈھکن اٹھاکر ڈبّے میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو اس بار اس کے ہاتھ کی گرفت میں دو خرگوش لٹک رہے تھے۔

بچے بے تحاشہ تالیاں پیٹ رہے تھے۔

عورتوں کی بھیڑ میں وہ خوابیدہ آنکھوں والی،

جادوگر کے کھیل انہماک سے دیکھنے والی اس بار چونک پڑی۔ چہرے پر پھیلی انجان کرب کی ساری شکنیں غائب ہوگئیں۔ آنکھوں میں اب نادیدہ خوشیوں کی چمک تھی۔ ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں میں کئی ایک چراغ جل اٹھے ہوں۔!

اچانک عورتوں کی بھیڑ سے وہ دیوانہ وار نکل کر جادوگر کے پاس پہنچ گئی۔

سبھی تماشائی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ جادوگر بھی اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے پر چھائی ہوئی وحشت دیکھ کر گھبرا گیا۔

"جادو والے!" اس نے ہلکی مگر جوش بھری آواز میں کہا۔ "میرا ایک کام کردو..... میں تمھیں منھ مانگا انعام دوں گی۔" اور اس نے جادوگر کا بازو تھام لیا۔ جادوگر کو اس کے ہاتھوں کی گرفت کا احساس بہت شدت سے ہوا۔

"ج.... ج.... ج.... جی...." جادوگر ہکلایا۔

"سچ کہتی ہوں۔۔ تمھاری انعام دوں گی.... میرے باپ نے میرے لیے جہیز میں جو کچھ جمع کیا ہے سب تمھیں دے دوں گی...." جذبات کی شدت سے اس کے لبوں میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔

"ک... ک.... کہیے.... کیا کام ہے....؟" جادوگر نے جلدی سے پوچھا۔

"مجھے اس ڈبے میں بند کردو۔"

"اس ڈبے میں؟" جادوگر حیران تھا۔

"ہاں.... ہاں...." اس نے تیز لہجے میں کہا

"لیکن.... بھلا کیوں؟"

"تم مجھے اس ڈبے میں بند کرکے میرا بھی جوڑا نکال دو۔" کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور جادوگر کے بازوؤں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ انجان کرب کی ساری شکنیں واپس لوٹ آئیں۔ آنکھوں میں جلتے ہوئے وہ سارے چراغ بجھ گئے۔ اس کے سانسوں کا زیر و بم تیز ہوگیا۔ ایسا لگتا

غزل

روشن بنارسی

کیا نہ ہونا تھا اور کیا نہ ہوا؟
خاک کا جسم گل قبا نہ ہوا
آنکھ بے منظری سے عریاں تھی
آسماں تھا کہ بے ردا نہ ہوا
جو ملا بے طلب ملا یارو!
کچھ بھی حاصل بہ مدعا نہ ہوا
ایک سورج کہ جو کبھی نہ ڈھلا!
اک ستارہ کہ بے ضیا نہ ہوا
وہ لہو خاک ہوگیا روشن
قیدِ شہ رگ سے جو رہا نہ ہوا

تھا جیسے وہ چلچلاتی دھوپ میں طویل مسافت کے بعد کسی برگد کی گھنی چھاؤں میں کھڑی ہوگئی ہو۔

جادوگر گم صم تھا جیسے اسے شاک لگ گیا ہو اور وہ دفعتاً سبھی تماشائیوں سے بے نیاز بے تحاشہ قہقہے لگانے لگی۔ قہقہے لگاتے لگاتے اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے

ادھر بچے چیخ رہے تھے۔

"پگلی ہے... پگلی... پگلی....!"

••

مطبوعات

سلطان انجم

نام کتاب ـــــــــــــ تبسّم
مصنف ـــــــــــــ رام لعل نابھوی
تقسیم کار ـــــــــــــ انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایوینو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
قیمت ـــــــــــــ بیس روپے

"تبسم" جناب رام لعل نابھوی کی اوّلین تصنیف ہے جس میں دیباچہ سمیت بیس طنزیہ و مزاحیہ تحریریں ہیں اور قیمت بھی بیس روپے ہی ہے۔ یہ سبھی خاکے ایک جیسے ہیں، فرق صرف انیس بیس کا ہے۔ طنز و مزاح سے بھرپور ان خاکوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ رواں دواں اور شگفتہ نثر کی عمدہ مثال ہیں۔ آپ کوئی بھی مزاحیہ شروع کرلیں تو اُسے سرپٹ پڑھ جائیں گے، کیا مجال کہ دم لینے اور رُکنے کی خواہش بیدار ہو۔ ان کے خاکوں کے اکثر کردار آپ کو حرکت میں نظر آئیں گے کیونکہ جمود کے نہ جناب نابھوی قائل ہیں اور نہ ان کے کردار۔ مثال کے لیے آپ اس مجموعہ میں ـــــ "لفافہ"، "ملاقات"، "مہمان" وغیرہ پڑھیں تو زورِ بیان کی داد دیے بغیر نہ رہ پائیں گے۔ کئی مقامات پر تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے خود کو بھی نہیں بخشا۔ "میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ بننے کی خواہش ... کی لیکن جب کچھ بھی نہ بن سکا تو ادیب بننے کا خیال آیا۔" "کہاں چھپے رہے" کی یہ ابتدائی سطریں سستی شہرت کے طلبگاروں پر گہرا طنز ہیں۔

"تبسم" کا ایک مقالہ "اردو ادب میں طنز و مزاح" اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ عام قاری کو مزاح نگاروں کے ناموں کی ایسی فہرست شاید ہی کہیں یکجا مل سکے۔ فاضل مصنف نے کافی محنت سے یہ مضمون پورا کیا ہوگا۔ اگر وہ خواجہ عبدالغفور، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم جیسے چند معتبر نام بھی شامل فرما لیتے تو ان چار بے چاروں پر احسان ہو جاتا کیونکہ یارانِ قلم کی محفلوں میں ان ہستیوں کا بصد احترام ذکرِ خیر ہوتا ہے۔

بقولِ مصنف "تبسم" پر چالیس تبصرے ملے اور ڈاکٹر وزیر آغا کے پیش لفظ کا ذکر کم و بیش سبھی تبصروں میں ہوا" اکتالیسویں تبصرے میں بھی یہ فرض ادا ہونا چاہیے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب "بہت بڑے پاکستانی نقاد" ہیں۔ اس پیش لفظ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ دوسرے ممالک کی طرف

تا کنے کا رجحان ابھی کم نہیں ہوا۔ روزی روٹی کے لیے دیارِ غیر میں جلنے والوں کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر ادیب بھی ان کی تقلید کرنے لگیں تو کبھی بار خوف آتا ہے کہ کہیں ادب (اور ادیب) بھی درآمد کرنے کی نوبت نہ آ جائے۔ ہمارا ملک ان دنوں قحط سالی سے ضرور دوچار رہے تاہم ادبا رسا کا کال نہیں پڑا ہے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہوں ہم

ڈاکٹر وزیر آغا نے "پیش لفظ" کی رسم تو ادا کر دی مگر زیرِ نظر مجموعے کا مطالعہ کرنے والے اس بات کی تائید کریں گے کہ لائق مصنف کا "دیباچہ" زیادہ دلچسپ اور خاصے کی چیز ہے۔

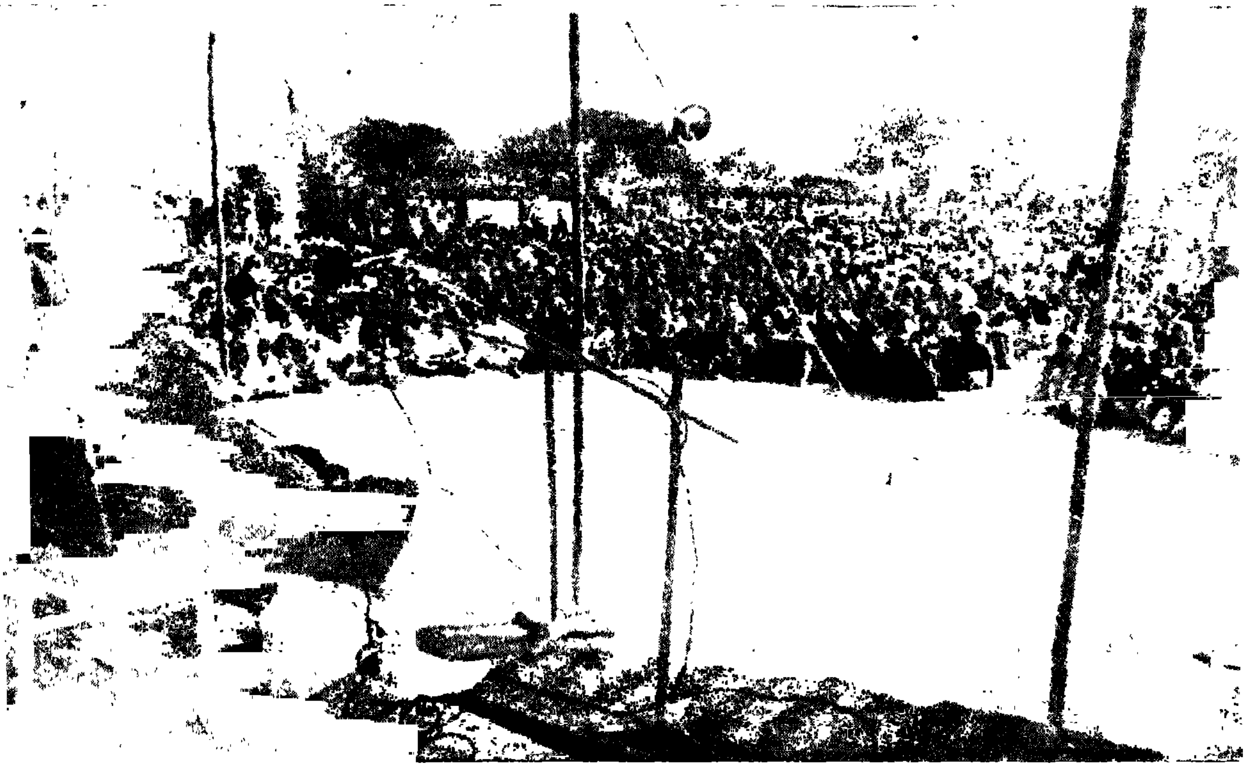
اُمید ہے کہ ہندوستان کی مختلف اکیڈمیوں سے "انعام یافتہ" یہ کتاب "مُتبسّم" اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں گراں قدر اضافہ قرار پائے گی۔

امروز قمر

آزاد غزل

سب گلی کوچوں سے واقف ہے، ٹھکانے سب عیاں ہیں ہر پتہ معلوم ہے
اُس کو سارے شہر کا جُغرافیہ معلوم ہے
صرف جلتی ریت پہ ہی منحصر ہوتے نہیں دُکھ ہجرتوں کے
اے میری آوارگی تو نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے تجھ کو کیا معلوم ہے
روز سنّاٹوں کا دامن چاک کر دیتا ہے کون؟
کون دیتا ہے صدا معلوم ہے؟؟
لمحہ لمحہ منزلوں سے دوریاں بڑھتی گئیں! اک گمان تو ہم غلط سمتوں پہ تھے
بدگمانی تھی کہ ہم کو راستہ معلوم ہے
منتشر ہو جائے گی اک دن حیات
مطمئن ہوں انتہا معلوم ہے

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ارجن داس ملک نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس سی او ۱۸۹۔۱۹۱ سیکٹر ۷ سی چنڈی گڑھ سے اپریل ۱۹۸۸ء کے لیے شائع کیا۔ طابع کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ٹی چنڈی گڑھ



یکم مارچ ۱۹۸۸ء کو ضلع حصار کے موضع باس میں ایک عظیم عوامی اجتماع سے
خطاب کرتے ہوئے۔ وزیر اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال۔



وزیر اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال ۱۵ مارچ ۱۹۸۸ء کو ضلع سونی پت کے موضع جاٹ جوشی میں ژالہ باری سے متاثرہ فصلوں کا معائنہ کرتے ہوئے۔

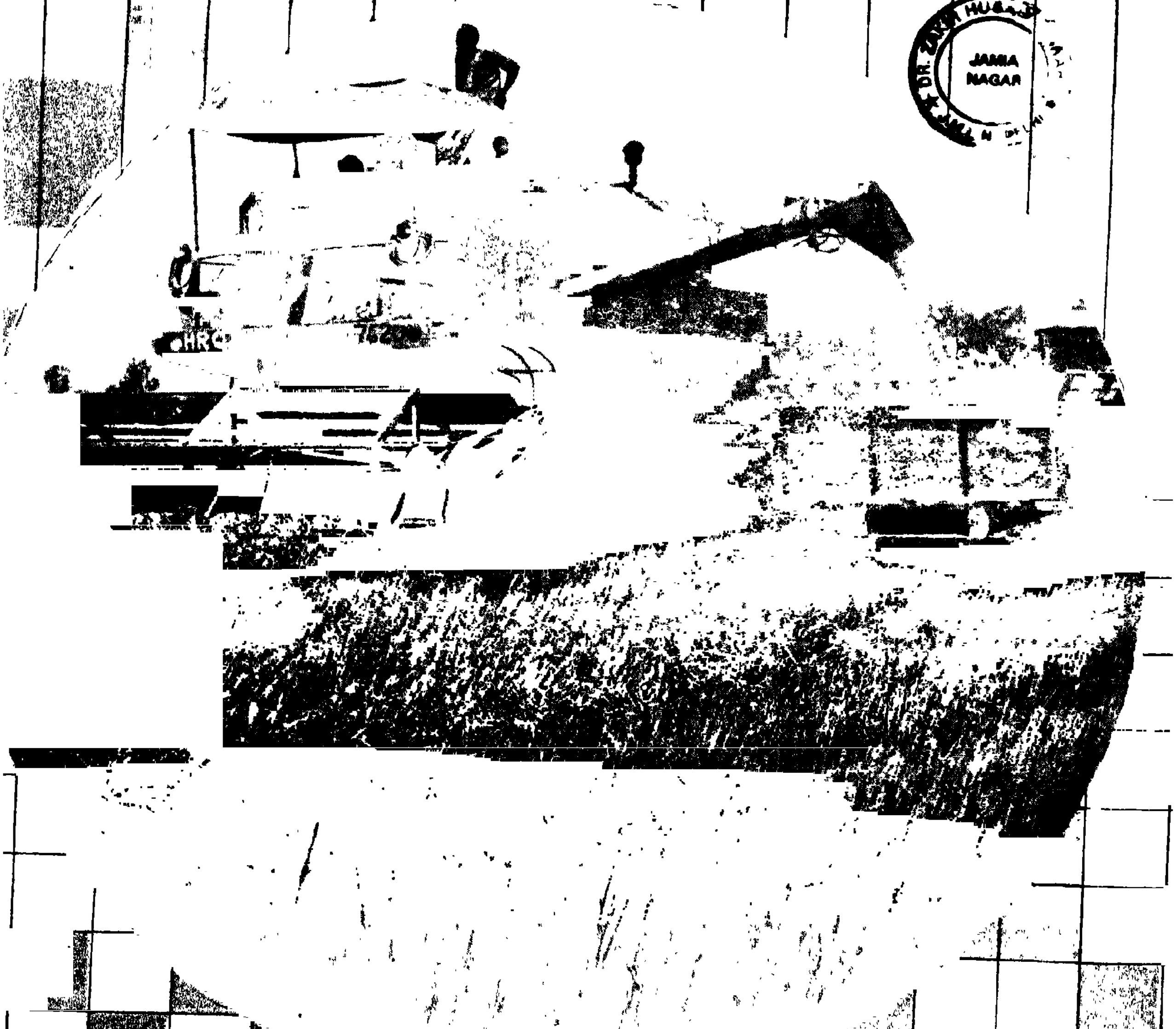
۲۵ مارچ ۱۹۸۸ء کو پولیس کمپلیکس مدھوبن (کرنال) میں "پاسنگ آؤٹ پریڈ ننگ" کے موقع پر "گارڈ آف آنر" کا معائنہ کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال۔

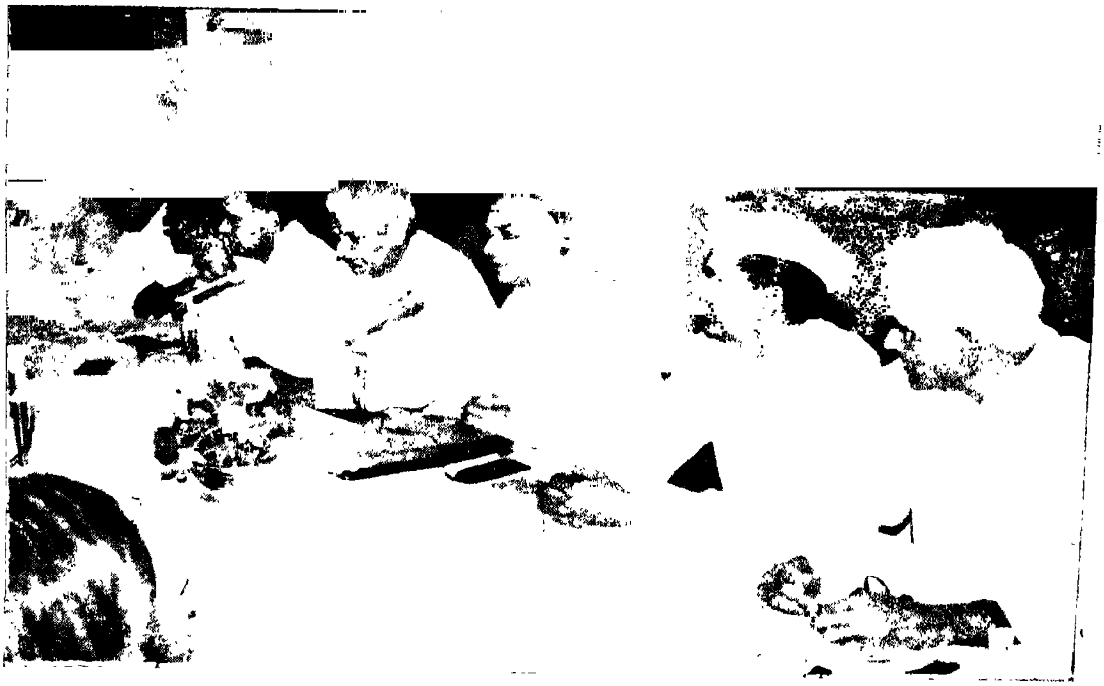


تعمیر

ہریانہ

مئی ۸۸ء





گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند براری نے ۲۶ اپریل ۱۹۸۸ء کو ہریانہ راج بھون چنڈیگڑھ میں رورل ڈویلپمنٹ بورڈ ہریانہ کی میٹنگ کی صدارت فرمائی — وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال اور ان کے ساتھی وزراء بھی اس میٹنگ میں موجود تھے ۔

عالیجناب دیوی لال وزیرِ اعلیٰ ہریانہ ۔ مئی ۱۹۸۸ء کو کوروکشیتر میں ۲۵ ویں لوک عدالت کی صدارت فرماتے ہوئے ۔



آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

مئی ۱۹۸۸ء شمارہ ۵ جلد ۱۶

مدیرِ اعلیٰ

ارجن داس ملک
آئی۔اے۔ایس

مدیر

سلطان انجم

سرورق: منجیت

فی شمارہ ۵۰ پیسے
چندہ سالانہ ۵ روپے

خط وکتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۴-۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ — ۱۶۰۰۱۷

مدیر کا مصنفین کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

ترتیب



گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند براری اور وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۱۱ اپریل ۱۹۸۸ء کو ہریانہ وزارت میں شامل کیے گئے نئے ممبران کے ساتھ (بائیں جانب سے کھڑے ہوئے) جناب پرمانند (منسٹر) جناب سیتا رام سنگلا (سٹیٹ منسٹر) جناب سچدیو تیاگی، جناب لچھمن داس کموج (ڈپٹی منسٹر) جناب طیب حسین اور راؤ رام نارائن (منسٹر)۔

گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند براری ۱۱ اپریل ۱۹۸۸ء کو ہریانہ راج بھون چنڈی گڑھ میں جناب نرسنگھ ڈھانڈا کو راجیہ منتری کے عہدے اور رازداری کا حلف دلاتے ہوئے۔ وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال تشریف فرما ہیں۔



بجٹ اجلاس کے خطبۂ افتتاحیہ سے اقتباسات

ترقی کی راہ پر گامزن ہریانہ

ہری آنند براری
گورنر ہریانہ



ہریانہ اسمبلی کے بجٹ اجلاس کا افتتاح کرنے کے لیئے گورنر ہریانہ کی تشریف آوری

مجھے ہریانہ اسمبلی کے اس سال کے پہلے اجلاس میں آپ سب کا استقبال کرتے ہوئے بے حد مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ریاست کی خدمت کرنے کا مجھے موقع دیا گیا ہے۔ میں اسپیکر صاحب آپ سب ممبران اسمبلی اور ہریانہ کے عوام کو اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

اتنی قلیل مدت میں میری حکومت نے ترقی کی رفتار کو تیز کرنے اور سماج کے کمزور طبقوں کی فلاح کے لئے کئی اقدامات کئے ہیں۔ بڑھاپا پینشن اور کمزور طبقوں کے لئے کواپریٹو اور دوسرے قرضوں کی معافی کچھ ایسے قدم ہیں جو مستقبل میں دیگر ریاستوں کی رہنمائی کریں گے۔

ضلع حصار کے موضع دریاپور کے پاس ۷ جولائی ۱۹۸۷ء کو ایک ایسا حادثہ ہُوا تھا جس میں ۳۴ بے قصور بس مسافروں کو دہشت گردوں نے ہلاک کر دیا تھا اور ۱۲ زخمی ہو گئے تھے۔ اس دردناک حادثے کے ردِّ عمل کے طور پر سرسہ، فتح آباد اور حصار کے آس پاس کے شہروں میں آتش زنی اور لُوٹ مار کے کچھ واقعات ہوئے۔ انتظامیہ کی بروقت کاروائی کے باعث چند ہی گھنٹوں میں حالات پر قابو پالیا گیا اور امن و امان قائم ہو گیا۔ دریاپور کے بہیمانہ حادثے میں ملوث مجرموں کی شناخت کر لی گئی اور ۱۶ ملزموں کو گرفتار کر لیا گیا۔

اہم مسائل میں اُلجھے رہنے کے باوجود بھی ہم اُن شہیدوں کو نہیں بھُولے جو جنوری ۱۹۸۶ء میں "راستہ روکو ایجی ٹیشن" کے دوران پولیس کی گولیوں کا شکار ہوئے۔ یہ تحریک ہریانہ کے عوام کے جائز مطالبے پُورے کروانے کے لئے چلائی گئی تھی۔ ان میں دوبارہ حد بندی سے متعلق محترمہ اندرا گاندھی کے ۱۹۷۰ء کے فیصلے کا نفاذ اور راوی بیاس کے پانی میں سے مناسب حصّہ حاصل کرنا شامل ہے۔

خریف ۱۹۸۷ء کے دوران برسات نہ ہونے کی وجہ سے ریاست کو بدترین قحط سالی کا سامنا کرنا پڑا اور کسانوں کو صرف زرعی پیداوار میں ۷۰۰ کروڑ روپے کا نقصان ہُوا۔ ریاستی حکومت کو مرکز نے سوکھا راحت کے نام پر صرف ۳۷.۲۲ کروڑ روپے کی امداد دی جو بہت ناکافی تھی۔ قحط سالی سے متاثرہ لوگوں کو راحت دینے کے لئے حکومتِ ہند سے مزید ۳۱۷ کروڑ روپے کی امداد مانگی گئی ہے۔

مسلسل قحط کے باعث دیہات کے جوہڑ خشک ہو گئے ہیں۔ محکمہ آبپاشی نے تقریباً ۳۰۰۰ جوہڑوں کو نہروں کا پانی سپلائی کیا ہے۔ اس کام کے لئے ۳۲۶.۵۰ لاکھ روپے کی رقم دی گئی ہے۔ قحط سالی سے متاثرہ علاقوں میں روزگار فراہمی کے لئے ۱۵ کروڑ روپے کی مزید رقم کا انتظام کیا گیا ہے۔ تعمیری کام شروع کر کے ۵۶ لاکھ سے بھی زیادہ "مین ڈیز" کا کام دلایا جا چکا ہے۔ دو ہزار دیہات میں جہاں سوکھا راحت کے کام جاری ہیں، روزانہ چالیس ہزار سے بھی زیادہ مرد، عورتیں کام کر رہے ہیں۔

موجودہ قیمتوں کے مطابق ریاست کی آمدنی ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۵۲۹۲ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۵۸۹۷ کروڑ روپے ہو گئی یعنی اس میں ۳.۷ فیصد کا اضافہ ہُوا ہے۔

اسی سال ۱۴۰ لاکھ مربع فٹ نہریں پکی کی گئی ہیں۔ اس سے پختہ نہروں کا رقبہ بڑھ کر ۴۵۱۰ لاکھ مربع فٹ ہو گیا ہے۔ مزید براں ۸۲۵ کلومیٹر آبی راستوں کو بھی پکا کیا گیا ہے۔ اس سے کل ۱۷۰۰۰ کلومیٹر آبی راستے پکے ہو گئے ہیں۔

بھیانک سوکھے کے دوران پینے کے پانی کی ضرورتوں کو پُورا کرنے کے لئے تین ہزار دیہات کے جوہڑوں اور چار سو پبلک ہیلتھ تالابوں کو بھرنے کے لئے یومیہ ۵۰۰ کیوسک مزید پانی سپلائی کیا گیا ہے۔

بجلی کے لئے آئندہ برس کے منصوبے میں ۱۸۳ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ۸۹-۱۹۸۸ء کے دوران ۲۱۰ میگاواٹ کے پانی پت تھرمل پاور پراجیکٹ کی تیسری سٹیج اور مغربی جمنا نہر پن بجلی پراجیکٹ کے 16 میگاواٹ کے بجلی گھر "سی" کے بھی شروع ہو جانے کی توقع ہے۔ سالِ رواں میں ریواڑی میں 220 کے وی کا ایک سب اسٹیشن، ۱۳۲ کے وی کے دو سب اسٹیشن پنڈری اور ڈینگ میں، دھوج، فرید آباد اور سانپلا میں ۶۶ کے وی کے تین سب اسٹیشن اور مختلف مقامات پر ۳۳ کے وی کے سات سب اسٹیشن شروع کئے گئے ہیں۔

زرعی پیداوار پر غیر متوقع قحط سالی کے بُرے اثرات کو دُور کرنے اور ۱۰ر جولائی ۱۹۸۷ء کے ہریانہ اسمبلی سیشن میں کی گئی یقین دہانیوں کی تکمیل کے لئے میری حکومت نے دیہی علاقوں کو بجلی کی تقسیم میں پہل دی۔ کسانوں کو فصل ربیع کے لئے کئی طرح سے راحت دی ہے۔ بیجوں، کھادوں، کیڑے مار دوائیوں اور چارہ بیج منی کِٹوں کی لاگت پر سب سِڈی کی غرض سے ۵۰ء۸۷،۷ لاکھ روپے کی مالی امداد منظور کی گئی ہے۔

میری سرکار نے کسانوں اور سماج کے کمزور طبقوں کو قرضے کی لعنت سے نجات دلانے کے لئے قرضے مُعاف کرنے کا انقلابی قدم اٹھایا ہے۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۸۶ء کو ادا کئے جانے والے پرائمری کوآپریٹو قرضوں اور سیوا سمتیوں کے قلیل المدتی اور وسط المدتی قرضوں پر ہر ایک قرض دار کو ۱۰,۰۰۰ روپے تک کی راحت دی گئی ہے بشرطیکہ وہ اپنا حساب بیباک کر دیتا ہے۔

بُنیادی طور پر ہریانہ زراعت پیشہ ریاست ہے جس کے ۸۲ فیصد علاقے میں جنگل لگانے کی مختلف سکیموں پر ۱۶ء۲۳ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے اور ۳۲۰ر۱۸ ہیکٹیر علاقے میں جنگل لگائے جائیں گے۔

ریاست میں صنعتوں کی ترقی بھی حوصلہ افزا ہے۔ چھوٹی صنعتی اکائیوں کی تعداد ۰۰۰ر۷۷ تک پہنچ گئی ہے۔ سالِ رواں کے دوران ایسی ۳۶۰۰ اکائیاں قائم کی گئیں۔ دیہی صنعتی کرن سکیم کے تحت ۲۰۰۰ یونٹ قائم کئے گئے ہیں۔ اِس سے ۷۵۰۰ سے زیادہ لوگوں کو روزگار ملا ہے۔

ریاست نے الیکٹرانکس کے شعبے میں بھی کافی ترقی کی ہے۔ ضلع گوڑگاؤں کے "اُدیوگ وِہار" میں ۵۰۰ الیکٹرانک یونٹوں والا ایک سینٹر بن رہا ہے۔

۱۹۸۸-۸۹ء کے دوران سماج کے کمزور طبقوں، درجِ فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح کی سکیموں پر ۳۴ء۱۰ کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ ۱۹۸۷-۸۸ء کے دوران ہریانہ ہریجن کلیان نگم کی جانب سے ۸۴۷ر۱۱ درج فہرست ذاتوں کے افراد کو اور ہریانہ بیک ورڈ کلاسز کلیان نگم نے ۹۲۱ افراد کو امداد دی۔

سرکار کی بڑھاپا پینشن سکیم کے تحت ۶۵ سال سے زیادہ عمر کا کوئی بھی شخص جو انکم ٹیکس نہیں دیتا، سو روپے ماہانہ کی شرح سے بڑھاپا پینشن حاصل کرنے کا حقدار ہے۔ اس سکیم سے تقریباً ۶ء۵۰ لاکھ لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

میری سرکار نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لئے یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے نئے یو جی سی گریڈ لاگو کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ۱۹۸۸-۸۹ء کے لئے موجودہ آسامیوں کے لئے ریاستی حکومت پر مزید ۷۶ء۶۰ لاکھ روپے کا بوجھ پڑے گا۔

مارچ ۱۹۸۸ء کے آخر تک ریاست میں ۲۰۵۰ سب سینٹر، ۳۲۶ پرائمری ہیلتھ سینٹر اور ۵۱ کمیونٹی ہیلتھ سینٹر ہوں گے۔ ۱۹۸۸-۸۹ء میں ۱۵۰ سب سینٹر، ۳۰ پرائمری ہیلتھ سنٹر اور ۱۰ کمیونٹی ہیلتھ سنٹر قائم کرنے کی ہماری تجویز ہے۔

سالِ رواں میں پینے کے پانی کی کمی والے ۳۸۰ دیہات میں واٹر سپلائی سہولتیں مُیسّر کرانے کی تجویز ہے۔ اِن میں سے ۳۷۰ گاؤں کو یہ سہولت حاصل ہو چکی ہے۔ دیہی واٹر سپلائی کے لئے "ٹیکنالوجی مشن" کے تحت ایک علیحدہ پروگرام شروع کیا گیا ہے جس کے لئے ۲ء۶۳ کروڑ روپے کا ایک پراجیکٹ ضلع گوڑگاؤں کے لئے منظور کیا گیا ہے۔

ہریانہ روڈ ویز مُلک کی بہترین روڈ ویز تسلیم کی جاتی ہے۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۷ء تک ریاست میں اور بین الریاستی شاہراہوں پر ہماری ۳۱۰۴ بسیں چلتی تھیں جن میں روزانہ ۱۲ء۰۲ لاکھ مُسافر سفر کرتے تھے۔ ۱۹۸۸-۸۹ء میں [illegible] کروڑ روپے

تعمیر ہریانہ ۷ مئی ۱۹۸۸ء

کے آوٹ لے میں سے ۵۰۶ لاکھ روپے بسوں کی تعداد بڑھانے پر خرچ کئے جائیں گے۔
آئندہ ۵ سال ۲۴۰۰ کلومیٹر نئی سڑکیں بنائی جائیں گی۔ جو سڑکیں تنگ اور ٹوٹی پھوٹی ہیں، اُن کے ۲۰۰۰ کلومیٹر حصے کو کشادہ اور درست کرنے کی بھی تجویز ہے۔

ہریانہ میں ٹورسٹ کمپلیکسوں کی تعداد اب بڑھ کر ۳۵ ہو گئی ہے۔ رسما لکھا میں ایک نیا موٹل اور ریستوران اور دار وہیڑہ میں "فاسٹ فوڈ سروس یونٹ" جو تقریباً مکمل ہونے والے ہیں اور انہیں جلد شروع کر دیا جائے گا۔

میری حکومت نے ۹ اگست ۱۹۸۷ء سے مجاہدین آزادی کی مالی امداد کو ۲۰۰ روپے ماہانہ سے بڑھا کر ۲۵۰ روپے ماہانہ کر دیا ہے۔ ہم نے دسمبر ۱۹۸۷ء کے آخر تک ہریانہ کے ۱۲۷ مجاہدین آزادی اور اُن کی بیواؤں کی عزت افزائی کی ہے۔ اس وقت ۳۵۸۲ مجاہدین آزادی کو جن میں آزاد ہند فوج کے ۲۴۹۴ فوجی اور اُن کی بیوائیں بھی شامل ہیں، ۲۵۰ روپے ماہانہ کے حساب سے مالی امداد دی جا رہی ہے۔

میری حکومت نے ملازمین کی پریشانیوں کو محسوس کرتے ہوئے حال ہی میں ایسے کئی قدم اٹھائے ہیں جس سے اُنہیں مالی فائدہ ہوا ہے۔ ہریانہ پہلی ریاست ہے جس نے اپنے ملازموں کے معاملے میں چوتھے تنخواہ کمیشن کی سفارشات کو لاگو کیا ہے۔

میری سرکار کی یہ کوشش ہوگی کہ ہریانہ کے عوام کو دیئے "بھرشٹاچار بند" کے نعرے کے وعدے کو متاثر کن طریقے سے پورا کیا جائے۔

(س-۱)

بقیہ ڈیڈلائن ص ۳۲ سے آگے

"مرحبا مرحبا۔ مرحبا۔ وہ خود ہی گھر کی تلاش میں نکل پڑا۔" ابوجہاد کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا اور وہ بیروت چھوڑنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

پانچویں روز لیونان جانے والے بحری جہاز میں سوار ہوتے ہوئے ابوجہاد نے اپنے بوڑھے باپ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے، وہ اپنے باپ سے بغل گیر ہوا۔ مصافحہ کرتے ہوئے اس کے باپ نے اس کے زخمی ہاتھوں کو دیکھا اور اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔ "دلگیر اور ابوحماد تو خیریت سے ہیں؟"

"دلگیر ٹھیک ہے لیکن ابوحماد دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گیا ہے۔"

"مقابلہ کرتے ہوئے؟" بوڑھا حیرت اور مسرت سے چلایا۔

"جی ہاں۔" ابوجہاد نے مختصر جواب دیا۔

"ابوجہاد! وہ شہید ہے، شہید کبھی نہیں مرتا وہ زندہ رہتا ہے اور اپنا رزق پاتا ہے۔ تو خوش نصیب ہے کہ تیرا بیٹا امر ہو گیا ہے۔" بوڑھے نے لرزتی آواز میں کہا۔ جہاز بندرگاہ چھوڑ رہا تھا، وہ اپنے گھر سے اور دور جا رہے تھے۔ لیکن گھر انہیں آج پہلے سے زیادہ قریب نظر آ رہا تھا۔ ● ●

بجٹ تقریر کے اقتباسات

جناب بنارسی داس گپتا

نائب وزیرِ اعلیٰ ہریانہ



مثالی ریاست ہریانہ

نائب وزیرِ اعلیٰ ہریانہ سنہ 89-1988ء کے بجٹ کو آخری شکل دیتے ہوئے۔

سنہ 88-1987ء ہریانہ کی تاریخ میں قابلِ ذکر رہا ہے۔ انتخابات میں عوام کی بے مثال حمایت کی بدولت بھاری اکثریت حاصل کرنے کے بعد لوک دل۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی ملی جلی سرکار نے جون سنہ 1987ء میں ریاست کی باگ ڈور سنبھالی۔ ہریانہ کے عوام کے اِس دانشمندانہ فیصلے سے مُلک کے دُوسرے حِصّوں میں بھی سیاسی بیداری کی ایک لہر آئی ہے، جس کے نتائج مستقبل قریب میں نظر آنے کی توقع ہے۔

سنہ 89-1988ء کے سالانہ منصوبے کے لئے 600 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جو سالِ رواں سے تقریباً 37 فیصد زیادہ ہیں۔ 89 - 1988ء کے سالانہ منصوبے میں امدادِ باہمی زراعت اور اِس سے متعلق خدمات کے لئے 53.46 کروڑ روپے، دیہی ترقی کے لئے 13.48 کروڑ روپے، آب پاشی اور سیلاب پر قابو پانے کے کاموں کے لئے 102.26 کروڑ روپے، بجلی کے لئے 182.83 کروڑ روپے، صنعتوں کے لئے 10.50 کروڑ روپے، ٹرانسپورٹ اور کمیونی کیشن کے لئے 33.96 کروڑ روپے، سماج سیواؤں کے لئے 90.50 کروڑ روپے اور دیگر خدمات کے لئے 13.01 کروڑ روپے کا انتظام ہے۔ ستلج جمنا لنک نہر پراجیکٹ کے لئے 34.50 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

نہروں کی ماڈرنائزیشن کے ایک پراجیکٹ کے تحت دسمبر 1987ء تک 451 کروڑ مربع فٹ سینچائی نالیاں پکی کی گئیں۔ اس سے 1892 کیوسک پانی ضائع ہونے سے بچایا گیا۔ عالمی بینک کی امداد سے جاری ایک پراجیکٹ سے 1.43 لاکھ ہیکٹیئر رقبہ کی مزید آبپاشی کے لئے ہریانہ سٹیٹ مائنر اریگیشن اینڈ ٹیوب ویل کارپوریشن کے ذریعہ کسانوں کے کھیتوں میں 17,000 کلومیٹر آبی راستے پختہ کئے گئے۔ 88-1987ء اور 89-1988ء میں ماڈرنائزیشن کے اس پراجیکٹ کے لئے بالترتیب 19.92 کروڑ روپے اور 20 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

پنجاب میں 212 کلومیٹر لمبے ستلج جمنا لنک نہر کے حصہ کو پورا کرنے کی میعاد آخری تاریخ اکتوبر 1988ء تک بڑھا دی گئی ہے۔ اس پراجیکٹ کی لاگت 1981ء کے 176 کروڑ روپے سے بڑھکر 1988ء میں 336 کروڑ روپے ہو گئی ہے۔ وزیراعظم کی یقین دہانی کے باوجود اس نہر کا تعمیری کام کسی مرکزی ایجنسی کو نہیں سونپا گیا ہے۔ ہماری شکایت کو دور کیا جائے اور ستلج جمنا لنک نہر کو اسی سال جون تک پورا کر دیا جائے۔

بجلی سپلائی کی حالت مزید بہتر بنانے کی غرض سے سالِ رواں کے دوران مغربی جمنا نہر پن بجلی پراجیکٹ کے آٹھ۔ آٹھ میگاواٹ کے دو اور یونٹ شروع کئے گئے ہیں جبکہ پانی پت پلانٹ کے 210 میگاواٹ صلاحیت والے پانچویں یونٹ پر زیادہ تر کام اکتوبر 1988ء تک پورا کر لیا جائے گا۔ دسمبر 1987ء تک ہمارے تھرمل پاور پراجیکٹوں میں پلانٹ لوڈ فیکٹر بڑھ کر 38.7 فیصد ہو گیا جبکہ پچھلے سال اتنی مدت میں یہ 32.4 فیصد تھا۔

زراعت پر ہماری 78 فیصد آبادی کا انحصار ہے اور ریاست کی کل آمدنی میں اس شعبہ کا حصہ 42.4 فیصد تک ہے۔ 88-1987ء کے دوران خوردنی اجناس کی پیداوار کا نشانہ خریف کے دوران 23.3 لاکھ ٹن تھا، ربیع کی فصل کے لئے 58.5 لاکھ ٹن تھا اور گنے (گڑ)، کپاس اور تلہن کے لئے نشانہ بالترتیب 7 لاکھ ٹن، 8.4 لاکھ گانٹھیں اور 2.97 لاکھ ٹن تھا لیکن بارش کی بہت زیادہ کمی کی وجہ سے پیداوار کے اس پروگرام کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ 89-1988ء کے دوران اجناس کی پیداوار کا یہ نشانہ 83.55 لاکھ ٹن مقرر کیا گیا ہے۔ آئندہ برس کی سکیم میں ٹیوب ویل لگانے کے لئے 1.4 کروڑ روپے اور فوارہ آبپاشی سیٹ لگانے کے لئے 90 لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔

کسانوں کو قرضہ راحت دلانے کے لئے پہل سر چھوٹو رام نے کی تھی، جس پر ہریانہ کو ناز ہے۔ ہریانہ کے سپوت اور کسانوں کے دوست کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتے ہوئے اور ان کی پیروی کرتے ہوئے لوک دل قائد چودھری دیوی لال نے اپنے انتخابی منشور میں ہریانہ کے رائے دہندگان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ غریبوں کو قرضوں کے بار سے نجات دلائیں گے۔ اسی لئے ہماری سرکار نے 15 اگست 1987ء کو ان وعدوں کی تکمیل کے لئے ٹھوس اقدامات کا اعلان کیا۔ ہماری ریاست میں

کوآپریٹو بینکوں سے قرضے فی قرضدار 10,000 روپے کی حد تک معاف کر دیئے گئے ہیں۔ قرضوں سے راحت کی یہ سہولت نہ صرف کسانوں کو بلکہ بے زمین کھیت مزدوروں، چھوٹے دستکاروں، چھوٹے دوکانداروں اور سماج کے دیگر کمزور طبقوں کو بھی دی گئی ہے جنہیں ہریانہ ہریجن کلیان نگم، ہریانہ پچھڑا ورگ کلیان نگم وغیرہ سے قرضے ملے ہیں۔ ہریانہ سٹیٹ لینڈ ڈیولپمنٹ بینک کے ذریعہ دیئے گئے بقایا ٹریکٹر قرضوں پر 15 ہزار روپے فی ٹریکٹر کی شرح سے قرضے کی رقم معاف کر دی گئی ہے۔ قرضہ معافی سکیم سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد 117 لاکھ ہے۔

قحط سالی کے باوجود 1987-88ء کے دوران 1986-87ء کے 23.39 لاکھ ٹن کے مقابلے میں 22.47 لاکھ ٹن گندم خریدی گئی۔ محکمہ خوراک و رسد نے ریاست میں مناسب قیمتوں کی 6447 دوکانوں کے ذریعہ ہر مہینے 30,000 ٹن گندم، 3500 ٹن چاول، 6400 ٹن چینی، 35,000 ٹن سیمنٹ اور 2,000 ٹن خوردنی تیل لوگوں میں تقسیم کرنے کے لئے جاری کیا ہے۔

صنعتی میدان میں دسمبر 1987ء تک چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی 3663، دیہی صنعتوں کی 1988 اور بڑے و اوسط پیمانے کی 10 اکائیاں قائم کی گئی ہیں۔ ریاست میں الیکٹرانک انڈسٹری کی حوصلہ افزائی کے لئے ایسے 500 یونٹوں کا گروپ گوڑگانوں میں جلد بن جائے گا جبکہ انبالہ اور گوڑگانوں کے الیکٹرانک سینٹروں نے عام استعمال کے 50 نئے الیکٹرانک آلات کا وکاس کر لیا ہے۔

1987-88ء کے دوران 445 اور 1988-89ء کے دوران ریاست میں مسافروں کی مزید سہولت کے لئے 705 نئی بسیں خریدی جائیں گی اور اس کام کے لئے ان برسوں میں بالترتیب 12.30 کروڑ روپے اور 14.00 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ 20,000 کلومیٹر لمبی موجودہ سڑکوں کے جال کو اور مضبوط اور کشادہ کرنے کے علاوہ 1987-88ء کے دوران 150 کلومیٹر اور 1988-89ء کے دوران 220 کلومیٹر نئی سڑکیں جوڑنے کی تجویز ہے۔ ریاستی عوام کے لئے صحت عامہ کی خدمات میں توسیع کی غرض سے 1987-88ء کے دوران 150 سب ہیلتھ سینٹر، 50 پرائمری ہیلتھ سینٹر اور 10 کمیونٹی ہیلتھ سینٹر قائم کئے جا رہے ہیں۔ جبکہ 1988-89ء کے دوران 150 اور سب ہیلتھ سینٹر، 30 پرائمری ہیلتھ سینٹر اور 10 کمیونٹی ہیلتھ سینٹر کھولے جائیں گے۔ 1988-89ء میں اس کام کے لئے 11.96 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

1988-89ء میں تعلیم کے لئے 32.43 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ 1987-88ء کے دوران دو نئے گورنمنٹ کالج کھولے گئے ہیں۔ 1988-89ء کے دوران ہائر ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے لئے ایک راجیہ پریشد اور 9 نئی سب ڈویژنل لائبریریاں قائم کرنے کی تجویز ہے۔ تعلیم بالغاں کے لئے موجودہ 6100 مرکزوں میں 900 اور مرکز جوڑ کر اسے اور مضبوط بنایا جائے گا۔

ضعیفوں کے ساتھ ہمدردی کے طور پر ہماری سرکار نے ایک فراخدلانہ بڑھاپا پینشن سکیم شروع کی ہے جس کے تحت 100 روپے ماہانہ کی شرح سے پینشن دی جاتی ہے۔ یہ لازمی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے والا شخص ہریانہ کا باشندہ ہو۔ کسی اور ذریعے سے اسے 100 روپے ماہانہ سے زیادہ پینشن نہ مل رہی ہو اور نہ ہی

دا انکم ٹیکس دیتا ہو۔ اس سکیم پر اس سال 44 کروڑ روپے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ آئندہ برس کے لئے 74.65 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

1987-88ء کے دوران مورنی پہاڑیوں، کرشن دھام (کوروکشیتر) اور نروانہ میں نئے ٹورسٹ کمپلیکس کھول کر اور البوب شہر اور آسا کھیڑہ میں ٹورسٹ کمپلیکسوں کو دوبارہ کھول کر ہریانہ میں ٹورازم کے جال کو اور مضبوط بنایا گیا۔ 1988-89ء کے سالانہ منصوبے میں ٹورازم کے فروغ کے لئے 1.75 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

بد ترین قحط سالی نے خریف 1987ء کے دوران ریاست کے بیشتر حصوں کو متاثر کیا ہے جس سے 700 کروڑ روپے کی فصل کا نقصان ہوا۔ حکومت ہند نے صرف 37.22 کروڑ روپے کی امداد دی۔ جبکہ ہم نے 68.35 کروڑ روپے کی مدد مانگی تھی۔ اس بات کا دکھ ہے کہ مرکزی حکومت نے اس معاملے میں ہمارے ساتھ سوتیلا سلوک کیا ہے۔

ربیع 1987ء کے دوران بھی کچھ ضلعوں میں ژالہ باری ہوئی۔ جس سے کھڑی فصلوں کو کافی نقصان پہنچا۔ ہمارے وزیر اعلیٰ جو کسانوں کے سچے دوست اور ہمی خواہ ہیں فوراً ژالہ باری سے متاثرہ ضلعوں میں گئے اور متاثرہ فصلوں کے لئے نقد معاوضے کا اعلان کیا یہاں تک کہ انہوں نے خود بھی کئی گاؤں میں رقم تقسیم کی۔ متاثرہ لوگوں کو ہماری سرکار نے معاوضے کی شکل میں 30.8 کروڑ روپے کی مالی امداد دی ہے۔ ہماری سرکار نے 1987-88ء میں راحت کے ایسے کاموں پر 10.50 کروڑ روپے خرچ کئے جن کو مرکزی حکومت نے منظور نہیں کیا ہے۔

ہماری سرکار نے سرکاری ملازموں کو یکم جنوری 1986ء سے چوتھے تنخواہ کمیشن کی سفارشوں کے مطابق نئے تنخواہ سکیل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلہ سے 139 کروڑ روپے کا خرچ بڑھا ہے۔ میڈیکل الاؤنس 50 روپے سے بڑھا کر 200 روپے سالانہ کر دیا ہے۔ سفر بھتہ اور سائیکل بھتہ دوگنا کر دیا ہے۔ 25,000 سے کم آبادی والے شہروں میں تعینات ملازموں کو 200 روپے تک مکان کرایہ بھتہ بھی دیا ہے جبکہ اس سے پہلے صرف 50 روپے تک ہی ملتے تھے۔ اسپیشل تنخواہ کی شرح بھی یکم جنوری 1986ء سے دوگنی کر دی گئی ہے۔ ان سبھی اقدامات سے سرکار پر 22.38 کروڑ روپے کا بوجھ پڑا ہے توقع ہے سرکاری ملازمین بھی پوری لگن، توجہ اور محنت سے اپنے فرائض انجام دیں گے۔



فضا ابن فیضی

رُباعیات

خاموش لہو، جوشش و روانی دے گا
ساحل کو سمندر کی کہانی دے گا
اے بُزدلو! تیشہ وار جینا سیکھو
پتّھر کو نچوڑو گے تو پانی دے گا

پیاسے کو کنواں، دشت کو دریا دے گا
کانٹے کو کنول، دھوپ کو سبزا دے گا
فردا سے ہو تم کس لیے اتنا مایوس
موسم کوئی سرسبز اشارا دے گا

منزل کا پتہ اور نشاں کیا دے گا
سمتوں کو یہ کچھ اور بھی الجھا دے گا
قائم ہے مرے گرد، غضب کی دیوار
کیا اب کوئی رستہ، مجھے رستا دے گا

ناخن کو سُلگتا ہوا عقدا دے گا
مٹھی میں پگھلتا ہوا شعلا دے گا
پلتا ہے جو ذہنوں میں بغاوت کا شعور
کچھ تو نئی نسلوں کو سہارا دے گا

آئینہ تراشے گا، نہ چہرا دے گا
کھولے گا کوئی در، نہ دریچا دے گا
تجھ کو مرے ماحول کا منظر نامہ
دے گا بھی تو اندوہِ تماشا دے گا

مفہوم سے لبریز پیالہ دے گا
لفظوں کا، مرے مُنہ میں نوالا دے گا
کچھ یوں ہے کہ وہ جب بھی ملے گا مجھ سے
ہر بات پہ، میرا ہی حوالا دے گا

آنکھوں کو، سرو برگِ تماشا دے گا
دیواروں کو، دروازہ، دریچا دے گا
آئینے معانی کے اٹھا لے گیا وہ
اب کون مرے لفظوں کو چہرا دے گا

ڈاکٹر نریش

وقت... اور ہم

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ؎

ہر لمحہ، ہر ساعت، ہر دم
دگرگوں میشود احوالِ عالم

زمانہ تو بدلتا ہی رہتا ہے۔ ہر لمحہ، ہر ساعت تغیر کا عمل جاری رہتا ہے لیکن ہمارے معاشرے کے تعلق سے زمانے نے جس تیزی کے ساتھ کروٹ بدلی ہے اس سے ہمارے لئے فکر کے متعدد نئے دریچے کھل گئے ہیں اور ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ زمانے کا یہ تغیر ہمارے معاشرے کے حق میں بہتر ثابت ہوا ہے یا اس سے ہمیں نقصان پہنچا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ دہائیوں میں ہمارا معاشرہ علم اور سائنس کی روشنی کی طرف بڑھا ہے اور ہم ترقی کر کے بیل گاڑی سے ریل گاڑی بلکہ ہوائی جہاز اور جیٹ تک آ پہنچے ہیں لیکن اس سفر میں بھی دنیا کے دوسرے ممالک ابھی ہم سے بہت آگے ہیں۔ اس ترقی سے ہمارا طرزِ زندگی تبدیل ہوا ہے۔ چند دہائیاں پہلے ہی وہ سب کچھ کہاں ہوتا تھا جو آج ہو رہا ہے۔ ہم نے اپنے بچپن میں آئس کریم کا نام تک نہیں سنا تھا۔ گھر پر جمائی ہوئی دودھ والی برف کی پیٹی لے کر جب خوانچے والا "ملائی کی برف" کی آواز لگاتا تھا تو ہمارے منہ میں پانی بھر آیا کرتا تھا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، حتیٰ کہ سینما ہاؤس بھی کہاں ہوتے تھے۔ میلوں ٹھیلوں میں بائی اسکوپ دیکھنا ہمارے لئے ایک ایسا تجربہ ہوتا تھا جیسے ہم نے دنیا کی کوئی بہت بڑی دولت حاصل کر لی ہو۔ یہ ترقی ہونا ہی چاہیے تھی۔ ہمارا معاشرہ بہت پچھڑا ہوا معاشرہ تھا جس کا آگے بڑھنا اپنی بقا اور ارتقا دونوں کے لئے ضروری تھا۔ افسوس اس کا نہیں ہے کہ ہم نے ترقی کیوں کی ہے بلکہ یہاں تو افسوس کی گنجائش یوں باقی ہے کہ ہم نے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کم ترقی کی ہے مگر میرے لئے اور میری طرح سوچنے والے لوگوں کے لئے ایک اور پہلو بھی ہے جو افسوسناک بھی ہے۔ وہ یہ کہ ترقی کی اس دوڑ میں ہماری شناخت جانے کہاں گم ہو گئی۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ ہماری وہ شناخت جسے ہم فخر کے ساتھ ہندوستانی تہذیب و تمدن کی پہچان کہا کرتے تھے، اس کا کیا ہوا؟ تغیراتِ زمانہ نے ہم سے ہماری پہچان چھین لی۔ مختصر یہ کہ ہمارا قد تو یقیناً بڑھ گیا ہے لیکن ہم اپنی پہچان

کھو بیٹھے ہیں۔

اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے معاشرے کی بنیادی اکائی کو توڑ دیا ہے۔ ہمارا معاشرہ جن اکائیوں سے تعمیر ہوا تھا، اس اکائی کا نام تھا۔ گھر۔ گھر سے مراد اینٹ چونے کی دیواروں میں کسی چھت کے نیچے سر چھپانا نہیں تھا بلکہ ایک ایسا گھر، جس میں مشترک کنبہ رہا کرتا تھا۔ ہمارے لئے گھر ہمیشہ ہی سے ایک تہذیبی علامت رہا ہے۔ "گھر جائیں گے تو گھر کے لوگ کیا کہیں گے" ——— ہمارے ہر فعل و عمل پہ یہ جملہ ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑا رہتا تھا کہ ہم اپنے اعمال کے لئے کہیں جواب دہ بھی ہیں۔ آنکھ کی شرم، گھر کی کا لحاظ، چھوٹوں سے محبت، بڑوں کا ادب، وضعداری اور رواداری گھر کی تہذیب کے لازمی اجزا تھے۔ تغیراتِ زمانہ نے ہماری اس بنیادی اکائی کو توڑ کر، ایک ایک اکائی کی دس دس اکائیاں بنا ڈالیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم تنہا پڑ گئے۔ تنہائی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا اور ہمارا وجود سمٹ سمٹ کر اپنی ذات تک محدود ہو گیا۔ ہم نے جو نئی اکائیاں قائم کیں، ان کو بھی ہم گھر ہی کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے ان نئے گھروں میں نہ پان دان کی خوشبو ہے، نہ حقے کی گڑگڑاہٹ نہ دیر سے آنے پر کسی بزرگ کا یہ سوال کہ اب تک کہاں تھے، نہ کسی قول پر تنبیہ اور نہ کسی فعل پر ملامت۔ گھر کی پرانی اکائی سمٹی نہیں تھی، پھیلا کرتی تھی۔ گاؤں کی بیٹی، گاؤں کی بہو کا تصور اس اکائی کی وسعتوں سے ہی پیدا ہوا تھا۔ وہ میرے گاؤں کا ہے، اس لئے میرا بھائی ہے، وہ میرے گاؤں کی ہے، اس لئے میری بیٹی ہے، بہن ہے، ماں ہے، بھابی ہے ——— سوچنے کا یہ انداز ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے جس رشتے میں باندھے رہتا تھا، وہ رشتہ کمزور پڑنے لگا اور کمزور پڑتے پڑتے بالآخر ٹوٹ گیا۔ اب ہمارے پڑوس میں کوئی بیمار ہے تو ہوا کرے، بھوکا ہے تو رہے، ہنستا ہے تو ہنسا کرے، روتا ہے تو روتا رہے ——— یہ لاتعلقی، یہ بے توجہی، یہ بیگانہ پن دہشت گردی کی اولین منزل تھا جس کے ہولناک نتائج سے ہم بے خبر رہے۔ آج جس دہشت پسندی سے ہم پریشان ہو رہے ہیں، اس کی بنیاد میں ہماری وہ ٹوٹی ہوئی اکائی موجود ہے جس کے ٹوٹنے کو ہم نے روکا نہیں تھا۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم ہم نہیں رہے ہیں اور وہ بھی نہیں ہو پائے ہیں جو ہم نے ہونا چاہا تھا۔ گذشتہ صدی میں اور موجودہ صدی کے ابتدائی حصے میں ہم مغربی تہذیب تمدن سے بے انتہا متاثر رہے ہیں۔ اس کا بہت بڑا سبب یہ تھا کہ ہم مغربی طاقتوں کے غلام تھے۔ اپنے سیاسی آقاؤں کی نقل میں ان جیسا ہونے کی آرزو ایک فطری عمل تھا لیکن ہم پر مغربی تہذیب کا جادو کچھ زیادہ ہی چل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے طور طریقے، اپنا رہن سہن، اپنا لباس، اپنی زبان، اپنا لب و لہجہ تک تبدیل کر لیا۔ ہم ان کے ایسے ہو گئے ہوتے تو ہمیں اس تغیر کو غلط نہ کہتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم ان کے ایسے نہیں ہو سکے ہیں ہمارے سنسکار اتنے گہرے تھے کہ ہم ان سے اپنے تمام رشتے توڑ ہی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہم پتلون پہنتے ہیں مگر کھانے کی میز پر بیٹھنے کی بجائے باورچی خانے میں چولہے کے قریب بیٹھ کر کھانا کھانا پسند کرتے ہیں۔ باورچی خانے میں روٹی پکاتی ہوئی بیوی یا والدہ کے قریب بیٹھنے میں پتلون آڑے آتی ہے لیکن ہم مجبور ہیں چونکہ پاجامہ اور دھوتی کو ہم قدامت کی، جہالت کی علامت گردان کر خیرباد کہہ چکے ہیں۔ پتلون سے ہمیں نماز پڑھنے میں دقت ہوتی ہے، مندر میں پالتھی مار کر دھیان کرنے میں دقت ہوتی ہے لیکن ہم مجبور ہیں۔

اسی طرح ہمیں یہ پسند ہے کہ آج جب سائنس کی ترقی نے انسان کو چاند کے سینے پر قدم رکھنے کا موقع عطا کر دیا ہے، ہم اپنی بہو بیٹیوں کو پردے سے باہر نکالیں اور شفاف دھوپ میں آنے دیں۔ لیکن ہم یہ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ ہماری بیٹی اپنے بھائی یا والد کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ اس کھلی دھوپ میں باہر نکلے۔ یہ تضاد درحقیقت دوروئی ہے، ہپوکریسی ہے۔ یہ دوروئی ہمارے کردار میں شامل ہوتی جا رہی ہے۔ نتیجے کے طور پر ہمارے قول و فعل میں تضاد آنے لگا ہے۔ "ذی ہوئی زبان" ایک ایسا محاورہ ہو گیا ہے جسے متروکات کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

زاہدہ زیدی

خدا خاموش ہے

خدا خاموش ہے
اشجار یوگی کی طرح دھونی رمائے ہیں
تھکی ہاری ہوائیں گھاس کے بستر پہ سوئی ہیں
سراسیمہ فضائیں سرنگوں ہیں
سرمئی چادر سے چہروں کو چھپائے ہیں
سمندر کی سلیٹی، شکست رو موجیں
کناروں سے گریزاں ہیں
فولاد و خار و خس کے ڈھیر میں اُلجھی ہوئی
مجروح ودگریاں ہیں

اندھیرے کی گپھاؤں سے نکل کر
نور کی پریاں اگر آئیں
پَر افشاں ہوں اگر اس وادیٔ پُرخار میں
اُن کے دمکتے بال و پر مجروح ہو جائیں
اندھیرے کا سمندر چار سُو اُمڈے
نگل لے نور کی مجبور کرنوں کو
خدا جاگے
مگر بس چند لمحوں کو
سیاہی کے سمندر اور کانٹوں کے بنوں میں
دیکھ کر پل بھر ہراساں ہو
گھڑی بھر کو پشیماں ہو
مگر کچھ سوچ کر اس منظرِ سفاک سے وہ بھی گریزاں ہو
وہ اپنی مملکت میں لوٹ جائے
اور خاموشی کی چادر تان کر
نیلی فضاؤں میں وہ پھر اک بار
گہری نیند سو جائے...

- - - - - - - - - - - - - - - -

اندھیرے کا سمندر چار سُو اُمڈے۔

اِس مضمون سے میرا مقصد نہ تو آپ کو اپنی وضع قطع تبدیل کرکے پھر سے قدیم لباس پہننے کی طرف راغب کرنا ہے اور نہ یہ کہنا کہ آپ انفرادی گھروں کی اکائیوں کو مدغم کرکے پھر سے گھروں کی قدیم اکائیاں قائم کریں۔ وقت کے پہیئے کو پیچھے کی طرف گھمانا ناممکن ہے۔ میں ایسا کرنے کا مشورہ بھی نہیں دے رہا ہوں۔ میرا مقصد تو صرف اِن پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ہے جو ان تغیرات قدرتی کے پیدا کردہ ہیں لیکن جن کی وجہ سے ہم اپنی پہچان کھوتے جا رہے ہیں۔ نئی روشنی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بھی اگر ہم شعوری طور پر اپنے تہذیبی و تمدنی سرمایہ کی حفاظت کا عزم کرلیں تو یقیناً نقصانات کا اندیشہ کم ہو جائے گا۔ تغیر کو روکنا تو نہ آپ کے بس میں ہے نہ میرے۔

بقول علامہ اقبال: ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

لیلیٰ لکھنوی

ایک ہی راستہ

اس قدر شدت کی بارش اور تیز و تند برفیلی ہواؤں میں جانے وہ اِدھر کہاں سے آ پہنچی تھی۔ موسم سرما میں رات گئے ایک کمسن لڑکی کو اس طرح تن تنہا باہر نکلنا زیب نہیں دیتا۔ حالات خواہ کچھ بھی ہوں دنیا والے تو اسے کوئی ایسی ویسی ہی لڑکی سمجھ کر موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔

ماجد جب برساتی سے اپنے کو لپیٹے تیز تیز قدموں سے تیسری منزل پر اپنے فلیٹ میں جانے کے لئے جیسے ہی سیڑھیوں کی طرف آگے بڑھا تو اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب اس کی نگاہیں ایک معصوم، تہی ساماں و خوبصورت لڑکی پر پڑیں جو بارش سے شرابور بھیگی پرانی ملگجی شال میں لپٹی سردی سے کانپ رہی تھی۔

نیم تاریک سیڑھیوں پر اس کے سرو جیسے قد اور نگاہوں کو خیرہ اور دل و دماغ کو چونکا دینے والے حسن کو دیکھ کر وہ نقش دیوار ہوگیا۔ ماجد کو دیکھ کر لڑکی گھبرا اُٹھی۔ ڈر اور خوف کے مارے وہ سہم کر دیوار سے لگ گئی۔ افسردہ روئی روئی نگاہیں ندامت اور شرم سے جھک گئیں۔ اس کے انداز اور طور طریق اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ کوئی بازارن نہیں تھی۔ اس میں نہ کوئی دلنوازی کی ادائیں تھیں اور نہ ہی معشوقانہ انداز۔ اس کے جسم کے کپڑے بھی کثیف اور ملگجے تھے جو اس کی خستہ حالی کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اگر وہ کوئی پیشہ ور ہوتی تو رات کے اندھیرے میں لوک پلک سے سج دھج کر باہر نکلتی کہ ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز بن جائے۔ لیکن اس لڑکی کے چہرے اور لباس سے اس بات کا انکشاف ہوتا تھا کہ وہ حالات کا شکار ہے۔ اس کا بجھا بجھا سا وجود کملایا ہوا چہرہ اور گھبرایا ہوا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی سخت بحران میں مبتلا ہے۔ ماجد بولا "کون ہو تم اور اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اس کے جواب میں وہ بے اختیار سسک اٹھی۔

اگر ماجد کو کسی شے سے نفرت تھی تو وہ رونے سے۔ اور عورتیں تو رونے اور واویلا کرنے میں بڑی ماہر ہوتی ہیں۔ ان کا یہ وار بڑا کارگر اور موثر ثابت ہوتا ہے۔ اس لمحے بھی جب وہ لڑکی رونے لگی تو اسے کچھ بوریت سی ہونے لگی لیکن پھر بھی ماجد کے دل میں اس کے لئے ہمدردی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا "دیکھو اس طرح رونے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ جو کچھ مدد میں کر سکتا ہوں وہ کروں گا۔ مجھ پر اعتماد کرو"

اس کی آواز میں خلوص تھا۔ لڑکی نے اپنی بھیگی بھیگی سرخ نگاہیں اوپر اٹھائیں وہ ماجد کے چہرے کو دیکھتی رہی جیسے اسے پرکھ رہی ہو کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس میں صداقت بھی ہے کہ نہیں۔ پھر رندھی سی آواز سے بولی "میں بارش رُکنے کا انتظار کر رہی ہوں جیسے ہی بارش رُکے گی چلی جاؤنگی"۔

"میرا کہا مانو جب تک تم میرے فلیٹ ہی میں بیٹھو جیسے ہی بارش بند ہوگی میں خود تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤنگا

اتنی رات گئے تمہارا تنہا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ جب اکیلی جوان عورت رات گئے باہر نکلتی ہے تو گھات میں چھپے بیٹھے بھیڑیئے نما انسان اس کی بوٹیاں چبا جاتے ہیں۔" جانے کیوں اس کا دل اس لڑکی کی حفاظت کرنے پر مُصر تھا۔ لڑکی کے چہرے پر ڈر اور دہشت کے گھنگھور سائے چھا گئے، لرزتی آواز سے بولی۔ "لیکن اب میرا نہ کوئی گھر ہے اور نہ ہی کوئی اپنا۔ اگر آپ مجھے یہاں ٹھہرنے کی کچھ دیر اور اجازت دے دیں تو آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

ماجد کا دل رحم اور ہمدردی سے پگھل گیا۔ "نہیں یہاں سیڑھیوں پر میں تمہیں کھڑے رہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔" وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے ساتھ وہ آہستہ قدم چلنے لگی۔ فلیٹ کے دروازے کا قفل کھول کر جب اس نے لائٹ آن کی تو اندھیرا کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔

ماجد نے دیکھا وہ لڑکی سر سے پا تک بڑی پیاری تھی۔ بے حد معصوم اور بھولی۔ فلیٹ میں داخل ہو کر زخشی نے محسوس کیا کہ وہ جو شخص از راہِ ہمدردی اُسے اپنے گھر لایا تھا وہ وہاں تنہا تھا۔ وہاں نہ اس کی بیوی بچے تھے اور نہ ہی کوئی دوسرا فرد۔ ایک بار پھر وہ ڈر سے کانپ کر بلک بلک کر رو دی۔ تو ماجد نے گھبرا کر پوچھا "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ اب تم میرے تحفظ میں ہو پھر یہ رونا کس لئے؟ یہاں آرام سے بیٹھو۔ اپنی گیلی شال اُتار دو ورنہ بیمار ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں چادر دیتا ہوں وہ اوڑھ لو۔" مگر وہ بدستور دروازے کے پاس کھڑی روتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ اس شخص کے خاندان کے ساتھ وہ کچھ ساعتیں گذارے گی مگر اوپر آ کر معلوم ہوا کہ سوائے اس کی ذات کے وہاں کوئی بھی نہ تھا جس نے اس کے ہوش اُڑا دیئے۔ سارا جسم برف کی قاش بن گیا اور آنکھوں کے سوتے کھُل گئے۔

بڑی عاجزی سے بولی۔ "خدارا دروازہ کھول دیجئے اور مجھے جانے دیجئے۔ وہ ہاتھ میں چادر لئے جلدی سے لپک کر اس کے پاس آیا اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اسے پیش کرنے لگا۔ مگر وہ جانے کے لئے اس قدر بدحواس ہو رہی تھی کہ چادر کی طرف اس نے نگاہ بھر کر دیکھا تک نہیں۔

"دیوانی ہو گئی ہو کیا؟ ایسی طوفانی رات میں اب کہاں جاؤ گی جبکہ بقول تمہارے اب نہ تمہارا گھر ہے اور نہ ہی عزیز و اقارب۔ یہاں آرام سے بیٹھو میں تمہارے لئے گرم گرم چائے لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر ماجد میز پر سے تھرمس لایا۔ اسے کھول کر اس میں سے چائے انڈیل کر کپ اس کی طرف بڑھایا لیکن زخشی نے منہ موڑ لیا اور بولی۔

"میرا خیال تھا آپ کے گھر میں آپ کے خاندان کے اور بھی لوگ ہوں گے مگر یہاں تو سوائے آپ کے اور کوئی بھی نہیں ہے۔ اسی لئے میں آپ سے بار بار کہہ رہی ہوں کہ مجھے جانے دیجئے۔"

"تو کیا ہوا اگر میری فیملی میرے ساتھ نہیں ہے تو کیا میں تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ اتنی رات گئے تم تنہا گھر سے کیوں نکلی؟ اور ہاں میں تمہارا نام تو پوچھنا ہی بھول گیا۔"

"زخشی کہتے ہیں مجھے۔ آپ جیسے لوگ جو راحت اور عافیت کی زندگی گذارتے ہیں وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یتیم، لیسر اور بے سہارا لوگوں کی نامرادی کی زندگیاں کس کسمپرسی کے عالم میں گذرتی ہیں۔ میری سوتیلی ماں جو میرے دور کے رشتے کی چچی بھی لگتی ہیں ـــــ انہوں آج رات مجھے مار کر گھر سے نکال دیا صرف اتنی سی بات پر کہ میں وقت پر کھانا تیار نہ کر سکی۔ کرتی بھی کیسے جبکہ لکڑیاں گیلی تھیں۔ یہ دیکھئے میرے بازو سے اب بھی خون بہہ رہا ہے۔ اگر ابو، امی اور بھیا ہوتے تو میری یہ گت نہ بنتی۔ وہاں کون تھا جو میرا پرسانِ حال ہوتا۔ جب جینے اور دلبستگی کے سہارے ٹوٹ جائیں اور دنیا میں کوئی اپنا نہ رہے تو ایسی زندگی کس کام کی۔" زخشی کے چہرے پر کرب ناک اثرات اور گہرے ہو گئے اور آنکھوں کے سوتے کھُل گئے۔

ماجد کا دردمند دل تڑپ اُٹھا وہ اداس لہجے میں بولا "کیا تمہارا کوئی بھی قریبی عزیز یہاں نہیں ہے۔ آخر

تمہارا بھائی کہاں ہے؟"

"جو اپنے تھے وہ ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو گئے یا بچھڑ گئے اور جو یہاں ہیں وہ دور کے رشتے دار ہیں۔"

اس کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

"اس میں کوئی کلام نہیں کہ تمہارے حالاتِ زندگی بے حد دردناک ہیں۔ اگر بُرا نہ مانو تو اپنے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ شاید میں تمہارے کام آسکوں۔" ماجد کی آواز میں ہمدردی اور خلوص تھا۔

"تقریب دو سال ہوئے جب امی ایک طویل علالت کے بعد ہم سب کو روتا چھوڑ کر ابدی نیند سو گئیں تو ابو نے طیب بھائی اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ انہوں نے ہمیں ٹوٹ کر چاہا۔ ہماری راحت اور آرام کیلئے کیا کچھ نہیں کیا۔ ان کے پیار اور محبت نے جو مرہم ہمارے دلوں پر لگایا تھا اُس سے امی کی موت کے زخم مندمل ہونے لگے تھے۔ پھر ایک دن ہماری دور کے رشتے کی بیوہ چچی مع اپنے دو بیٹوں کے ساتھ آگئیں۔ بس ان کا آنا ہماری بربادی کا پیغام تھا۔ ابو کے سامنے امی کا ذکر کر کے خوب روئیں۔ ہم دونوں بہن بھائی کو گلے سے لگا کر تسلی دی اور اس قدر حسنِ سلوک اور محبت سے پیش آئیں کہ ہم سبھی ان کے گرویدہ ہو گئے۔ چند دن کے اندر ہی اندر انہوں نے گھر کا سارا کام بڑے سلیقے سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب ابو سکریٹریٹ جاتے جہاں وہ ہیڈ کلرک تھے بھیا کالج اور میں اسکول تو وہ بڑی پھرتی اور خوش اسلوبی سے ہم لوگوں کو ناشتہ تیار کر کے کھلاتیں۔ ابو کیلئے کھانا ساتھ کرتیں۔ ابو ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ عورت شکل وصورت سے بھی اچھی تھی اور اس پر بے حد سمجھ دار اور چالاک۔ اس نے اپنا ہر وار موقع محل دیکھ کر کیا جانے کب اور کس وقت ابو سے درپردہ قول قرار اور عہد وپیماں ہوئے کہ وہ ان کے جال میں پھنستے چلے گئے اور بغیر طیب بھائی اور مجھے بتائے نکاح کر لیا۔ اس دن بھیا اور میں بہت روئے تھے۔ آخر صبر کی سِل سینے پر رکھ کر زندگی کے

اس چیلنج کو بھی قبول کر لیا۔" وہ ایک ہی سانس میں اتنا کہہ گئی اور دم لینے کیلئے چند سیکنڈ رکی۔ جیسے ایک بہت لمبا سفر کر کے آئی ہو۔ ماجد نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک چودہ یا پندرہ سال کی لڑکی کو اس طرح باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اور باوجود کمسنی کے وہ اپنی عمر سے کچھ بڑی نظر آرہی تھی۔ لب ولہجہ کی شائستگی نے اس کی زبان کو جو فصاحت اور خوش بیانی عطا کی تھی وہ ماجد کو حیران کر گئی۔ اس نے دیکھا رحمتی کی چائے کی پیالی جوں کی توں رکھی تھی۔ اس نے پیالی کو چھوا تک نہ تھا۔

"چائے تو پی لو۔ اب تو یقیناً ٹھنڈی ہو گئی ہوگی۔ اگر کہو تو اور بنا دوں! بس چند منٹ لگیں گے۔"

"نہیں۔ جب دل اُداس ہوتا ہے تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"ہاں تو پھر کیا ہوا؟" وہ بڑے غور سے اس کی سرگزشت سُن رہا تھا ـــــــ

"ابو سے نکاح کے چند ہفتے بعد ہی چچی کا طیب بھائی اور میرے ساتھ برتاؤ بدل گیا۔ اب زیادہ تر وہ خود بخود ہم دونوں سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتیں۔ اپنے بیٹوں کی حمایت اور طرف داری میں مجھے بے دریغ صلواتیں سناتیں۔ غرضیکہ وہ پیارا سا گھر جس میں ہم آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے، جہنم بن کر رہ گیا۔ ابو نے ہم لوگوں کو روتے بھی دیکھا مگر خاموشی کے ساتھ شکوے بھی سنے اور چچی کی بدزبانی بھی سنی مگر ایک لفظ نہیں بولے۔ شاید اپنے دل میں نکاح کر کے شرمسار تھے۔ کیونکہ انہوں نے چچی کا صرف روشن پہلو ہی دیکھا تھا ان کے ظاہری اخلاق کا، خوش طبعی کا اور بناوٹی محبت کا۔ اور اب مگر وہ پہلو بھی دیکھ رہے تھے جس کی انہیں امید نہ تھی۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ حالات اس درجے پر پہنچ جائیں گے۔ وہ ہمیشہ کے کم سخن اور کم گو انسان تھے۔ جب ہی تو گھر کے حالات دیکھ کر وہ ہر وقت اداس اور فکرمند رہنے لگے۔ جب کبھی بھیا کو چپ اور مجھے روتا ہوا دیکھتے بس صرف اتنا کہتے "میرے جیتے جی کسی بات کا رنج نہ کرو۔ بس خوش رہو۔ ابھی میں زندہ ہوں۔" وہ ہم لوگوں کو خوش رہنے کیلئے کہتے تھے مگر خود ذہنی انتشار کا شکار

ہوگئے تھے اور ایک دن آفس میں ان کا ہارٹ فیل ہوگیا انکی موت ہمارے وجود کے ایک حصے کی موت تھی۔ وہی ہماری بقا کا عیار اور دم ساز تھے۔ انہیں کی اماں میں ہم جی رہے تھے۔ ان کی موت کے بعد ہماری زندگی میں ایسا طوفان آیا کہ قدم ڈگمگا گئے۔ دل کے گوشوں سے لہو کا سیلاب اُبل پڑا۔ کلیجے میں درد سا اُٹھا اور پھیلتا گیا۔ کئی دن تک کوئی ہوش نہیں رہا کہ کب صبح ہوئی اور کب رات۔ ... ایک گھور اندھیرا تھا جو ہر طرف طاری تھا۔ چچی جو تھوڑی سی ظاہرداری ابو کی ذات سے برتتی تھیں وہ نقلی ملمع کی طرح آناً فاناً اُتر گئی۔ اب نہ انہیں کسی کا لحاظ تھا اور نہ پاس اب وہ ہر وقت کھنچی کھنچی سی رہنے لگیں۔ اُن کے ترکش میں جتنے تیر تھے ان سے ہم دونوں کا دل و جگر چھلنی کر دیا۔ خوب جی کے لگائے۔ خوب اپنی حسرتیں نکالیں،" وہ سسکنے لگیں۔

" آخر تمہارے بھائی کا ردِعمل کیا تھا؟ وہ تو مرد تھا اس قسم کی توہین اور اشتعال انگیزی کی باتیں کیسے گوارا کرتا رہا؟ اور آج رات جب تمہاری چچی نے تمہیں گھر سے نکال دیا تو اس نے تمہیں کیسے تنہا جانے دیا؟ "

" طیب بھائی بہت ہی خود دار اور ابو کی طرح کم سخن واقع ہوئے ہیں۔ چچی کے زہر میں بجھے ہوئے کلمات، بات بات پر فقرے بازی طنز و تضحیک آمیز گفتگو نے ان کے سکون کو درہم برہم کر دیا۔ میں نے اکثر راتوں کو انہیں روتے دیکھا تھا۔ وہ بی اے کرنا چاہتے تھے لیکن ابو کی موت نے ان کی آرزو تہ تیغ کر دی۔ ہر وقت کی طعن و تشنیع سے تنگ آ کر ایک دن بھوکے پیاسے گھر چھوڑ کر چلے گئے اور آج تک واپس نہیں آئے" یکبارگی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر سنبھل کر بولی" ان کو گھر سے گئے ڈیڑھ مہینہ ہوگیا ہے۔ انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ کاش بھیا مجھے بھی ساتھ لے جاتے تو میں چچی کے مظالم اور ہر وقت کی تُوتُو سے بچ جاتی۔ اب تو جینے کا کوئی سہارا بھی نہیں رہا۔" رخشی کے چہرے پر بیکراں غم اور اُداسی چھا گئی تو ماجد کا درد مند دل تڑپ اُٹھا۔ وہ سوچنے لگا" یہ پیاری سی معصوم لڑکی جو اس کمسنی میں دنیا کے غموں اور جان لیوا مراحل سے ہمکنار ہو کر اس وسیع دنیا میں محبت اور گھر کے تحفظ سے محروم کر دی گئی ہے اور اس کا انجام اور حشر کیا ہوگا؟ وہ نادان یہ سوچنے سے قاصر ہے کہ اس جہان کے شریف بدمعاش اور درندے نما انسان اس کے پاکیزہ دامن کو داغدار کر دیں گے اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا لیں گے اور اس کی آبرو سرِ بازار بکے گی۔ اگر ہم میں سے کسی نے اُسے سہارا نہ دیا تو غیرتِ انسانی بے آبرو ہو جائے گی۔ آخر اس کی اپنی بھی تو بہن ہے۔ کیا وہ یہ بے حرمتی اور آبرو ریزی اپنی بہن کے لئے گوارا کرے گا؟ اگر نہیں تو وہ اس یتیم و بلبیر پھول جیسی بے سہارا بچی کو سہارا کیوں نہیں دیتا؟

اگر وہ اسے اپنے وطن علی گڑھ لے جائے اور اپنے بھائی رضا کی شادی اس سے کر دے تو کتنا اچھا ہو۔ اس کی زندگی بھی سنور جائے گی اور رضا کا گھر بھی آباد ہو جائے گا" یہ خیال آتے ہی دفعتاً ماجد کے اُداس چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

" رخشی تمہیں زندگی سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ انسان کی زندگی میں غم آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں جس طرح ہر رات کے بعد سحر ہوتی ہے۔ خوشیوں کی عمر تو بہت مختصر ہوتی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم ساری زندگی اداسی اور ناامیدی کی نذر کر دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنی سی عمر میں تم نے بڑی سختیاں جھیلی ہیں بڑے عظیم صدمے اٹھائے ہیں مگر تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟ مشیتِ ایزدی کے سامنے انسان سرنگوں ہے لیکن رخشی مرنے والوں کے ساتھ لوگ مر نہیں جاتے ہیں اور نہ جانے والوں کو روک سکتے ہیں۔ مگر قسمت سے اب تم مجھے مل گئی ہو میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے دامن میں خوشیاں بھر دوں گا۔"

رخشی کی نگاہیں ماجد کے مسکراتے چہرے پر پڑیں۔ اس کے الفاظ زور زور سے اس کے کانوں میں گونجنے لگے "قسمت سے اب تم مجھے مل گئی ہو میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے دامن میں خوشیاں بھر دوں گا۔" تو وہ جیسے یکدم ہوش میں آگئی۔ ماجد کے انداز اور الفاظ نے اسے بدحواس کر دیا دل کے اندر ایک کوندا سا لپکا اور ہزاروں

اندیشوں نے اُسے گھیر لیا۔ وہ لرز اٹھی۔ اس نے مردوں کی عیارانہ فطرت، ریپ اور مظلوم لڑکیوں کی بیکسی کی بڑی دردناک داستانیں سنی تھیں اور واقعات پڑھے تھے اور آج وہ تن تنہا اس طوفانی اندھیری رات میں ایک غیر مرد کے فلیٹ میں اسیر بیٹھی تھی اور باہر اب بھی اسی شدت سے بادل گرج رہے تھے اور بارش ہو رہی تھی۔ اس کی زخمی روح زخمی پرندے کی طرح چھٹپٹا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی اس کی بدنصیبی اسے ایسے موڑ پر لے آئی تھی جہاں سے اس کے فرار کی ہر راہ مسدود تھی اور جذبات کی رو میں اس غیر اور اجنبی شخص سے جانے کیا کیا کہہ گذری تھی جیسے کسی نے آتش فشاں کا دہانہ کھول دیا ہو اب وہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا کہ وہ کس قدر مجبور اور بے بس ہے۔ نہ اس کا کوئی سرپرست ہے اور نہ کوئی مددگار! اب کسی لمحہ بھی وہ اس کی عصمت پر ڈاکہ ڈالنے والا ہے!!" اسے ماجد کی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی ہمدردی اور بے تکلفی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بدحواس کر گئی۔ اس کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں تو وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

"نہیں اب مجھے کچھ نہیں چاہیئے میں اب جاؤں گی" وہ بے تحاشہ بند دروازے کی طرف بڑھی اور چٹخنی کو ہاتھ لگا کر کھولنے کی ناکام کوشش کرنے لگی مگر اس تک اس کا ہاتھ نہ پہنچ سکا تو رخشی بچوں کی طرح رو دی۔

"یہ کیا دیوانگی ہے رخشی؟ اس طوفانی رات میں آخر تم کہاں جاؤگی؟ ذرا سوچو تو۔ تم آرام سے دوسرے کمرے میں جاکر سو جاؤ۔ صبح میں تمہیں اپنے وطن علی گڑھ لے چلونگا وہاں میرا سارا خاندان ہے۔ بیوی بچے، ماں، بہن اور بھائی تم ان کے ساتھ رہنا۔ وہ سب تمہیں بڑے پیار سے رکھیں گے"۔ ماجد کی آواز میں بڑا خلوص بڑی اپنائیت تھی مگر وہ بڑے غصے اور بیزاری کے ساتھ بولی "میں کہیں بھی جاؤں آپ کو مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں کسی غیر کے گھر ہرگز نہیں جاؤں گی یہ میری غیرت اور خودداری کی توہین ہے۔ مجھے لفظ ترس سے نفرت ہے کہ انسان کسی کی ہمدردیوں اور رحم کا خواہش مند ہو اور یا کسی کی مہربانی کا، مجھے اپنے غم میں کسی غیر کی شرکت گوارا نہیں ہے۔ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔ آپ برائے مہربانی دروازہ کھول دیجئے" اس کی لرزتی آواز کمرے میں گونج گئی۔

"نہیں رخشی دروازہ نہیں کھلے گا۔ باہر کی دنیا تنہا اور جوان لڑکیوں کو راس نہیں آتی ہے۔ زندہ رہنے کی للک میں جب بے سہارا عورت باہر نکلتی ہے تو لامحدود شریف بدمعاش آدم زاد خونخوار درندے اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ میں نے کہا نا بس آج کی رات تم یہاں گذار لو بس صبح ہوتے ہی میں تمہیں علی گڑھ لے جاؤں گا۔ میں دوسرے کمرے میں تمہارا بستر ٹھیک کئے دیتا ہوں"۔ ماجد کی آواز میں تحکم اور اصرار تھا ـــ جسے سن کر رخشی کے سارے جسم کا خون منجمد ہوگیا۔ رہے سہے حواس اڑ گئے اور دل بہت گھبرانے لگا۔ اب رہائی کے راستے بند ہوگئے تھے ..... فرار کا ہر وار خالی گیا ..... ہر طرف مایوسی اور ناامیدی کے تاریک اور ڈراؤنے اندھیرے چھا گئے!!

جیسے ہی ماجد دوسرے کمرے کے اندر گیا رخشی نے بڑی پھرتی سے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھولی اور ایک جست میں نیچے چھلانگ لگادی ـــ کھڑکی کھلنے کی آواز کے ساتھ فضا میں ایک باریک دردناک چیخ گونجی اور بارش کی رم جھم میں گم ہوگئی تو یکبارگی ماجد کا دل دہل اٹھا۔

وہ بدحواس گھبرایا گھبرایا ڈرائنگ روم میں آیا تو وہاں وہ نہ تھی۔ کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے، ور باہر سے برفیلی ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔ لرزتے قدموں اور دھڑکتے دل سے کھڑکی سے باہر جھانکا تو بڑا ہی روح فرسا منظر تھا۔ ڈامر کی پتھریلی زمین پر رخشی کا نازک بدن کیچڑ میں لتھڑا اور لہو کے دریا میں نہایا پڑا تڑپ رہا تھا اور جیسے ساری فضا سرخ ہوگئی تھی ...... اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے دردمند دل تڑپ اٹھا...... کیسی عجب بات تھی کہ رخشی اس کے دلی جذبات سمجھنے سے قاصر تھی اور اس نے اپنی آبرو بچانے کیلئے جان دے دی۔

"یا خدا میں نے کیا چاہا تھا کیا ہوگیا"......

بے اختیار وہ کہہ اٹھا "میری ننھی منی بہن تو نے اپنے بھائی کو پہچاننے میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اری میں تو اپنے بھائی کے ساتھ تیری شادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ تیری ویران زندگی کو گلزار بنانا چاہتا تھا۔ تیرے آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کر لینا چاہتا تھا ـــ کاش تو اتنا تو سمجھتی کہ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں آج بھی دردمند دل دوسروں کی چاہت اور ہمدردی میں دھڑکتے ہیں، باوفا اور پُرخلوص لوگ اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ کاش مجھے موقع تو دیا ہوتا ـــ مجھے ایک بار آزما کے تو دیکھا ہوتا ـــ میں وہ نہیں تھا جو تو مجھے سمجھ بیٹھی تھی۔ میں نے تو صرف ایک رات یہاں بسر کرنے کے لئے کہا تھا اور سحر ہونے میں تو صرف چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ اتنی جلدی کا ہے کی تھی؟ کیا یہی ایک ہی راستہ نجات کا رہ گیا تھا؟

وہ کانپتے لرزتے قدموں سے فلیٹ کے نیچے اُترا ..... اپنے ہاتھوں سے چادر اس کے بھیگے جسم پر ڈال جیسے وہ اوپر چھوڑ آئی تھی۔ جانے کتنی دیر تک وہ غمگین ویران سا لاش کے پاس بارش میں کھڑا بھیگتا رہا اور اشک برساتا رہا۔ رجنی کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔"

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ارجن داس ملک نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او نمبر ۱۸۹-۱۹۱ سیکٹر ۱۷سی، چنڈی گڑھ سے مئی ۸۸ء کے لئے شائع کیا۔
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ ٹی۔ چنڈی گڑھ

شو دیال سحاب

غزل

جھلکے جو نہ پردے سے وہ جلوہ نہیں ہوتا
خود جلوہ ہی پردہ ہو تو پردہ نہیں ہوتا

اللہ رے فضا تابیِ جلوہ کا یہ عالم
اُس حسنِ شفق تاب سے پردہ نہیں ہوتا

پردے میں بھی کر لیتے ہیں وہ اُن کا نظارہ
اربابِ نظر سے کبھی پردہ نہیں ہوتا

کچھ شائقِ جلوہ کی نگاہوں میں کشش ہے
کچھ جلوے کی شوکت ہے کہ پردہ نہیں ہوتا

جلوے کی ضیاؤں کا اِک آئینہ ہے پردہ
یوں عکس نمایاں ہے کہ پردہ نہیں ہوتا

جب حدِ نظر سے بھی گزر جاتی ہیں نظریں
اُن کا کہیں سنگم ہو تو پردہ نہیں ہوتا

پردے سے عبارت ہے سحاب اذنِ تماشا
یہ حسنِ طلب ہوتا ہے پردہ نہیں ہوتا

مصوّر سبزواری

غزلیں

انجانا سا روگ لگا ہے کیا سمجھائیں تمھیں
اپنی چاہت اِک خوشبو ہے کیسے دِکھائیں تمھیں

جانے والو! ہم کیا دیں گے اور دعائیں تمھیں
اپنی عمر کے باقی دن بھی سب لگ جائیں تمھیں

نزدیکی سے ختم ہوئی قدر و قیمت اپنی
تم سے دُور چلے جائیں تو پھر یاد آئیں تمھیں

اب کے سفر میں اندر اندر یوں جی ڈرتا ہے
جیسے پلٹ کے اب ہم شاید دیکھ نہ پائیں تمھیں

تنہائی سے اتنا مصوّر کیوں گھبراتے ہو
کاٹ کے اِک دن گھر جانا ہے اپنی سزائیں تمھیں

جب کسی کے پلٹ آنے کی توقع ہی نہ ہو
جلتی دہلیزوں کی ہر آنکھ بجھا دی جائے

خواب ہی کاٹنے ہیں خواب اگانے والو
کیا زیاں ہے جو بھی عمر گنوا دی جائے

کشتیٔ نوح نہیں ہم جو بچا لیں سب کو
جو جہاں ہے وہیں رہنے کی دعا دی جائے

اپنے احسان سے تن پوشیاں کرنے والو
مجھے الفاظ کی چادر ہی اڑھا دی جائے

اور سناٹے ہوئے دشتِ ندا کے گہرے
کیا خبر آج کی شب کس کو صدا دی جائے

ایس۔ ایس۔ چاولہ

روحانی رشتے

ایک سال بعد موہنی چلنے پھرنے کے قابل ہو سکی تھی۔

مگر ایک سال پہلے۔ ڈاکٹر شیام نے اس کوٹھی کی حالت دیکھی تو اس کا دل بھر آیا تھا۔ حالت بہت خستہ تھی کبھی اس کوٹھی کے مکین اس شہر کی نامی ہستیاں مانی جاتی تھیں۔ اور آج نہ تو اس کوٹھی کے مالک نظر آتے تھے۔ نہ نوکروں کی ریل پیل تھی اور نہ کوٹھی کے آگے کاروں کی بھیڑ تھی۔ باغ اجڑا ہوا تھا۔

اس کوٹھی میں اس کی بے عزتی ہوئی تھی اور اس نے دوبارہ یہاں نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ مگر اس کی قسم پر ایک اور قسم کی گرہ لگ گئی تھی۔ جس کا وہ پابند تھا۔ اور آج وہ اس گرہ لگی قسم کو پورا کرنے کے لئے اس کوٹھی میں آیا تھا۔

ڈال پر ہرا پتہ خوب بہار دیتا ہے۔ اس پتہ کے ناز و نخرے بہت بھرتے ہیں۔ ہوا کے ذرا سے اشارے پر وہ لچک لچک کر ناچ اٹھتا ہے۔ ایسا ہی حال موہنی کا تھا۔ موہنی سیٹھ بنشی داس کی بیٹی تھی۔ موہنی کا بڑا بھائی باپ کے بزنس میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ موہنی چھوٹی تھی اور گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ موہنی بےحد خوبصورت۔ نازک بدن۔ باوقار تھی۔ وہ کالج کے پہلے سال میں تھی۔ سیٹھ جی کو شوق تھا، کہ ان کی لڑکی بی۔اے کرے اور پھر وہ اپنی برادری میں اپنے مقابل کا کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دیں۔

پڑھائی میں کمزور پا کر انہوں نے اس کی ٹیوشن رکھ دینے کی سوچی تھی۔ وہ کوئی بزرگ ماسٹر چاہتے تھے۔ کوئی بزرگ اچھا پڑھانے والا انہیں نہیں مل پایا تو انہوں نے اپنے ایک دوست کی سفارش پر شیام کو ٹیوشن پڑھانے کے لئے رکھ لیا تھا۔ شیام میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں تھا۔ وہ بے حد لائق اور حلیم نوجوان تھا۔ باپ کسی دفتر میں کلرک تھا۔ گھر بہن بھائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ اپنی لیاقت اور وظیفے کے بل بوتے پر اپنی پڑھائی کر رہا تھا۔ ٹیوشن کی تمام آمدنی وہ ماں باپ کو دے دیتا تھا۔ امیری ایک ایسی ادا ہے جس میں تمام قصور تو کیا۔ سات خون تک معاف ہو جاتے ہیں اور غریبی ایک ایسی لعنت ہے، ایک ایسی دلدل ہے، جس میں پھنس کر اچھا بھلا انسان بھی بے بسی بے حسی کی دلدل میں دھنسا چلا جاتا ہے۔ اس لئے شیام عشق کا خیال اپنے دل میں کیسے لاتا؟ شیام کئی اور لڑکیوں کے ٹیوشن

لیتا تھا۔ مگر اس نے ہمیشہ اپنے کام سے مطلب رکھا تھا۔
یہاں پر بھی اُس نے اپنی ڈیوٹی کو ہمیشہ ترجیح دی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مگر بھلا ہو جوانی کے جوش۔ امیری کی شان۔ حُسن کی ضد اور
نزیا ہٹ کا کہ موہنی شیام پہ ہزار جان سے فدا ہو گئی تھی۔
شیام کی اُس سے متعلق لا تعلقی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کشش
کا باعث بنی تھی وہ اس کو جیت لینا چاہتی تھی۔ شیام نے پانی کے
علاوہ اس گھر میں اور کسی چیز کو کبھی بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا
یہاں موہنی اچھے سے اچھے کھانے۔ پکوان اُس کے سامنے رکھتی
مگر وہ ان کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ موہنی سوچتی
رہتی تھی کہ وہ اس پتھر کو موم کیسے کرے!

اب یہ بھی ممکن نہ تھا کہ شیام نے موہنی کے حُسن کو
دیکھا یا سراہا نہیں تھا۔ مگر وہ اپنی حد سے آگے بڑھنا نہیں
چاہتا تھا۔ وہ لکشمن ریکھا کو پار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وُہ ایسے
خالی عشق کو کیا کرتا جس سے پیٹ کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہو۔
پھر بدنامی زیادہ اور فائدہ کم۔ آخر موہنی نے اپنی چند سہیلیوں
سے مشورہ طلب کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ موہنی کی سالگرہ قریب
ہے۔ وہ شیام کو بغیر بتائے اس میں شامل کر لے۔ موہنی اس
دن اس کی خوب خاطرداری کرے۔ جتنا نزدیک ہو سکے وہ
ہو جائے۔ وہ بھی آخر انسان ہے کچھ تو کھُلے گا ہی۔ پھر موہنی
کی ہمت ہے! — جنمدن پر موہنی اور اس کی چند سہیلیاں شیام
کے انتظار میں موجود تھیں۔ موہنی نے کہا کہ وہ آج نہیں پڑھے گی اور
وہ شیام سے گزارش کرے گی کہ وہ بھی اس پارٹی میں شامل ہو
جائے۔ شیام نے بار بار انکار کیا۔ مگر موہنی نے کہا کہ کیا آپ میری
اتنی سی بات بھی نہیں مان سکتے؟ میری سہیلیوں کے سامنے
آپ میری بے عزتی کر کے چلے جائیں گے؟ آپ کو تو چاہیئے کہ آپ
میری پوری طرح سے مدد کرتے۔ اتنی ساری لڑکیوں میں گھرا شیام
انکار نہیں کر سکا۔ موہنی نے شیام کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ ایسے
ایسے کام کرتے اُن دونوں کے کبھی ہاتھ ٹکراتے۔ کبھی جسم ٹکرا لیتے۔
بدن کی کشش اور اُن کے ٹکرانے سے جو ایک گرمی پیدا ہوتی ہے
اس سے چاہت اور نزدیکی کا راستہ کھُلتا ہے۔ پارٹی میں موہنی

کے کالج کے لڑکے لڑکیاں۔ دیگر دوست و رشتہ دار موجود
تھے۔ یہ سب نوجوان تھے۔ اس لئے شور و غل زیادہ تھا۔
شیام اپنی غریبی کا سرمایہ لئے ایک کونے میں دبک کر گُم
ہو جانا چاہتا تھا مگر موہنی کی خواہش تھی کہ شیام اُس کے
نزدیک رہے اور اس دن اسے نمایاں مقام ملے۔ موہنی کی کسی
سہیلی نے بے پر کی اُڑائی تھی کہ شیام بہت اچھا گاتا ہے۔
سو موہنی اور دُوسرے لوگوں نے گانے کی فرمائشیں بار بار
کیں۔ اور جب شیام نے گانا شروع کیا تو ایسے لگا جیسے وقت
رُک گیا ہو۔ لوگوں کے سانس رُک گئے ہوں اور لوگ اپنے وجود
تک سے بے خبر تھے۔ گانا ختم ہُوا تو طلسم ٹوٹا۔ زور زور کی
تالیاں بجیں۔ شیام کو مجبوراً دو اور گانے سُنانے پڑے۔
موہنی کی خوشی کی اُس دن انتہا نہ تھی۔

شیام نے غریبی تو بھرپور دیکھی تھی۔ ضرورتوں کی کمی۔
اپنی تنگی۔ بے کسی اور بے بسی سے تو وہ اچھا طرح آشنا
تھا۔ مگر دولت کو اس بے دردی سے بہا سکنے کا اس کا پہلا
تجربہ تھا۔ وہ بار بار سوچتا تھا کہ اس دن کی ایک پارٹی ایک
کھانے اور سجاوٹ کا خرچہ اس کے خاندان کے تمام سال کے
خرچہ سے بھی زیادہ تھا۔ کیا لوگ روپیہ کو اس بے دردی سے
لُٹا سکتے ہیں؟ اور دُوسری طرف لوگ بھُوکے۔ محتاج ہیں۔ پائی
پائی کو ترستے ہیں۔ اب یہ پرماتما کی یا دُنیا والوں کی اندھی بانٹ
ہے؟

اُس دن کے بعد موہنی نے شیام کو ایک تناور درخت
کی طرح مان لیا تھا اور خود ایک نازک پیاری بیل کی طرح اس
درخت کے گرد لپٹ جانے کی آرزو مند تھی۔ اس کے من میں
شیام اس کے لئے ایک بہت بڑا سہارا اور آسرا تھا۔ ۔ ۔
جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی گئی۔ شیام پیچھے ہٹتا چلا گیا تھا۔
شیام عشق کی آگ میں جل رہی موہنی کو کیسے سمجھا سکتا تھا کہ
اُن دونوں کا ملاپ ممکن نہیں ہے۔ امیری غریبی کا میل نہیں ہو
سکتا ہے۔ مگر عشق تو اندھا ہوتا ہے۔ وہ جس راہ پر چل نکلا،
بس چل نکلا۔ موہنی بار بار کہتی تھی کہ شیام جب تم ڈاکٹر بن جاؤ

سمجھے تو مجھے پہچان لینا۔ میں تمہاری ہم سفر بن جاؤں گی، اور کانٹوں کو بھی پھول سمجھ لوں گی۔ شیام نے موہنی کو دُنیا کی اُونچ نیچ سمجھائی مگر وہ اپنی ضِد کی پکی نکلی۔

آخر شیام کو ایک ہی طریقہ نظر آیا اور اُس نے وہ ٹیوشن ہی چھوڑ دی۔ وہ واپس وہاں نہیں گیا۔ اُسے خوشی تھی کہ اُس کو کشمکش دیکھا پار نہیں کرنا پڑی تھی۔ مگر شیام کا ہر اندازہ غلط ثابت ہُوا۔ عشق میں جل رہی موہنی نے شیام کا نہ آنا اپنی بے عزتی تصور کیا۔ اُسے اپنی امیری، خوبصورتی اور عقل پر ناز تھا۔ اُس نے آج تک اپنی ہر ضِد کو پُورا کروالیا تھا۔ اب وہ کیسے پیچھے رہ جاتی! اُس نے پھر اپنی سہیلیوں سے مشورہ کیا۔ کچی عمر کی کچی کلیاں اپنے کچے تجربہ کی بناء پر بس یہی سکیم بنا سکیں تھیں کہ موہنی شیام کی طرف سے چند عشقیہ خطوط کِسی سے لکھوالے اور شیام نے جو نہ دستخط موہنی کی کاپی پر کئے تھے اس کی کاربن سے پہلے نقل کر کے بعد میں سیاہی سے پکا کر لیا جائے اور سب کو یہی کہے کہ وہ اور شیام ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ خطوط ثبوت ہو جائیں گے۔ موہنی نے پہلے بات اپنی ماں سے کی۔ وہ سُنتے ہی آگ بگولا ہو گئی تھی۔ وہ سیدھی موہنی کے پتاجی کے پاس پہونچی۔ مشورے ہوئے اور آخر کار موہنی کے پتاجی نے اپنے اُس دوست کو بُلوالیا جس نے شیام کی سفارش کی تھی۔ پھر شیام اور اس کے پتاجی کو بُلا لیا گیا تھا۔ شیام پر الزام لگائے گئے کہ اس نے موہنی جیسی معصوم لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں پھانسا۔ اُسے عشقیہ خطوط لکھے۔ اسے شادی بیاہ کے جھُوٹے وعدے کئے۔ ایسے وہ اپنی اوقات بھُول کر اُن لوگوں کی عزت سے کھیلا تھا۔ وہ چاہیں تو شیام کے خاندان کے تمام افراد کو ختم کروا سکتے ہیں۔ ان کی بے عزتی بھی کی جا سکتی ہے۔ اُن کو اِتنا مجبور بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس شہر کو ہی چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر وہ یہ ظلم نہیں کرنا چاہتے۔ اب شرافت اِسی بات میں ہے کہ شیام آئندہ ایسی گندی، گری ہُوئی اور کمینہ حرکتوں سے باز آجائے۔ ورنہ ان کا حشر بُرا ہوگا۔ شیام یہ تمام الزامات سُن کر حیران رہ گیا تھا۔ یہ انہونی کیسے ہوئی

بن کر اُس کے سامنے آرہی تھی۔ اُس نے کہا کہ تمام الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں۔ اتنے میں موہنی آگے بڑھی اور اُس نے کہا کہ شیام میں نے حقیقت بیان کر دی ہے۔ تم نے میرے من میں پیار کی چنگاری سُلگا دی تھی۔ وہ اب اتنی بڑھ چُکی ہے کہ کسی طرح سے بجھائی نہیں جا سکتی۔ یہ سچ ہے کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

شیام نے دیکھا کہ اگر موہنی نے لڑکی ہو کر اتنی ہمت دکھائی ہے تو اس موقعہ پر پیچھے ہٹ جانا مردانگی میں شامل نہیں ہوگا۔ شیام نے ہوش سے کام لیا اور کہا کہ موہنی جو کچھ بات تم نے کہی اگر وہ ٹھیک ہے تو یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر میں نے شادی کروائی تو وہ صرف تم سے ہوگی ورنہ میں ساری عُمر شادی نہیں کرواؤں گا۔ موہنی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے آبشار رواں تھے۔ بمشکل آواز کو قابو میں کر کے وہ بولی کہ میرے شیام میں ہندوستان کی ایک بے بس لڑکی ہوں جسے بھیڑ بکری ہی سمجھا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے اُس کی رسی اُسکے ماں باپ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور شادی کے بعد وہ رسی اور عورت نما جانور دونوں سسرال والوں کو سونپ دیئے جاتے ہیں۔ اگر کبھی میرے ساتھ زبردستی کی بھی گئی تو وہ شادی میرے جسم سے تو ہو سکتی ہے مگر یہ رُوح اچھُوتی اور کنواری تمہاری اور صرف تمہاری رہے گی۔ اور جب بھی میں دُنیاوی بندھنوں سے آزاد ہوئی تو میں تمہارا انتظار اسی کوٹھی میں رہ کر کروں گی۔ میرے شیام، آنا مت بھُولنا۔ میرا آخری سانس تمہیں دیکھ کر ہی نکلے گا — موہنی کے مُنہ پر اس کے باپ نے زور سے تھپڑ مارا اور شیام کو دھکے دے کر باہر کر دیا گیا تھا۔

ایسے کتنے سال گزر گئے۔ شیام نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اُسے وظیفہ ملا۔ وہ جرمنی چلا گیا۔ اُس نے اپنا نجی ہسپتال قائم کر لیا تھا۔ دولت اور شہرت اُسے بے اندازہ ملی تھیں۔ اس وقت وہ دماغی علاج کے لئے دُنیا کے چند گنے چنے ڈاکٹروں میں سے تھا۔ اب اس کے بالوں میں سفیدی آچکی تھی۔ اس دفعہ وہ ہندوستان بس دو دنوں کے لئے ایک کانفرنس

میں شامل ہونے کو آیا تھا۔ ایک دن اُس نے اپنے پُرانے شہر کو دیکھنے کے لئے رکھا تھا۔ آج وہ موہنی کو ملنے آیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اب موہنی کہاں ہوگی۔ کیسے ہوگی۔ کیا اُس کی شادی ہوچکی ہوگی۔ اُس کا شوہر اور بچے ہوں گے۔

وہ کوٹھی کے دروازہ تک پہنچا اُس نے دستک دی۔

ایک باریک سی آواز اُبھری "کون ہے۔ چلے آؤ"۔ دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔ موہنی محض ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ بس ایک ڈور سے بندھی اُس کی زندگی لٹک رہی ہے۔ ڈور ٹوٹی نہیں کہ وہ موت کے مُنہ میں جاکر گری نہیں۔ وہ آگے بڑھا۔ موہنی بڑی مشکل سے اُٹھ کر بیٹھی تھی۔ شیام نے پُوچھا۔ "موہنی، تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔" موہنی نے کہا کہ شیام تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ تم مجھے ملنے آگئے ہو۔ اب میں سکون سے مر سکوں گی۔ میں دُنیا کو یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ اگر کسی ہندوستانی عورت نے پیار کیا ہے تو اُس نے اُسے آخری دم تک نبھا دیا ہے۔ اس تمام عرصہ میں یہی پرارتھنا کرتی رہی ہوں کہ بس ایک دفعہ تمہیں دیکھ لوں۔ تمہاری گود میں اپنا سر رکھ کر ابدی نیند سو جاؤں۔

شیام نے ہنس کر کہا۔ کہ موہنی تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ بس چند ماہ کی دیکھ بھال کے بعد تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تم اس کوٹھی میں اکیلی کیسے ہو۔ ماں باپ۔ بھائی۔ شوہر۔ بچے سب کہاں ہیں؟

موہنی نے مسکرا کر کہا۔ شیام میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ ماں باپ نے مجبور کیا۔ دھمکیاں دیں۔ پھر اپنی ٹوپی میرے قدموں پر رکھ دی۔ مگر میں نہیں مانی۔ میں نے کھانا پہلے کم کر دیا پھر چھوڑ دیا۔ میں نے دُنیا سے من ہٹا لیا۔ میں جوگن بن گئی۔ اتنے میں ماں باپ مر گئے۔ بھائی یہ کوٹھی میرے لئے چھوڑ کر چلا گیا۔ زندہ رہنے کے لئے کبھی کبھی کچھ کھا لیتی ہوں۔ زندگی میں اور تو کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ بس تمہارا انتظار۔ انتظار اور انتظار رہ گیا تھا۔ پھر اس نے اشتیاق سے پُوچھا۔ "شیام۔ کیا تم نے شادی کر لی ہے۔" شیام ہنستا ہی چلا گیا۔ اُس نے کہا کہ ہاں شادی تو میری ہوگئی ہے پہلے اپنی پڑھائی سے کی تھی

پھر اپنے پیشہ سے کر لی ہے۔ موہنی نے زور سے سانس لی اور کہا کہ شیام تم نے میری محبت کی لاج رکھ لی ہے۔

پھر شیام نے وہ بات کہی جو ایک ڈاکٹر شاید کبھی نہ کہہ پاتا۔ وہ موہنی میں زندہ رہ سکنے کی قوت کی طاقت دیکھنا چاہتا تھا اور اس نے یہ پیمانہ استعمال کیا تھا۔ شیام نے کہا کہ موہنی اب تم تو زندہ رہنا نہیں چاہتیں۔ تو میں تمہارے بغیر زندہ رہ کر کیا کروں گا! کیوں نہ میں تمہارے سامنے ہی اپنے پران تیاگ دوں میں ایک گولی کھا لیتا ہوں۔ بس ایک سیکنڈ بھی شاید ہی لگے۔ میں دُنیا میں "پھول" کی بجائے "تھا" بن جاؤں گا۔ شیام اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ موہنی کا ہاتھ اُس کے مُنہ پر تھا۔ اُس نے کہا کہ مرد اور ڈاکٹر ہو کر ایسی بُزدلی کی باتیں کرتے ہو۔ تم نہیں مرو گے۔ تمہیں نہیں مرنا ہے۔ تمہیں میرے لئے اب زندہ رہنا ہے۔ زندگی چاہے کتنی مختصر کیوں نہ ہو۔ ہم اکٹھے ہی کاٹیں گے۔ اگر تمہیں سُن کر تسلی ہو سکتی ہے تو میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ میں تمہاری خاطر زندہ رہنے کو تیار ہوں۔ بس یہی بات وہ سُننا چاہتا تھا کیونکہ مریض میں زندہ رہنے کی اُمنگ جاگ اُٹھی تھی۔ یاس اور اندھیرے راستوں سے اُبھر کر زندہ رہنے کی خواہش اُوپر اُبھر آئی تھی۔ اس لئے اُسے یقین تھا کہ موت کی پرچھائیں اب ٹل گئی ہے وہ اُسے جرمنی لے آیا تھا۔ ہسپتال کے کام کے بعد ہر لمحہ وہ موہنی کے ساتھ گزارتا تھا۔ دونوں کو یہ علم تھا کہ اب اُن کا جسمانی بندھن تو ممکن نہ تھا۔ اور رُوحانی رشتوں کو کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ یا وہ بے نام رہ سکتے ہیں۔ ہر رشتہ خون کا ہی رشتہ تو نہیں ہوتا ہے۔ پھر ہر رشتہ سماجی۔ مذہبی رشتوں میں بھی نہیں بندھ سکتا۔

دُنیا میں رُوحانی رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ذات۔ پات۔ مذہب۔ امیری۔ غریبی۔ عورت۔ مرد کی ذات اور سماجی بندھنوں سے بہت اُوپر ہوتے ہیں۔ یہ رشتے پانی کی طرح صاف۔ ہوا کی طرح زندگی کو تازگی بخشنے والے اور نُور کی طرح پُر نُور ہوتے ہیں۔

ایسے ہی رشتوں میں موہنی اور شیام بندھ گئے تھے۔

نثار احمد صدیقی
(گیا)

اُردو افسانہ

۱۹۶۵ء کے بعد

"افسانہ معاشرے کا آنسو ہے جو افسانہ نگار کی آنکھ سے ٹپکتا ہے۔ اس ایک بوند میں معاشرے کی آرزوئیں، خواہشات، تصورات، خوشیاں اور غم، ورثہ، ماحول، تاریخ، جغرافیہ، آب ہوا، تہذیب، ثقافت، جسم اور رُوح سب شامل ہوتے ہیں۔ اس نقطے میں مکان کی تمام وسعتیں یا کم از کم ان کا ایک بڑا حصہ صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس لمحے میں "زمان" کی تمام وسعتیں یا کم از کم اُن کا ایک بڑا حصہ واضح طور پر جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اس قطرے میں پُورا سمندر یا کم از کم اس کا ایک بڑا حصہ ٹھاٹھیں مارتا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔"

سیّد محمود قاسم (آج کا افسانہ) کی اس تعریف کی جامعیت اور قطعیت سے قطع نظر ایماندارانہ جائزہ لیا جائے تو اس تعریف کے دل میں وہ افسانے بھی سما سکتے ہیں جو ۶۵ء سے پہلے لکھے گئے اور جو ۶۵ء کے بعد لکھے جا رہے ہیں۔ اس بحث میں پڑنے کے بجائے کہ ۶۵ء کے بعد کیا اور کیسا لکھا گیا ہم براہِ راست یہ دیکھنے کی کوشش کریں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ۶۵ء کے بعد افسانے کے نام پر کیا اور کیسی چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔

۶۵ء کے بعد افسانوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ تین نسلیں یا تین طبقے ہیں جو اس سفر میں رواں دواں ہیں۔ پہلی نسل یا طبقہ اُن لوگوں کا ہے جو ۶۵ء سے پہلے کے ہیں اور جنہوں نے ۴۷ء سے پہلے ہی افسانہ نگاری کے باب میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اور اپنا مقام متعین کر لیا تھا مثلاً راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، اے حمید، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، غلام الثقلین نقوی، ——— دیویندر ستیارتھی، وغیرہ وغیرہ ———

دُوسری نسل یا طبقہ اُن لوگوں کا ہے، جن میں سے چند لوگوں نے تو آزادی سے کچھ قبل اور اکثر نے آزادی کے بعد باضابطہ پُورے زور کے ساتھ لکھنا شروع کیا، ایسے افسانہ نگاروں میں منٹو، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم، شکیلہ اختر، آمنہ ابوالحسن، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، سلمیٰ صدیقی، ش مظفر پوری، اکرام جاوید، اقبال متین، رام لعل، جوگندر پال، مہندر ناتھ، کلام حیدری، غیاث احمد گدی، قاضی عبدالستار، دیویندر اسر، انتظار حسین، عوض سعید وغیرہ

کو شامل کیا گیا ہے۔

ایک تیسری نسل وہ ہے جس نے باضابطہ طور پر سنہء کے بعد اور پھر پورے زور و شور سے ۱۹۶۵ء کے بعد افسانہ کے میدان میں اپنے اشہبِ قلم کا زور دکھایا ہے۔ اس نسل کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں انور سجاد، احمد ہمیش، سریندر پرکاش، اکرام باگ، بلراج مین را، بلراج کومل، ظفر اوگانوی، ڈاکٹر نریش اور احمد یوسف وغیرہ کے نام ہیں، لیکن اس مبہم تقسیم کے باوجود قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا افسانہ نگار کس نسل یا طبقہ میں شامل کئے جانے کے قابل ہے۔ کیونکہ بعض ایسے بھی افسانہ نگار ہیں، جو پہلی نسل کے ہوتے ہوئے بھی دوسری یا تیسری نسل کی نمائندگی کرتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو تیسری نسل یا طبقہ میں آنے کے باوجود پہلی نسل یا طبقہ سے ذہنی طور پر زیادہ متاثر اور نزدیک ہیں لیکن مجموعی طور پر ہر سہ نسل یا طبقہ کے افسانہ نگاروں کے ساتھ کچھ دور کچھ قریب کا معاملہ ہے۔ پھر بھی مطالعہ کی آسانی کے لئے افسانہ نگاروں کے پورے کارواں کو خانوں میں تقسیم کرکے ان کے فن کا جائزہ لینا آسان ہوگا۔ مذکرہ بالا افسانہ نگاروں میں سے منٹو کے علاوہ آج بھی ہر فرد اردو افسانے کے پیچ و خم کی پیمائش ناز و ادا کی نمائش نشیب و فراز کی ستائش اور جملہ اسرار کی پردہ کشائی کے عمل میں مصروف ہے اور افسانے کے وسیلے سے شش جہت سے انسان اور انسان سے متعلق واقعات و تجربات، احساسات و خیالات، کیفیات و حسیات کا اظہار کرکے چمنِ ادب میں نت نئے گل بوٹوں کا اضافہ کر رہا ہے۔ لیکن یہاں پر ایک بات کا اظہار ضروری ہے کہ بہرحال ۱۹۶۵ء کے بعد حالات قطعی طور پر وہ نہیں رہے ہیں جو ۱۹۶۵ء کے پہلے ۴۷ء تک یا ۴۷ء سے کچھ پہلے تک تھے۔ سائنسی ترقیات و تجربات و انکشافات بدلتے ہوئے حالات جاگیردارانہ نظام کی مکمل شکست و ریخت، بحرِ بیکراں کی طرح امڈتی ہوئی آبادی، گھنگھور گھٹاؤں کی طرح مسائل کی برسات امن و سکون کی جستجو باہر کی مایوسی اور محرومی اور اندر سے ٹوٹنے کا عمل یہ اور اس طرح کی بہت ساری باتیں آج کے انسان پر براہِ راست اثر انداز ہو رہی ہیں اور بہرحال افسانہ نگار اسی معاشرہ کا ایک فرد ہوتا ہے جس میں معاشرہ کے دوسرے لوگ زندگی بسر کرتے ہیں اور چونکہ فنکار معاشرہ کے دیگر افراد کے مقابلہ میں اپنی قوت احساس و اظہار اور جذب و اختراع کی بناء پر دوسرے لوگوں سے ہمیشہ ممتاز و افضل ہوتا ہے اس لئے ان حقائق سے زیادہ ہی متاثر نظر آتا ہے اسی لئے ۱۹۶۵ء کے بعد افسانوں میں آج کے معاشرے کا پورا کرب، شکست و ریخت کا المیہ، مسائل کی یورش، نئے تجربات و انکشافات، سماجی شعور، تشکیک، وجود کا احساس، حقائق کا عرفان، سب کچھ نظر آتا ہے — مثال کے طور پر راجندر سنگھ بیدی کا ۱۹۶۵ء کے بعد کا لکھا ہوا افسانہ "متھن" لیجئے جس میں موجودہ عہد کے ایک عظیم مسئلہ (مسئلہ جنس) کو مہنجو داڑو، ہڑپا، اور کھجراہو کے پس منظر میں دیکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اختر اورینوی نے اپنے افسانہ "جراحتِ دل" — میں Heart Transplantation کے سائنسی موضوع کو افسانے کے سانچے میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ موضوع کو برتنے کے ساتھ ہی افسانہ نگاری کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ہمیشہ تہذیب کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کے تمام افسانوں اور ناولوں کی بنیادی وہ تہذیب ہے جو برصغیر کی مشترکہ تہذیب کہلاتی ہے اور اپنے ۱۹۶۵ء کے بعد کے افسانوں میں بھی انہوں نے اسی تہذیب کو برتا ہے لیکن نئی تہذیب کی روشنی میں فکری طور پر جیسے اور برتنے کا انداز کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے بھی ۱۹۶۵ء کے بعد کئی افسانے لکھے ہیں جن میں "کلا اور کلاکار" کو نمائندہ حیثیت حاصل ہے۔

اب یہ بات ایک مسلمہ حقیقت کی صورت اختیار کر گئی ہے کہ موجودہ دور میں فن و ادب، ادیبوں اور فنکاروں کے لئے خواہ جتنی بھی اہم چیز ہو لیکن عوام الناس کی نظروں میں عام طور پر فن و ادب سے زیادہ غیر اہم کوئی اور چیز نہیں گرچہ اس کا اظہار نہیں ہوتا اور ادب نوازی و فن پرستی کے ثبوت دیئے جا رہے ہیں۔

ان افسانہ نگاروں کے جلو میں بڑھتی ہوئی افسانہ نگاروں کی دوسری نسل اپنے بزرگوں کے فیض اور اپنی ذہانت کے بل بوتے پر

افسانے کا سفر طے کر رہی ہے۔ لیکن اِس پہلی نسل اور دوسری نسل کے افسانہ نگاروں میں فرق ہے' وہی فرق جو شام کے ڈھلنے سورج آفتاب کے چڑھتے سورج کے درمیان ہوتا ہے' فطری طور پر دوسری نسل کے افسانہ نگار پہلی نسل کے افسانہ نگاروں سے زیادہ پُر جوش اور باہمت نظر آتے ہیں۔ اور اسی لئے ان کے یہاں لے بالکی بھی پہلی نسل کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن پہلی نسل کے مقابلے میں آگہی کی دولت انہیں زیادہ میسر ہے' یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ عرفان و آگہی کی منزل بڑی ریاضت چاہتی ہے۔ شعور پختگی چاہتا ہے اور شعور کی پختگی کا تعلق ماننا پڑے گا کہ بڑی حد تک عمر کی پختگی سے ہے۔ اس لئے دوسری نسل کے نمائندہ افسانہ نگار واجدہ تبسم' جوگندر پال' ہاجرہ مسرور رام لعل' غیاث احمد گدی وغیرہ کے یہاں عمر کے ساتھ ساتھ بتدریج پختگی بھی آتی چلی گئی۔ اور ۱۹۶۵ء کے بعد ان کے افسانے افسانہ نگاری کی بیش قیمت مثالیں ہیں۔ مثلاً جوگندر پال کا افسانہ "رسائی" رام لعل کا افسانہ "بے سرکا گوتم" غیاث احمد گدی کا افسانہ "رشتہ اور چھری" "شاہ بہ ہم سایہ" "اندھے پرندے کا سفر" وغیرہ یقینی طور پر اُردو کے اچھے افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

اِن دو نسلوں سے الگ ایک تیسری نسل ہے جو ادب کی دُنیا میں ۱۹۶۵ء کے بعد اُبھرتی ہے اور جن کے افسانے جدید افسانے کہلاتے ہیں' جدید افسانہ' جدید شاعری یا مجموعی طور پر جدید ادب کی طرح بڑا ہی پیچیدہ سوال ہے۔ جدید افسانہ دراصل ایک بہت ہی Fluid چیز ہے جس میں ہر روز تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں۔ کیونکہ موجودہ معاشرے میں خود زندگی کی قدروں میں ہر لمحہ تغیر کا عمل جاری ہے۔ آج کی حقیقت بے حد Complex ہو گئی ہے اور اس میں ہر روز ہر لمحہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں رُونما ہونے والے چھوٹے بڑے مادے اور پیچیدگیاں شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لئے جدید افسانے کا جائزہ لینے کے لئے ان تبدیلیوں اور تغیرات و حقائق کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جو ۱۹۶۰ء کے بعد ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد زندگی اور زندگی سے متعلق ہر شے کی بحث کے ساتھ ہی ان کو دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کا انداز بھی بدلا ہے۔

جدید افسانہ نگار اپنے افسانوں میں صرف ان ہی حقائق کا ذکر نہیں کرتا جو خود اُس پر گزرے ہوں یا اس کے سامنے یا اس کے قریب کے لوگوں پر بلکہ جدید افسانہ نگار اُن حقائق سے بھی اُسی طرح متاثر ہوتا ہے جو دنیا کے کسی بھی فرد پر کسی بھی ملک اور مقام میں گزرے ہوں اور اس لحاظ سے جدید افسانہ نگاروں کی حقیقت نگاری اس سے قبل کے افسانہ نگاروں کی حقیقت نگاری سے مختلف ہے۔

۱۹۳۰ء کے بعد اُردو کے افسانہ نگاروں نے صحیح معنوں میں حقیقت نگاری کی ابتدا کی' لیکن ان لوگوں نے محض ادب میں حقیقتیں پیدا کیں اور ان سے ایک قدم آگے بڑھ کر ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء کے بعد افسانہ نگاروں نے حقیقتوں کا اظہار کیا لیکن ۱۹۶۵ء کے بعد افسانہ نگاروں نے حقیقتوں کی حقیقتیں تلاش کی ہیں۔ جدید افسانہ نگار کسی حقیقت کو دیکھ کر بے چوں و چرا اُسے تسلیم نہیں کر لیتا۔ اور نہ بغیر سوچے سمجھے اس کی نفی کرتا ہے بلکہ اس بات کا پتہ لگاتا ہے کہ وہ حقیقت جو ہمارے سامنے ہے' خود اُس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے ذیلی وجود میں کون سی شے کس رنگ میں ہے۔ اس لئے وہ ہر حقیقت کو خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو' ریزہ ریزہ کر کے دیکھتا ہے۔ اور پھر جو حقیقت اس کے سامنے آتی ہے اُسے وہ اپنے افسانے میں پیش کر دیتا ہے۔ (جدید افسانوں میں علامت اور تجرید اسی وجہ سے ملتے ہیں) کچھ دیر کے لئے حقیقت کی اس اجنبی تصویر کو دیکھ کر لوگ چونک اٹھتے ہیں کہ کیا یہ بھی ممکن ہے۔؟ اور ہم نے جس حقیقت کو جس طرح سمجھا تھا کیا اس کی اصل حقیقت وہی ہے جو افسانہ نگار نے پیش کی ہے۔

آج ہم اُس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہیرو ہیروئن' رقیب جیسے کرداروں سے ہمدردی یا نفرت کا جذبہ خوف یا عقیدت جیسے جذبات بے معنی ہو گئے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں کی حقیقت اور کسی مقصد کو آگے آنے نہیں دیتی ہے بلکہ وہ اسے ایک کنارے رکھتا جاتا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں کے سامنے متنوع مسائل کا ایک انبار ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُردو کے جدید افسانوں میں تجریدی اور علامتیت کو برتنے کا رجحان زیادہ ملتا ہے اور موضوعات کا تنوع کم' موضوعات کا تنوع ہندی افسانوں میں زیادہ ملتا ہے اور تجریدیت اور علامتیت کم۔

لیکن جدید افسانہ نگاروں کے سامنے مسائل الگ الگ متعین صورتوں میں کھڑے نہیں ہیں بلکہ مُسلم تجربات کی بنیاد پر وہ اور اس کی دُنیا خود مسائل کے اندر ہے۔ اور وہ ان مسائل کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ معاشرے کے یہ مسائل جدید افسانہ نگاروں کے عہد ہی میں نہیں رُونما ہوئے ہیں۔ پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، احمد علی اور سجاد ظہیر کے دور میں بھی یہ مسائل تھے لیکن ان مسائل کی نوعیت میں وقت اور زمانہ کے اعتبار سے فرق پیدا ہوتا گیا ہے۔ پریم چند کے "سوزِ وطن" کے عہد کے مسائل اور تھے اور جن دنوں "انگارے" شائع ہُوا اُس وقت کے مسائل کچھ اور تھے۔ اور آج مین را، سریندر پرکاش اور احمد ہمیش کے دور کے مسائل کی نوعیت کچھ دوسری ہے۔ اسی طرح ہر دور کے لوگوں نے الگ الگ طور پر مسائل کو محسوس کیا ہے اور برتا ہے۔ جدید افسانہ نگار مسائل کی حقیقت کو صرف محسوس ہی نہیں کرتے بلکہ محسوس کرنے کے بعد اُن پر ایک کیفیت، ایک حالت طاری ہوتی ہے۔ (کیونکہ ان کے یہاں خلوص اور لگن کی کمی نہیں) اور وہ مسائل کی حقیقت کو احساس کو اپنے افسانوں میں استعمال کرتے ہیں بلکہ ایک کیفیت برت کر حقیقت کو تلاش کرتے ہیں۔

جدید افسانوں کی پیش کش عموماً دو صورتوں میں ہو رہی ہے۔ تجریدی اور علامتی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:

"اس طرح کے افسانے آزادی سے پہلے کے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً کرشن چندر کا "غالیچہ" "چوراہے کا کنواں" اور "چھوڑی" احمد ندیم قاسمی کا "سلطان" "وحشتی" ممتاز شیریں کا "میگھ ملہار" احمد علی اور عزیز احمد کے بعض افسانے بھی تجریدی افسانوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن مذکورہ تمام افسانوں میں تجریدی اور علامتی بال و پر تو نظر آتے ہیں لیکن انہیں تجریدی اور علامتی افسانے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ تجریدی اور علامتی اُن معنوں میں جن معنوں میں مین را، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، ظفر اوگانوی، کمار پاشی، ڈاکٹر نریش، بلراج کومل، انور سجاد، اختر یوسف اور نور الہدیٰ کے افسانے تجریدی یا علامتی کہے جاتے ہیں۔"

جدید افسانوں میں طریقہ اظہار عموماً علامتی ہوتا ہے یا پھر تجریدی (Verginia Woolf) کے شعور کی رو (Stream of Consciousness) کی تکنیک کو اپنا کر بعض جدید افسانے لکھے جا رہے ہیں، تو کچھ افسانے (Anti stream of Consciousness) میں لکھے جا رہے ہیں۔ بعض افسانہ نگار افسانوں میں ڈراما تکنیک کو اپنا رہے ہیں جیسے احمد ہمیش کی "ساتویں کہانی" بعض افسانہ نگار فلم نعرہ تکنیک پر افسانے لکھ رہے ہیں جیسے بلراج مین را کی کہانی "کمپوزیشن" کیا یہ کوئی نئی چیز ہے۔ بہت پہلے اسی تکنیک پر مختار صدیقی کی نظم "روشنی" آ چکی ہے۔ کچھ افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو آرکسٹرا تکنیک پر افسانہ لکھ رہے ہیں جیسے انور عظیم کا افسانہ "ٹھنڈی سُرنگ" پاکستان میں تجریدی یا علامتی رجحان کے نمائندہ افسانہ نگار مندرجہ ذیل ہیں۔

انتظار حسین (ہم سفر، زرد کتا)
عبد اللہ حسین (ندی، جلا وطن)
احمد اصغر (ایک بونڈلبوگی، سواری، بے نام کہانی)
انور سجاد (مرگی، گائے، پرندے کی کہانی)
غلام الثقلین (لمحے کی موت اور سرگوشیم)

ہندوستان میں اس کو آگے بڑھانے والوں میں:

دیوندر اسر۔ بلراج مین را۔ سریندر پرکاش۔ راج رائے۔ بلراج کومل۔ کمار پاشی۔ اختر یوسف، ظفر اوگانوی اور ڈاکٹر نریش کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۶۵ء کے بعد لکھے جانے والے افسانوں میں بعض ایسے بھی ہیں جنہیں ہم بجا طور پر Anti Story کہہ سکتے ہیں مثلاً سریندر پرکاش کا "تلقار مبش" احمد ہمیش کا "مکھی"۔ اکرام باگ اور انور سجاد کے افسانے اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

محمد سلیم خاں ہمراز

ڈیڈ لائن

دھوئیں کی گھٹائیں چھٹ گئی تھیں، آگ کی بارش رک گئی تھی، بموں کا طوفان تھم گیا تھا۔ مگر سیلاب ابھی جاری تھا۔ انتہائی شدید اور خون ریز جنگ کے بعد سڑکوں پر انسان اور انسانیت کا خون بہہ رہا تھا۔ بارود کے دھماکوں کی کان پھاڑ دینے والی آوازیں بند تھیں لیکن ان سے متاثر انسانوں کی آہ و بکا اور زخمیوں کی چیخ و پکار کا شور ہر لمحے تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی غیرتِ انسانی گہری نیند سو رہی تھی۔ ظلم و نا انصافی اور وحشت و بربریت کے اس ننگے ناچ پر لوگ گونگے اور بہرے بن گئے تھے۔ نہتے مظلوموں کی پکار پر خاموش تماشائی بن کر وہ بدترین بے حسی کا ثبوت دے رہے تھے۔

زمین آسمان اور سمندر سے دس گھنٹے کی اندھا دھند بمباری نے سینکڑوں فلک بوس عمارتوں اور بے شمار مہاجر بستیوں کو ملبے کا ڈھیر کر کے سینکڑوں انسانوں کو جلا کر سیاہ کر دیا اور ہزاروں کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا جس سے یہ جیتا جاگتا شہر ایک بڑے کھنڈر اور قبرستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جس کی ہولناکی شام کے گہرے سائے کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جہاں موت کا شکار ہونے سے بچ رہنے والے تباہ برباد انسان، دشمن کے زبردست محاصرے میں بجلی، پانی اور زندگی کی ادنیٰ ضرورت سے محروم مصیبت کی ناقابلِ بیان آزمائش سے دوچار تھے۔

اس تباہ اور برباد شہر کے ایک حصے میں تھکن سے چور

خالد الوزیر نے اپنی زخمی انگلیوں پر کسی ہوئی پٹیوں کو کھولنے کی کوشش کی مگر یہ پٹیاں گوشت اور ہڈیوں میں اس طرح دھنس چکی تھیں کہ اسے اتارنے میں اسے یوں لگا جیسے جان نکل گئی ہو۔ لیکن جان نکلنے کا تصور ذہن میں آتے ہی اسے وہ انگنت معصوم اور بے گناہ انسان یاد آ گئے جو اس کے سامنے ہمیشہ کے لئے دم توڑ گئے قربانیوں کی امٹ داستان لکھ گئے تھے۔ اس خیال سے خالد الوزیر پر جنون طاری ہو گیا اور اس نے پٹیوں کو زخموں سے نوچ کر پھینک دیا۔ اس کی انگلیاں ہڈیوں کا پنجر بن گئی تھیں۔ لیکن زخم اب اسے کوئی تکلیف نہیں دے رہے تھے۔ اس کا سارا درد سمٹ کر اس کے دل میں اتر آیا تھا۔ جہاں انتقام کی آگ اور آزادی کی شمع جل رہی تھی۔ ڈھائی مہینے سے خالد الوزیر ایک طویل اور بھیانک جنگ میں مصروف تھا جس میں اس کے بیشمار ساتھی کام آ چکے تھے۔ اب جنگ بند ہو گئی تھی اور اسے قلق تھا کہ وہ کیوں زندہ بچ گیا ہے۔؟ اس سے پہلے وہ کئی جنگیں لڑ چکا تھا مگر اسے اپنے زندہ رہنے پر نہ کبھی حیرت ہوئی تھی اور نہ ملال ہوا تھا۔ کیونکہ جنگ بندی کے بعد بھی ان پر ایک نئی جنگ مسلط کرنے کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھی اور وہ اس کے مقابلے پر آمادہ رہتے تھے۔ لیکن اب وہ اپنے گھروں سے کوسوں دور پھینکے جا رہے تھے۔ اس لئے خالد الوزیر کو اپنے زندہ رہ جانے کا شدت سے احساس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ موت تو سب کو آتی ہے لیکن شہادت خوش نصیبوں کا حصہ

ہے اور وہ اپنی بد قسمتی پر افسردہ تھا۔ پھر بھی یہ سوچ کر اس نے اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ شاید قدرت اس سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے جو موت بار بار اس سے قریب آ کر لوٹ گئی۔

ڈھائی مہینے کی اس جنگ میں سب سے بڑی تباہی اور ہلاکت جنگ کے آخری ایام میں ہوئی تھی جب مسلسل دس دنوں تک زمین، آسمان اور سمندر سے آگ اور شعلے برس رہے تھے اور اس عرصے میں ابو جہاد کی ہلکی مشین گن اور توپ اس قیامت صغریٰ کا جواب دیتے دیتے کئی بار آگ اور انگارہ بن چکی تھیں۔ اس کے یہ دونوں ہتھیار انسانیت سوز وحشی درندوں کا مسلسل شکار کر رہے تھے۔ مارٹر کا دہانہ سرخ ہو جاتا تو ابو جہاد کی مشین گن آگ اگلنے لگتی اور جب مشین گن تپ جاتی تو مارٹر گولے برسانے لگتا۔ اس لامتناہی جنگ میں مارٹر اور مشین گن نے اس کی انگلیوں کو اس طرح جھلس دیا تھا کہ وہ گوشت پوست سے بے نیاز ہوتی جا رہی تھیں جس پر پٹیاں باندھ کر وہ انہیں چلاتا رہا اور جب ہاتھوں کی انگلیاں بالکل ہی جواب دے جاتیں تو وہ اپنے پنجوں سے انہیں چلانے لگتا۔ ان دونوں ہتھیاروں کے استعمال کے لئے کم سے کم تین آدمی درکار تھے لیکن وہ تنہا یہ کام انجام دیتا رہا۔ اس طرح سر بکف مٹھی بھر سرفروش ایک درندہ صفت منظم گروہ سے لوہا لیتے رہے۔

آج صبح ابو جہاد کے پاس گولہ بارود ختم ہو گیا تھا لیکن مشین گن کے کچھ راؤنڈ ابھی باقی تھے ان کے ختم ہو جانے پر دست بدست جنگ کے لئے وہ خود کو تیار کر چکا تھا۔ کیوں کہ اب سپلائی ممکن نہیں تھی۔ مگر اچانک جنگ بندی کا اعلان ہو گیا جس کے ساتھ دفاعی کمانڈ نے اسے اپنے خاندان کے پاس واپس جانے اور پھر مغربی بیروت چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی جو اپنے گھر پہنچنے کے لئے جنگ کر رہے تھے، اب یہ جنگ بندی انہیں اپنے گھر سے کوسوں دور لے جا رہی تھی۔ فدائین رنجیدہ تھے، لیکن قائد کا حکم انہیں بہر حال ماننا تھا۔

ابو جہاد کا مورچہ فرانسیسی سپاہیوں نے سنبھال لیا۔ اس نے مارٹر پر الوداعی نظر ڈالی اور مشین گن لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہر طرف ماتم تھا۔ تباہی تھی، بربادی تھی لیکن اس تمام تر شکست و ریخت کے باوجود لوگوں کا حوصلہ شکست خوردہ نہیں تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ کبھی کبھی سوچ میں اس طرح گم ہو جاتا کہ گرد و پیش کی بھی خبر نہ رہتی۔

ابھی کچھ روز پہلے اس کا گھر وادی لبقعہ میں واقع مہاجروں کی فہد بستی میں تھا لیکن چند روز کی جنگ کے بعد یہ فہد بستی تباہ ہو کر اب مغربی بیروت میں آ بسی تھی۔ ابو جہاد انسانوں کی ہلاکت اور تباہی کے روح فرسا مناظر دیکھتا ہوا اس بستی آبادی میں داخل ہو گیا جہاں کچھ علاقے محفوظ رہ گئے تھے وہ اس ہلچل میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا محسوس کر رہا تھا لیکن جب کہیں وہ اپنے خیالات سے آزاد ہو کر بھوکے پیاسے بچوں کے رونے بلکنے کا منظر دیکھتا تو اس کا دل پھٹنے لگتا، اور اسے اپنا بیٹا ابو حماد یاد آ جاتا۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہو گا؟

ابو جہاد چلتا رہا لیکن کھلے ہوئے زخموں پر گرم ہوا لگنے سے اس کی انگلیاں پھر اکڑنے اور دکھنے لگی تھیں۔ اس نے پٹیاں پھر کس لیں، پھر بھی زخموں کی ٹیسوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اس کے زخموں کی شدید تکلیف پر کبھی کبھی یہ پریشان کن سوال غالب آ جاتا کہ چودہ برس کا اس کا بیٹا اس سے ضرور پوچھے گا۔

"ڈیڈی ہمارا گھر کہاں ہے؟ اب ہمیں یہاں سے تو کہیں نہیں جانا ہو گا۔؟"

یہ خیال آتے ہی وہ اپنے زخموں، جنگ بندی اور بیروت چھوڑنے کا حکم یکسر بھول جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ابو حماد کا یہ سوال اس کے ذہن میں ایک بازگشت کی طرح گونجنے لگا۔ اس کے سر پر ہتھوڑے سے برسنے لگے، اور اس نے پیر جھٹکتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ابو حماد نے اس سے یہ سوال کیا تو اسے ڈانٹ کر کہے گا

"تم اتنے چھوٹے تو نہیں ہو کہ یہ نہ دیکھ سکو کہ ہر طرف موت اور تباہی منڈلا رہی ہے اور تم گھر گھر کی رٹ لگا رہے ہو تمہیں شرم آنی چاہیے!"

پھر اس تلخ جواب پر وہ آپ ہی آپ شرمندہ سا ہو گیا

کیونکہ اسے یاد آیا کہ جب وہ چھوٹا تھا تو اس نے بھی تل زعترہ کے اپنے گھر کے اجڑنے پر اپنے باپ سے یہی سوال کیا تھا۔

"ابو! ہمارا گھر کہاں گیا!" جس کے جواب میں اس کے باپ نے اپنی بندوق سنبھال کر محاذ پر جاتے ہوئے بڑے عزم سے کہا تھا۔

"میں گھر کی تلاش میں جا رہا ہوں!" اس کا باپ اس دن سے آج تک لڑ رہا تھا۔ وہ اس جنگ میں بھی کہیں برسرپیکار تھا اور نہ جانے زندہ تھا یا کام آ چکا تھا۔ ہوش سنبھالنے پر ابوجہاد بھی گھر کے حصول کی جنگ میں شریک ہو چکا تھا۔ مگر گھر کی تلاش میں اتنی قربانیوں کے باوجود وہ ہر لڑائی کے بعد اپنے گھر سے اور دور ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری تھی، چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ابوحماد کو سمجھائے گا اور کہے گا۔

"بیٹے! کھویا ہوا گھر حاصل کرنا بڑا مشکل اور صبر آزما کام ہے، لیکن گھر ایک ضرور ملے گا اس کے لئے جد وجہد جاری ہے۔ اس نے سوچا کہ ابوحماد اتنا نادان نہیں ہے اور نہ ہی کور مغز ہے کہ وہ یہ بات نہ سمجھ سکے۔ وہ اس جواب سے ضرور مطمئن ہو جائے گا۔ اس خیال سے ابوجہاد کو کافی راحت محسوس ہوئی، اور اس کے زخمی پاؤں اپنی راہ پر اور مضبوطی کے ساتھ اٹھنے لگے۔ چلتے چلتے ابوجہاد اب مغربی بیروت میں مہاجروں کے عارضی پڑاؤ سے گزر رہا تھا جو وادی بقعہ کی فہد بستی کی تباہی کے بعد قائم کیا گیا تھا۔ یہ پڑاؤ بھی وحشت و بربریت کی آماجگاہ تھا۔ یہاں بھی زخمیوں، بیماروں کی کراہوں اور بھوک پیاس سے بچوں کے بلبلانے کا شور تھا اور قدم قدم پر بچھڑ جانے والوں کا ماتم ہو رہا تھا اور کہیں کہیں سرفروشوں کے پرعزم نعرے گونج رہے تھے۔ وہ ان آوازوں کی پرجوش اور دلخراش تانوں پر چلتا رہا اور پھر یہ آوازیں اس کے کانوں کے پردے پھاڑتی ہوئی دماغ میں داخل ہو گئیں۔ جہاں ایک بھونچال سا آ گیا اور اس کے اندر جھنجھلاہٹ سی پیدا ہو گئی اور یہ سب آوازیں صرف ایک آواز میں ڈھل گئیں۔ اور یہ ابوحماد کی آواز تھی جو پوچھ رہا تھا۔

"ابو ہمارا گھر کہاں ہے؟ ہم کیا اپنے گھر میں......؟"

ابوجہاد کو غصہ آ گیا اور وہ چلا کر بولا۔

"بے وقوف، گدھے، تم مجھے کیوں تنگ کر رہے ہو......" لیکن یکلخت اسے خیال آیا کہ وہ ایک تباہ و برباد شہر میں بے گھروں اور بدنصیبوں کی ایک بستی سے گزر رہا ہے، جہاں ابوحماد کا دور دور پتہ نہیں ہے، پھر وہ اس طرح کیوں چلا رہا ہے اور غصہ کرنے کا حق بھی کیا ہے جب کہ گذشتہ صدی سے یہ سوال ہر نئی نسل اپنے بڑوں سے پوچھتی آئی ہے، ہر نئی جگہ ... یہ پرانا سوال ہمیشہ ایک نئے سوالیہ نشان کی طرح ابھرتا آیا ہے۔ وہ پوری صدی سے در جنوں بار ادھر سے ادھر منتقل ہوتے آ رہے ہیں اور آج بھی بے گھر اور بے وطن ہیں۔

ابوجہاد ایک بار پھر شرمسار ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ سارا غصہ اسے اپنے اوپر آ رہا ہے اور یہ وہ غبار ہے جو پوری طرح نہیں نکل سکا ہے اس کا نکاس اب جھنجھلاہٹ کی شکل میں ہو رہا ہے، آخر بچوں کے لئے گھر کا بندوبست کرنا بڑوں کی ہی ذمہ داری ہے۔ وہ اپنی زخمی انگلیاں اپنی مشین گن اور بازوؤں پر پھیرنے لگا اور زخمی پاؤں جما کر زمین پر رکھتا ہوا اپنے خیمے تک پہنچ گیا۔

نرس کے لباس میں ابوجہاد کی بیوی نے اپنے شوہر کا استقبال کیا۔ دلگیر کو اس روپ میں دیکھ کر اسے تسکین ہوئی۔ وہ ایک پتھر پر تھکا تھکا سا بیٹھا رہا اور پانی پلانے کے بعد دلگیر اس کے زخموں پر دوائیں لگانے اور پٹیاں باندھنے لگی۔ جب زخموں کی تکلیف کچھ کم ہوئی تو اس نے پوچھا۔

"ابوحماد کہاں ہے؟"

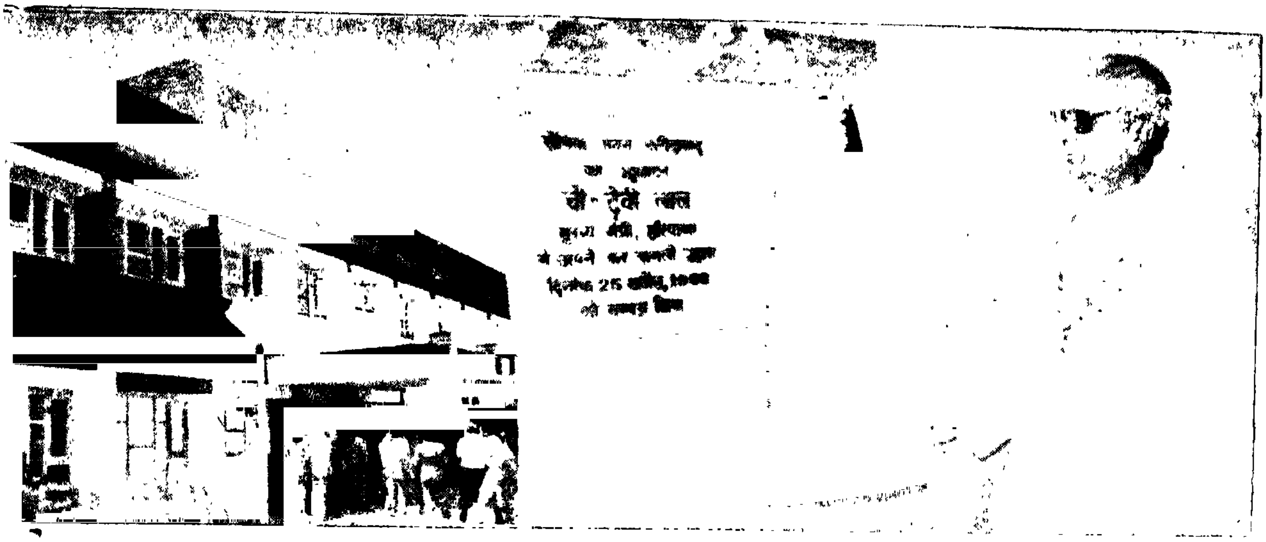
"ابوحماد بچوں کے گوریلا دستے کے ساتھ محاذ پر لڑنے گیا تھا۔" اس کی بیوی نے فخر اور سنجیدگی سے کہا۔

"ابھی لوٹا کیوں نہیں؟" ابوجہاد نے خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بہادری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گیا ہے۔"

دلگیر نے کمال صبر کا اظہار کرتے ہوئے اسے اطلاع دی

(بقیہ صفحہ پر)



وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۲۵ اپریل ۱۹۸۸ء کو فرید آباد میں ایک نئے ٹیسٹنگ ہاؤس کی عمارت کا افتتاح فرماتے ہوئے۔

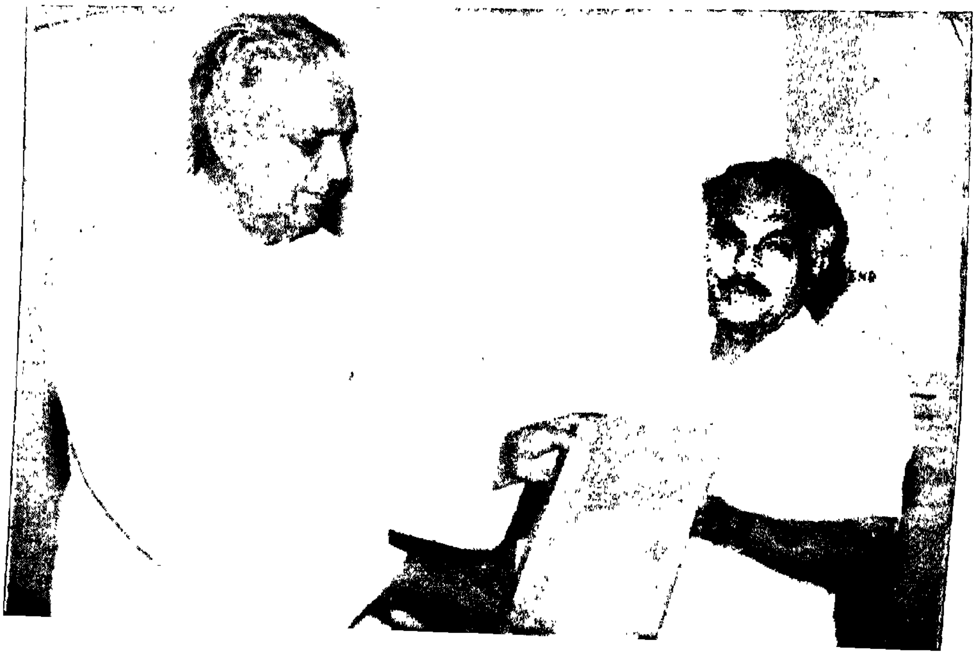


نائب وزیرِ اعلیٰ ہریانہ جناب بنارسی داس گپتا ۱۰ مئی ۱۹۸۸ء کو بلب گڑھ میں ۱۸۵۷ء کی کی تحریکِ آزادی کے جانباز شہیدوں کے میموریل پر پھول چڑھا کر نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔



عالیجناب دیوی لال وزیرِ اعلیٰ ہریانہ ۸ مئی ۱۹۸۸ء کو پی۔ ڈبلیو۔ ڈی
ریسٹ ہاؤس بھوانی میں معذور افراد کو ٹرائی سائیکلیں عطا کرتے ہوئے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب چودھری دیوی لال نے ۱۶ مئی ۱۹۸۸ء کو پنڈت جواہر لعل
نہرو جنم شتابدی کے سلسلے میں جناب ایس۔ ایس۔ سودی کی تصنیف: "دی کنگڈم
آف ہیون" کی رسمِ اجراء ادا فرمائی۔



جون ۱۹۸۸





گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند براری کی صدارت میں ۲۶ مئی ۱۹۸۸ء کو ہریانہ راج بھون، چنڈیگڑھ میں ہندوستان کی آزادی کی ۴۰ ویں سال گرہ اور پنڈت جواہر لال نہرو جنم شتابدی سے متعلق ریاستی سطح کی کمیٹی کی تیسری میٹنگ ہوئی۔ وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال بھی اس میٹنگ میں موجود تھے۔

آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

جون ۱۹۸۸ء　شمارہ نمبر ۶　جلد نمبر ۱۶

مدیرِ اعلیٰ

ارجن داس ملک
آئی۔ اے۔ ایس

مدیر

سلطان انجم

سرورق : پون کمار

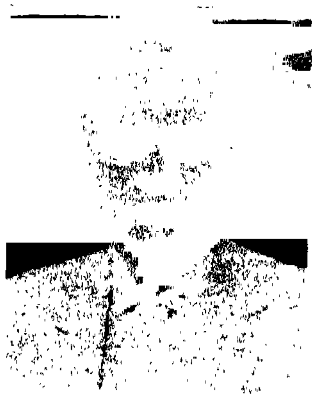
فی شمارہ　۵۰ پیسے
سالانہ　۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔ سی۔ او ۱۸۹۰-۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

خصوصی شمارہ

ترتیب



پیغام

ہری آنند براری، گورنر ہریانہ

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ چودھری دیوی لال، وزیرِ اعلیٰ ہریانہ کی قیادت میں قائم ہریانہ سرکار اس سال ۲۰ر جون کو اپنی حکومت کا پہلا کامیاب سال مکمل کرنے جا رہی ہے۔

ریاست ہریانہ تقریباً ۲۱ سال پہلے وجود میں آئی۔ اس قلیل مدت میں اس نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ ترقی کے میدان میں اس کی حصولیابیاں قابلِ تعریف ہیں۔ اب اس کا شمار ایسے بہت زیادہ خوشحال اور ترقی پذیر صوبوں میں ہونے لگا ہے۔ جنھوں نے ترقیاتی سرگرمیوں کے سبھی شعبوں میں لمبے قدم اُٹھائے ہیں۔ ریاست میں زرعی پیداوار میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا ہے۔ آج ریاست کے صنعتی نقشے میں واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ تعلیم اور صحت خدمات میں بھی بے حد توسیع ہوئی ہے۔ ہریانہ کے سبھی دیہات میں بجلی پہنچا دی گئی ہے۔ ہریانہ اپنی ٹرانسپورٹ اور ٹورسٹ سروسز کے لیے ملک بھر میں مشہور ہے۔

ہریانہ ایک فلاحی ریاست ہونے کے ناتے سماجی انصاف دلانے کے تئیں پُر عزم ہے۔ اس مقصد سے سماج کے غریب، پسماندہ اور اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کی حالت سدھارنے کے لیے کئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ ہریانہ کو ملک کا پہلا صوبہ ہونے کا فخر حاصل ہے جہاں بڑھاپا پنشن اسکیم شروع کی گئی ہے۔ بے روزگار نوجوانوں کو انٹرویو پر جانے کے لیے مفت سفر کی سہولتیں بھی دی گئی ہیں۔ خواتین کی حالت سدھارنے اُنھیں تعلیم دلانے اور اُن کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے ہیں تاکہ وہ ترقی کے عمل میں برابر کی شریک بن سکیں۔

میں اس موقع پر اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ ریاست چودھری دیوی لال کی دانشمندانہ قیادت میں برق رفتاری سے ترقی کرتی رہے گی۔

ह. आ. बरारी

(ایچ۔اے۔ براری)

اپنے اندر جھانکنے کا دن



چودھری دیوی لال
وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

ہریانہ میں لوک دل۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت کا ۲۰ رجون ۱۹۸۸ء کو عوام کی خدمت کا ایک سال پورا ہونے جا رہا ہے۔ ہم نے اپنی حکومت کی پہلی سالگرہ کو " وکلپ دِوس " کے طور پر محض اس بات پر زور دینے کے لیے منانے کا فیصلہ کیا ہے کہ اپوزیشن پارٹیاں کانگرس کا کامیاب بدل ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ ہریانہ کے تجربے نے اسے بخوبی ثابت کر دیا ہے۔

میں یہ مختصر سا مضمون اس وقت لکھ رہا ہوں جب کہ لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے ضمنی انتخابات کی چناوی مہم زور شور سے چل رہی ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہوا کا رخ واضح طور پر اپوزیشن کے موافق ہے۔ ایک رو ہے جو اپوزیشن کے حق میں بہہ رہی ہے۔ اگر اپوزیشن پارٹیوں کے ممتاز لیڈر ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جائیں، لوگوں کو بیدار کریں اور رائے عامہ کو ہموار کریں تو ہریانہ کا تجربہ دہرایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہریانہ جیسا سنگھرش (انصاف دلانے کے لیے جدوجہد) سبھی اپوزیشن پارٹیوں کے ذریعہ مل کر ملک بھر میں چلایا جائے۔ دوسرے ہمیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے آئندہ ۱۲ مہینے لگاتار جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔

جہاں تک میرا سوال ہے " وکلپ دِوس " میرے لیے اپنے اندر جھانکنے کا دن ہے۔ ہم نے اس کم مدت میں عام لوگوں کی سربلندی کے لیے دوامی اہمیت کے قدم اٹھائے ہیں۔ ہمیں اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ مثال کے لیے ہم سبھی کمرشیل بینکوں کو کسانوں اور غریبوں کے قرضے معاف کرنے پر راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم راحت، اصلاحات

اور ترقی کے مختلف شعبوں میں ہم نے اپنے کئی وعدے پورے کر دیے ہیں۔

بے روزگاروں کو راحت دینے کے اپنے وعدے کو پورا کرتے ہوئے ہم نے انٹرویو پر جانے والے بے روزگار نوجوانوں کو مفت سفر کی سہولت میسر کرائی ہے۔ اس سے ریاست کے ہزاروں بے روزگار نوجوانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

وعدے کے مطابق ۶۵ سال سے زیادہ عمر کے ہر شہری کے لیے ہم نے ۱۰۰ روپے ماہوار کی بڑھاپا پینشن

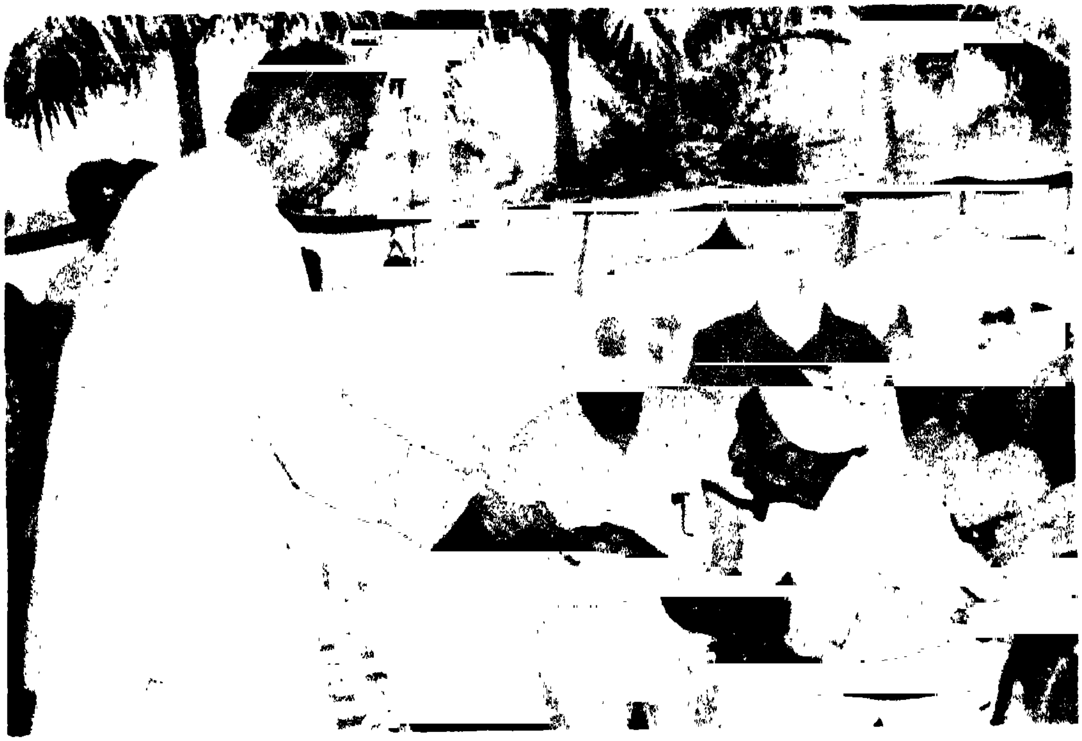


وزیر اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال ژالہ باری سے متاثرہ کھیتوں کا معائنہ کرتے ہوئے

سکیم شروع کی ہے۔ شرط یہ ہے کہ پینشن پانے والے انکم ٹیکس نہ دیتے ہوں اور نہ ہی انھیں کسی طرح کی سروس پینشن مل رہی ہو۔ یہ پینشن محتاجوں کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ ریاست کے ان بزرگ شہریوں کے تئیں احسان مندی کا اظہار ہے۔ جنھوں نے اپنی عمر کے ۶۵ سال ہریانہ کو ملک کی بیحد خوشحال ریاستوں میں سے ایک ریاست بنانے کے لیے سخت محنت میں صرف کر دیے۔ اس سکیم سے تقریباً ۷٫۵۰ لاکھ افراد فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

ہم نے ۱۰ ہزار روپے تک کے تمام کوآپریٹیو قرضے معاف کر دیے ہیں جس سے کسانوں، غریب دکانداروں

اور سماج کے دیگر کمزور طبقوں کو بے حد راحت ملی ہے۔ گنا پیدا کرنے والوں کے لیے منافع بخش قیمت یقینی بنانے کی غرض سے ہم نے گنے کی قیمت فی کوئنٹل ۳۲ روپے تک دی ہے۔ جو کہ ملک میں سب سے زیادہ ہے۔ مزید برآں ہم نے پریشان تاجر طبقے کو راحت دینے کے لیے سیلز ٹیکس کے ڈھانچے میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ اس کے باوجود ہم نے اس اچھے ڈھنگ سے اپنے لیے فنانس کا انتظام کیا ہے کہ فنانس کمیشن نے چنڈی گڑھ کے اپنے حالیہ دورے کے دوران .... لئے وسائل تلاش کرنے اور اعلیٰ درجہ کے مالی ڈسپلن کے لیے ہریانہ کی تعریف کی ہے۔ ہم نے یہ سب رفتار ترقی



وزیر اعلیٰ ہریانہ سے بڑھاپا پینشن حاصل کرتا ہوا ایک ضعیف العمر شخص

میں کوئی رکاوٹ ڈالے بغیر کیا ہے۔

خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے زرعی سیکٹر کو وافر پانی اور بجلی کی فراہمی ہماری حکومت کی پالیسی کا اہم جزو رہا ہے۔ بجلی کے میدان میں اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم نے تین طرح کی تدبیریں اختیار کیں۔ پہلی ریاست کے پاور پلانٹوں میں بجلی کی پیداوار بڑھائی گئی، دوسری، زرعی سیکٹر کو سپلائی دینے کے لیے بجلی کی سپلائی کو درست کیا گیا، تیسری، نئے ٹیوب ویلوں کو بجلی کے کنکشن دینے کے کام کو اور تیز کیا گیا۔

ہمارے فریدآباد اور پانی پت کے تھرمل پلانٹوں اور تاجے والا کے پاس کے ہائیڈل پراجیکٹوں میں یکم جون ۱۹۸۷ء سے ۳۱ مئی ۱۹۸۸ء تک ایک سال کے عرصہ میں ۲۴۷ کروڑ یونٹ بجلی پیدا ہوئی جب کہ ان ہی پلانٹوں سے ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۱۶۵ کروڑ یونٹ بجلی حاصل ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے گذشتہ ایک سال کے مقابلے میں جون ۱۹۸۷ء سے مئی ۱۹۸۸ء تک ان پلانٹوں نے ۵۰ فیصد بجلی زیادہ پیدا کی۔

موجودہ حکومت کے برسر اقتدار آنے سے پہلے کے ایک سال میں زرعی سیکٹر کو ۲۵۵ کروڑ یونٹ بجلی



وزیر اعلیٰ ہریانہ عوام کی شکایتیں دور کرنے کے لیے "کھلے دربار" میں عوام کے درمیان

سپلائی کی گئی تھی۔ اب یہ سپلائی ۳۴۵ کروڑ یونٹ تک پہنچ گئی ہے۔ اس طرح گذشتہ ایک سال کے مقابلے میں پچھلے ایک سال میں زرعی سیکٹر کو بجلی ۳۵ فیصد زیادہ سپلائی ہوئی۔ جون ۱۹۸۶ء سے مئی ۱۹۸۷ء کے درمیانی عرصے میں زرعی سیکٹر کو اوسطاً روزانہ ۷۰ لاکھ یونٹ بجلی دی گئی۔ جون ۱۹۸۷ء کے بعد یہ سپلائی بڑھا کر ۹۵ لاکھ یونٹ روزانہ کر دی گئی۔ زرعی سیکٹر کو روزانہ ۲۵ لاکھ یونٹ فاضل بجلی سپلائی کرنا ایک ایسا قدم ہے جس سے ریاستی حکومت کی اس پالیسی کا اعادہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے زرعی سیکٹر کو بجلی دی جائے۔

۳۱ مئی ۱۹۸۸ء کو ختم ہونے والے پچھلے ایک سال میں زراعت کے علاوہ دیگر شعبوں کو ۲۷۴ کروڑ یونٹ بجلی سپلائی کی گئی جب کہ مئی ۱۹۸۷ء کے آخر تک کے ایک سال میں ان سیکٹروں کو ۲۵۳ کروڑ یونٹ بجلی دی گئی تھی۔

ریاست میں نئے ٹیوب ویلوں کو بجلی دینے پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں دیے گئے ۱۵,۳۷۰ کنکشنوں کے مقابلے میں ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۲۶,۸۲۷ ٹیوب ویلوں کو بجلی کے کنکشن دے کر ایک ریکارڈ

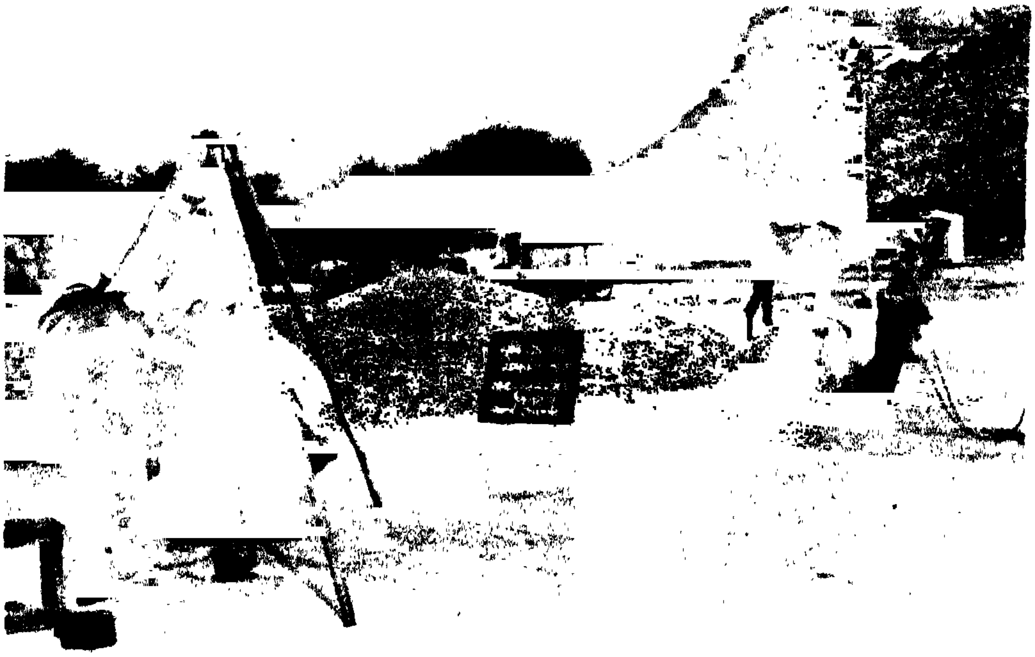


خشک سالی سے متاثرہ لوگوں کو روزگار مہیا کرانے کی غرض سے دیہات میں جوہڑوں کی کھدائی کروائی گئی

قائم کیا گیا۔

بارشیں نہ ہونے اور لگاتار خشک سالی کے باعث بھاکڑہ ڈیم میں پانی کی سطح اور جمنا میں پانی کے بہاؤ پر بُرا اثر پڑا۔ اس کے باوجود پانی کو سنبھالنے کی بہتر تکنیک کی بدولت ہم نے گزشتہ برس کے ۱۶,۲۰ لاکھ ہیکٹیئر کے مقابلے میں ۱۹,۵۲ لاکھ ہیکٹیئر زمین کو آبپاشی کی سہولتیں مہیا کرائیں۔ اگر ستلج جمنا لنک نہر بروقت مکمل ہو جاتی تو زیادہ علاقے میں آبپاشی کی سہولتیں میسر کرائی جا سکتی تھیں اور ہم خشک سالی کا مقابلہ کرنے میں

اور بجلی کامیاب ہوسکتے۔ ہم اسے جلدی مکمل کرانے کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں۔ میں وزیر اعظم سے مل کر بھی ستلج جمنا لنک نہر کے کام کو تیز کرنے کی درخواست کر چکا ہوں۔ گزشتہ برس کے ۶۷٫۳۵ لاکھ ٹن اناج کے مقابلے میں اس ایک سال میں ہم نے ۶۲٫۴۸ لاکھ ٹن اناج پیدا کیا۔ صرف بارانی علاقوں میں ۱۴ لاکھ ٹن اناج کم پیدا ہوا۔ اس سے عام کسانوں اور ریاست کی معیشت کو زبردست دھکا لگا لیکن اگر ہم... زرعی سیکٹر کو کافی بجلی اور آبپاشی کے لیے پانی کی بے پناہ کوششیں نہ کرتے تو یہ صورت مزید سنگین ہو جاتی۔



قحط سالی کے شکار کسانوں میں کم شرح پر چارہ تقسیم کیا گیا

ہم نے پچھلے سال ملک کے دوسرے حصوں کی طرح اس صدی کی جس بدترین خشک سالی کا سامنا کیا، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ریاستی حکومت نے کسانوں سے آبیانہ، تقاوی اور دوسرے ٹیکسوں، قرضوں کی وصولی ملتوی کر دی۔ ریاست کے ۸۰ لاکھ مویشی قحط سے دوچار ہوئے۔ ریاستی حکومت نے ۳۲ لاکھ روپے خرچ کر کے ۶۰۰۰ گاؤں کے جوہڑ یا بار نہروں کے پانی سے بھر کر مویشیوں کے لیے پانی کا انتظام کیا۔ بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے چارے کی قیمتیں بڑھ گئیں لیکن حکومت نے کسانوں کو مویشیوں کے لیے ۶۵ روپے کوئنٹل کی عام

قیمت پر چارہ مہیا کرایا۔ چونکہ ریاست میں کافی چارہ میسر نہیں تھا، اس لیے ہمسایہ ریاست پنجاب سے بھوسا منگوایا گیا۔ اور اُسے لانے کے تمام اخراجات ۲۱۷٫۶۷ لاکھ روپے ریاست نے ادا کیے۔ کسانوں کو بھوسا خریدنے پر ادا کی جا رہی قیمت کے حساب سے ۲۵ روپے کوئنٹل سے ۵۰ روپے کوئنٹل تک سبسڈی دی گئی۔ مزید برآں، عام کسانوں کو چارے پر سبسڈی دینے کے علاوہ پنچایتوں، سوشل سروس گروپوں کی طرف سے قائم، مقامی علاقوں کے آوارہ مویشیوں کی گئو شالاؤں، مویشیوں کے باڑوں اور راجستھان کے ساتھ ملتے اضلاع سے ہریانہ میں آئے



شاندار ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کے لحاظ سے ہریانہ سرِ فہرست ہے

مویشیوں کو چارہ سپلائی کرنے کے لیے ۲۵٫۵۰ لاکھ روپے منظور کیے گئے۔ قحط سے ہم سے بھی زیادہ متاثر راجستھان کے لوگوں کے لیے ازراہِ ہمدردی بھوسے کے ۲۵۰ ٹرک راجستھان کے اضلاع جیسلمیر اور باڑمیر بھیجے گئے۔ ساتھ ہی ریاست کے پشو دھن کے، اچھے چارے اور پانی کی کمی سے پیدا ہوتے والی بیماریوں سے بچاؤ کی غرض سے ۳٫۸۰ کروڑ روپے کی رقم مویشیوں کی طبی دیکھ بھال کے لیے منظور کی گئی۔

خشک سالی کی وجہ سے دیہات کے کھیت مزدور، بے روزگار ہو گئے۔ اُن کے لیے گاؤں کے

جوہڑوں کی کھدائی، صفائی اور سڑکیں بنانے کے فلاحی کام پیدا کر کے مقامی طور پر روزگار مہیا کیا گیا۔ انھیں ۱۹ روپے ۲۵ پیسے کے حساب سے نقد اور جنس کی صورت میں اجرت دی گئی۔ راحت کے ان کاموں سے ۶۴ لاکھ دنوں کا کام پیدا ہوا۔

پینے کے پانی کی سپلائی کا کام اور تیز کرنے کے لیے ۸۵ء۵ کروڑ روپے منظور کیے گئے۔ پینے کے پانی کی سپلائی میں اضافہ کی غرض سے شہری علاقوں میں ۵۷ اور دیہی علاقوں میں ۲۵ نئے ٹیوب ویل کھودے گئے۔ تمام شہری اور دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی سپلائی جاری رکھنے کے لیے خصوصی کوششیں کی گئیں اور ہمیں اس کام میں مکمل کامیابی کے حصول پر اپنے افسران کی داد دیتا ہوں۔

ریاست کی جامع معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے ایک مضبوط صنعتی ڈھانچہ از حد ضروری ہے۔ ہم نے صنعتوں کی برق رفتار ترقی اور انڈسٹری کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کی غرض سے صنعتیں لگانے والوں کو فراخدلانہ رعایتیں دیں۔ ان مراعات کا مقصد صنعتیں لگانے والوں اور معروف صنعتی گھرانوں کو اپنی انڈسٹریاں ہریانہ میں لگانے کے لیے راغب کرنا ہے تاکہ ریاست کی صنعتی بنیادیں مستحکم ہوں۔ ان رعایتوں میں پاور جنریٹنگ سیٹوں پر سبسڈی، سرمایہ سبسڈی، الیکٹرانکس انڈسٹری کے لیے خصوصی رعایتیں، ٹیکسوں سے چھوٹ، فکسڈ کیپٹل انوسٹمنٹ کو روک دینا اور گھاٹے میں چل رہی اکائیوں کو فروغ دینے کے لیے راحتیں وغیرہ شامل ہیں۔

حکومتِ ہریانہ جمہوری روایات اور عوام کے آئینی حقوق کی حمایت کے لیے پُرعزم ہے۔ نچلی سطح پر جمہوری اداروں کی بحالی کی غرض سے تقریباً بیس برس کے بعد میونسپلیٹیوں کے انتخاب کرانا میری سرکار کے ذریعہ اٹھایا گیا ایک اور تاریخی قدم ہے۔ پنچایتوں کے چناؤ بھی جلد ہی کرائے جا رہے ہیں۔ میرا نعرہ ہے "لوک راج لوک لاج سے چلتا ہے"۔ ہمارے دروازے عوام کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ عوام جب چاہیں میرے ساتھی وزراء اور ریاستی حکومت کے تمام افسران سے مل سکتے ہیں۔ حکومتِ ہریانہ کا ہر افسر روزانہ صبح ۱۱ بجے لوگوں کی شکایتیں دور کرنے کے لیے اپنے دفتر کے باہر ایک کھلا دربار لگاتا ہے اور سینکڑوں لوگ روزانہ ان درباروں میں آتے ہیں۔ اس سے لوگوں کو بڑی راحت ملی ہے اور انتظامیہ میں سدھار ہوا ہے۔ اس سے انتظامیہ اور عوام میں موجودہ فاصلے کو کم کرنے میں مدد ملی ہے۔ بہرحال آج انتظامیہ تک رسائی ماضی کی بہ نسبت زیادہ آسان ہے۔ انتظامیہ کی لوگوں سے دوری سے بھرشٹاچار بڑھتا ہے۔ ہماری حکومت نے نہ صرف رازداری کے نقاب کو ختم کیا ہے، جو پہلی انتظامیہ کے طریقۂ کار کی خصوصیت تھی بلکہ پارٹی نے لوگوں سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کے لیے بھرشٹاچار کم کرنے کی خاطر کئی ٹھوس قدم اٹھائے ہیں۔ ہم نے

اینٹی کرپشن بورڈ قائم کیا ہے۔ وجیلینس مشینری کو فعال اور چوکس کیا گیا ہے۔ ہر محکمہ میں فلائنگ سکویڈ قائم کیے جا چکے ہیں۔ نگران افسروں کو ہدایتیں دی گئی ہیں کہ وہ اپنے خطا کار ماتحتوں کے برتاؤ پر سخت نظر رکھیں۔

ہم نے سماج کے کمزور طبقات یعنی شیڈولڈ ذاتوں، پسماندہ طبقات اور ڈینوٹیفائیڈ/ومکت جاتیوں کی فلاح کے کاموں کو فروغ دینے کی خاطر کئی قدم اُٹھائے ہیں۔ ایسے دیہات میں، جہاں پسماندہ طبقوں کے ۵۰ یا اس سے زیادہ لوگ ہوں، ایک ایڈیشنل نمبردار ان پسماندہ طبقوں میں سے ہوگا۔ ہم نے ان میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے پوسٹ۔میٹرک، پوسٹ گریجویٹ اور پروفیشنل کورسوں کے طلباء کے فائدے کے لیے بلاسود قرضوں کی رقم میں اضافہ کر دیا ہے۔ مزید براں، ہریانہ ایسی واحد ریاست ہے جس نے ژالہ باری سے متاثر کسانوں کو دی جانے والی راحت کا پانچ فیصد غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہریجن کھیت مزدوروں اور اُن کے کنبوں کو بھی دیا ہے ——

امن و امان ریاست کی لگاتار معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ امر طمینان بخش ہے کہ چند سماج دشمن عناصر کے اُکسانے کے باوجود، جو سماج کے مختلف طبقوں میں ٹکراؤ پیدا کر کے امن و امان کو غارت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، ہریانہ کے عوام نے نہایت سمجھداری اور تحمل سے مکمل فرقہ وارانہ خیرسگالی برقرار رکھی ہے۔ میں ریاست کے لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی بھی شخص کو کسی کے جان و مال سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور ہر قیمت پر امن و امان قائم رکھا جائے گا۔

ہم نے لوگوں سے جو وعدے کیے تھے، یہ مختصراً اس سلسلے میں کیے گئے چند اقدامات ہیں۔ میں ایسی بیش انتظامی اور سماجی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں جس سے سماجی، اقتصادی کایا کلپ کا فائدہ محروم اور ضرورت مند لوگوں کے گھروں تک پہنچ جائے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ کسانوں، مزدوروں، چھوٹے دوکانداروں اور روشن خیال طبقوں، افسروں اور ریاستی انتظامیہ کے ملازموں کے پُرخلوص اشتراک اور تعاون سے ہم اپنی تمام مشکلات پر قابو پانے کے قابل ہو جائیں گے۔ ابھی ابھی ختم ہوتے سال کے مقابلے میں آنے والے برسوں میں ہمارا کارواں اور زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھے گا۔ ہمیں اپنی گزشتہ کارگزاریوں پر فخر ہے اور ہم راجیہ واسیوں کو یقین دلاتے ہیں کہ آنے والا کل اور زیادہ روشن اور تابناک ہوگا۔

(۱۰۳)

وِکلپ دِوس: 20 جون 1988ء

ترقی کی نئی منزلیں

— نئی بڑھاپا پینشن سکیم کے تحت ۶۵ سال یا اس سے زیادہ عمر کے ہریانہ کے ایسے ساڑھے سات لاکھ شہریوں کو جو انکم ٹیکس نہیں دیتے اور نہ ہی کوئی سروس پینشن لے رہے ہیں، ۱۰۰ روپے ماہوار کے حساب سے بڑھاپا پینشن دی گئی ہے۔

— دس ہزار روپے تک کے کوآپریٹو بینک قرضے معاف کر دیے گئے ہیں جس سے ۷ لاکھ ۴۷ ہزار کسانوں، چھوٹے دکانداروں، دیہی دستکاروں، شیڈولڈ ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کے افراد اور دیگر بے زمین مزدوروں کو فائدہ ہوا ہے۔

— بے روزگار نوجوانوں کو سرکاری نوکری کے لیے انٹرویو پر جانے کے لیے مفت بس سروس کی سہولت دی گئی ہے۔

— کسانوں کو ان کی پیداوار کے مناسب دام دلوائے گئے اور خاص طور پر گنے کی قیمت تو ۳۲ روپے فی کوئنٹل تک ادا کی گئی۔

— زرعی سیکٹر کو اس سال کے دوران ۵۴۳ کروڑ یونٹ بجلی دی گئی جو پچھلے سال (۸۷-۱۹۸۶ء)

تعمیر ہریانہ ۱۴ جون ۱۹۸۸ء

سے ۳۵ فیصد زیادہ ہے۔

——— ۱۹۸۷-۸۸ء کے دوران ۲۶,۷۸۲ ٹیوب ویلوں کو بجلی دی گئی جب کہ پچھلے سال ۱۵,۳۷۰ ٹیوب ویلوں کو بجلی دی گئی تھی۔

——— صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے کئی رعایتیں دی گئیں جن میں پسماندہ علاقوں میں بڑھی ہوئی سرمایہ سبسڈی، سیلز ٹیکس سے چھوٹ یا ملتوی کرنا، غیر مقیم ہندوستانیوں کے لیے صنعتی پلاٹوں کی ریزرویشن شامل ہیں۔ یہ سب "سنگل ونڈو سروس" کے ذریعہ مہیا کروائے جاتے ہیں۔

——— تقریباً دو دہائیوں کے بعد راست بھر میں میونسپل الیکشن کروائے گئے۔

——— شیڈولڈ ذاتوں کے بے زمین کھیت مزدوروں کو، ژالہ باری سے متاثرہ علاقوں میں کسانوں کو دیے جانے والے معاوضے کی پانچ فیصد رقم کام میں ہوئے نقصان کو پورا کرنے کے طور پر دی گئی۔

——— ڈپٹی کمشنروں، پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور تمام محکموں کے سربراہوں کے ذریعہ لگائے جانے والے جنتا درباروں سے عوام کی شکایتوں کو دور کیا جاتا ہے۔



غزلیں

کرشن موہن

○

حد ہے اندوہِ دروُنی کی
موسم نے اُداسی دُونی کی

یارو ہم کیا توصیف کریں
شہروں کی بوقلمونی کی

اپنا تو حال ہوا ابتر
سنگت نے رنگت خونی کی

یہ یاس کی بے حس دُھندلاہٹ
مستی ہے کسی افیونی کی

ہیں من کی اُداسی کا درپن
رنگیں باتیں باتونی کی

ناوک ہیں دلِ نازک کے لیے
باتیں دُنیائے زبونی کی

ہے سوزِ دروں بھی اِک صورت
آب وتابِ بیرونی کی

○

کچھ حوصلہ کر اے دل ورنہ ہے بہت مشکل
رام اُس بُتِ سرکش کو، کرنا ہے بہت مشکل

ہر رنگ میں بیکل ہوں اے یاس کہاں جاؤں
جینا ہے بہت مشکل، مرنا ہے بہت مشکل

ہر شخص کو چاہت کی توفیق نہیں ہوتی
دل نذر کسی بُت کو، کرنا ہے بہت مشکل

تقصیر تو دلکش تھی، تعزیر ہے رنج افزا
کرنا ہے بہت آساں، بھرنا ہے بہت مشکل

حق بات کا شیدا ہوں، اللہ سے ڈرتا ہوں
میرے لیے دنیا سے، ڈرنا ہے بہت مشکل



قطعات

صابر ابوہری

○

نہ کی اس کی پرواہ کبھی ہم نشیں
گئی جان اپنی کہ باقی رہی
جسے شیخ منبر پہ کہتا نہ تھا
سرِدار وہ بات ہم نے کہی

○

غلط ہے کہ دیدارِ حق کے لیے
خبر چاہیے یا بصر چاہیے
ان آنکھوں سے دید اس کی ممکن نہیں
اسے دیکھنے کو نظر چاہیے

○

ہوں پیشِ نظر جس میں سود و زیاں
وہ سوداگری ہے محبت نہیں
وطن سے نہ مانگو وفا کا صلہ
وطن کی محبت تجارت نہیں

○

مری یہ تمنا نہیں اے خدا
کہ میں ہر مصیبت سے بچتا رہوں
مری آرزو تو بس اتنی سی ہے
کہ میں ہر مصیبت میں ہنستا رہوں

○

بشر دوستی کو بناؤ شعار
دکھاؤ نہ دشمن کا بھی دل کبھی
محبت کے ہر سو جلاؤ چراغ
یہی ہے عبادت، یہی بندگی

تعمیرِ ہریانہ ۱۷ جون ۱۹۸۸ء

ابراہیم یوسف

قصہ گل بکاؤلی اور اردو ڈراما

اس داستان کی بنیاد پر متعدد مثنویاں ور ڈرامے عالم وجود میں آتے ہیں۔ اردو کے ابتدائی ڈرامہ نگار اساطیری قصوں، دیو مالا، داستانوں اور مثنویوں کو ڈرامائی شکل دینے کی طرف زیادہ مائل رہے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لوگوں کو اس زمانے میں ان میں بہت دلچسپی تھی اور ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ڈرامہ نگار کو بنا بنایا پلاٹ مل جاتا تھا جب پارسیوں نے تھیٹر کو کاروبار کے طور پر اپنایا تو شاہنامے سے واقعات لے کر ڈرامے لکھے اور لکھواتے تاکہ وہ اپنی قوم کی عظمتِ رفتہ کو پیش کر سکیں۔ ان ڈرامہ نگاروں کے لیے داستانوں میں گل بکاؤلی کا قصہ سب سے زیادہ پرکشش رہا ہے انھوں نے ضرورت کے مطابق اس میں تھوڑی بہت تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ قصہ بکاؤلی پر لکھے گئے مندرجہ ذیل ڈراموں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ گل بکاؤلی۔ نسروان جی مہروان جی آرام

۲۔ بکاؤلی عرف غنچۂ عشق۔ غلام حسین عرف حسینی میاں ظریف۔

۳۔ بکاؤلی و تاج الملوک عرف ثمرہ نیک وبدسلوک۔ حافظ محمد عبداللہ

۴۔ ثمرہ نیک وبدسلوک معروف بہ عشق بکاؤلی و تاج الملوک۔ امیر جان ادا۔

۵۔ گل بکاؤلی۔ کریم الدین مراد

۶۔ گل بکاؤلی عرف ناٹک ہمت عالی۔ مولوی الٰہی بخش نامی۔

۷۔ سنگین بکاؤلی۔ ونایک پرشاد طالب

۸۔ سنگین بکاؤلی۔ محمود میاں رونق

۹۔ چترا بکاؤلی۔ کریم الدین مراد

۱۰۔ چترا بکاؤلی عرف گلزار عاشقی ۔ مرزا نظیر بیگ ۔

گل بکاؤلی کا قصہ اس قدر طول طویل ہے اور بیچ بیچ میں ضمنی قصے بھی موجود ہیں کہ پورے قصے کو ڈرامائی شکل دینا ممکن نہیں۔ اگر ہم قصہ کو بغور دیکھیں تو قصہ خود دو حصوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے پہلا حصہ قصہ کے ابتدا سے بکاؤلی کو راجہ اندر کے ذریعہ قید کیے جانے تک اور دوسرا حصہ اس کے بعد سے قصہ کے اختتام تک جس میں چترا وت قصہ کے اسٹیج پر نمودار ہوتی ہے۔ اردو کے ڈرامہ نگاروں نے ان دونوں حصوں کو علاحدہ علاحدہ اپنے ڈراموں کے لیے منتخب کیا ہے۔

ڈاکٹر عبد العلیم نامی فرماتے ہیں کہ "بکاؤلی کا موضوع بہت فرسودہ ہے۔ متعدد ڈرامہ نویسوں نے اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ غلام حسین ظریف نے بکاؤلی عرف غنچۂ عشق کے نام سے ۱۸۸۷ء میں ایک ڈرامہ لکھا۔ حافظ عبد اللہ اور نظیر اکبر آبادی نے ۱۸۹۳ء میں چترا بکاؤلی کے نام سے ڈرامے لکھے۔ منظر بریلوی نے اسے چندراولی کا نام دیا۔ حافظ عبد اللہ نے چندر بکاؤلی سے موسوم کیا۔ مولوی بخش الٰہی نامی (الٰہی بخش نامی) ۱۸۹۲ء اور وحشت دہلوی نے گل بکاؤلی کے نام سے یاد کیا۔ حافظ عبد اللہ نے گل بکاؤلی عرف ثمرۂ نیک و بد سلوک کے نام سے لکھا ہے"[۹]

ڈاکٹر نامی کے اس بیان میں اوپر دی گئی فہرست کے آخر ڈرامے آگئے ہیں۔ ڈاکٹر نامی نے اپنے اس تحقیقی مقالہ میں اس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے اس چند سطری اقتباس میں ہی دو غلطیاں موجود ہیں اول تو حافظ عبد اللہ کے ڈرامے نیک و بد سلوک کا نام غلط درج کیا ہے دوسرے منظر بریلوی کے نام کے ساتھ چندراولی کا نام اس طرح درج کیا ہے جیسے اس ڈرامے کا تعلق بکاؤلی کے قصہ سے ہو حالانکہ اس کا دور سے بھی تعلق بکاؤلی کے قصہ سے نہیں ہے۔

رونق کے ڈرامے "سنگین بکاؤلی" کے بارے میں نامی صاحب فرماتے ہیں۔ "یہ منظوم ڈرامہ دو ڈراپ سین پر مشتمل ہے۔

میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۶ء درج ہے۔ راجہ اندر کی رقاصہ (بکاؤلی) شرقستان کے شہزادے تاج الملوک ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر عاشق ہو کر اس کو پرستان لے جاتی ہے واپسی پر وہ پکڑا جاتا ہے ایک دیو اسے گرفتار کر کے راجہ کے حضور میں پیش کرتا ہے۔ راجہ بکاؤلی کو طلب کرتا ہے اور بحالت غصہ جلا کر خاکستر کر دیتا ہے راجہ اس کو پھر زندہ کرتا اور اس کا زیریں حصہ پتھر کا بنا کر اس کو بارہ سال قید سخت میں رکھنے کا حکم دیتا ہے لیکن بکاؤلی چار سال کے اندر ہی راجہ کو گا بجا کر خوش کر لیتی ہے راجہ اس کی شادی تاج الملوک سے کر دیتا ہے"[۱۰]

ڈاکٹر نامی نے رونق کے ڈرامے "سنگین بکاؤلی" کا جو پلاٹ عنایت فرمایا ہے اسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا غلط نہیں کہ اس کا کوئی تعلق بکاؤلی کے قصہ سے نہیں ہے سوائے نام اور بکاؤلی کو نصف پتھر کی بنائے جانے کے باقی تمام واقعات اندر سبھا امانت کے معلوم ہوتے ہیں۔

گل بکاؤلی پر لکھے گئے اکثر ڈرامے نایاب

ہیں۔ اس وقت ہمارے پیش نظر دو ڈرامے ہیں جن پر تفصیلی بحث کی جا سکتی ہے ایک۔" ثمرۂ نیک و بد سلوک معروف بہ عشق بکاؤلی و تاج الملوک ۔ مصنفہ امیر جان ادا دوسرا" چترا بکاؤلی " از کریم الدین مراد امیر جان ادا حافظ عبداللہ کی انڈین امپیریل تھیٹریکل کمپنی کی چیف ایکٹریس تھی۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے وہ چوتھا ایڈیشن ہے جو ایک ہزار کی تعداد میں مطبع الٰہی آگرہ سے ۱۹۱۸ء شائع ہوا ہے اس کا دیباچہ ۹/ اپریل ۱۸۸۶ء کو لکھا گیا اس لیے اس کا پہلا ایڈیشن بھی اس سال چھپ گیا ہوگا۔ اس نام کا ایک ڈرامہ حافظ عبداللہ کا بھی موجود ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ امیر جان کا ڈرامہ حافظ عبداللہ ہی کا ڈرامہ ہے جس میں کچھ معمولی تبدیلیاں کرکے کاروباری نقطہ نظر سے امیر جان کے نام سے چھپوا دیا گیا ہے سرورق پر بعانت حافظ عبداللہ لکھا ہوا ہے۔ حافظ عبداللہ کے مطبوعہ ڈراموں کا ایک خاص پیٹرن ہوتا ہے یعنی ہر ڈرامے پر دیباچہ ہوتا ہے پھر اصطلاحات ناٹک اس کے بعد تختۂ ناٹک۔ گائی جانے والی چیزوں کی دھن اور تال ضرور بتلائی جاتی ہے اور کسی مقبول گانے کا مصرع لکھ کر طرز بتلائی جاتی ہے اور یہ سب چیزیں امیر جان ادا کے مطبوعہ ڈرامے میں موجود ہیں۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو امیر جان کا یہ ڈراما نظرانداز کرنے کے لائق نہیں ہے۔ پورا ڈرامہ تین ڈراپ سین پر مشتمل ہے۔ پہلے ایکٹ میں آٹھ سین دوسرے میں چار اور تیسرے میں چھ سین ہیں گویا مجموعی طور پر اٹھارہ سین ہیں۔ ڈرامے میں دو غزلیں مجید کی اور ایک رونق کی بھی ہے مثنوی گلزار نسیم کا بھی وہ حصہ ڈرامے میں شامل ہے جہاں پھول کے غایب ہو جانے پر بکاؤلی پریشانی ہوتی ہے ؂

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

امیر جان ادا کا ڈراما زین الملوک کے اندھے ہو جانے سے شروع ہو کر روح افزا کی سفارش پر بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی ہو جانے پر ختم ہوتا ہے قصہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے صرف محمود اور حمالہ دیونی کے واقعہ کو شامل نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ دیو جو تاج الملوک کو کھا جانے پر تیار تھا تاج الملوک کے یہ کہنے پر کہ

بہ آگاہی دیتا ہوں اس دم تجھے
سلیماں نبی کی ہوں میں نسل سے
نہ اب دیر کر مجھ کو کھا لے شتاب
کرے گا کہاں تک سوال و جواب

اس پر دیو جواب دیتا ہے۔

نہ کھاؤں گا تجھ کو نہ کھاؤں گا میں
نہ ایک بال تیرا دکھاؤں گا میں
لیا تو نے جن کا ہے اس وقت نام
وہ آقا ہمارے ہیں ہم ہیں غلام

اور پھر ایک دوسرے دیو کے ذریعہ تاج الملوک کو بکاؤلی کے باغ میں پہنچوا دیتا ہے۔

ڈرامے کی خوبی اسے ایکٹ اور سین میں تقسیم کرنا ہے۔ اٹھارہ سینوں میں کوئی سین

غیر ضروری اور بھرتی کا نہیں۔ سین اس تسلسل سے آتے ہیں کہ قصہ کہیں ٹھہرتا ہوا نظر نہیں آتا بلکہ برابر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ سینوں کی طوالت بھی اس سین میں کرداروں کی موجودگی کے مطابق ہے اگر سین میں دو کردار آتے ہیں تو سین مختصر ہوتا ہے اور اگر دو سے زیادہ کردار آتے ہیں تو ان کی مناسبت سے سین بھی چھوٹا بڑا ہو جاتا ہے یہ ایسی خوبی ہے جس کے باعث ناظر یا قاری کسی قسم کی اکتاہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ڈرامے کا تین چوتھائی حصہ نظم میں اور ایک چوتھائی نثر میں ہے۔ نثر میں ہم قافیہ جملوں کا اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ ان سے نظم کا سا ترنم پیدا ہوتا ہے۔ گانوں میں اپنے زمانے کی مقبول دھنوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ اپنی ان خصوصیات کے باعث۔ ثمرۂ نیک و بد سلوک معروف بہ عشق بکاؤلی و تاج الملوک۔ انیسویں صدی کے اچھے ڈراموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

" چترا بکاؤلی " کریم الدین مراد کا بہت ہی معروف ڈراما ہے۔ کریم الدین مراد کو احسن لکھنوی اپنا استادِ روحانی تسلیم کرتے ہیں اور ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ وہ پچاس برس قبل وہ کام کر گئے" جس کو باعتبار ترقی آج یعنی پچاس برس کے بعد امید کی جا سکتی تھی[۳۰] چترا بکاؤلی کی مقبولیت کا اندازہ احسن لکھنوی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ منشی کریم الدین مراد کے انتقال کے بعد وہ (دادا بھائی ٹھوٹھی) ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ڈرامہ نگاروں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اسی تلاش میں ایک مرتبہ میں ان کو مل گیا اور چترا بکاؤلی کا نمونہ پیش کر کے مجھ سے اسی زبان میں ڈراما لکھنے کی فرمائش کی میرا پہلا ڈرامہ جو کسی مالک کے انڈر کنٹرول لکھا گیا وہ چندراولی ہے"۔

اور پھر آگے فرماتے ہیں" میں نے چترا سے سبق لیا ہے جیسا کہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں ان کا کمال قابل تقلید تھا وہ وہی ڈرامہ نگار تھے"۔ احسن لکھنوی کے یہ اعترافات مراد اور چترا بکاؤلی کی اہمیت کا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی لکھتے ہیں"۔ یہ (چترا بکاولی) بھی رونق کے ڈرامے سے ماخوذ ہے[۳۱] لیکن رونق کے ڈرامے سنگین بکاؤلی کا جو پلاٹ اوپر درج کیا گیا ہے اس کا چترا بکاؤلی سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر نامی کا یہ خیال کہ چترا بکاؤلی رونق کے ڈرامے سے ماخوذ ہے محض بے بنیاد ہے۔

چترا بکاؤلی تین ڈراپ سین پر مشتمل ہے۔ پہلے ایکٹ میں پانچ سین دوسرے میں تین اور تیسرے میں پانچ سین ہیں یعنی کل تیرہ سین ہیں ڈرامے کا آغاز راجہ اندر کے دربار سے ہوتا ہے جہاں راجہ اندر کو پتہ چلتا ہے کہ بکاؤلی عشق آدم زاد میں مبتلا ہے تو وہ بکاؤلی کے قتل کا حکم دیتا ہے اس پر سبز پری راجہ اندر سے درخواست کرتی ہے۔

" بکاؤلی پری ہماری سردار زینتِ دربار ہے اگر یہ چاند غضب کے بادل میں چھپایا جائے گا تو بندہ پرور ہم جیسے ستاروں کا لشکر بغیر سردار کے ابتر ہو جائے گا۔

سزا کوئی ایسی نکلتی رہے کہ زندہ رہے
اور جلتی رہے
یہ پوشاک چرمی بدلتی رہے تو پھر
نوری سانچے میں ڈھلتی رہے"

اس پر راجہ اندر بکاؤلی کو روز جلا کر پاک کرنے، پھر جلا کر دربار میں لانے کا حکم دیتا ہے بکاؤلی روز جلائی جاتی ہے اور پھر زندہ کر کے دربار میں لائی جاتی ہے، اس پر بھی بکاؤلی تاج الملوک کے عشق سے باز نہیں آتی تو راجہ اندر اسے نصف پتھر کی بنا کر مندر میں قید کر دیتا ہے یہاں کریم الدین مراد نے اصل قصہ میں ایک خوشگوار تبدیلی کی ہے۔ راجہ اندر اس کے اصلی حالت میں آنے کی یہ شرط رکھتا ہے۔

ایک سمے وہ تیرا دلبر بیچ میں آکر پھنس جاوے
اس کی قوم کی عورت کا دل اس کی خاطر للچاوے
جب تک تجھ سے شادی کی وہ لینے اجازت نہ آوے
اور تو اپنی مرضی کا اقرار نہ اس کو بتلا وے
جیتے جی اس جرم سے تو چھٹکارا پھر نہ کبھی پاوے

بیت

سن سن یہ بھید تو جو اسے کہہ سنائے گی
مانند اپنے اس کو بھی پتھر بنائے گی

تاج الملوک کو جوگیوں کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی آپ ایک مندر پیدا ہو گیا ہے وہ پراسرار ہے اور صرف رات کے وقت کھلتا ہے۔ تاج الملوک اس مندر کے پاس جاتا ہے اور رات میں کھلنے پر اس میں داخل ہوتا ہے جہاں اس کی ملاقات بکاؤلی سے ہوتی ہے پھر تو وہ ہر رات مندر میں جانے لگتا ہے۔ بکاؤلی اسے موتی دیتی ہے کہ وہ اسے بیچ کر اپنی گذر بسر کرے۔

تاج الملوک پر موتی چرانے کا الزام لگایا جاتا ہے اس زمانے میں بہت سے شہزادے چتراوت سے شادی کرنے آتے ہیں مگر وہ کسی کو پسند نہیں کرتی اتفاق سے اس کی نظر تاج الملوک پر پڑ جاتی ہے اور وہ اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ چتراوت کی سہیلیاں چھبیلا، نرملا اور خود چترا بہت کوشش کرتی ہیں مگر تاج الملوک اس کی طرف مائل نہیں ہوتا اسی دوران چترسین کو زین الملوک کا خط ملتا ہے کہ اس کا لڑکا تاج الملوک کدھر نکل گیا ہے اس کی تلاش کی جائے اسی کے ساتھ ساتھ خط میں یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ کس طرح وہ بکاؤلی کے باغ سے پھول لایا کس طرح دلبر بیسوا کو چوسر میں ہرا کر اپنے بھائیوں کو اس کی قید سے آزاد کرایا وغیرہ وغیرہ۔ یہ خط چتراوت پڑھ لیتی ہے پھر تاج الملوک کو بلوا کر رجھانے کی کوشش کرتی ہے اب بھی تاج الملوک پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو چتراوت کہتی ہے کہ تم چور ہو تو تاج الملوک اس پر حیرت کا اظہار کرتا ہے تو چتراوت کہتی ہے کہ

"ایک چوری کیسی، آپ کی پیشانی سے چوری، جواری، مکاری، عیاری، برادر خواری ہر ایک عیب کی نمود اری ہے۔"

تاج الملوک ان سب الزامات سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وہ یہ الزامات

ثابت کر دے تو وہ اس کا غلام بن کر رہے گا۔
چترا ایسے میں زین الملوک کا خط بتلاتی ہے اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس نے بکاؤلی کے باغ سے پھول چرایا اس لیے وہ چور رہے، دلبر بلیسوا کے ساتھ جوا کھیلا اس لیے جواری ہے وغیرہ وغیرہ تاج الملوک قائل ہو جاتا ہے۔ چترا چونکہ شرط جیت چکی ہے اس لیے وہ اسے شادی کے لیے مجبور کرتی ہے تاج الملوک کہتا ہے کہ وہ ایک دیوی کا پجاری ہے اس سے اجازت لینا ضروری ہے سب مندر جاتے ہیں اور بکاؤلی سے شادی کی اجازت طلب کرتے ہیں بکاؤلی جونہی شادی کی اجازت دیتی ہے مندر غائب ہو جاتا ہے اور بکاؤلی اپنی اصلی حالت میں آجاتی ہے سب ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔
چترا بکاؤلی انیسویں صدی کا نہ صرف مقبول ڈراما تھا بلکہ قابلِ تقلید بھی تھا۔ جس کا اعتراف احسن لکھنوی نے کیا ہے کریم الدین مراد نے قصہ میں معمولی تبدیلی کر کے اس کے ڈرامائی حسن کو بہت بڑھا دیا ہے۔ چتراوت کی سہیلیوں چھیلا اور نرملا کی نوک جھونک اور شوخیاں ڈرامے کے ماحول کو خوشگوار بنائے رکھتی ہیں ایک بات اور ڈرامے میں پولیس کے کالے کرتوتوں کو پیش کیا گیا ہے جو ڈرامے کا ایک اضافی وصف ہے۔ انیسویں صدی میں حکومت کی مشنری کی پول کھولنا بڑی جرات کی بات تھی۔ انیسویں صدی میں ڈرامے کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار گانوں کی مقبولیت پر ہوتا تھا۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ "چترا بکاؤلی کے گیتوں اور گانوں کی نمایاں خصوصیت ان کا سیدھا سادھا اور چلتا ہوا ترنم ہے اور یہ ترنم کبھی مناسب بحر کے انتخاب سے پیدا کیا گیا ہے کبھی مصرعوں کو دو یا زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اور ان موقعوں پر ترنم اور خوش آہنگی کی کیفیت کو ابھارنے میں ہم وزنی اور ہم قافیہ الفاظ کو نمایاں دخل ہے[۵]" ڈرامے کی نثر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں "مکالموں میں استعمال ہونے والی نثر بھی سلیس اور سادہ ہے۔ جملوں کی ساخت میں ہر جگہ چھوٹے چھوٹے ہم وزن یا ہم قافیہ فقروں سے مدد لی گئی ہے اور اس طرح نثر میں بھی نظم کا سا خوشگوار اور مترنم تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ سادگی کے علاوہ ان جملوں میں جا بجا زبان کا چٹخارہ بھی ملتا ہے اور زبان کا لطف بھی[۶]۔"
قصہ گل بکاؤلی نے نہ صرف اردو داستانوں میں گرانقدر اضافہ کیا ہے بلکہ یہ واحد داستان ہے جس پر تحقیق بھی کی گئی ہے۔ اس کی بنیاد پر مثنوی گلزار نسیم جیسی اہم مثنوی لکھی گئی ہے اور اردو کے ڈرامائی ادب میں بہت اضافہ کیا ہے جو عرصہ تک لوگوں کی تفریح کا ذریعہ رہے آج ہم ان مافوق الفطرت واقعات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ انیسویں صدی کا انسان اگر کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر ان پر یقین رکھتا تھا انھیں سن کر پڑھ کر اور اسٹیج پر دیکھ کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان ڈرامہ نگاروں نے جنھوں نے پری اور انسان

کے عشق پر ڈرامے لکھے ہیں ہمیشہ انسان کی عظمت اور بزرگی کو پیش کیا ہے۔ "نزرہ نیک و بدسلوک" میں دیو حضرت سلیمان کا نام سن کر اپنی شرارت سے توبہ کرلیتا ہے اسی طرح "چترا بکاؤلی" میں جب سبز پری بکاؤلی کے انسان سے عشق کرنے کی حمایت کرتی ہے توسب پریاں لعنت ملامت کرتی اور انسان کو حقیر ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

لال پری کہتی ہے۔

لال: ہے خاک اور پانی سے جو انسان کو سانا
سبز: پھر کس لیے ہے تم نے سلیمان کو مانا
سب: ہیہات یہ بدذات نے کیا بات نکالی
اس خاک کے پتلے میں کرامات نکالی

ان ڈراموں میں نہ صرف انسان کی عظمت اور بزرگی کو پیش کیا گیا ہے بلکہ اس کی ہمت اور بہادری کے بھی گیت گائے گئے ہیں اور ان سے بڑھ کر یہ کہ ان ڈراموں میں ہمیشہ پری کو انسان پر عاشق ہوتے دکھایا گیا گویا انسان پری سے زیادہ خوبصورت مخلوق ہے۔ غرض یہ کہ وہ ڈرامے جن میں پری اور انسان کے عشق کو پیش کیا گیا ہے نظر انداز کرنے کے لائق نہیں بلکہ انھیں نئے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

۱؎ اردو تھیٹر (جلد دوم) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، ص ۱۰۰

۲؎ رونق بنارسی۔ عہد اور تخلیقات۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ادب لطیف لاہور فروری ۱۹۵۷ء: ص ۲۲

۳؎ بہار کا اردو اسٹیج اور اردو ڈرامہ، پروفیسر سید حسن، جناب سید حسن صاحب نے اپنی محولہ کتاب میں۔ نامۂ احسن کا پورا متن دے دیا ہے۔ نامۂ احسن رسالہ بہارستان لاہور کے جنوری فروری ۱۹۲۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ احسن لکھنوی کے بیانات اسی نامۂ احسن سے لیے گئے ہیں۔

۴؎ اردو تھیٹر (جلد دوم) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، ص ۱۶۱

۵؎ کریم الدین مراد کے ڈرامے، مرتبہ سید امتیاز علی تاج، ص ۱۵۳

۶؎ کریم الدین مراد کے ڈرامے، مرتبہ سید امتیاز علی تاج: ص ۱۵۴

ہم نے کچھ اس ڈھب سے دیکھا رنگِ دُنیا عمر بھر
جاگتی آنکھوں میں تھا خواب تماشا عمر بھر
یہ وہ دھرتی تھی جہاں کوئی نہ آیا عمر بھر
سُونا سُونا ہی رہا دل کا جزیرا عمر بھر
رفتہ رفتہ ٹوٹ جاتے ہیں سبھی رشتے مگر
درد کا رشتہ کچھ ایسا تھا، نہ ٹوٹا عمر بھر
بے تکلف تھے وہ ہم سے پھر بھی اپنے درمیاں
اِک تکلف کا رہا ہلکا سا پردا عمر بھر
لہلہاتی ہی رہی پرویز کِشتِ آرزو
مُسکراتے ہی رہے زخمِ تمنّا عمر بھر



غزلیں

پرکاش ناتھ پرویز

ابھی تک یاد ہے دل کو وہ شرحِ آرزو لکھنا
کسی کو سیم تن کہنا، کسی کو خوب رُو لکھنا
خبر دینا کہ گلہائے چمن کا حال کیسا ہے
ذرا فرصت ملے تو داستانِ رنگ و بُو لکھنا
کِسی گُلرنگ پیکر کو سمجھنا حاصلِ ہستی
کِسی بے نام لمحے کو جہانِ آرزو لکھنا
نہیں یہ ارتقائے فکر و فن تو اور پھر کیا ہے
کِسی جانِ تمنّا کو "غزل کی آبرو" لکھنا
مجھے پرویز تہذیبِ بہاراں نے سِکھایا ہے
گُلوں کو جام کہنا اور شبنم کو لہو لکھنا

جب بھی آنسو تری پلکوں پہ نظر آتے ہیں
رُوح کی سطح پہ سو زخم اُبھر آتے ہیں
خواب آنے کے لیے نیند ضروری تو نہیں
جاگتے میں بھی کئی خواب نظر آتے ہیں
میں تو دیوانہ ہوں تو مجھ پہ بہت طنز نہ کر
اہلِ دانش بھی ترے زیرِ اثر آتے ہیں
دل تو ہے ایک مگر زخم ہیں بے اندازہ
یہ وہ دیوار ہے جس میں کئی در آتے ہیں
حُسن والوں میں بھی کیا طُرفہ کشش ہے پرویز
اُن سے ملنے کے لیے اہلِ نظر آتے ہیں

غزلیں

بہت پرانی حقیقت فسانا ہے میرا
قفس کے گوشے میں اب آشیانا ہے میرا

نہ کوئی میرا ہدف ہے نہ کوئی میرا صدف
خود اپنی ذات ہی یارو نشانا ہے میرا

دلِ حزیں کی روش اُس سے ملتی جلتی ہے
یہ دوست وہ ہے جو دشمن پرانا ہے میرا

وہ آدمی ہوں کہ جس کو زمیں سے نسبت ہے
نیا نہیں ہے پرانا گھرانا ہے میرا

زمین سے ہے نہ کچھ آسمان سے رشتہ
ہوا کے دوش پہ اب آشیانا ہے میرا

میں اُس کی آنکھوں میں اک خواب بن کے اترا ہوں
زمیں اُس کی ہے لیکن زمانہ ہے میرا

خود اپنے دل میں کہ اُس کی نگاہ میں عنواںؔ
پتا نہیں ہے کہاں اب ٹھکانا ہے میرا

ڈاکٹر عنوان چشتی

پرکاش فکری

ہراساں شام ہے تنہائیوں کی
سیاہی چار سُو پرچھائیوں کی

چمکتے پانیوں کے آئینے میں
چھپی ہے تیرگی گہرائیوں کی

پرندے بھی خبر لاتے نہیں اب
فضا کی نیلگوں پہنائیوں کی

کہاں وہ خواب ہیں آوارگی کے
کہاں وہ بزم ہے سودائیوں کی

بتا کس طور سے فکریؔ گزاریں
سلگتی رات یہ پروائیوں کی

م۔ق۔خان

اظہارِ ذات

رضیہ بری طرح جھنجلائی ہوئی تھی۔ گھر میں کچھ قریبی رشتہ دار اور دوسرے مہمان ابھی تک موجود تھے لوگوں کے چہروں اور آنکھوں میں اُگے سوال اسے بے چین کرتے رہتے۔ کچھ بے تکلف لوگ اظہار تشویش یا ہمدردی کے بہانے دریافت کرتے رہتے گھر کے لوگوں کو وہ کسی طرح بہانے بنا کر ٹال دیتی لیکن سہیل کے دوستوں کو جواب دینا یا مطمئن کرنا اور بھی مشکل تھا وہ کوئی کام کرتی رہتی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگتی۔ ٹیلیفون پر طرح طرح کے سوال کیے جاتے۔ ہر چند کہ اس نے دس دنوں میں بہت حد تک جھوٹ بولنا یا بہانے تراشنا سیکھ لیا تھا لیکن وہ ابھی اس فن میں طاق نہیں ہوئی تھی۔ کسی کام کو بہ حسن و خوبی انجام دینے کے لیے جتنی مشق حاضر دماغی یا حاضر جوابی کی ضرورت ہوتی ہے اس میں وہ ماہر نہیں ہوئی تھی۔ ہوتی بھی کیسے کہ یہ افتاد تو اس کے لیے نئی نئی تھی۔

وہ ذہنی الجھن و انتشار میں ہوتی اور ٹیلیفون کی گھنٹی گونجنے لگتی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کبھی کسی کو کچھ جواب دیتی کبھی کچھ، کبھی جگہ کا نام غلط بتا دیتی تو کبھی اس کے کام کی نوعیت کا غلط اظہار ہو جاتا۔ اب وہ اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ اسے لگتا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں پرسکون زندگی گزارے۔ لیکن گھر میں مہمان بھرے تھے وہ راہِ فرار کیسے اختیار کرتی؟ ایک دن محض اپنے ذہنی تناؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے چھوٹے بھائی کے یہاں دوپہر کے بعد چلی گئی تھی اور وہاں سے زیادہ پریشان اور الجھ کر آئی تھی۔ بعد میں وہ

سوچتی سوزش! وہ وہاں نہیں گئی ہوتی تو اچھا تھا۔ شکر تھا کہ شاہد اُس کے چھوٹے بھائی نے ساری باتیں تخلیہ میں کہی تھیں ـــــ ورنہ ـــــ

بات بھی عجیب اور پریشان کن تھی۔ شاہد نے لکھنؤ میں سہیل کو ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ایک ہوٹل میں دیکھا تھا۔ وہ نوجوان لڑکی کون تھی؟ یہ سوال بار بار اُس کے ذہن کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

کیا کوئی ذی شعور ذمہ دار شخص جس نے چند دنوں قبل اپنی بڑی بیٹی کی شادی کی ہو، ایسی گھٹیا حرکت کر سکتا ہے؟ رضیہ نے دل کو سمجھایا۔ شاہد نے پہچاننے میں ضرور غلطی کی ہے۔ سہیل ایسی ذلیل حرکت نہیں کر سکتا ہے۔ سہیل نے کہا تھا وہ محض دو تین دنوں کے لیے دفتر کے کام سے کلکتہ جا رہا ہے۔ کہاں کلکتہ اور کہاں لکھنؤ؟ آخر کلکتہ سے یک بہ یک لکھنؤ کا سفر کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ جہاں آمد و رفت کے اتنے آسان، اچھے اور تیز ذرائع موجود ہوں وہاں کسی شخص کو ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں دیکھا جانا کون سی غیر ممکن بات ہے۔ دو تین دنوں کا عرصہ کب کا گزر چکا ہے۔ شاہد نے یہ اطلاع کئی دنوں کے بعد دی تھی۔ وہ ماضی میں الجھی حال کی گتھیوں کو سلجھانے میں محو تھی کہ کال بیل گونج اٹھی وہ تیز چلتی ہوئی دروازے کے پاس گئی۔

دروازے پر سہیل کا جگری دوست اشوک کھڑا تھا۔ اشوک کے چہرے پر بھی تشویش تھی اس نے دریافت کیا۔ "آخر یہ ناعاقبت اندیش کہاں چلا گیا؟ دفتر میں اس کی چھٹی بھی ختم ہو چکی ہے۔"

رضیہ کے لیے یہ بھی ایک انکشاف تھا۔ سہیل دفتر کے کام سے نہیں، چھٹی لیکر گیا ہے۔ رضیہ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ فوراً وہ کوئی بات بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور اس نے کہا "مجھے تو بس اتنا کہہ کر گئے ہیں کہ دفتر کے کام سے دو تین دنوں کے لیے کلکتہ جا رہے ہیں۔"

رضیہ کی باتیں سُن کر اشوک کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ اُسے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالیں گے۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں شادی کی پریشانیوں کی وجہ سے شاید تھک گیا ہو۔"

"لیکن انہیں کچھ خبر تو......." اپنا جملہ پورا نہیں کر پائی۔

"آپ بالکل مطمئن رہیں۔ وہ ایک دو دنوں میں آجائے گا۔ ہم پالتو جانور جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ وہ اتنی دیر تک ہی دوڑے گا جتنی دیر تک آپ اس کی رسی ڈھیلی رکھیں گے۔ آپ نے اسے گھر کی فکر سے پہلے ہی آزاد کر دیا تھا... ریس دیکھنا، کہیں ہانکنا، کلب جانا، بوٹنگ کرنا ہی نہ اس کا مشغلہ تھا ذرا آجائے تو مجھے فوراً خبر کر دینا۔ میں اُس بچو کی خبر لیتا ہوں، غیر ذمہ دار، آوارہ!"

رضیہ لوٹ کر آ رہی تھی کہ اُس نے چند عورتوں کو چھپ کر اُن کی گفتگو سنتے دیکھا۔ رضیہ کو ناگوار لگا۔ اس کا جی چاہا کہ سارے لوگوں کو فوراً اپنا گھر چھوڑنے کو کہہ ڈالے۔ رضیہ اندر داخل ہوئی کہ ان عورتوں میں سے ایک نے انجان بن کر سوال کیا۔ "کون صاحب تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

رضیہ کا چہرہ غصہ اور نفرت سے تمتما اٹھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ انہیں کچھ کھری کھوٹی سناتی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی

بجنے لگی۔ ان دنوں گھنٹی اور رضیہ کے دل کی دھڑکن ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پہلے تو اس نے گھنٹی کو بجنے دیا۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا کہ کوئی دیوار سے لگی دیکھ یا سُن تو نہیں رہی ہے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے ذرا اطمینان ہوا تو اس نے ٹیلیفون اٹھایا۔ "ہیلو، میں رضیہ بول رہی ہوں۔"

"میں ہوں ممی، سلمیٰ السلام علیکم۔"

"سلمیٰ! کیا بات ہے؟"

"میں پاپا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ پاپا نے اتنی جلدی ہی مجھے بھلا دیا۔"

"تمہارے پاپا ابھی لکھنؤ سے نہیں لوٹے ہیں۔"

"لکھنؤ! کل آپ نے کہا تھا وہ کلکتہ گئے ہیں۔" سلمیٰ نے اظہار تشویش کیا۔

رضیہ نے محسوس کیا جیسے ایک راز جسے وہ اپنے سینے میں محفوظ رکھنا چاہتی تھی فاش ہو گیا۔ اس نے فوراً جھوٹ کا سہارا لیا۔

"ہاں بیٹا، میں بھول گئی۔ تمہارے پاپا ابھی کلکتہ سے نہیں لوٹے ہیں۔ تم ہر وقت اپنے پاپا کو ہی تلاش کرتی ہو۔ تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تمہارے بغیر میں کتنا اکیلا پن محسوس کرتی ہوں۔ سارا گھر کیسا سونا سونا لگتا ہے؟ کبھی ہم سے باتیں کرو گے"

"آپ سے تو دو دنوں قبل ہی دیر تک باتیں کرتی رہی تھی۔ پاپا ہوتے تو......"

"پاپا کی چہیتی بیٹی! اچھا تمہارے پاپا کو آتے ہی تمہارے پاس بھیج دونگی۔" رضیہ نے ریسیور رکھ دیا اور سوچنے لگی کہ مستقبل میں کسی سے باتیں کرنے سے پہلے اچھی طرح ذہن نشین کر لے گی کہ وہ کس شہر کا نام لیگی۔

رضیہ نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ سہیل میں ایسا انقلاب رونما ہوگا۔ ان کی ازدواجی زندگی کا اُنیس واں سال تھا۔ اس سے قبل رضیہ نے سہیل کو کسی لڑکی یا عورت کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھتے یا دلچسپی لیتے نہیں دیکھا تھا۔ سہیل اس پر بری طرح فریفتہ تھا۔ آخر اب وہ کون سا ایسا حادثہ ہو گیا تھا کہ یک بہ یک یہ تبدیلی آئی۔ کسی اطمینان اور خوش دلی سے سہیل نے شادی انجام دی تھی۔ خواہ کیسا ہی سنگین معاملہ درپیش آتا وہ خندہ پیشانی سے حل تلاش کرتا۔ ہاں بیٹی کی رخصتی کے وقت سہیل کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے گوشوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے تھے تو وہ اس جگہ سے ذرا دور ہٹ کر سگریٹ پیتا رہا اور اپنے چند قریبی دوستوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے خود کو فریب دینا چاہتا تھا اور دوسروں کو اپنے جذبات، اپنے غم سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اپنی کمزوری کا اظہار برملا وہ کبھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اور شادی کے محض پانچویں دن سہیل کا غائب ہو جانا اور وہ بھی کسی نوجوان لڑکی کے ساتھ دیکھا جانا ــــــ اس کا دل اپنے بھائی کی اس اطلاع کو جھٹلانے پر تلا تھا۔ یہ ہرگز ممکن نہیں جب وہ جوان تھا۔ جب بیشتر لوگوں کے قدم ڈگمگاتے ہیں وہ اس قدر ثابت قدم، اصول و ضوابط کا پابند، اپنے پندار کا قیدی تھا۔ اور اسی شخص سے یہ ساری نازیبا حرکت سرزد ہو کیسے سکتی ہے۔

رضیہ ہر طرح سے اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہتی لیکن دبے پاؤں ایک عجیب احساسِ شکست اس

کے سکون کو پارہ پارہ کرنے کو داخل ہو جاتا۔ شاہد نے جو کچھ دیکھا تھا وہ سچ ہے تو پھر کیا ہوگا؟ وہ لوگوں کو کیا منہ دکھائے گی بیٹی کے سسرال والے کیا سمجھیں گے؟ اس کے بیٹوں پر کیا اثر پڑے گا؟

رضیہ نے کھڑکی کھولکر دیکھا۔ اس کی نگاہیں دیر تک خلا میں آوارہ گھومتی رہیں۔ باہر کا منظر عجیب بے کیف تھا۔ یہ مئی کا آخری ہفتہ تھا کہیں سبزی کا نام نہ تھا چلچلاتی دھوپ میں گرم ہوا سے پتے سنولائے منہ لٹکائے ہوئے تھے پودے سرنگوں، نیم خوابیدہ۔ رضیہ کے دل کے اندر ہمہ منگوتے پیران چڑھتے غم و رنج کی ہمنوائی کر رہے تھے ساری فضا سوگوار تھی، اس نے کھڑکی بند کردی اس کے اندر مدافعت کی ساری قوت مفلوج سی ہو گئی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگی اس کا ذہن منتشر تھا۔ خیالوں کے کارواں آتے اور گزر جاتے اس کی نظر قدِ آدم آئینہ پر رک گئی اس کا اپنا سراپا اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس کا رنگ آج بھی گورا تھا۔ جسم زیادہ موٹا تھا نہ دبلا قد میانہ تھا۔ لیکن پیشانی اور آنکھوں کے قریب کہیں کہیں جھریوں کی آمد آمد کی نشاندہی کرتی چند لکیریں ضرور تھیں جو غور سے دیکھنے سے ذرا نمایاں ہو رہی تھیں۔ کام کی زیادتی سے ہاتھ کا چمڑا کھردرا ہو گیا تھا اور بانہوں پر نیلی نیلی رگیں ذرا ابھر آئی تھیں۔ اس کے بال اب بھی کمر سے نیچے تک تھے لیکن ان میں خال خال چاندی کے تار جیسے سفید بالوں کا وجود رضیہ کے لیے پریشان کن تھا۔

رضیہ کے اندر، گرتی عمر اور جاذبیت کے فقدان کا احساس جاگ اٹھا۔ یہ احساسات اس کے دل پہ چرکے لگانے لگے۔ اور اسے لگا سہیل کے اس طرح غائب ہونے کا راز اسے پتہ چل گیا شاید میری جسمانی کشش کی کمی نے سہیل کو یہ غلط قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ رضیہ نے آج تک ان باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ وہ اپنی کشش کو برقرار رکھتی، اپنے جسم کی آرائش و زیبائش کا خیال رکھتی۔ سہیل کی بے پایاں محبت اور دل نوازی نے اس کو اس جانب دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں دی تھی انسان مدافعت کے لیے تو کمربستہ ہوتا ہے جب کہیں سے خطرے کا خدشہ ہو۔ رضیہ نے اس وقت مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ابھی کسی مشاطہ... کے پاس جائیگی اور اپنی تمام تر خامیوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریگی۔ وہ ہجومِ خیالات میں غرق تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے اس کا دھیان توڑ ڈالا۔

"ہیلو، میں رضیہ بول رہی ہوں۔ آپ .....؟" رضیہ نے ذرا بے رخی سے کہا۔ دوسری جانب سے جواب کے بدلے بچوں کو چمکارنے یعنی بوسے لینے کی آواز آئی۔ رضیہ بھنا گئی "کیا بدتمیزی ہے؟"

"معاف کرینگی محترمہ! کیا آپ مجھے اس حق سے بھی محروم کرنا چاہتی ہیں؟" آواز سہیل کی تھی۔

"سہیل"! رضیہ کے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

"میں ریلوے اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ گھر پہ سب خیریت سے ہے نا؟"

"سب خیریت ہے۔ لیکن تم اس طرح......؟" رضیہ نے سوال کرنا چاہا۔

"ابھی آتا ہوں۔ اور دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

رضیہ اُٹھ کر سہیل کے کھانے کا انتظام کرنے لگی۔ اس کی بے چین نگاہیں بار بار دروازے کی جانب اُٹھ جاتیں۔ اس کے دل میں اب بھی شبہ تھا کہ سہیل آ گیا ہے۔

سہیل آیا۔ اس کے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ تھی ——— جیسے کوئی بڑی مہم سر کر کے آیا ہو۔ اس وقت اس کے دونوں بیٹے آ گئے۔ سب نے بڑی گرم جوشی سے سہیل صاحب کا خیر مقدم کیا۔ بیٹیوں نے پاپا کی واپسی کی خوشی میں ماں سے سینما جانے کی اجازت لی اور چل دیئے۔ سہیل نے کہا۔ "اجازت ہو تو میں غسل کر لوں؟" رضیہ مسکرا دی۔ سہیل غسل خانے میں گھس گیا۔ پانی کے گرنے کی آواز کے ساتھ ہی سہیل کے گنگنانے اور سیٹی بجانے کی آواز سنی تو وہ دم بخود رہ گئی۔ سہیل میں یہ نمایاں تبدیلی تھی۔ وہ اس قدر کھلنڈرا تو پہلے بھی کبھی نہ تھا۔

دوسرے مہمان شام کے وقت لوگوں سے ملنے یا گھومنے نکل گئے تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ کمرے میں نہایت اطمینان سے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ رضیہ چائے لائی تو اسے کھینچ کر سہیل نے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ "آؤ تم سے مجھے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

"چھوڑو بھی۔ اور رہنے دو۔ اپنی باتوں کو اپنے پاس رکھو۔ تھکے ہارے آئے ہو آرام کرو۔ باتوں کے لیے اور بھی وقت ہے۔"

"میں تھکا ہوں نہ پریشان۔ میری جان میری باتیں تو سُن لو۔"

"میں سلمیٰ کو خبر کر دیتی ہوں کہ پاپا آ گئے ہیں اور تم سے ملنے جا رہے ہیں۔"

"سلمیٰ کو بعد میں خبر کرنا۔ ابھی فوراً جا کر ملنا کیا ضروری ہے؟ کل مل لوں گا۔ رضیہ نہیں چاہتی تھی کہ جو کچھ اُس نے سنا تھا اس کی تصدیق سہیل سے کرائے یا سہیل کی زبان سے اس کی حرکت کی تاویل سنے بھلا کون سو پھرا شوہر ہو گا جو اپنی بدچلنی اور آوارگی کا اقرار اپنی بیوی سے کرے گا۔ اور ان ساری باتوں سے حاصل بھی کیا ہے؟ جو ہونا تھا ہوا۔ حادثات اُلٹے پاؤں نہیں لوٹتے۔ لیکن وہ سہیل کو ٹھکرا بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ سہیل کے پاس بیٹھ گئی۔ آپ کا کلکتہ کا کام خیر و خوبی کے ساتھ انجام پا گیا نا؟ پھر جلد ہی آپ کو جانا تو نہیں پڑے گا نا؟"

سہیل نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور رضیہ کو اور قریب کھینچ کر کہنے لگا۔ میں دفتر کے کام سے نہیں گیا تھا اور نہ کلکتہ گیا تھا۔ میں درحقیقت یہاں سے لکھنؤ پھر دہلی اور چند دنوں کے لیے دہرہ دون گیا تھا۔"

رضیہ حیرت سے سہیل کو دیکھ رہی تھی اسکے اندر عجیب جنگ تھی۔ کیا وہ سچ سچ......رضیہ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سہیل نے کہنا شروع کیا۔ "میں ایک جوان عورت کے ساتھ گیا تھا۔ میں نے یہ پورا عرصہ اسی جوان عورت کے ساتھ گزارا ہے۔"

رضیہ ایک ٹک سہیل کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تصویر

حیرت تھی کہ آخر سہیل کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس دیدہ دلیری اور فخر کے ساتھ اقرارِ جرم کر رہا ہے۔ کیا رضیہ کا وجود، کیا ان کا رشتہ بے معنی ہو گیا ہے؟ وہ شخص جو پیکرِ وقار و حیا تھا اتنا بے شرم ہو گیا ہے۔ کیا گناہ نے اس کی حیا اور عزت و ناموس کا سارا لباس ایک جھٹکے میں اتار ڈالا ہے؟ ——

سہیل نے رضیہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دریافت کیا۔ "تم ضرور سوچ رہی ہو گی کہ میں نہایت بے شرم اور نفس پرست ہو گیا ہوں اور مجھے اپنی عزت کا بھی پاس نہیں" رضیہ خاموش رہ گئی تو سہیل نے کہا۔ "کیا تم کچھ نہیں کہو گی۔ مجھے مجرم گناہگار نہیں ٹھہراؤ گی؟"

رضیہ پھر خاموش رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا سوال کرے، کیا جواب دے؟

"میں یہ بھی بتا دوں کہ مجھ پر یہ خبط کیسے سوار ہوا اور تب شاید تمہیں اتنی شکایت نہیں رہے گی۔ کیوں؟" سہیل نے پھر دریافت کیا۔ رضیہ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنی ساری قوتِ گویائی یکجا کر کے کہا۔ "میں تمہیں کیا کہوں اور میرے کچھ کہنے یا واویلا مچانے کا اب حاصل ہی کیا ہے اور تم تو خود ہی ساری باتیں کہتے جا رہے ہو۔"

"شاید تم میری باتوں کی روح تک پہنچنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو۔ عام حالات میں سچ مچ ہماری حرکت نہایت ذلیل اور ناقابلِ معافی ہے لیکن ذرا غور کرو کہ کیا تم نے کبھی مجھے کسی عورت میں دلچسپی لیتے پایا ہے؟ کسی نے کبھی تم سے یہ باتیں کہی تھیں؟"

"یہ کون کہہ رہا ہے" رضیہ نے کہا۔

"تو صاف صاف سنو۔ اپنی بیٹی کی شادی کے وقت میں نے محسوس کیا۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب میں کچھ ہی دنوں میں نانا اور پھر دادا ہو جاؤں گا۔ اس کا مطلب ہوا میں بے کار ہو گیا ہوں۔ اس احساس نے میرے جذبات پر جیسے تازیانے لگائے اور میرے اندر ایک عجیب بغاوت نے جنم لیا۔ تم عورت ہو شاید تم ان باتوں کو محسوس نہیں کرتیں کیونکہ تم گھریلو زندگی میں اس طرح محور ہتی ہو کہ اپنے ارد گرد تو کیا تمہیں خود اپنا ہوش بھی نہیں رہتا کہ وقت کے بے رحم سیلِ رواں نے ہمیں کہاں کس چٹیل میدان یا بے آب و گیاہ جزیرے پر گمنامی اور محرومی کی زندگی گزارنے کیلئے چھوڑ دیا ہے؟"

رضیہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی اور انجانے میں اس نے بھی وہ ساری باتیں سہیل سے کہہ ڈالیں جو کچھ دیر قبل قدِ آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر اس کے دل میں اٹھی تھیں۔ سہیل نے بڑے غور سے رضیہ کی باتیں سنی اور مسکراتا رہا اور پھر اس نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے تمہارے اندر بھی خفیہ احساسات آخر کار بیدار ہو اٹھے۔ اب تم شاید میرا ذہنی کرب سمجھنے کے قابل ہو گئی ہو۔ میں نے اس وقت یہ محسوس کیا تھا کہ میں اپنی جوانی کو اتنی آسانی سے ضعیفی اور مجبوری کی گود میں ابدی نیند سونے نہیں دوں گا اور اسی احساس نے۔"

"اچھا تو میں اب سمجھی کہ تم نے اپنی جوانی کی تلاش میں ایک جوان جسم کا سہارا لینا ضروری سمجھا۔"

رضیہ نے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔ "بالکل درست! تم نے صحیح غمازی کی ہے گو تم نے طنز کا لہجہ اختیار کیا ہے لیکن حقیقت کا اقرار کرنا میرے سامنے گناہ ہے نا جرم۔"

رضیہ حیرت بھری نظروں سے سہیل کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک طوفان سا برپا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی سہیل اسی طرح اپنی جوانی واپس ڈھونڈتا رہا تو اس کا کیا ہوگا؟ کیا اس کا وجود اب بے معنی ہو گیا ہے۔ سہیل بھی رضیہ کی ذہنی کشمکش محسوس کر رہا تھا "میری جان تمنا! اب سارے بادل چھٹ جانے چاہئیں۔ میں نے اسی لئے ساری باتیں کہہ دیں۔ تم آج بھی میرے لئے وہی ہو جو آج سے انیس سال قبل تھیں۔ ایک مسئلہ میرے سامنے آیا تھا میں نے فوری طور پر اس کا حل تلاش کیا۔ اس کی وجہ بھی صرف یہ ہے کہ میں نے زندگی میں جس چیز کی خواہش کی ہے اسے حاصل کیا ہے۔ اسی خود اعتمادی نے میرے قدم ڈگمگا دئے لیکن یہ آخری خواہش تھی اس کے بعد مجھے جوان بنے رہنے کا — قطعی شوق نہیں۔ اب میں بوڑھا ہونے اپنی موجودہ حالت کو گلے لگانے کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔"

"بہت خوب! تم نے اپنی ناآسودگی کو آسودگی میں بدل لیا۔ اور میرے اندر اگر یہی جذبہ پیدا ہو جائے تو بتاؤ کیا تم اسے برداشت کر و گے؟" رضیہ نے بڑا بے تکا سوال کیا۔

سہیل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سہیل نے رضیہ کو بھینچتے ہوئے کہا "بھلا اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ادھر دیکھو میں بالکل جوان ہوں۔"

رضیہ نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر آگئی جھریاں یکسر غائب ہو گئی ہیں۔ اس کے چہرے پر پُر اعتماد طمانیت آگئی تھی — وہ مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس کی جوانی پھر سے واپس آگئی تھی۔

●●

مہر چند کوثر

غزل

غم کے طوفاں نہ تھے شورشِ آفات نہ تھی
پھر بھی ایسی کبھی ناسازئ حالات نہ تھی

آپ آئیں یہاں تجدیدِ مراسم کے لئے
یہ تو ہونا ہی تھا، مجبورئ حالات نہ تھی

شعر کہتا رہا مجبورِ طبیعت ہو کر
شاعری میرے لئے عزتِ سادات نہ تھی

اب مرے دردِ محبت سے تغافل کیوں ہے
کیا یہی درد ترے پیار کی سوغات نہ تھی

گفتگو ان سے بہت کھل کے ہوئی ہے کوثر
مگر اتنا ہے کہ پہلے سے ملاقات نہ تھی

رفیع حیدر انجم

پلیٹ فارم

کون سا اسٹیشن ہے ؟

"..........."

"کس سمت سے آئے ہو ؟"

"..........."

"کس سمت کو جا رہے ہو ؟"

"..........."

اسٹیشن کا نام مٹ چکا ہے۔ دشائیں دھند میں کھو گئیں ہیں۔ نام اور دشا سے پیٹ تھوڑی بھرتا ہے۔ نمبر یاد رکھو ـــــ پلیٹ فارم نمبر ۲۔ کہیں بھی جانے کے لیے ٹرین کی ضرورت پڑے گی۔ آنے اور جانے والے کو معلوم ہے کہ آنے والی ٹرین کہاں جائے گی ؟ ہاں، ہاں! دفتر جانے کے لیے نکلا ہوں۔ پروموشن ہو جانے کے بعد ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ ہمیشہ وقت پر پہنچنا پڑتا ہے۔

فیکٹری جانا ہے،

کالج جانا ہے،

اسٹیڈیم جانا ہے،

تقریر کرنا ہے،

شاپنگ کرنا ہے۔

نعرے لگانا ہیں، ہڑتال کرنا ہے، جلوس میں شامل ہونا ہے...... ... ...

کہیں نہ کہیں جانا ہے اور کچھ نہ کچھ کرنا ہے تو ٹھہرے رہو۔ بلا مقصد کوئی نہیں ٹھہرتا۔ مگر ٹرین ایک منٹ کے لیے رُکے گی۔ ایک منٹ کے وقفے میں چڑھنا اور اُترنا ہے۔ جو اپنا ایک منٹ ضائع کر دے گا وہ ہزاروں منٹ پیچھے رہ جائے گا۔ لہٰذا اپنا اپنا منٹ سنبھال کر رکھو۔

سفر ـــــ لامحدود

ذرائع ـــــ واحد

رفتار ـــــ مشینی

گھڑی دیکھتا ہوں۔ آج وقت سے پہلے
پہنچ گیا ہوں۔ تو کیا ہوا؟ وقت سے پہلے پہنچ کر
بھی وقت کے ہمراہ چلنا ہے۔

وقت ـــــ نو بج کر بائیس منٹ۔

شیڈیولڈ ٹائم ـــــ نو بج کر تیس منٹ۔

مارجن ـــــ آٹھ منٹ۔

آٹھ منٹ ..... آٹھ منٹ ..... آٹھ

....

چائے کی پیالی تین منٹ میں ختم کر سکتا ہوں
بقیہ پانچ منٹ سگریٹ سلگانے اور پلیٹ فارم
کا جائزہ لینے کے لیے کافی ہیں۔

جلدی جلدی چائے حلق میں انڈیل کے سگریٹ
سلگاتا ہوں اور آنکھوں کو مٹھی میں دبوچ کر ہاتھ بلند
کرتا ہوں۔ پھر مٹھی کھول کے چہار سمت اچھال دیتا
ہوں ـــــ اب ہاتھ اور کوٹ کی جیبوں میں ٹھنسے
ہیں۔

آنکھیں واپس چہرے کے گڈھوں میں آ کر
اپنی اپنی رپورٹ پیش کرتی ہیں۔

"کچھ کچھ بکھرے ہوئے اور بظاہر ٹھہرے ہوئے
لوگ دراصل دوڑ رہے ہیں ......"

آنکھوں کی رپورٹ پر خوفزدہ ہونے کے بجائے
مسکرانے کی ایکٹنگ کرتا ہوں اور اقرار کے انداز
میں گردن ہلا ہلا کے خود کو مطمئن کرنے کی سعی کرتا
ہوں۔ ہاں چائے پینے کے مختصر سے وقفہ میں ایک
پرکشش چہرے کی بدولت کئی بار دوڑ کر دفتر ہو
آیا ہوں۔ سب اسی طرح دوڑ دوڑ کر واپس آ رہے ہیں
واپس آ کر ہانپ رہے ہیں اور ہانپتے ہانپتے ہی ٹرین
کے منتظر ہیں کہ مزید دوڑنے سے نجات حاصل کر سکیں

آنکھیں بند کر کے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ
کرتا ہوں۔ آنکھوں کی پتلیاں اپنے اپنے گڈھوں
میں خاموش اور ساکت ہیں۔ کسی خالی جگہ پر بیٹھنا چاہیئے
چار منٹ باقی ہیں۔

ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا ہوں۔

"ٹائم پلیز ـــــ!" لاشعوری طور پر چونک پڑا ہوں
"نو بج کر چھبیس منٹ!" نو وارد مسکرا کر قریب
ہی بیٹھ گیا ہے۔ اسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔

بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال، گرد آلود چہرہ، بڑھا
ہوا شیو، پپڑی جمے ہونٹ، خشک اور پچکے ہوئے
گال، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، ادھڑا ہوا شرٹ
پھٹے ہوئے پائنچے کا پتلون، برہنہ پا ....

ارے! یہ تو وہی ہے ...... اس نے اپنی مخصوص
مسکراہٹ سے محظوظ نہ کیا ہوتا تو شناخت ناممکن تھی
لیکن ...... لیکن اس کا حلیہ؟

وہ تو خاصہ اسمارٹ اور پرشکوہ تھا۔ فائیو
اسٹار ہوٹل کی طرح شاندار اور سجیلا۔ امپالا
اور شیورلیٹ کی طرح چست اور پھرتیلا۔ ملٹی اسٹوریڈ
بلڈنگ کی طرح پروقار ...... لگتا ہے کسی خوفناک
زلزلے سے شدید طور پر متاثر ہوا ہے۔

تین منٹ بچ رہے ہیں۔

اس پر خرچ کرنے کے لیے اتنا وقت بہت ہے
اس کے وجود کو تین منٹ سے تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے
کرتا ہوں۔

وہ گزشتہ کئی روز سے بلاناغہ اسی پلیٹ فارم
پر نو بج کر اٹھائیس منٹ پر آتا رہا ہے۔ آتے ہی
اپنی مخصوص مسکراہٹ اُگل کر وقت دریافت کرتا

ہے۔ پھر قریب ہی بیٹھ کر بیقراری کے عالم میں ٹرین کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ ٹرین آتی ہے۔ سب اس کی جانب جھپٹتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہلتا۔ اسی طرح سر نیوڑھائے بیٹھا رہ جاتا ہے عجیب آدمی ہے۔ اگر اسے کہیں نہیں جانا تو یہاں آتا ہی کیوں ہے؟ کیوں اپنی شخصیت کو ایک معمہ بنا کر الجھائے رکھتا ہے؟ کیا اس پلیٹ فارم اور آنے والی ٹرین سے اس کا کوئی خوش گوار یا تکلیف دہ ماضی وابستہ ہے؟ آج وہ وقت مقررہ سے پہلے کیوں پہنچ گیا ہے؟ اس سے اس کی شناخت بھی چھین کر کون لے گیا ہے؟ آج تو وہ بالکل لاتعلق سا بیٹھا ہے۔ ٹرین کا انتظار کرنے کی ایکٹنگ بھی نہیں کر رہا ہے۔ پتہ نہیں، کون ہے؟ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ ممکن ہے یہ کوئی بڑا فراڈ ہو۔

ایک منٹ بچا ہے۔

ٹرین کے صحیح وقت پر آنے کی اطلاع دی جا چکی ہے۔ سگنل بھی ہو چکا ہے۔ اکسٹھ سیکنڈ کے بعد پلیٹ فارم سنسان ہو جائے گا۔ حسب معمول آج بھی وہ بنچ پر ٹھونٹھ کی طرح پڑا رہ جائے گا۔

آخری منٹ کے ساٹھویں حصے پر دھڑدھڑاتی ہوئی بجلی کی دیو قامت ٹرین پٹڑی پر پھسل گئی ہے اس سے پہلے کہ ٹرین کی جانب لپکوں وہ یکایک اپنی جگہ سے اٹھا ہے اور پیچھے کی طرف دھکیلتا ہوا بے تحاشا دوڑتا چلا گیا ہے۔

گرتے گرتے سنبھلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہوں مگر ٹرین پلیٹ فارم کی پوری بھیڑ نگل کر جا چکی ہے۔ ••

اوم کرشن راحت

غزل

یوں تو بے کار ہے اس دور میں شاعر ہونا
کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے سخنور ہونا

وائے مجبوری کہ پھولوں کا نہ کہنا کچھ بھی
اور بڑھ بڑھ کے زباں خار کی گز بھر ہونا

دل کی ہستی کے لیے کتنا بڑا خطرہ ہے
خواہشوں کا یوں صفیں باندھ کے لشکر ہونا

زود رنجی ہے حریفانِ سخن کا شیوہ
تم طرف دار مرے سوچ سمجھ کر ہونا

موجِ رحمت ہی کا ہو لمس تو پھر بھی یارو
مجھ کو منظور نہیں گھاٹ کا پتھر ہونا

مرے سینے میں مصائب کی گھٹن کے باعث
ہے ہر اک سانس کی خواہش دمِ آخر ہونا

دونوں عالم کے توازن کا سبب ہے راحتؔ
اس کا افلاک پہ اور میرا زمیں پر ہونا

رؤف خوشتر

لقوہ جوابِ لقوہ

یورپ اور ایشیائی باشندوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ان کے شب و روز میں بالترتیب فرض اور مرض کا بڑا دخل ہے چنانچہ اول الذکر فرض نبھانے اور آخرالذکر مرض بڑھانے میں مصروف رہتے ہیں۔ شہروں میں اب مکانات، سینما گھروں اور تعلیمی اداروں کے علاوہ شفاخانوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ اس بات کا مظہر ہے کہ اب ہم قلیل مدت میں علیل ہونے کا گُر جان گئے ہیں۔ اب تو ہمارا یہ حال ہے کہ مہینہ میں ایک بار کم از کم ڈاکٹر کے دیدار ہوئے بغیر جان کو چین نہیں آتا۔ بعض تو اس تشویش کے ساتھ اپنے خاندانی معالج کے پاس دوڑتے ہیں کہ پورا مہینہ بخیر کیسے گزرا۔ انہیں کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کہیں کچھ نہ ہونا بھی تو کوئی نیا مرض تو نہیں۔ اب دل کے مریض ہی اپنے آپ کو دلدار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ذیابیطس میں مبتلا خود کو دنیا کا سوئٹ SWEET شخص بتلاتے ہیں دردِ شکم میں تڑپنے والے خود کو کارل مارکس کا کٹر مخالف گردانتے ہیں۔ صاحب دردِ سر کا خیال ہے کہ عقلِ سلیم ان ہی کے پاس ہے۔

لوگ اب اسنادات، توصیفی دستاویزات کے بجائے ایکسرے اور طبی رپورٹیں بتلاتے ہیں کہ دیکھو ہم بھی ہر ماہ ڈاکٹروں کو اپنی فیس دیتے ہیں۔ کیا امیر کیا غریب سبھی اپنا فرض تبلاتے ہیں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ذراسی چھینک بھی بھک منگے کو چھینک کے ماہر سے ٹھیک علاج کرواتے پر مجبور کرتی ہے ادھر کچھ دنوں سے اپنے چپراسی بوم الدولہ کو اپنے خلافِ معمول کانوں پر شال اوڑھے رکشا میں آفس کو آتے دیکھا تو ہم سچ مچ جل گئے۔ اسی لیے کہ ہم پیدل ہی آفس آتے ہیں۔ اس نے ہماری طرف کو ضرب لگاتے ہوئے کہا صاحب وہ دن گئے جب امیروں اور وزیروں کو ہی دل کا مرض ہوتا تھا اب تو جمہوری دور ہے کسی بھی معاملہ میں عوام خاص سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ جب سے دفتر میں بالائی آمدنی مل رہی ہے بڑے صاحب کی طرح میرا بھی بینک بیلنس اور بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے یہی نہیں پچھلے ہفتہ سینہ میں خلش ہوئی۔ فوراً قلبِ شہر میں واقع دل کے بہترین ماہر کے دواخانہ میں حاضر ہوا۔ ڈاکٹروں نے تصدیق کردی کہ غریب کے سینہ میں بھی دل

ہے اور وہ امیروں کے دل کی طرح بل کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا کرتب دکھاتا ہے۔ ڈاکٹروں نے پھیکی غذائیں اور مہنگی دوائیں استعمال کرنے کو کہا ہے میرا جگر دیکھیے کہ دل کے لیے دل کھول کر خرچ کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر سے بھی کہہ دیا ہے ؎

بل جو بھی بنے گا دے دیں گے
مفلس کا سہارا دل ہی تو ہے

تو صاحب جہاں وہ اب تک آفس میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے اونگھتا تھا وہاں اب وہ دل پر ہاتھ دھرے سوتا ہے۔ سرخ فیتوں والی فائل کو کسی خاص مجبوری کے سبب ذرا سا آگے بڑھانا مقصود ہو تو چپراسی لوم الدولہ کو زبردستی جگانا پڑتا ہے کام کرنے اور اٹھنے کے فرض یاد دلانے پر وہ لیٹے ہی لیٹے گنگناتا ہے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت قرض سے بھر نہ آئے کیوں
سوئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں جگائے کیوں

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح طبقاتی فرق یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ بھاری مرض اور پرس والوں کے لیے آرام دہ شفاخانے ہیں۔ غریبوں کے لیے عوامی دواخانے ہیں جہاں ہر عرض اور مرض پر ایک ہی دوا دی جاتی ہے۔ دوا جسے دیکھ کر پانی بھی پانی ہو جاتا ہے۔ اور یوں بھی ان دونوں دواخانوں کی دوا ریلوے اسٹیشنوں کے ہوٹلوں کی چائے اور پوسٹ آفس کے گوند میں پانی ہی پانی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے دوست کو جب پیاس لگتی ہے وہ قریب کے دواخانوں میں کسی نہ کسی درد کا رونا رو کر ایک گلاس وہ جسے عملہ دوا کہتا ہے۔ پی کر اپنی پیاس بجھا لیتے ہیں۔ دوا پینے کا مرض اتنا عام ہو گیا ہے کہ اب ڈر ہو چلا ہے کہ خون دان کے وقت جسم سے خون کے بجائے مختلف دواساز کمپنیوں کے لیبل نہ نکل پڑیں۔ اب ان شفاخانوں میں رشوت کا مرض پھیل گیا ہے۔ عملے کو کچھ نہ کچھ تھمانے پر آپ کو سہولتیں اور راحتیں مہیا ہوں گی اس شعور سے بھرے اور غموں سے گھرے ماحول میں سکون کے بہترین ٹھکانے شفاخانے ہو گئے ہیں ان ٹھکانوں میں نئے مریض کی آمد پر پرانے یوں استقبال کرتے ہیں ؎

اس انجمن میں آپ کو آنا ہے بار بار
دیوار و در کو غور سے پہچان لیجیے

اگلے وقتوں میں لوگ دل کا سکون روح کا چین حاصل کرنے کے لیے کعبہ یا کاشی جانے کا عزم کرتے تھے اب لوگ بڑے بڑے شفاخانوں کا رخ کرتے ہیں جہاں کی ہر شے سفید ہوتی ہے۔ عمارت، فرش، آلات پلنگ بستر اور نرسیں ان میں استراحت کی سعادت عموماً کالے دھن والوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ وہ کچھ دن انکم ٹیکس، بیوی اور دوسرے سنگین مسائل سے دور اس سفید ماحول میں لیٹے ہی لیٹے کالا دھن چھپانے اور چھاپنے کے منصوبے بنا کر نکلتے ہیں۔ اب دنیا میں ایک نئی متعدی بیماری پھیلتی جا رہی ہے۔ کسی دن اچانک ہی قائد کا مزاج بگڑ جاتا ہے اور وہ مہنگے شفاخانے کے ہمہ وقتی نگہداشت میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اس کی نگرانی طبی عملے سے زیادہ اس کے حلیف کرتے ہیں۔

بھولے بھالے عوام قائد کی سلامتی اور صحتیابی کے لیے اپنی صحت کو خطرہ میں ڈال کر رات رات بھر شفاخانے کا چکر لگاتے ہیں لیکن باشعور شہری سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ایک انٹرول ہے۔ چنانچہ ہفتہ بعد قائد کی مکمل صحت یابی کی سنسنی سرخی سبھی حلقوں میں

کھیلی جاتی ہے قائد دواخانے سے ڈاکٹروں کی پرچی نہیں ایک نیا منشور لے کر نکلتا ہے اس کے بعد قائد دواخانے میں داخل ہوجاتا ہے۔ دواخانہ کا عملہ خاموش تماشائی بن کر ان عصری تبدیلیوں کو سمجھ جاتا ہے کہ ؎

"بستر تو وہی رہتا ہے مگر بیمار بدلتے رہتے ہیں"

ایک زمانہ تھا لوگ تعلیم اولاد، کھیل کود، دولت جائیداد میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش میں رہتے تھے اب ماحول اور مواقع بدل گئے۔ ہمارے دفتر میں دو صاحب ایک دوسرے کے کٹر مخالف تھے۔ ہر معاملہ میں وہ ایک دوسرے پہ سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ دونوں نے دوبار شادیاں کیں۔ دونوں رشوت لینے پکڑے گئے اور معطل ہوئے پھر دونوں دے دلا کر بحال اور بہال (ترقی پاکر) ہوگئے۔ ان ہی میں سے ایک کو لقوہ ہوگیا اور وہ صاحب فراش ہوگئے۔ اب ہم نے دوسرے صاحب کو عجیب نظروں سے دیکھا وہ بھی اپنی صحت پر تف بھیجتے ہوئے کفِ افسوس ملنے لگے کہ ان کا حریفِ سود و زیاں اب حریفِ ناتواں بن کر ایک معاملے ہی میں سہی اُن سے آگے بڑھ گیا۔ پھر اگلے ماہ سنا کہ دوسرے صاحب کو بھی لقوہ ہوگیا ہے اب وہ دونوں حریفِ دیرینہ ایک دوسرے کے متعلق تشویشناک خبریں سُن سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ ہم نے ایک بار غار سے پوچھا:

"بھئی ہم شکوہ جواب شکوہ تو سنتے آئے تھے اسے کیا کہیں گے؟" چپراسی بوم الدولہ کب خاموش رہتا اپنے دل پر ہاتھ رکھے لیٹے لیٹے جواب دیا۔" اجی صاحب اسے کہتے ہیں لقوہ جواب لقوہ ......"! ●

افضال ملک مالیر کوٹلوی

غزل

تیرے غم نے کیا مشہور مجھے گھر گھر میں
میری بربادی کا چرچا ہے زمانے بھر میں
جنگ کے فلسفی ظالم ہیں جہاں میں ورنہ
فوج سفاک نہیں ہوتی کسی لشکر میں
نیند کھلتے ہی اجالوں نے بجھادیں آنکھیں
جانے کیا دیکھا تھا خوابوں کے سیہ منظر میں
کیوں ہر اک ضرب پہ اُٹھتی ہے تڑپتی ہوئی چیخ؟
کس کے رونے کی صدا چھپ گئی ہے پتھر میں
ہاتھ کیوں روک لیا قتل سے افضال ملک!؟
کیا ترا دل نظر آیا تھا تجھے خنجر میں!؟

پسپائی

دیکھو کتنے کمینے ہیں۔ منہ اٹھا اٹھا کر بھونکتے رہتے ہیں روتے رہتے ہیں، شکایتیں کرتے ہیں مگر اب مالک کے سامنے جانے کی بات آگئی تو کیسے ایک دوسرے پر ٹال رہے ہیں۔ حامد سے کہا چلو۔ اس نے کہا آرہا ہوں۔ عارف سے بولا تو وہ بولا ابھی ہاتھ کا کام نپٹا کر آتا ہوں۔

پتہ چلا تھا کہ مالک جانے والے تھے کئی دن سے یہ پلاننگ ہو رہی تھی کہ اس کا گھیراؤ کیا جائے۔ سالانہ ترقی اگست میں ہوتی تھی۔ مگر آج اور کل ہوتے ہوتے دسمبر آگیا تھا۔

جب پیر سیڑھی پر رکھ دیا جائے تو منزل طے ہو جانے میں کیا کسر رہ جاتی ہے چنانچہ دسمبر بھی ختم ہونے کو تھا اور ترقی کا دور دور پتہ نہ تھا۔ کم تنخواہ۔ مہنگائی اتنی زیادہ کہ الاماں الحفیظ کمر ڈھکو تو سر کھل جائے سر کو ڈھانپو تو پیر جبکہ مالکان کے اخراجات میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ ہر ایک کے پاس اپنی ایک کار اور اس کو چلانے والا نجی ڈرائیور جس کا خرچہ دفتر برداشت کرتا تھا پھر تمام ذاتی اخراجات دفتر کے سر منڈھ دیئے گئے تھے۔ یہ بات نہیں کہ دفتر کی یومیہ آمدنی میں کوئی کمی آرہی ہو۔ بالکل نہیں بزنس تو اور دن دونا رات چوگنا زیادہ ہو رہا تھا۔ اور دفتر کے ملازمین کے سامنے تنگی کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔

مالکان کی پالیسی تھی کہ دفتر کے لوگوں میں اتحاد قائم نہ رہے۔ لوگ آپس میں لڑتے رہیں۔ اسی میں ان کی کامیابی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس حربے کو انھوں نے اس بار اسٹاف کی تنخواہ نہ بڑھانے میں استعمال کیا تھا۔ جگہ جگہ مالکان کے ایجنٹ اور ممبر بیٹھے تھے جو منٹ منٹ کی خبریں مالکان کے کانوں تک پہنچایا کرتے تھے۔

ایک وہ بھی زمانہ تھا جب یہاں لوگوں کو مہینہ کی پانچ تاریخ کو تنخواہ اور ۲۲ تاریخ کو نصف تنخواہ بطور ایڈوانس مل جایا کرتی تھی۔ مہینہ میں ایک جمعرات کو مالکان اور ملازمین باہم مل کر کھانا کھاتے تھے جاڑوں کے شروع میں ہر ایک کو ایک ایک لحاف بانٹا جاتا تھا۔

اب یہ حال ہے کہ ایڈوانس سسٹم ختم کر دیا گیا۔ لحاف بٹنے بند ہوگئے تنخواہ وقت پر نہیں ملتی۔ روتے روتے دس بارہ

اور پندرہ تاریخ تک بات پہنچ جاتی ہے۔

یہ بھی ایک مصنف مند چلن ہے کہ اگر قلیل آمدنی بروقت فراہم ہو جائے تو کام لشٹم پشٹم ہو ہی جاتا ہے لیکن تاریخ میں ردبدل ہو جائے تو ادھار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ادھار میں زیادہ خرچہ ہوتا ہے کیونکہ زیادہ کھایا پیا جاتا ہے۔

اس دن دفتر والوں میں ایسا عجیب تال میل اور اتفاق ہوا کہ خود مالکان کے حاشیہ بردار دفتر والوں کو مالکان کے خلاف مورچہ لگانے کی دعوت اور ترغیب دے رہے تھے۔ خوشامدی لوگوں نے طے کر لیا تھا کہ اب سالانہ ترقی کے لئے آواز بلند کی ہی جانی چاہئے۔ اور اس کے لئے یہ لائحہ عمل بنایا گیا تھا کہ مالکان کا گھیراؤ کیا جائے پورے ہفتہ اسی طرح کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں وہ تکمیل کا مبارک دن آ گیا تھا اس درمیان مالکان تھوڑی دیر کو دفتر آتے اور ذرا دیر بیٹھ کر آوارہ پرندے کی طرح پھر ہو جاتے۔

کافی وقت اسی پس و پیش میں گذر گیا کہ سب لوگ جمع ہو کر چلیں گے۔ پھر یہ طے کرنے میں دیر ہوئی کہ آگے کون جائے۔ سب مالکان کی نظروں سے بچنا چاہتے تھے۔ ادھر مالکان کے جانے کا وقت بھی آ رہا تھا خیر جیسے تیسے کر کے خوشامدیوں نے ہی ہمت کی اور وہی قافلہ سالار کے فرائض ادا کرنے چلے بجلی کی سی سرعت سے کچھ لوگوں نے کیبن کا دروازہ کھول کر اندر اپنی جگہ بنائی۔ باقی لوگ ایک دوسرے کی اوٹ لئے نظریں بچا کر کھڑے ہو گئے۔ مالک ایک دم چونک کر بولے

"خیریت ہے بھائی؟"

"جی..... وہ ترقی....." جنگ بہادر نے بے خوف و خطر کہا۔

"کیسی.....؟" مالک نے انجان بنکر پوچھا۔

"سالانہ ترقی....." راشد میاں نے بات آگے بڑھائی۔

"ابھی کچھ نہیں....." مالک نے جواب دیا "آپ کو دفتر کے حالات کا پتہ ہے۔ میری مجبوریوں پریشانیوں کو نہیں دیکھتے۔ میں کتنی دیر کے لئے آتا ہوں۔ آپ کو تو ایسے حالات میں میری مدد کرنی چاہئے تھی۔ مجھے ذہنی پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے آگے آنا چاہئے تھا"

"لیکن کب تک؟" میرے منہ سے نکل گیا۔

"جب موقع ہوگا....." مالک نے ہنس کر کہا "آپ لوگوں کو تو معلوم ہی ہے کہ لسٹ تیار رکھی ہے صرف ایک بیٹھک کی نظر سے گذارنی ہے۔

"لیکن حضور.....!"

"بس میں نے کہہ دیا نا کہ اس سلسلہ میں آگے کچھ نہیں اٹھا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ترقی ہوگی اور ضرور ہوگی۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں روک سکتی لیکن اس میں تھوڑا وقت لگ سکتا ہے۔ کچھ لگ گیا کچھ اور باقی ہے۔ آپ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہیں....."

ان جملوں کا ایسا اثر ہوا کہ لوگوں کا سارا غبار ختم ہو گیا۔ جیسے طوفان ایک دم تھم گیا۔ آگ کے شعلے خاموش ہو گئے...

"اچھا ایسا کریں....." جنگ بہادر نے کہا "آپ ایڈوانس دلا دیا کریں....."

"ایڈوانس بالکل نہیں ملے گا....."

"آج پانچ تاریخ ہو گئی پھر تنخواہ.....؟"

"ہاں آج کو چھوڑ کر یہ وعدہ رہا کہ اگلے ماہ سے تنخواہ کو پانچ سے چھ تاریخ نہیں ہوگی" مالک نے یقین دہانی کرائی فوراً ہی فوج کی واپسی ہونے لگی۔ لوگ نظریں چرائے ایک دوسرے کا سہارا لئے کیبن سے باہر آنے لگے۔ رونمائی ہو جانے کا ڈر ان پر بُری طرح غالب تھا۔

میں نے باہر آکر اپنے ایک ساتھی سے کہا: "آپ کا ڈپارٹمنٹ اندر کیوں نہ گیا؟ کریم بھیا کو تو لوگ گھسیٹتے رہ گئے تھے وہ سب کو چھوڑ کر آپ کے پاس آ گئے تھے۔ آخر اتنی بزدلی اور کم ہمتی کیوں؟"

"بھائی صاحب!" وہ ساتھی بولے۔ "یہاں بھی مالک نے توپ چلائی ہے۔ اس کے کانوں میں ہماری بے چینی کی خبریں تو پہنچ ہی رہی تھیں۔ اس کا ذہن پراگندہ تھا۔ وہ بڑا دور اندیش آدمی ہے۔ اپنے مجرمانہ ذہن کو وقتی سکون دلانے کی خاطر اس نے اپنے حاشیہ برداروں سے در پردہ کہا تھا کہ تم لوگ میرا گھیراؤ کرو۔"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس ساتھی نے میرے چودہ طبق روشن کر دیئے ——

میں یہ موازنہ کرنے لگ گیا کہ کیوں لوگ مالک کے سامنے جانے سے آناکانی کر رہے تھے۔ میرے منہ سے نکلا "واقعی بھائی آپ درست کہتے ہیں۔"

دوست کا جواب تھا موجودہ حالات میں بزدلی یا نمک خواری ہی وقت کا تقاضہ ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا کہ اس سے پہلے بھی آپ سے ہی ایک موقع پر کس طرح مالک نے ایک مفروضہ معاہدہ کا حربہ استعمال کر کے ہماری حق تلفی کی تھی۔ میں بھی آپ کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ گویا آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں۔ آخر ضرورت بات تو میری بھی ہیں۔"

بات بالکل صاف ہو گئی تھی۔ لوگ گئے تھے مالک کا گھیراؤ کرنے مگر مالک نے کمال ہوشیاری سے خود ملازمین کا گھیراؤ کر دیا تھا۔ اب لوگ آنکھیں کھولے منہ بند کئے مالک کو آتے جاتے دیکھتے تھے۔ ان کی حالت قیدی جیسی تھی مگر مالک آزاد پرندے کی مانند بے خوف و بے دھڑک دفتر میں آتا جاتا تھا۔ اب کسی طرح کا غم اسے نہ تھا۔ ملازمین بری طرح محبوس ہو کر رہ گئے تھے۔ ⁂ ⁂ ⁂

نیاز جیراجپوری

غزل

دھوپ بھلی لگتی تھی پہلے، لیکن اب یہ جلائے گی
موسم بیت گیا سردی کا اب تو گرمی آئے گی
کمرے میں جی گھبرائے گا، دھول اڑے گی آنگن میں
سورج چھت پہ رقص کرے گا دھوپ گھروں میں آئے گی
لرزیں گے اشجار ہوا سے ہو گی جب شمشیر بکف
پیلے پڑ جائیں گے پتے، شاخ شاخ تھرائے گی
آگ بچھی ہو گی راہوں میں سر پہ ہو گی دھوپ کڑی
رستہ چلنا مشکل ہو گا ہمت آنکھ چرائے گی
کوکھ زمیں کی جھلسے گی یا دل برہم ہو جائیں گے
دیکھ کے سونا سونا پنگھٹ ندیا سمٹی جائے گی
خشک زباں پانی مانگے گی، جلتے پنکھ گھنا سا یہ
اڑ جائیں گے گونگے پنچھی گرمی جب چلائے گی
ہاتھ دعا کو اٹھیں گے جب گرمی کی بپتا میں نیاز
اس کی رحمت سے گرمی بھی ساون سی ہو جائے گی

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ارجن داس ملک نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس سی او نمبر ۱۸۹ - ۱۹۱ سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ سے جون ۱۹۸۸ء کے لیے شائع کیا۔
طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو ٹی چنڈی گڑھ



۲۴ مئی ۱۹۸۸ء کو ہریانہ راج بھون، چنڈی گڑھ میں ہریانہ سٹیٹ کونسل فار چائلڈ ویلفیئر کی ایگزیکیوٹو کمیٹی کی میٹنگ ہوئی، جس کی صدارت گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند بارّی نے فرمائی۔

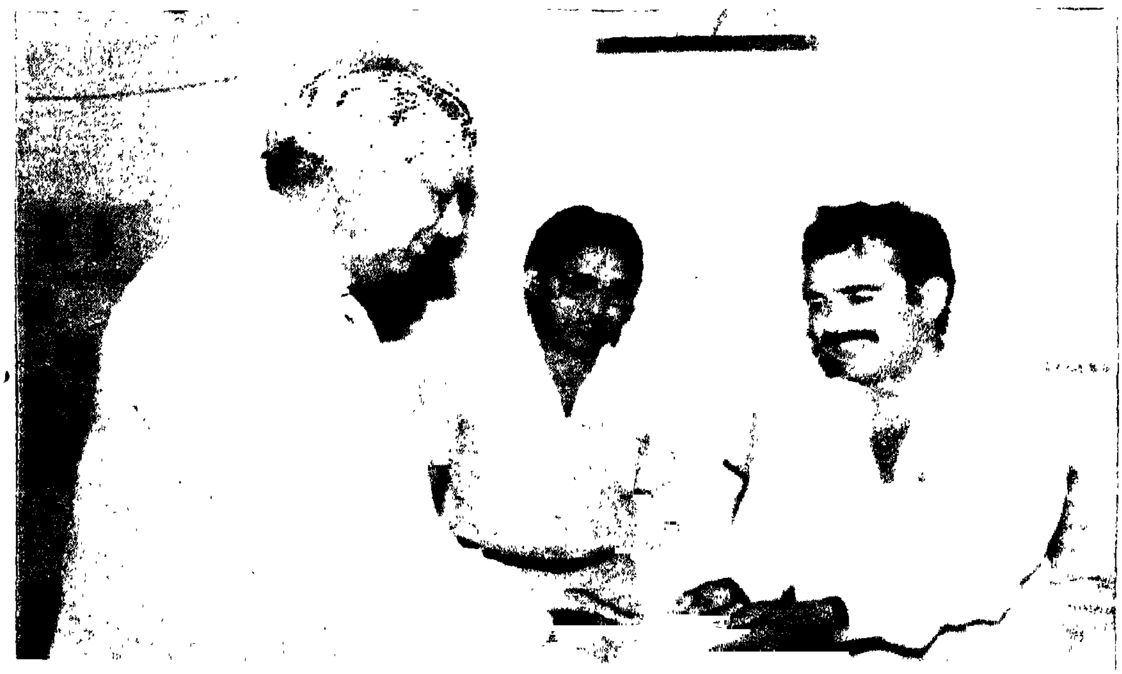
وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۲۴ مئی ۱۹۸۸ء کو چنڈی گڑھ میں ۹ویں فنانس کمیشن کے چیئرمین جناب این۔ کے۔ پی۔ سالوے اور کمیشن کے معزز ممبران کے ساتھ محوِ گفتگو۔





یکم جون ۱۹۸۸ء کو وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال اپنے ساتھی وزراء اور حکومتِ ہریانہ کے اعلیٰ افسران کے ہمراہ چنڈی گڑھ کی خوبصورت "سکھنا جھیل" میں جمع ہو چکی فالتو مٹی کو ہٹانے کی مہم میں شامل ہوئے۔

۲۶ مئی ۱۹۸۸ء کو وزیر اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال کی خدمت میں سوکھا راحت فنڈ کی دوسری قسط کے طور پر ۸۵,۰۰۰ روپے کا چیک پیش کرتے ہوئے ہریانہ سول میڈیکل ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر آر۔ ایس۔ پونیہ۔



تعمیر ہریانہ

جولائی ۱۹۸۸ء



گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند برارای ۲۳ رجون ۱۹۸۸ء کو پنچکولہ میں منعقدہ ایک تقریب میں ٹسٹینگ پر پوار ٹیون کے "وکیشنل ٹرینیز" کو اسناد عطا کرتے ہوئے۔

۲۳ رجون ۱۹۸۸ء کو چنڈیگڑھ میں وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل وی۔ این شرما سے بات چیت کرتے ہوئے۔



آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

جولائی ۱۹۸۸ء شمارہ نمبر ۷ جلد نمبر ۱۶

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۹۔۱۹۰۔۱۹۱
سیکٹر ۱۷ سی، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

ترتیب

غزلیں

ہونے کو یہاں کھیل نیا کب نہیں ہوتا
جی چاہتا ہے جو وہی یارب نہیں ہوتا
نیت ہو اگر نیک تو شبنم بھی بہت ہے
ویسے تو سمندر سے بھی تر لب نہیں ہوتا
چہروں پہ نقابیں ہیں یہاں مصلحتوں کی
جینے کے لیے ہم سے یہ کرتب نہیں ہوتا
مقتل میں جب آئے ہو تو کیا صبح ہے کیا شام
اس کارِ خوش انجام میں اب تب نہیں ہوتا
سایے کی ہے فطرت میں جگہ اپنی بدلنا
تادیر کسی ایک کا منصب نہیں ہوتا
تدبیر بھی آخر کو اثر رکھتی ہے انجمؔ
ہاتھوں کی لکیروں کا لکھا سب نہیں ہوتا

انجم عرفانی

اب آوازِ ضمیر آئے نہ آئے
دلوں کی سمت تیر آئے نہ آئے
ہمیشہ دھیان دروازے پہ رکھنا
صدا دینے فقیر آئے نہ آئے
لکھیں گے داستانِ دل لہو سے
ہمیں اسلوبِ میرؔ آئے نہ آئے
اُسے قیدِ سفر ہے عمر بھر کی
رہا ہو کر اسیر آئے نہ آئے
ابھی سے آگ کیا گھر کو لگانا
اِدھر کوئی کبیرؔ آئے نہ آئے
ذرا سی ٹھیس بھی قاتل ہے انجمؔ
سرِ شیشہ لکیر آئے نہ آئے



اوم کرشن راحت

اللہ رکھی

پاکستان سے آئے دوستوں کی محفل میں پتہ نہیں اللہ رکھی کا ذکر کیسے آگیا۔ حمید نے کہا۔

"کرشن بھاپے پاکستان بننے کے بعد اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اس وقت تو لوگوں کو اپنے رشتہ داروں ہی کا کچھ پتہ ٹھکانہ نہیں تھا۔ اللہ رکھی کی کس کو فکر تھی۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میری چھاتی پر گھونسہ مار دیا ہو۔ ٹھیک ہے وہ طوائف تھی لیکن ـــــ

اللہ رکھی سے میری اس وقت سے جان پہچان تھی جب میں ساتویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ اللہ رکھی نے ہمارے محلے میں عین ہمارے گھر کے سامنے مکان کرایے پر لے لیا تھا اور اس بات پر سبھی محلے والے بہت سیخ پا ہوئے تھے۔ ان دنوں یہ بات تھی بھی بہت عجیب۔ شریفوں کے محلے میں کسی بازاری عورت کا آکر رہنا سب کو اکھرا تھا۔ پتہ نہیں کہ لوگ اس کے چاند سے چہرے کو دیکھ کر گھبرا اٹھتے تھے یا اپنے دلوں کی دھڑکنوں کو سن سن کر۔ ہمارے محلے سے ملحق ہی ہیرا بازار تھا اور دن ڈھلتے ہی نشے میں جھومتے ہوئے کچھ لوگ کبھی کبھار ہمارے محلے میں بھی آنکلتے تھے۔ رات کو طبلے اور سارنگی کی آواز ہمارے گھروں کی اس کوٹھری میں بھی پہنچ جاتی تھی جہاں میری ماں ماتھے پر بل ڈالے مجھے کہانی سنانی شروع کر دیتی یا پھر کوئی لوری۔

گرمیوں کے موسم میں جب ہم لوگ چھت پر سونے کے لیے جاتے تو یہ آوازیں اور گانے والیوں کے منہ سے نکلے گیتوں کی لے بھی صاف صاف سنائی دیتی تھی۔ جسے سن کر میرے پتاجی بھی اپنے پیروں سے زمین پر تھاپ دینا شروع کر دیتے تھے یا پھر اپنی سوٹی چارپائی کے پائے سے ٹکرا کر سُر سے سُر ملانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

ایک بار جب میرے ماموں کچھ دنوں کے لیے ہمارے ہاں رہنے کے لیے آئے تو میرے پتاجی سے بولے۔

"بھائی صاحب! آپ کے بزرگ بہت سیانے تھے۔ دیکھیے کہ اپنا مکان عین دریا کے کنارے بنوایا تھا۔"

"دیکھو تو کیسے بکواس کرتا ہے۔" میری ماں نے کہا، جو چھت پر اپنے بھائی کو دودھ کا گلاس دینے آئی تھی اور پھر ساری چھت میرے ماموں اور میرے پتاجی کے قہقہوں سے بھر گئی تھی۔ یہیں

ان دونوں کا منہ تکتا رہ گیا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس میں ایسی کون سی بات اتنے زور زور سے ہنسنے کی تھی، شاید وہ باتیں میری چھوٹی سی عقل کے لیے بہت بڑی تھیں۔

مندر اور مسجد میں محلّے والوں کی میٹنگوں سے ضرور ہی اللہ رکھی کے پاؤں اکھڑ جاتے مگر اسی وقت فضلا نمبردار اس معاملے میں آ پڑتا تھا اور اس نے ساڑھے تین ہزار روپوں میں وہ مکان جس میں اللہ رکھی رہ رہی تھی۔ خرید کر اس کی رجسٹری اللہ رکھی کے نام کروادی تھی اور کرایہ دار سے مکان کی مالک بن کر اللہ رکھی محلّے والوں کے خلاف ڈٹ گئی تھی اور لوگ چپ ہو گئے تھے۔

کریم الدین عرضی نویس، منشا رام ڈپٹی کمشنر کا منشی، علیا دھوبی، سرداری لال کباڑیا اور دیگر افراد جن کے گھر ہمارے اڑوس پڑوس میں تھے نہ جانے اپنے گھروں کی چھت پر چڑھ کر اللہ رکھی کے گھر کی طرف کیا دیکھتے رہتے اور ہمارے صحن تک لالہ منشا رام کی بیوی کی آواز اکثر آیا کرتی تھی ــ

"اے جی! اوپر چھت پر بیٹھے کیا کر رہے ہو نیچے آئیے نا ــ آج کچہری نہیں جانا کیا؟"

محلّے کے نوجوان پتنگ یا کبوتر اڑانے کے بہانے اپنی اپنی چھتوں سے اترنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ وہ یہی سوچتے کہ شاید اللہ رکھی بال سکھانے یا پھر سردیوں میں دھوپ سینکنے کے لیے اپنے کوٹھے پر آ جائے لیکن اللہ رکھی نے محلّے کے نوجوانوں کو یہ موقع کبھی نہیں دیا تھا۔ وہ تو اس کی پرچھائیں بھی کبھی اس کی اپنی دیوار پر نظر نہیں آئی تھی۔

شام کو جب وہ گھر سے مجرے کے لیے نکلتی تو چادر میں لپٹی ہوئی استاد رمضانی سارنگی والے کے پیچھے پیچھے سر نہوڑائے اس طرح چلا کرتی تھی جیسے محلّے کی بہوئیں۔ ہاں اس کے پیچھے پیچھے خوشبوؤں کا ایک قافلہ چلتا تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ وہ بھینی بھینی خوشبو تو آج تک بھی میرے دماغ سے نہیں نکلی۔ میں نے کئی عطر فروشوں کی دکانوں پر جا کر بہت سی شیشیاں کھول کھول کر سونگھی ہیں۔ لیکن ـــ وہ خوشبو شاید اس زمین سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اڑ چکی ہے۔

جب کبھی اللہ رکھی کے گھر کوئی نوکر بازار جانے کے لیے موجود نہ ہوتا اور مہمانوں کے لیے شربت کی ضرورت ہوتی تو وہ مجھے گلی میں کھیلتا ہوا دیکھ کر اپنی بیٹھک کے دروازے کی اوٹ سے مجھے کرشن کہہ کر پکارتی تو مجھے ایسا لگتا کہ اپنے پتاجی سے مار کھانے کے بعد جیسے مجھے میری ماں پیار سے پچکار رہی ہو اور میں اپنا کھیل چھوڑ کر اس کی بیٹھک کے نزدیک پہنچ جاتا تو وہ کہا کرتی۔

"کاکا! ذرا خلیفے کی دوکان سے ایک پاؤ دہی یا اودھو رام کی دوکان سے دو گلاس شربت تو لادے اللہ تیری عمر دراز کرے۔ ذرا بھاگ کے جانا اور آہستہ آہستہ آنا۔"

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ میرے پتاجی ہاتھ میں سوٹی اٹھا کر بازار کی طرف جا رہے ہوتے تو اللہ رکھی دروازے کی اوٹ سے کہتی "بابو جی ـــ یہ کچھ کچہری کے کاغذات ہیں۔ ذرا دیکھیے" میرے پتاجی دروازے کے قریب ہو کر اس کے ہاتھ سے کاغذات لے کر کچھ دیکھتے اور اسے سمجھا بجھا کر... آگے چلے جاتے۔

کچھ ہی مہینوں میں اللہ رکھی محلّے کا ایک انگ بن گئی۔ اب کسی کو اس کا وہاں رہنا اکھرتا نہیں تھا لیکن مجھ سے بڑی عمر کے لڑکوں کو ان کے ماں باپ کچھ سمجھاتے بجھاتے ضرور رہتے تھے۔ کسی کی

پتنگ کٹ کر اگر اللہ رکھی کی چھت پر جا گرتی تو اسے
لینے اللہ رکھی کے ہاں کوئی نہیں جاتا تھا اور وہ
میرے ہی حصے میں آتی تھی۔ اللہ رکھی بڑے لاڈ چاؤ سے
پتنگ کی ڈور لپیٹ کر پتنگ کو کھونٹی پہ ٹانگ دیا
کرتی اور میرے اسکول سے لوٹ آنے کی راہ دیکھا
کرتی تھی۔

اللہ رکھی شب برات یا عید کو حلوہ اور سویاں
ضرور ہی ہمارے ہاں بھیجا کرتی تھی۔ یہ لین دین
کیسے شروع ہوا یہ تو مجھے پتہ نہ چل سکا تھا لیکن
اپنی ماں کو میں نے پلیٹیں اور طشتریاں رسوئی سے
باہر رکھنے کی بات اکثر کہتے سنا تھا۔ میری ماں ان
برتنوں کو چھوا تک نہیں کرتی تھی اور میرے پتاجی
کو اس کے ہاں سے آئی چیزوں کو کھانے سے منع بھی
نہیں کرتی تھی اور کبھی کبھار ہمیں کھاتا دیکھ کر
بول اٹھتی

"لگتی تو بہت خوبصورت ہیں۔ بہت سواد ہیں
کیا۔ یہ سویاں کتنی باریک ہیں۔"

"تم بھی دیکھو تو نا کھا کر" میرے پتاجی کہتے۔

میری ماں بناوٹی غصے سے کہتی۔ "ہٹو جی —
کھانے پینے کے لیے اپنا دھرم تھوڑے ہی بھرشٹ
کر لینا ہے۔"

جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا ویسے ویسے
مجھے خود ہی اللہ رکھی کے ہاں جانے میں جھجک سی محسوس
ہونے لگی تھی اور اللہ رکھی بھی اب مجھے بازار سے
دہی یا شربت لانے کے لیے نہیں کہتی تھی۔

پھر میں کالج کی پڑھائی اور تصویریں بنانے
کے شوق میں ایسا کھویا کہ محلے کے لڑکوں کے ساتھ
آنکھ مچولی کھیلنے تک کی لت بھول گیا اور میں
سارے محلے والوں سے کٹ کر رہ گیا تھا اور ان
میں سے ایک اللہ رکھی بھی تھی۔ آتے جاتے کبھی
کبھی وہ بیٹھک کے دروازے کی اوٹ سے میری خیر خبر
پوچھتی تو مجھے شرم تو آتی ہی تھی اور اس کے
ساتھ ساتھ میں "ٹھیک ہے" کہہ کر جلدی سے
جلدی اس سے پیچھا چھڑانے کی سوچنے لگ جاتا۔

ایک دن بی۔ اے کا امتحان دینے کے بعد جب
ہمارے کالج کا انگریز پرنسپل ہمارے محلے میں ہمارے
گھر کا پتہ پوچھتا پوچھتا ہماری بیٹھک میں آ بیٹھا تو
سارے کا سارا محلہ ہمارے گھر کے سامنے اکٹھا ہو کر
طرح طرح کی باتیں کرنے لگا اور میری نگاہ اچانک
اللہ رکھی کی بیٹھک کی طرف اٹھ گئی، وہ بہت
حیران و پریشان پردے کی اوٹ سے ادھر دیکھ
رہی تھی اور اس کے چہرے سے ایسا لگتا تھا
جیسے وہ پوچھ رہی ہو "کاکا کیا بات ہے؟"

جب میرے پتاجی کو بازار میں یہ خبر ملی
وہ بہت تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بازار سے گھر
پہنچے تو اللہ رکھی نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

"بابو جی! خیر تو ہے؟"

"دیکھو۔"

میرے پتاجی جلدی سے یہ کہہ کر بیٹھک میں
آ گئے۔ پرنسپل نے اپنی کرسی سے اٹھ کر ان سے
ہاتھ ملایا اور اپنے پاس بٹھا کر کہا۔

"ول لالہ صاحب! تمھارا لڑکا بہت
بڑا آرٹسٹ بنے گا۔ یہ ہم آج بولتا ہے — ہم
یہی کہنے ادھر آیا تھا — اسے بمبئی آرٹ اسکول میں
داخل کروا دے۔ یہ بہت بڑا آرٹسٹ بنے گا — ہم پھر
بولتا ہے۔ اچھا ہمارا بات پر دھیان رکھنا۔
ہم جاتا ہے۔" یہ کہہ کر ہمارے کالج کا پرنسپل
تو وہاں سے چلا گیا لیکن میرے پتاجی کو عجیب
سوچ میں ڈال گیا۔ میرے پتاجی نے تو سوچ رکھا
تھا کہ ادھر بی۔ اے کے امتحان کا نتیجہ نکلا ادھر

انھوں نے مجھے کسی سرکاری دفتر میں کلرک لگوایا۔

شام کو مجرے پر جانے سے پہلے اللہ رکھی ہمارے گھر آگئی اور میرے پتاجی سے کسی انگریز کے ہمارے گھر آنے کی وجہ پوچھی اور کہنے لگی۔

"بابوجی! وہ ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ اس انگریز کا دماغ تو خراب نہیں تھا جو آپ کے ہاں چل کر آیا۔ اس کو ضرور کاکے میں کچھ نظر آیا ہوگا۔"

شاید یہ بات میرے پتاجی پر کچھ اثر کر گئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انھوں نے مجھے بمبئی آرٹ اسکول میں داخلہ دلوا دیا تھا۔

جب میں چھٹیوں میں بمبئی سے گھر لوٹتا تو اللہ رکھی دروازے کی اوٹ سے جب میرا حال پوچھتی تو میری خرابیِ صحت کی بھی بات ضرور کرتی اور کہتی "کاکا میری تصویر کب بناؤ گے۔ جب میں بوڑھی ہو جاؤں گی؟"

یہ بات اگلی چھٹیوں پر ٹل جاتی۔ بات دراصل یہ تھی کہ اللہ رکھی کی تصویر بنانے کے لیے مجھے دو دو تین تین گھنٹے لگاتار ایک یا دو ہفتے متواتر اس کے گھر میں بیٹھنا پڑتا اور نہ جانے کس کارن یہ بات ٹل ہی جاتی۔ ویسے بھی اللہ رکھی شاید بات کرنے کے لیے ہی بات کرتی وہ اس معاملے میں ایسی سنجیدہ بھی نہیں تھی۔ میری چھٹیاں دوستوں یاروں کے ساتھ گھومنے فلمیں دیکھنے یا بمبئی میں رہ کر خراب ہوتی صحت کو سدھارنے میں ہی بیت جاتیں۔

اپنی پڑھائی کے تیسرے سال جب میں چھٹیوں میں گھر لوٹ کر آیا تو میرے پتاجی کے خیالات کافی بدلے ہوئے تھے۔ رشتہ داروں نے انھیں اچھی طرح سے میرے خلاف یا میری پڑھائی کے خلاف بھر رکھا تھا۔ "آج کل لڑکوں کو بمبئی جیسے بڑے شہر میں اکیلا چھوڑنے کا زمانہ کہاں ہے لالہ جی!" "یہ آرٹ وارٹ تو آوارہ اور امیر آدمیوں کے چونچلے ہیں۔" "بھلا تصویریں بنا بنا کر کسی نے اپنا پیٹ پالا ہے۔" "لالہ جی لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

جتنے منہ اتنی باتیں اور میرے پتاجی نے مجھ سے کہا۔ "کرشن میں اب اور خرچہ برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے گھر کے دیگر افراد کا بھی خیال رکھنا ہے ــــ ابھی تمھاری دو بہنوں کی شادی کا بوجھ میرے سر پر ہے۔"

میں نے ان کی بہت منت سماجت کی لیکن بے سود اور ایک روز بیٹھک میں بیٹھے ہوئے ہم میں تکرار بڑھ گئی اور میرے پتاجی غصے میں اتنے زور سے گرجے کہ اڑوس پڑوس کے سبھی آدمی اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور ہماری بیٹھک کے سامنے جمع ہو گئے اور مجھے ہی کچھ شرم آگئی اور میں اٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے بہتیری کوشش کی اپنے ان رشتہ داروں سے بھی اپنے پتاجی کو کہلوایا جو مجھ سے تھوڑی بہت ہمدردی رکھتے تھے لیکن بے سود۔ پتاجی کے دوستوں سے بھی سفارشیں کروائیں لیکن انھوں نے نہ ماننا تھا نہ مانے۔ میرا دل بری طرح سے ٹوٹ گیا۔ سب آس امیدیں مٹی کے گھروندوں کی طرح مٹی میں مل گئیں۔ میرے آرٹسٹ بننے کے سب خواب چکنا چور ہو گئے۔

یہ بات اڑتی اڑتی اللہ رکھی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ ایک دن رمضانی سارنگی والے نے مجھ سے کہا کہ بائی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔ بہت ضروری کام ہے۔ میں اللہ رکھی سے ملنے گیا تو وہ بولی "کاکا! اگر کہو تو میں بابوجی سے بات کروں؟"

"نہیں نہیں۔ میں نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا ہے۔ آپ کے کہنے سے کچھ نہیں ہونے کا۔ میرے پتا جی تو کئی بار کہہ چکے ہیں کہ وہ کبھی انگریز پرنسپل کی باتوں میں نہ آتے۔ یہ تو اللہ رکھی بیچ میں آ گئی اور ——"

"میری بات ادھوری ہی تھی کہ وہ بولی: "کاکا! اور کتنی پڑھائی باقی ہے؟"

"دو سال"۔

"تو تمہارا ایک مہینے کا خرچ کتنا آتا ہے؟"

"تقریباً ستر روپے۔"

وہ کچھ دیر چپ بیٹھی رہی اور پھر بولی۔

"کاکا! اگر تو کسی سے بات نہ کرے تو ایک میری بات سن!"

اور بغیر میرا جواب سنے سو سو روپے کے نو نوٹ دیتے ہوئے بولی۔

"کاکا! جب تم کمانے لگ جاؤ گے نا تو مجھے یہ رقم لوٹا دینا۔ یہ تمہارا سال بھر کا خرچ ہے۔ اگلی چھٹیوں میں جب آؤ گے تو پھر دیکھا جائے گا۔ تم اپنی پڑھائی پوری کرو۔ تمہیں میری قسم ہے اگر تم نہ کرو۔ اور میں تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میرے جیتے جی یہ بات لالہ جی کو پتہ نہیں چلے گی۔"

اور وہ میری جھولی میں نوٹ پھینک کر اندر چلی گئی اور اندر سے دروازے کی کنڈی لگا لی۔

میں عجیب تذبذب میں پڑ گیا۔ مجھے پڑھائی جاری رکھنے کی خوشی بھی تھی لیکن میرے من پر اللہ رکھی کے احسان کا دباؤ زیادہ تھا۔ میں انھیں ملے جلے جذباتوں میں گھرا ہوا اور اپنے من کو سمجھاتا ہوا کہ "یہ روپے میں.... اپنی پہلی تصویر کے بکتے ہی اللہ رکھی کو لوٹا دوں گا" روپوں کو جیب میں ڈال کر وہاں سے باہر آ گیا۔ اپنے من کو یہ تسلی بھی دی تھی کہ میں اس کے روپے بہت جلد دو گنے کر کے لوٹا دوں گا۔ دراصل اس سوچ کے پیچھے اپنے پتا جی کی خواہ مخواہ کی ضد کو نیچا دکھانا بھی مقصود تھا۔

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد جس روز مجھے بمبئی کے لیے روانہ ہونا تھا تو میرے پتا جی میرے اس فیصلے پر حیران رہ گئے۔ اس بات کو لے کر انھوں نے میری ماں سے بھی جھگڑا کیا تھا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ بمبئی جانے کے لیے پیسے مجھے اس نے دیے تھے مگر جب اس نے قسمیں کھائیں تو پتا جی کی اس طرف سے تو تسلی ہو گئی تھی لیکن وہ میرے ساتھ سچ مچ ہی ناراض ہو گئے تھے۔ تانگے میں سب سامان رکھوا کر جب میں تانگے میں بیٹھا تو میری نظر اللہ رکھی کی بیٹھک کی طرف گئی۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑی اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے اللہ سے دعا مانگ رہی تھی اور میرے پتا جی کھڑے اپنا نچلا ہونٹ چبا رہے تھے۔

میں سارے راستے پتا جی کے غصے اور ماں کی مجبوری اور اللہ رکھی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اور بمبئی پہنچتے ہی میں اپنی پڑھائی، تصویروں کے رنگوں میں پھر کھو گیا اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ ایک سال کیسے بیت گیا۔ اور اس بار میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جاتے ہی سب سے پہلے میں اللہ رکھی کی تصویر بناؤں گا۔ چاہے مجھے یاروں دوستوں کی صحبت سے کنارہ کشی کرنا پڑے۔ چاہے فلموں اور جوانی کی دیگر بدعتوں سے کچھ دنوں کے لیے چھٹی ہی کیوں نہ لینا پڑے۔

جیسے جیسے چھٹیوں کے دن نزدیک آ رہے تھے ویسے ویسے ملک کی سیاست میں گرمی زور پکڑ رہی تھی اور اس کی آنچ ہم تک بھی پہنچنے لگی تھی۔ ملک کی آزادی اور پاکستان بنائے جانے کی تاریخوں

سا تعین ہو چکا تھا۔ اور پھر سارے ملک میں خون خرابے، لوٹ مار، آتش زنی کی وجہ سے ساری فضا دھواں دھار ہو گئی تھی۔

جب میں اپنے شہر پہنچا تو سارا شہر مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔ لیکن ... جلے ہوئے مکانوں کا ملبہ اور ورق ورق ہوتی کتابیں اب بھی سڑک کے کنارے یا کوڑے کے ڈھیروں میں دیکھی جا سکتی تھیں۔ سڑتی ہوئی لاشوں کی بو اب بھی فضا میں رچی ہوئی تھی۔ پاکستان سے آتے ہوئے لوگ ابھی خالی ہوئے مکانوں میں نہیں گھسے تھے۔ البتہ شہر کی ہندو آبادی مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے گھروں سے المونیم کے برتن، پلیٹیں، حقے اور یہاں تک کہ طوطوں کے خالی پنجرے تک اٹھا اٹھا کر اپنے گھروں میں لے جا رہی تھی۔ محلے میں گھستے ہی میری نظر اللہ رکھی کے مکان کی طرف گئی جہاں ایک عجیب قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کھلی کھڑکیاں اور دروازے ایسا لگتا تھا کہ گھر چھوڑ کر جانے والوں کے پلٹ آنے کے انتظار میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خالی راستوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بے زبان تھے۔ اس لیے کچھ بول نہیں رہے تھے۔ شاید ان کی بے زبانی میرے ہونٹوں پر بھی مسلط ہو کر رہ گئی تھی۔ گھنٹوں بیٹھا میں اللہ رکھی کے گھر کی طرف دیکھتا رہا۔ میری ماں مجھے سارا قصہ بتاتی رہی کہ کس طرح شہر میں لوٹ مار مچی تھی۔ کس طرح اللہ رکھی فضلے نمبردار اور دیگر کوٹھے پر آنے والوں کے انتظار میں بیٹھی رہی تھی۔ اور اسے لینے کے لیے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا حال پوچھنے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ رمضانی سارنگی والا کمیٹی باغ میں قتل کر دیا گیا تھا اور اللہ رکھی کے منہ پر جیسے تالا لگ گیا تھا۔ آج شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلی ہے۔ وہ بازار کی وہ شے ہے جس کا کچھ مول ہے بھی اور نہیں بھی۔

"تیرے پتا جی نے کچھ دنوں تک تو لوگوں کی منت سماجت کر کے اس کی جان بچائی تھی اور اسے اپنے گھر میں لے آئے تھے۔ لیکن کچھ پتہ نہیں چلا کہ وہ رات کے وقت یا صبح سویرے کب اپنی چھوٹی سی صندوقچی اٹھا کر یہاں سے چلی گئی تھی۔ شاید تیرے پتا جی نے اسے گلی کا موڑ کاٹتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اسے پکار نہیں پائے تھے۔ مبادا لوگ ان کی آواز سن کر ـــ"

صبح سویرے ہی میں اس کیمپ میں پہنچا جہاں شہر کے تمام مسلمان، پاکستان جانے کے انتظار میں اپنے ہی شہر میں اپنے گھروں سے باہر، اپنے دوستو اور ہمجولیوں کے بارے میں سوچ رہے تھے جنہیں وہ پیچھے چھوڑے جا رہے تھے۔ میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا لیکن میں اللہ رکھی کے بارے میں کسی سے کچھ بھی پوچھ نہ سکا۔ شاید مجھے ڈر دامن گیر تھا کہ لوگ کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ لوگ پوچھیں گے کہ کون اللہ رکھی تو میں کیا کہہ کر اپنی پہچان دوں گا۔ مجھے فضلا نمبردار وہاں نظر ضرور آیا تھا لیکن وہ اپنی گھوڑی کے لیے کسی بنیئے سے چنوں کی بوری کا سودا کر رہا تھا۔ اور مجھے اس سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

کتنے برس بیت گئے۔ اس کا اتہ پتہ ملتا بھی تو کہاں سے۔ اس کے بارے میں بتاتا بھی کون۔ ہاں کل پاکستان سے آئے دوستوں کی

محفل میں پتہ نہیں اللہ رکھی کا ذکر کیسے آ گیا
حمید نے کہا۔
"کرشن سہاپے! پاکستان بننے کے بعد اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس وقت تو لوگوں کو اپنے رشتہ داروں ہی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اللہ رکھی کی کس کو فکر تھی"۔

اب میں کئی بار کینوس، رنگ اور برش لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کئی بار میرے دل میں اللہ رکھی کی تصویر بنانے کا خیال آتا ہے مگر یہ بات ٹلتی جاتی ہے۔ کل کی محفل کے بعد میں ساری رات اس خیال کو اپنے ذہن میں پختہ کرتا رہا کہ میں اس کی تصویر ضرور بناؤں گا۔ اب میرے سامنے کینوس بھی ہے، رنگ بھی ہیں۔ برش بھی ہیں۔ وقت بھی ہے، دماغ میں اللہ رکھی کا تصور بھی ہے، مگر یہ کیا۔ ابھی ابھی جو میرے ذہن کے پردے میں اللہ رکھی تھی وہ اپنے روپ کیسے بدلنے لگ پڑی۔ مجرے پر بیٹھی اللہ رکھی۔ فضلے نمبردار کی رکھیل اللہ رکھی۔ شریفوں کے محلے میں رہنے والی طوائف اللہ رکھی۔ رمضانی کے پیچھے پیچھے چلنے والا، چادر میں لپٹا خوشبوؤں کا قافلہ، میری جھولی میں نو سو روپے کے نوٹ پھینکنے والا اور اندر کے کمرے میں جلد گم ہو جانے والا سایہ اور اس کے بول "سہاپا! جب تو کمانے لگ جائے گا تو بیشک میرے روپے لوٹا دینا"۔

میں اب کمانے بھی لگ گیا ہوں۔ میری بنائی ہوئی پہلی تصویر فروخت ہوئے پندرہ برس ہو گئے ہیں۔ میرے پاس اب پیسے بہت ہیں۔ میں اپنا قرض چکانا بھی ...... چاہتا ہوں۔ مگر میں یہ کیسے لوٹاؤں۔ مجھے پتہ نہیں اللہ رکھی مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچی بھی تھی کہ نہیں۔ وہ پاکستان جا بھی پائی تھی کہ نہیں وہ زندہ بھی ہے کہ نہیں۔

میرے ہاتھ میں رنگ سے بھرا برش ہے اور سامنے کینوس۔ سوچتا ہوں کہ کیا میں اس خوشبو کی تصویر بنا بھی پاؤں گا کہ نہیں جو میرے دل و دماغ میں چھائی ہوئی ہے۔ میرا دماغ سوچنے سے عاری ہے۔ میرا فن میرا منہ چڑا رہا ہے اور کینوس اب بھی خالی ہے میرے ذہن کی طرح۔

فرحت قادری

غزل

صلیب و دیر و حرم ہیں گونگے
ہمارے سب محترم ہیں گونگے
کوئی صدا ہے نہ کوئی آہٹ
تمہارے سارے ستم ہیں گونگے
ہراس و ہیبت کا ہے یہ عالم
کہ ذہن و فکر و قلم ہیں گونگے
بڑا بھیانک یہ حادثہ ہے
زبان رکھ کر بھی ہم ہیں گونگے
حصارِ کہسار میں ابھی تک
نہ جانے کتنے صنم ہیں گونگے
نشانِ منزل بتا رہے ہیں
اگرچہ نقشِ قدم ہیں گونگے
اداسیوں کے خموش منظر
مری توقع سے کم ہیں گونگے

غزل

کرشن کمار طورؔ

اپنے ہونٹوں پر اِک دعا روشن کر
تیرے دل میں بھی ہے خدا روشن کر

اب تو یہی اِک جائے اماں باقی ہے
آنکھیں کھول طلسمِ انا روشن کر

کھول دے جتنے قفل ہیں دروازوں کے
جو کچھ بھی ہے اپنے سوا روشن کر

جو آنکھوں کو نم لب لرزیدہ کرے
تو اب اِک ایسی ہی دعا روشن کر

چٹی چُپ کے سحر میں ہیں سارے لوگ
لفظ لہو سے بزم ذرا روشن کر

جگنو بن کر ہر ذرّے سے ہو ظاہر
ہر اِک دشت میں اک ہی صدا روشن کر

نئے سرے سے خود اپنے کو پہچان
طاق پہ رکھا ہوا دیا روشن کر

اپنے لہو سے لکھ کتابِ زیست کو طورؔ
اور اس کے ہاتھوں کی حنا روشن کر



اعتراف

میں زندہ ہوں
کہ میں نے زندگی کا زہر
جُرعہ جُرعہ پی کر
سوچ کو اپنی نکھارا ہے
پلا ہوں سانحوں کی گود میں
آنکھیں ملائیں میں نے شبِ خونِ حوادث سے
صلیبِ غم پہ
مجھ کو وقت نے اکثر چڑھایا ہے
مگر حرفِ شکایت میرے ہونٹوں پر نہیں آیا
برہنہ گفتنی نے مجھ کو رسوا کر دیا ہر سُو
مگر شاکی نہیں میں زندگی کا
آج بھی اس بیسوا سے پیار کرتا ہوں
اگر یہ جرم ہے تو
جرم کا اقرار کرتا ہوں۔



کشمکش

مہدی پرتاب گڈھی

آغازِ سفر کے سرد لمحے
رستے میں کھڑے ہیں میرے، تن کے
حائل سے ہیں سدِّ راہ بن کے
وہ لب ہیں وفورِ غم سے لرزاں
تھا کیف و سرور جن پر رقصاں
عارض کہ جو تھے، مہکتے گلزار
مرجھائے مرجھائے سے ہیں بیمار
آنکھوں کے میکدے ہیں ویراں
چہرہ تصویرِ دردِ پنہاں
بے درد حالات کے تقاضے
جاں لیوا اُن آنکھوں کے اشارے
بڑھتے قدم روکتے ہیں آنسو
بنتی ہے زبان چشمِ آہو
یہ کشمکش ہے کتنی جان لیوا
آغازِ سفر مگر ہے کرنا
دل چاہے ہے حُسن کی رفاقت
روکے ہے مگر خرد کی حکمت
وہ آنکھیں کہتی ہیں ٹھہر جا
دانشوری کہتی ہے نکل چل

ڈاکٹر نریش

مسلم معاشرے کی رسومات

اسلام کے ظہور کے زمانے میں اخلاقی اور تہذیبی اعتبار سے عرب معاشرے کی حالت ناگفتہ تھی۔ لہٰذا اسلام کے ابتدائی دور میں جو رسمیں مسلم معاشرے میں رائج ہوئیں ان کے پس منظر میں دو مخصوص مقاصد کار فرما تھے۔ اوّل یہ کہ ان رسموں کے ذریعے ایک صحتمند معاشرے کی تنظیم ہو اور دوسرے یہ کہ ان کے ذریعے نورستہ معاشرے کو اخلاقی قدروں سے ہمکنار کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی دور کے مسلم معاشرے میں سماجی رسومات سادہ، نمائش سے مستثنٰے اور مائل بہ مذہب ہوتی تھیں۔ لیکن جیسے۔ جیسے اسلام عرب کی حدوں سے باہر نکل کر دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلتا گیا ویسے۔ ویسے ہر ملک کی مقامی رسومات اسلامی رسموں کو متاثر کرتی رہیں۔ ہندوستان میں چونکہ بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جنہوں نے اپنا پیدائشی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا۔ اس لئے اسلامی رسومات کے ساتھ ساتھ اپنے آبا و اجداد کی رسمیں بھی ادا کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ نکاح کی خالص اسلامی رسم کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلم معاشرے میں دولہا کا گھوڑی پر بیٹھنا، تلوار لیکر چلنا، دلہن کا ڈولی میں وداع ہونا اور ڈولی پر سے پیسوں کا صدقہ جیسی کتنی ہی مقامی رسمیں مروج چلی آرہی ہیں مگر باوجود ان مقامی رسموں کے ہندوستانی مسلم معاشرے میں بنیادی طور پر وہی رسمیں موجود ہیں جو کبھی عرب معاشرے میں رائج ہوئیں تھیں۔ ذیل میں ہندوستانی مسلم معاشرے کی بنیادی سماجی رسموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اوّل اذان

مسلم سماج میں جب کوئی بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اسے نہلا دھلا کر پاک کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد گھر کا کوئی بزرگ اس کے کان میں اذان دیتا ہے۔ بچہ چونکہ پہلی بار اذان سنتا ہے، اس لئے اس رسم کو اوّل۔ اذان کہا گیا۔

عقیقہ

بچّے کی پیدائش کے ساتویں دن۔ اس کے نام پر کسی جانور کی قربانی دی جاتی ہے

اسے عقیقہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص بچے کی پیدائش کے ساتویں دن یہ رسم ادا نہ کر سکے تو اسے کسی دن بھی ادا کر سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس رسم کی ادائگی کے لئے اسے اسی دن کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جو بچے کے یوم پیدائش سے ساتواں دن پڑتا ہو مثلاً اگر بچہ پیر کے روز پیدا ہوا ہے تو جب بھی اس کی رسم عقیقہ ادا کی جائے گی اتوار کا دن ہی ہوگا۔ اولاد اگر نرینہ ہو تو دو بکریاں یا دو بھیڑ اور اگر مادین ہو تو ایک بکری یا ایک بھیڑ کی قربانی دی جاتی ہے۔ عام طور پر بچے کے سر کو مونڈ کر اس کے بالوں کے وزن کا سونا یا چاندی خیرات کیا جاتا ہے اس کے بعد عقیقے کا گوشت رشتہ داروں، بھائی چارے اور غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ختنہ

بچہ جب ذرا بڑا ہو جاتا ہے نائی کو بلوا کر اسکے عضو تناسل کے اوپر کا گوشت کٹوایا جاتا ہے اسے "ختنہ کرنا" یا "سنت" کہتے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں ختنہ کے ذریعے مسلمان کو جسمانی طور پر باقی لوگوں سے مختلف پہچان حاصل ہوتی ہے اس لئے اس رسم کو "مسلمانی" یا "مسلمان کرنا" بھی کہا جاتا ہے۔ اس رسم کے آخر الذکر نام غلط العام ہیں چونکہ بچہ اوّل اذان کے ساتھ ہی مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر بچے کو نہلا دھلا کر تیار کیا جاتا ہے اور ختنہ کے بعد اس کے جسم کے نچلے حصے پر سرخ کپڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ اس تقریب پر شریکِ بھائی چارے کے لوگوں اور رشتہ داروں کا بچے کو شگون سلامی دینا بھی مروّج ہے۔

نکاح

مسلم معاشرے میں بچوں کے جوان ہونے پر ان کے والدین ان کی شادی طے کرتے ہیں۔ چونکہ مسلم معاشرے میں سگے بہن، بھائی کو چھوڑ کر باقی کے اکثر رشتوں میں شادی کی جا سکتی ہے اس لئے عام طور پر ازدواجی نسبتیں بچوں کی طفلی میں طے ہو جاتی ہیں۔ ہندو معاشرے میں مروّج رسم کے برعکس مسلم معاشرے میں لڑکی والے لڑکا تلاش نہیں کرتے بلکہ شادی کی پیش کش لڑکے والے کو ہی کرنا ہوتی ہے۔ نکاح کے دن دولہا برات لیکر دولہن کے گھر پہنچتا ہے۔ مسلم معاشرے میں چونکہ شادی کو سماجی اقرار کے طور پر لیا جاتا ہے، اس لئے نکاح کے وقت یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے گا تو اسے کتنی رقم ادا کرنی ہوگی۔ اسے "مہر" کہا جاتا ہے۔ دولہا اور دلہن جب اظہار رضامندی کر کے اس اقرار نامے کو قبول کر لیتے ہیں تو مولوی —— نکاح پڑھواتا ہے۔ نکاح کے موقع پر خرما کی تقسیم (چھوارے لٹانا) اور نکاح کے بعد ولیمہ (طعام عروسی) کا رواج بھی عام ہے۔ نکاح کے وقت دو مسلمان گواہوں کی موجودگی ضروری ہے۔ شیعہ معاشرے میں نکاح کے وقت تو نہیں لیکن طلاق کے وقت دو گواہوں کی موجودگی ضروری مانی جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ گھروں میں نکاح کے اقرار نامے کو زبانی قبول کرنے کے ساتھ ساتھ تحریری صورت بھی دے دی جاتی ہیں جسے "کابین نامہ" کہتے ہیں۔

تدفین

مسلم معاشرے میں کسی کی موت پر آہ و بکا کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ موت واقع ہونے پر مُردے

کو نہلا دھلا کر پاک کیا جاتا ہے اور اسے کفن پہنایا جاتا ہے۔ تب اس کے جنازے کو قبرستان لے جایا جاتا ہے جہاں جنازے کی نماز ادا کی جاتی ہے نماز کے بعد مردے کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے۔ قبر کو مستطیل خندق کی صورت میں تیار کیا جاتا ہے جس کی مغربی دیوار میں لحد بنائی جاتی ہے مردے کو لحد میں لٹانے کے بعد لحد کو خم ہائے شکستہ اور نم مٹی سے بند کر دیا جاتا ہے۔ ازاں بعد قبر میں مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ خندق کے پر ہونے پر سطح زمین سے اونچی قبر تیار کر دی جاتی ہے۔ تدفین کی اس رسم میں تین باتیں قابل ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ جنازے کے ساتھ جانے والا ہر مسلمان جنازے کو کاندھا دینا کارِ ثواب سمجھتا ہے، دوسرے یہ کہ نماز جنازہ میں شامل ہوتا ہے اور تیسرے یہ کہ قبر میں مٹی ڈالنے میں شریک ہوتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو ان رسومات کے پس منظر میں عرب کے جغرافیائی اور سماجی حالات نظر آتے ہیں اذان دے کر بچے کو اسلام میں داخل کیا جاتا ہے عقیقہ کے ذریعے بچہ پیدا ہونے کی خوشی میں معاشرے کو شریک کیا جاتا ہے۔ عرب چونکہ ہندوستان کی طرح زراعتی ملک نہیں تھا اس لئے وہاں کسی خوشی میں معاشرے کو شریک کرنے کے لیے گوشت ہی تقسیم کیا جا سکتا تھا۔

ختنہ سے کثرت اولاد کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ اس زمانے کے عرب میں اور بالخصوص نوزائیدہ اسلامی معاشرے کو کثیر تعداد میں اولاد کی ضرورت تھی۔ اس لئے ختنہ کی رسم مسلم معاشرے میں رائج ہوئی۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عرب معاشرے میں عورت مردوں کے ہاتھ کا کھلونا ہوتی تھی۔ ایک صحتمند معاشرے کی تنظیم کے لئے سماجی اقرار کے طور پر نکاح کی رسم جاری کیا جاتا اور ازدواجی زندگی میں طلاق کی گنجائش نکالنا بہت ضروری تھا۔ ●

بقیہ ہڑتال ـــــــــ صـ ۲۲ سے آگے

زیادہ ہی گرد جم گئی تھی جن کی وہ ہڑتال کی وجہ سے دھلائی بھی نہ کرا سکتے تھے۔ جس دن اے۔جے واپس گئے۔ اُس کے دوسرے ہی دن چوکیوں پر پھر موکلوں کی بھیڑ نظر آنے لگی ــــ اور وکیل لوگ اپنے کاموں میں لگ گئے ــــ لیکن ان کا وجود ٹوٹ ٹوٹ گیا ــــ اُن کی حالت اس گرے ہوئے انسان کی تھی جو اٹھ کر بدن کی دھول تو جھاڑتا ہے، ساتھ ہی اپنے چاروں طرف دیکھتا بھی ہے، کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا ہے ــــ!

ہڑتال جاری تھی تو جیل کے قیدی بھی امید میں تھے۔ پھر وکیل لوگ تھے جنھوں نے امّید کو یقین میں بدل دیا تھا ـــ ضلع جج چلے جائیں گے تو کوئی نیا جج آئے گا جس سے لین دین کر کے معاملہ جلد نپٹا لیا جائے گا ــــ لیکن اُدھر ہڑتال ختم ہوئی اُدھر اُمّید ــــ! اور وہ عادی ملزم جن کے لیے جیل ہی گھر تھا، پھٹی پھٹی نگاہوں سے جیل کی چہار دیواری کو دیکھنے لگے ــــ جسے خود انھوں نے ہی بنایا تھا ــــ پھر انھوں نے جیل کے آہنی پھاٹک کی طرف دیکھا ــــ جس سے کوئی مٹ میلی شام آ کر لپٹ گئی تھی ــــ!!

نسیم بن آسی

ہڑتال

ایسا معلوم ہوا ہے جیسے سورج مغرب سے نکل رہا ہو! یا آسمان پھٹ کر زمین پر آ رہا ہو — ! کچہری میں وکیلوں نے یکایک ہڑتال کر دی تھی — بدعنوانی، رشوت اور غلط کاری کے خلاف — !

"وکیلوں نے ہڑتال کی ہے!"

"ہاں بھئی! اب نیا انقلاب آنے والا ہے!"

"بات کیا ہے؟"

"ضلع جج کے خلاف رشوت اور بدعنوانی کا الزام

"آپ نے سنا ہے حسن صاحب! آپ کہتے تھے نا؟ جج صاحب بہت شریف اور ایماندار آدمی ہیں!"

"اور شاعر بھی!" کسی نے لقمہ دیا۔

"کیا شاعر بے ایمان نہیں ہوتے، ہمارے محلّے میں شاطر صاحب نے "بزمِ ادب" قائم کی تھی۔ اسی کے نام پر بہت سارا چندہ جمع کیا اور سب ہڑپ کر گئے —"

"بزم ادب" قائم کی تھی یا "بزم ہڑپ"؟

ایک بار پھر سب کے دانت دکھائی دیے۔ جو پان سے لال تھے۔ ایک کا پان اس کے ہونٹوں کے نیچے بہہ کر آ گیا تھا — !

جنگلی لتا کو جانے کون سی محبت تھی جو وہ کچہری کی کائی لگی چہار دیواری کو نہیں چھوڑتی تھی۔ اور اپنی کھردری باہیں اُس کے گلے میں ڈالے لپٹی رہتی رہتی — کچہری کی چہار دیواری کافی دور تک پھیلی ہوئی تھی جس میں پورے ضلع کی گندگی سما سکے — ! اس کے صحن میں آم، جامن اور نیم وغیرہ کے اونچے اونچے درخت کسی پہرے دار کی طرح دن رات کھڑے رہتے — پھر بھی اُن کے سائے میں ٹوٹی ہوئی چوکیوں پر بیٹھے ہوئے موکلوں کی کھوپڑیاں اپنے آپ گرم ہو جاتیں! اس پر وکیل لوگ دن کے اجالے میں اُن کی جیبوں کی صفائی کر دیتے۔ جس سے انھیں گھر جانے کے لیے کرائے کے بارے میں بھی سوچنا پڑتا — !

دس بجتے ہی آدمیوں کی بھیڑ کے ساتھ بڑے وکیلوں کی کاریں پولیس کی جیپیں اور اسکوٹر گرد اُڑاتے ہوئے کچہری کے گیٹوں سے داخل ہونے لگتے! گاڑیاں اپنے اپنے اڈوں پر جا کر رک جاتیں — ! کاروں کے دروازے ایک جھٹکے کے ساتھ کھلتے اور منشی جی فائلوں کا بھاری بوجھ لیے وکیل صاحب

کے پیچھے ہو لیتے۔ بڑے وکیل کے منشی بھی کسی وکیل سے کم نہیں ہوتے ہیں۔ وکیلوں سے اتنی گھبراہٹ نہیں ہوتی ہے، جتنی منشی جی سے! یہ صرف شکل دیکھنے کے موکل سے پانچ روپے وصول کر لیتے ہیں! منشی کے بغیر وکیل کا کام نہیں چل سکتا ہے تو موکل کا بھی نہیں! اس لیے منشی جی کو خوش رکھنا ضروری ہے۔!

بلڈنگ کے اوپر اور نیچے ججوں اور مجسٹریٹوں کے اجلاس لگتے۔۔ جہاں کالے گاؤن میں جج اپنی اونچی کرسیوں پر بیٹھے رہتے۔ اُن کی کرسیوں کے ٹھیک پیچھے دیوار پر گاندھی جی کی بڑی سی تصویر آویزاں رہتی۔

لیکن جب سے ہڑتال ہوئی تھی، سیاہ و سفید کے مالک جج اور مجسٹریٹ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیکار ہو رہے تھے۔ اُن کے قلم جنھیں ایک پل فرصت نہیں ہوتی، میز پر فالتو پڑے رہتے۔!

لوگوں کو ضلع جج پر غصّہ آتا۔ جو اصل میں اُنھیں اپنے آپ پر آنا چاہیے تھا۔ قیدی جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے اور اُن کی ضمانت نہیں ہو رہی تھی تو اس میں ضلع جج کا کیا قصور تھا۔ وہ تو روز کچہری آتے۔ اور اپنے اجلاس میں بیٹھتے۔

"کوئی بھی... آکر اپنا کیس کرالے۔" وہ کہتے ہیں۔ لیکن کوئی وکیل اُن کے پاس نہ جاتا۔ وہ جیسے آتے، اُسی طرح شام کو اپنے بنگلہ میں واپس چلے جاتے۔!

جس جگہ بنگلہ تھا کچہری سے کوئی بھی پیدل چل کر جلد ہی وہاں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن آپ کی سہولت کے لیے اُس کا نام بھی بتاتا ہوں۔! اُسے "نیا بس اڈا" کہتے ہیں۔ جو کچہری کے مغرب کی طرف ہے۔ رکشا والوں کو "نیا بس اڈا" بتانا ہی کافی ہے!

لمبے چوڑے لان کے اندر گلاب اور دوسرے پھولوں کی باڑ تھی جو ہر آنے جانے والوں کے اندر کسی بنگلہ کا احساس کراتی رہتی۔! بڑے سے گیٹ پر ضلع جج کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ گیٹ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ صرف رات کو بند ہوتا تھا۔ گیٹ سے ایک چوڑی شاہراہ بنگلہ تک چلی گئی تھی جس کے دونوں طرف ہرے بھرے پودوں کی قطاریں تھیں جنھیں مالی آزادی سے پھیلنے اور بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ بنگلہ کے اندر پڑی ہوئی زیادہ زمین اب تک فالتو ہو رہی تھی۔ پھر بھی اس میں موسمی سبزیاں اُگائی جاتیں۔ گھنے گھنے آم کے درختوں پر بور آتے۔ اور اُن میں پھل بھی لگتے۔۔ جو چیز زیادہ دیکھنے کے لائق تھی وہ چمیلی کی بیل تھی جو بے سرو سامانی کے ساتھ لپک کر بنگلہ پر چڑھ گئی تھی۔۔ بیل تو خیر اپنی عادت کی وجہ سے دیوار سے لپٹ گئی تھی لیکن جج صاحب کو شاعری کی لت جانے کیسے پڑ گئی جو اُن کی عمر کے ساتھ بڑھاپے تک چلی آئی تھی اور اب اُن سے الگ ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ اُن سے ٹوٹ کر پیار کرنے والی بیوی اُن کی اسی سنک سے ہمیشہ چڑھی رہتی جس کی جج صاحب ذرا بھی پروا نہ کرتے۔!

ایسے تو وہ اپنے پورے وجود سے جج تھے لیکن اُن کے اندر کا شاعر کہیں نہ کہیں سے سر نکال کر جھانکنے لگتا۔ پھر بھی وہ اُن شاعروں میں نہ تھے جو اشارہ پاتے ہی شروع ہو جاتے ہیں۔۔ اور سننے والے کو بھاگنے کے لیے راستہ دیکھنا پڑتا ہے۔۔ کسی کے کہنے پر دو چار شعر سے آگے نہ بڑھتے۔۔۔ لیکن شعر و ادب پر کھل کر دیر تک باتیں کرتے۔ اُن کی باتوں میں گہرائی ہوتی، فکر انگیزی ہوتی۔۔!

ہڑتال کی وجہ سے کوئی کام دھام نہ ہونے پر بھی جج صاحب تھک کر شام کو بنگلہ پر آتے۔۔ گیرج کے سامنے سلیٹی رنگ کی کار کھڑی ہو جاتی۔ وہ کچھ دیر آرام کرتے۔ پھر ورانڈے میں آنکلتے۔ جہاں کرسیاں لگی رہتیں۔ ملنے جلنے والے آتے رہتے۔ ان میں زیادہ تر

اسٹاف ہی کے لوگ ہوتے۔ یا پھر ان کا کوئی ہم مزاج جس کا تعلق شعروادب سے ہوتا۔! وہ شام کو گھر پر ہوتے تو معلوم ہوتا۔ صبح ہو رہی ہے۔ کچہری کا ماحول اور ہڑتال جو گرد بن کر ذہن پہ چھایا رہتا، ڈھل جاتا اور اندر ہی اندر گھٹتا ہوا سکون چہرہ پر لوٹ آتا۔

اور جب صبح ہوتی تو معلوم ہوتا شام ہو رہی ہے۔ وہی کچہری کی ہڑتال اور نعرے کسی آسیب کی طرح اُن کا پیچھا کرنے لگتے۔ کچہری کا وقت ہوتے پر وہ بوجھل قدموں سے کار میں جا کر بیٹھ جاتے اور گیٹ پار کرکے جو کار کبھی تیزی سے نکل جاتی تھی، اب دھیرے دھیرے چلتی ہوئی نظر آتی۔!

ہڑتال کو جیسے ضد ہو گئی تھی اور ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔

انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!

نوجوان وکیلوں کی ٹولی میں نعرے بلند ہوتے۔ یُوا نیتا پورے جوش وخروش میں آجاتے۔ ان مٹھی بھر بوڑھا نیتاؤں کو آتے ہوئے دیکھ کر کسی نے کہا۔ دیکھیے۔ جُوّاں (سر کے جُوّاں) لوگ آرہے ہیں۔

ہی۔ ہی۔ ہی.....

کوئی بات ضرور ہے!

بات کچھ نہیں، صرف اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی بات ہے!

سنتے ہیں ضلع جج پر رشوت اور غبن کا الزام ہے۔ یہ کچہری میں جو نئی بلڈنگیں بن رہی ہیں، اس میں انھوں نے بہت کمیشن کھایا ہے۔!

ایسی بات نہیں، جج صاحب بہت ایماندار اور با اصول انسان ہیں۔ بکواس! ضرور ان میں کوئی بات ہے۔ نہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے، وکیل لوگ پندرہ دنوں سے ہڑتال پر رہیں۔ آخر ان کے بھی تو بال بچے ہیں۔!

پھر۔؟

ان کے کاموں کی جانچ اور ان کا ٹرانسفر ہوگا!

نہیں ٹرانسفر وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔

ہوگا۔!

وہ جوش جو جسم کے کسی حصہ میں پڑا سو رہا تھا، یکایک اُن کے ہاتھوں اور چہروں پر آکر کوئی شیطانی شکل اختیار کر گیا۔ اور لوگ بحث کرتے ہوتے ایک دوسرے کے گریبانوں تک آگئے۔!

کچہری میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے لوگ۔ کچھ اور دکھائی دیتے۔ تھک ہار کر جب واپس جانے لگتے جب بھی وہ کچھ اور دکھائی دیتے۔!

احمقوں کی کمی نہیں غالبؔ: ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ غالبؔ کا یہ شعر جو آج موکلوں پر چسپاں ہو رہا تھا، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُن کی شاعری ہر دور کے لیے ہے۔ جو آپ بیتی ہوتے ہوئے بھی جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو اُن کی بدقسمتی تھی اُن کے زمانہ میں آجکل کی طرح نقاد نہیں تھے۔ جو اُن کے کلام کو سمجھتے۔! ادب کو جتنا نقاد سمجھتے ہیں کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔! انھوں نے اعلیٰ ادب کے کیسے کیسے اصول بنائے ہیں۔ میں تو منٹو کو سر پھرا ہی کہوں گا۔ جس نے کہا تھا، نقاد جو کہتے ہیں، اس کا ٹھیک اُلٹا کرنا چاہیے۔ نقادوں کی بیساکھی نہ ہو تو ادیب اور شاعر ایک قدم نہیں چل سکتے۔!

اس دن بار ایسوسی ایشن میں جب وکیلوں کی میٹنگ تھی۔ ان کی تقریر سننے کے لیے موکل بھی گھس بیٹھ کر رہے تھے۔ اور ہال کی ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ دیوار پر بڑے اور نامور وکیلوں کی تصویریں لگی تھیں۔ جو اب مرحوم ہو چکے تھے۔ کچھ تصویروں پر پھولوں کے ہار بھی چڑھے تھے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جنھیں مرنے کے بعد دنیا یاد کرتی ہے۔

اور اُن کی تصویروں پر پھولوں کے ہار چڑھاتی ہے۔
دیوار کے پاس کھڑے موکل، وکیلوں کے چہروں پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید وہ اُس تقریر کو پڑھ رہے تھے، جو اُن کے چہروں پر آکر چھپ گئی تھی ۔۔۔ ! جمہوریت میں کچھ ملے یا نہ ملے، لیڈروں کی تقریر سننے کو ضرور ملتی ہے۔ جب ہی ایک نیتا وکیل یا وکیل نیتا مائک پر آیا۔

"بھائیو! خوں۔ خوں۔ خوں ۔۔۔ اُسے یکایک کھانسی آگئی جو اتنی لمبی ہو گئی کہ دروازہ تک چلی گئی۔ کسی نے پانی کا ایک گلاس دیا۔

"لیجیے ... !"

"بھائیو!" وہ پھر کہنے لگا۔ "یہ تو آپ جانتے ہی ہیں، یہ ہڑتال کیوں ہے؟ کیا ہم لوگوں کا دماغ پھر گیا ہے جو اپنا کام دھام چھوڑ کر اتنے دنوں سے ہڑتالوں پر ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں، آج ہمارے ملک میں چوری، رشوت اور لوٹ عام ہو گئی ہے۔ جب سے یہ نئی سرکار آئی ہے...

"نیتا جی! گاڑی لائن سے اُتر گئی ۔۔۔ صرف ہڑتال کی بات کیجیے۔ پارٹی اور سیاست کو جیب ہی میں رکھیے۔"

وہ پھر کہنے لگا ۔۔۔ "یہ جج صاحب کی غلطی نہیں ہے، ہماری سرکار کی غلطی ہے جس سے ہر طرف بُرائی پھیلی ہوتی ہے۔"

"آپ پھر پالٹکس کو گھسیٹے جا رہے ہیں۔" کوئی سرکار کا حمایتی وکیل بولا ۔۔۔ "معلوم ہوتا ہے، انتی پارٹی ہے۔"

پھر اس کا کندھا پکڑ کر بٹھا دیا گیا۔ !

ایک دوسرے وکیل مائک پر آئے جو کھدر دھاری تھے۔ اور منہ میں پان کی پیک لیے ہوئے تھے۔ جب ہی کسی نے ان کے سامنے سے مائک لے کر اپنی طرف کر لیا۔ اور بولا "بھائیو! اب یونین کے پریزیڈنٹ آپ کے سامنے تقریر کریں گے۔ آپ سے گذارش ہے، آپ اُن کی باتیں خاموشی سے سنیں۔"

یونین کے پریزیڈنٹ کھدر دھاری نیتا نے پہلے کھانس کر گلا صاف کیا۔ پھر کہنے لگے ۔۔۔

"بھائیو! ہم سب کو اس ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ ضلع جج کے کاموں کی جانچ کے لیے ہائی کورٹ سے کمیشن مقرر ہو چکا ہے۔ جب تک اُن کا ٹرانسفر نہیں ہو جاتا، ہم دم نہیں لیں گے! ہماری ہڑتال جاری رہے گی۔ آپ لوگ ایک بار بولیں ۔۔۔ انقلاب زندہ باد!"

پورا ہال نعرے سے گونج اُٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، انقلاب جو برسوں سے پڑا کہیں بوڑھا ہو رہا تھا، یکایک جوان ہو کر بار ایسوسی ایشن میں آگیا ہے، جو کچھ کر کے ہی رہے گا ۔۔۔ !

جو کھدر دھاری وکیل مائک پر بول رہے تھے اُن کی چوکی اکثر خالی نظر آتی تھی، جب وکالت سے گھبرا گئے تو وہ یونین کے پریزیڈنٹ ہو گئے ۔۔۔

تقریر کے دوران لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں اس لیے کہ تالی بجانا ہماری عادت ہو چکی ہے ۔۔۔ کوئی نیتا بڑا ہے یا چھوٹا اس کا اندازہ اُن کے کاموں سے نہیں، انھیں تالیوں سے لگایا جاتا ہے ۔۔۔ جس نیتا کی تقریر میں جتنی زیادہ تالیاں بجتی ہوں، سمجھیے وہ اُتنا ہی بڑا نیتا ہے!

تقریروں کا پروگرام جب ختم ہوا تو لوگ ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے نکلنے لگے ۔۔۔ جیسے سینما کا شو ختم ہونے کے بعد ہوتا ہے ۔۔۔ ! باہر آئے تو رکشا اور ٹیمپو والوں کی وہی آواز ۔۔۔

جو سینما ہال کے سامنے سڑک پر سنائی دیتی ہے۔! بھیڑ اُمڈ کر یکایک سڑک پر آ گئی تھی۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کہاں جائیں — ! اب وہ گھر بھی جا رہے تھے تو معلوم ہو رہا تھا، باہر جا رہے ہیں — !

ڈاکٹر مایوس گھر سے چلے ٹھیک وقت پر، لیکن اُنھیں راستہ ہی میں دیر ہو گئی۔ ٹرک والوں نے سڑک جام کر دی تھی۔ اور بہت دور تک ٹریفک کا اژدہام پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا — مسافر پولیس والوں کو گالی دے رہے تھے جو رشوت لے کر ٹرک والوں کو پوری ڈھیل دے دیتے ہیں۔ بنگلہ تک آتے آتے شام ادھیڑ ہو چکی تھی۔ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے اور مکان کی کھڑکیاں رات کی آمد کا پتہ دے رہی تھیں — ڈاکٹر مایوس گیٹ کے پاس پہنچے تو اُنھیں گیرج کے باہر سلیٹی کار نظر آئی — جو بجلی کی روشنی میں دور ہی سے چمک رہی تھی — جس کا مطلب تھا — "صاب" ہیں۔

کھپ..... کھس۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔

جج صاحب کے اردلی آپس میں ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے۔ وہ ایسا اُس وقت کرتے تھے۔ جب انھیں کوئی کام نہ ہوتا تھا اور شیطان اُن کے دماغ میں آ کر بیٹھ جاتا تھا — اردلی پانڈے ڈاکٹر مایوس کو پہچانتا تھا —

"جج صاحب ہیں؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"جی ہاں! صاب ہیں!" اُس نے اُسی انداز میں جواب دیا۔ اور اُنھیں بینچ پر بیٹھنے کے لیے کہتا ہوا وہ بنگلہ کی طرف چلا گیا —

ڈاکٹر مایوس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ گلاب اور دوسرے انگریزی پھول اندھیرے کی کالی چادر اوڑھ چکے تھے۔ درختوں نے بھی اپنا سر جھکا لیا تھا۔ صرف ورانڈے پر چمیلی کی بیل نظر آ رہی تھی، جس پر بجلی کی ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی — پھر اُس کے بعد ورانڈے میں رکھی ہوئی کرسیاں اور بیچ میں ایک چھوٹی سی میز دکھائی دے رہی تھی۔ پانڈے کچھ دیر بعد آیا اور کہا۔

"آپ ورانڈے میں بیٹھیں۔ "صاب" ابھی آ رہے ہیں!"

ڈاکٹر مایوس ورانڈے میں بیٹھ گئے — اور جج صاحب کے آنے کا انتظار کرنے لگے — دروازہ پر کوئی سایہ اُبھرا — جج صاحب معمولی کرتا اور لنگی میں ایک درویش معلوم ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر مایوس نے کھڑے ہو کر آداب کہا۔ پھر مصافحہ کیا۔ جج صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے انھیں بھی قریب والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا — کچھ لمحہ خاموشی رہی — پھر ڈاکٹر مایوس نے کہا۔

"آج کل تو آپ بہت پریشان ہوں گے!"

یہ کہہ کر اُنھوں نے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا کوئی پریشانی یا گھبراہٹ ظاہر ہو رہی ہے یا نہیں۔ — لیکن اُنھیں تعجب ہوا — جج صاحب نے بے فکر ہو کر کہا۔ ہڑتال سے میں ذرا بھی پریشان نہیں ہوں۔ میں نے تیس سال کی سروس میں کوئی ایسا کیس نہیں کیا جس میں رشوت لی ہو۔ رہ گئی بلڈنگوں کے بارے میں کمیشن کی بات، اسے وکیل لوگ ثابت کر کے دکھائیں۔ مٹھی بھر وکیل ہیں جو شور غل کر رہے ہیں — !"

ڈاکٹر مایوس نے دیکھا، جج صاحب کا چہرہ کسی اندر کی روشنی سے چمک رہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے ماحول میں سکوت چھا گیا۔ پھر جج صاحب نے خود ہی سکوت توڑا۔ انسان عمر سے بھلے ہی بوڑھا ہو جائے، دل سے کبھی بوڑھا نہیں ہوتا ہے۔ وہ بات کا ماحول بدلنے کے لیے ہڑتال سے شاعری پر پلٹ آئے جیسے کھانا کھانے کے

بعد انسان پان پر آجاتا ہے۔ پان نہ ہو تو سگریٹ بھی چل جاتا ہے۔ سگریٹ بھی نہ ملے تو بیڑی، یہ بھی نہ ہو تو پھر کھینی ہی چل جاتی ہے۔ جب کچھ بھی نہ ہو تو وہ جھک مارتا ہے ــــ! ڈاکٹر مایوس آتے ہی اس لیے تھے کہ کچھ شعر و شاعری اور ادب کی باتیں ہوں۔ جنھیں دیکھ کر جج صاحب کی بیوی کہہ اُٹھتیں ــــ ایک تو یہ تھے ہی، تم بھی آ گئے ــــ! ان کی بیوی کی بات سُن کر ڈاکٹر مایوس مسکرانے کی کوشش کرتے لیکن وہ صرف کوشش کرتے جب کہ جج صاحب زور کا قہقہہ لگاتے۔

جج صاحب نے اپنے دو تین شعر سنائے۔ جو بالکل تازہ تھے جنھیں دروازہ کے پاس کھڑی اُن کی بیوی نے بھی سُنا ــــ اور سُن کر جیسے کہہ رہی ہوں ــــ اب تو بس کرتے ــــ مان لیا....!

اُنھوں نے ایک دو شعر اور سنائے جو بالکل جدید تھے، لیکن بامعنی ــــ شعر جدید شاعر بھی کہتے ہیں ــــ وہ صرف مطلب کی پروا نہیں کرتے۔ جسم پر لباس ہونا چاہیے، بدن ننگا دکھائی دیتا ہے، کوئی بات نہیں ــــ! لیکن جدید شاعری بھی اب کہاں رہی ــــ بھلا ہو نقالوں کا ــــ جتنے جدید قافیے تھے، اب پرانے معلوم ہوتے ہیں ــــ!

ڈاکٹر مایوس نے بھی دو تین شعر سنائے۔ جو اُن کے نہیں کسی دوسرے کے تھے۔ یہ اُن کی ایمانداری تھی کہ اسے انھوں نے چھپایا نہیں ــــ اب تو کلام کسی کا، نام کسی کا زمانہ آگیا ہے ــــ مشاعرہ میں کسی کی غزل پڑھ لیجیے ــــ اور داد لے لیجیے ــــ!

جج صاحب نے گھڑی دیکھی۔ یکایک انھیں کچھ یاد آگیا ــــ انھیں کہیں جانا تھا ــــ اور وہ چلتے ہوئے ڈاکٹر مایوس کو سیڑھیوں تک ــــ چھوڑ آئے۔

جس دن ہائی کورٹ سے ایڈمنسٹریٹو جج جانچ کے لیے آئے، کچہری کی فضا ایک بار پھر بدل گئی۔ وکیل آپس میں باتیں کرتے تو موکل بھی اُن کے پاس پہنچ جاتے۔ باتیں اُن کی سمجھ میں آتیں۔ کچھ نہ بھی آتیں۔ پھر بھی وہ اپنا چہرہ اُن کی طرف کیے رہتے ــــ ایسا معلوم ہوتا آج کچھ ہو کر رہے گا۔ اے۔ جے سے سب سے پہلے جونیر وکیل ملے۔ جن سے انھوں نے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا اپنے بڑے وکیل لوگوں کو بلائیے۔ جونیر نیتا وکیلوں کو بہت دکھ ہوا۔ انھیں نالائق سمجھ کر خاطر میں نہیں لایا گیا۔ اس پر وہ ایک دم بھڑک اُٹھے ــــ اور ہال سے واک آؤٹ کر گئے۔

"اے۔ جے واپس جاؤ۔ اے جے واپس جاؤ!"

"وہ آپ لوگوں سے کیا بات کریں گے؟" کسی نے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ لوگوں کی پڑھائی اسکول کے پیچھے ہوئی ہے۔"

اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا۔

اے۔ جے اور بڑے وکیلوں میں بات چیت ہوئی۔ لیکن ضلع جج کے خلاف کوئی الزام نہیں بنا ــــ ہڑتال جائز کاموں کے لیے ہو تو کوئی بات نہیں، ہم ناجائز ہڑتال کرنے کے بھی عادی ہو گئے ہیں۔ ہڑتال کی عمارت اپنے آپ گر گئی ــــ جس کی بنیاد وکیلوں نے خود رکھی تھی ــــ شاید اُس میں انھوں نے لوہا، چونا اور سیمنٹ کم ملایا تھا اور روپے زیادہ بچا لیے تھے ــــ!!

ہڑتال میں وکیلوں کے کوٹوں پر پہلے سے

(بقیہ صـ ۳۹ پر)

ساحل احمد



رنگ ہوا کا میلا ہے
سبز نمی ہے کہرا ہے
کئی طرح کے چہروں میں
کون سا چہرہ اس کا ہے
سبز ہوا کے کہنے پر
دھوپ نے رستہ بدلا ہے
کس نے مڑ کر ساحلؔ جی
اپنا سایہ دیکھا ہے
تم نے پوچھا ساحلؔ کو
ملکِ سخن کا راجہ ہے

o

رمز کی باتیں ہوتی ہیں
بند کتابیں ہوتی ہیں
سنگ دلوں کی محفل میں
گنگ زبانیں ہوتی ہیں
صبح کی باتیں سن کر ہی
خلق کی راتیں ہوتی ہیں
کتنے چہرے والوں کی
کند نگاہیں ہوتی ہیں

آگ لگا دی خیموں میں
تیر چھپے تھے سینوں میں
پیاس بجھی تھی گودوں میں
موت چھپی تھی تیروں میں
گنگ ہوا تھا پانی بھی
حشر بپا تھا سینوں میں
تیغ و سناں کی تیزی تھی
بنتِ علیؓ کی باتوں میں
خون کی حرمت شامل تھی
ساحلؔ اُن کی تیغوں میں

نثار احمد صدیقی

تخلیق کا کرب

میری بیوی تقریباً دو گھنٹے سے تخلیق کے کرب میں مبتلا ہے۔ وہ درد سے کراہ رہی ہے مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ میرے گھر میں محلے کی کچھ بوڑھی اور تجربہ کار عورتیں جمع ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر تدبیروں میں لگی ہیں تاکہ میری بیوی کو تخلیق کے کے کرب سے نجات دلا سکیں ـــــ اور میں جو اردو کا افسانہ نگار ہوں سر جھکائے بیٹھا سوچ رہا ہوں اور دل ہی دل میں خدا سے دعا بھی کرتا جا رہا ہوں کہ جلد اور آسانی سے یہ مرحلہ طے ہو جائے......

مگر اس کے فوراً بعد تو بچہ کے لیے دودھ چاہیئے اور پھر بچہ کی ماں کے لیے بھی کھانے کا کچھ انتظام ہونا ضروری ہے اور آج ہی میرے گھر میں کچھ نہیں ہے۔ میں خود بھی بہت بھوکا ہوں ـــــ

لیکن بھوک کا احساس ختم ہو گیا ہے ـــــ میں فی الحال صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ پیسہ کا بندوبست کہاں سے کروں؟ کس سے قرض مانگوں....؟ مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ یک بیک میری سوچوں کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔

میرے سامنے کھڑی بوڑھی پڑوسن مجھ سے کہہ رہی ہے ـــــ بیٹا! اسے اسپتال لے جاؤ۔ ہم لوگوں کی تمام تدبیریں ناکام ہو گئیں ـ!!

اور مجھے ایسا لگا ـــــ جیسے میرے کانوں میں گرم گرم شیشہ ڈال دیا ہو .... یا پھر میرا دماغ اپنے مرکز سے تھوڑا کھسک گیا ہو۔ میں گھبراہٹ میں فوراً گھر سے باہر آ گیا۔ میرے ساتھ وہ بوڑھی پڑوسن بھی دروازے تک آئی ......

پھر مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئی کچھ سوچ کر واپس لوٹ گئی ـــــ مگر میں اتنی رات گئے

کس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔ اسی کش مکش میں مبتلا اپنے ایک دوست کے دروازے تک پہنچ گیا جو اسی محلے میں رہتا ہے۔ وہ بھی میری طرح کہانیاں لکھتا ہے۔ وہی اس کا ذریعہ معاش ہے مگر وہ ہندی کا افسانہ نگار ہے ۔۔۔!! وہ خود ہی دروازہ کھولتا ہے اور اتنی رات گئے مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دریافت کرتا ہے۔ کیا بات ہے ؟

"ارے یار! کچھ پیسے ہوں تو اس وقت کام چلا دو۔ بیوی کو ہاسپٹل لے جانا ہے اور میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔۔۔۔ اور میں ......!!" میں ایک سانس میں سب کچھ کہہ جاتا ہوں۔

وہ خاموشی سے اندر جاتا ہے اور ایک بیس روپے کا نوٹ میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں مگر زبان ساتھ نہیں دیتی۔ صرف تشکر آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہوں، اور واپسی کے لیے مڑ جاتا ہوں ۔۔!!

میں ہاسپٹل میں تقریباً چار گھنٹوں سے زچہ خانے کے باہر ایک بوسیدہ اسٹول پر بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ واقعی عورت اللہ تعالٰے کی شاہکار تخلیق ہے۔ کتنی صابر و شاکر ۔۔۔۔ زندگی میں ہر ہر مرحلے پر، ہر ہر قدم پر کتنا دکھ اٹھاتی ہے اقبال نے شاید ٹھیک ہی کہا ہے ؎

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

لیکن آج کی تہذیب اور ترقی یافتہ دنیا عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھ رہی ہے اور اسے آزادیٔ نسواں کا خوب صورت نام دے کر عورتوں کو ورغلا رہی ہے اس کو کیا کہا جا سکتا ہے ۔۔۔۔

۔۔۔۔ اور کیا ہم ۔۔۔۔۔!!

اسی درمیان ایک نرس آ کر مجھے ایک پرزہ تھما دیتی ہے ۔۔۔۔" اے مسٹر، یہ دوا جلد لے آیئے" اور پھر واپس زچہ خانے میں چلی جاتی ہے۔ میں خاموشی سے وہاں سے باہر آجاتا ہوں۔ نہ جانے اس دوا کی کیا قیمت ہو۔ ؟ جیب میں پڑا صرف دس روپے کا نوٹ کلبلا رہا تھا ۔۔۔۔ خیر کہ وہ دوا سستی ہی تھی ۔۔۔۔۔ مگر اور دواؤں کی ضرورت پڑی تو ۔۔
۔۔۔۔۔ یہ سوچ کر میں اداس ہو گیا ۔۔۔ لیکن ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا ۔۔۔۔۔۔
میں ایک مشہور و معروف پبلشر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

پبلشر نے مجھے دیکھتے ہی بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔

"آیئے آیئے، صاحب تشریف رکھیے۔ کہیے کیسے اس غریب خانے کو آپ نے رونق بخشی ۔۔۔ کہیے میں کیا آپ کی خدمت کر سکتا ہوں ۔۔ ؟"

دوسرا کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے اس کی چاپلوسی پر سخت غصہ آجاتا اور میں فوری طور پر واپس لوٹ آتا۔ کیونکہ مجھے اس بے جا تصنع سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ مگر میں تو اس وقت سب کچھ برداشت کر سکتا تھا ۔۔۔! میں نے بڑی آہستگی سے کہا۔" دیکھیے میں اس وقت ایک بہت ہی ضروری کام سے آیا ہوں۔"

"فرمایئے، فرمایئے۔ زہے قسمت ۔۔۔۔۔!!"

دیکھیے، مجھے اس وقت فوری طور پر کم از کم دو سو روپے کی سخت ضرورت ہے۔ میری بیوی ہاسپٹل میں پڑی تڑپ رہی ہے ۔۔۔۔!"

"دو سو روپے یکمشت ......" پبلشر کا چہرہ سخت
اور کھردرا ہو گیا تھا ...... پھر بھی اس نے کہا۔ "دیکھیں
مسودہ آپ کیا لائے ہیں ؟"
"مسودہ ساتھ میں لایا نہیں ہوں اور نہ کوئی
مسودہ میرے پاس ہے۔ البتہ میں آپ سے وعدہ
کرتا ہوں کہ ایک ہفتہ کے اندر دس افسانوں پر
مشتمل ایک مسودہ آپ کو دے دوں گا۔"
"دیکھیے صاحب! تب تو بڑی مشکل ہے۔
اس کا لہجہ سخت اور جذبات سے بالکل عاری تھا
میں اس وقت دو سو روپے تو نہیں دے سکتا
البتہ پچیس تیس روپے سے کام چلے تو حاضر ہوں۔"
میرا جی تو چاہا کہ ایک زناٹے دار تھپڑ رسید
کر دوں ...... یا کم از کم اسے بہت برا بھلا کہوں
کہ جس نے ایک فن کار کو ذلیل و رسوا کیا ہے۔
مگر مجھے میری بیوی کے مسلسل کراہنے کی آواز
میری روح میں حلول کرتی محسوس ہوئی۔!
"ٹھیک ہے دیوان صاحب کم از کم پچاس
دے دیجیے۔!"
دیوان صاحب نے مسکراتے ہوئے پچاس
روپے کا ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا، "دیکھیے اپنا
وعدہ یاد رکھیے گا۔ اور جلد سے جلد مسودہ بھجوا
دیجیے گا۔"
اور پھر جب میں ہاسپٹل پہنچا تو نرس شاید
میری ہی تلاش میں تھی۔
"او، مسٹر! آپ کدھر چلا گیا تھا۔ میں کتنی
دیر سے آپ کو تلاش کر رہی ہوں۔ جائیے جلدی
سے یہ انجکشن لے کر آئیے۔" میں دوڑتا ہوا دوا
لانے چلا گیا۔

اور اب پھر زچہ خانے کے باہر بوسیدہ
اسٹول پر بیٹھا خاموشی سے آنے جانے والے چہروں
کو تک رہا ہوں۔ اب تک وہاں ایک اچھی خاصی بھیڑ
جمع ہو چکی ہے۔ جس میں کچھ عورتیں بھی ہیں مرد بھی
...... بوڑھے بھی ...... جوان بھی ...... بچے بھی ...
مگر ہر شخص کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان نمایاں
تھا ...... کچھ کے چہروں پر گھبراہٹ ... کچھ مطمئن
...... کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے ...... کچھ
لوگ اضطراب کی حالت میں ٹہل رہے تھے۔ کچھ لوگ
خاموشی سے ایک دوسرے کا منھ تک رہے تھے۔ اور
جب بھی کوئی سسٹر لیبر روم سے باہر آتی تو ہر شخص
لپک کر اس سے اپنی خوشی جھپٹ لینا چاہتا تھا ...
میں بہت دیر تک بیٹھا یہ تماشا دیکھتا رہا ...... !
یک بیک میرے ذہن میں پبلشر کا کہا جملہ گونجنے لگا
"مسودہ جلد بھجوا دیں۔ مسودہ جلد بھجوا دیں ......!"
میں نے سوچا اتنے سارے چہروں میں سے کسی
چہرہ پر افسانہ کیوں نہ تلاش کر دوں ...... میں
نے افسانے کی تلاش میں ذہن کو کسی ایک نقطہ
پر مرکوز کرنے کی کوشش کی ...... میں خود
بھی اپنی بیوی کی طرح تخلیق کے کرب میں مبتلا
ہو گیا ہوں۔ مگر مجھے تو دس افسانے بہر حال لکھنے
ہیں ..... وعدہ تو پورا کرنا ہی ہے ...... میں
سوچ رہا ہوں کہ کیا اپنے ڈاکٹر دوست کا
افسانہ لکھوں جو شادی شدہ ہے اور دو بچوں
کا باپ ہے۔ مگر پھر بھی ایک نرس مارگریٹ سے
محبت کرتا ہے اور وہ چاہتا بھی ہے کہ اس کی زندگی
پر ایک افسانہ لکھوں ---! یا پھر میں اس عورت
کو اپنا افسانہ کا موضوع بناؤں جسے بہت قریب

سے جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک اس کا شریف شوہر زندہ تھا وہ بھی بہت شریف تھی۔ پردے کی پابند تھی مگر جیسے ہی اس کے شوہر کا انتقال ہوا اس نے ایسے بال و پر نکالے کہ بس توبہ ہی بھلی۔ اس سے تو کہیں بہتر کوئی پر کٹی کبوتری ہوگی۔ حالاں کہ وہ دو جوان بیٹوں کی ماں بھی ہے۔

یا پھر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں اس پڑوسن کی کہانی لکھوں جس کا کوئی بیٹا نہیں ہے صرف ایک بیٹی ہے جو شادی شدہ ہے۔ مگر اکثر اپنے میکے ہی میں رہتی ہے۔ یہیں اس کا داماد بھی رہتا ہے حالانکہ سنتا آیا ہوں کہ اس کے سسرال والے امیر و کبیر ہیں۔ اور شریف ہیں۔ اس کے باوجود کانتی (پڑوسن کی لڑکی کا نام) سسرال نہیں جاتی۔ یا پھر اس کی ماں اسے سسرال نہیں جانے دیتی۔ نہ جانے دونوں میں کون سی بات صحیح ہے —— لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے درمیان ۱۸ گھنٹے کا ساس اور داماد میں مہابھارت کا منظر ہوتا ہے۔ جس میں کبھی کبھی کانتی بھی شریک ہوتی ہے۔ کبھی ماں کی مدافعت میں اپنے شوہر سے لڑتی ہے، گالیاں دیتی ہے —— اور کبھی شوہر کی طرف داری میں اپنی ماں سے لڑتی جھگڑتی ہے۔

...... ان تینوں کے جھگڑے میں کبھی کبھی کانتی کا باپ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جو ایک پیر کا اور کمزور و نحیف آدمی ہے۔ ان لوگوں کی لڑائی کی شروعات بڑے عجیب و غریب ڈھنگ سے ہوتی ہے..... پہل ہوتی ہے داماد اور ساس سے ..... پھر اس ڈرامے میں کانتی کا رول اجاگر ہوتا ہے —— اور پھر اس کا باپ —— مگر اس بوڑھے کے ملوث ہوتے ہی سب کے سب اسی بوڑھے پر یلغار شروع کر دیتے ہیں۔ اس طوفان بدتمیزی میں یہ تمیز کرنا بڑا مشکل ترین مرحلہ ہے کہ کون کس کو گالی دے رہا ہے...... حالانکہ وہ لوگ ذلیل سے ذلیل ترین گالیوں کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔ ڈرامہ کا "ڈراپ سین" ان لوگوں کے تھک جانے کی غمازی کرتا ہے۔

لیکن یہ بھی میرے افسانے کا موضوع نہیں بن سکتا —— تب پھر کیوں نہ میں اس شخص کی کہانی لکھوں جو اپنی سوتیلی ماں سے بات بات پہ جھگڑے کرتا ہے اور بہت ہی نالاں رہتا ہے۔ حالانکہ اس کی سوتیلی ماں اسے بہت زیادہ پیار و محبت دیتی ہے۔ اس نے اس کی پرورش کی ہے —— مگر کہلائے گی تو آخر سوتیلی ماں —— ! لیکن میں اگر اس کہانی میں اپنی ماں کی کہانی شامل کر دوں جو میری اپنی سگی ماں ہے اور میں اس کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اس طرح میری بیوی اس کی واحد بہو ہے۔ مگر میری ماں میری بیوی کے ساتھ یا خود میرے ساتھ ایسا برتاؤ جائز رکھتی ہے کہ اس شخص کی سوتیلی ماں بھی ایسا برتاؤ نہیں روا رکھتی ہوگی —— مگر میں کیا کروں کس سے کہوں۔ میں اپنا دکھ کسی سے کہنے کا عادی نہیں ہوں۔ پھر بھی جب کبھی اس کا تذکرہ کسی سے کرتا ہوں تو کوئی شخص یقین نہیں کرتا ہے کہ اپنی سگی ماں ایسا کرتی ہوگی۔ میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا یہ سچ مچ میری ماں ہے ؟ اس نے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے —— ؟ مگر تمام سوالات کے جوابات اثبات میں ہوتے ہیں اور میں دنیا کی ایسی واحد ماں پاکر خوش ہو لیتا ہوں.....

اور ......!

(بقیہ ص ۳۵ پر)

غزلیں

شاہد میر

زندگی کے چمن جواں ہوں گے
جانے اس وقت ہم کہاں ہوں گے
لب پہ آئیں گی پے بہ پے چیخیں
یوں سبھی اب لوگ نغمہ خواں ہوں گے
شاخِ سرسبز ہوگیا ہے وہ
وار اب اُسی پہ ناگہاں ہوں گے
ہوگئے نقشِ بے نشاں جو لوگ
وہ مرے عہد کا نشاں ہوں گے
خامشی کا طلسم ٹوٹے گا
جب پرندے خبر رساں ہوں گے

سب کو جو بے مثال لگتے ہیں
لوگ وہ خال خال لگتے ہیں
جو تیری قربتوں میں گذرے تھے
اب وہ لمحے وبال لگتے ہیں
ایک غنچہ جو مسکراتا ہے
قہقہے ڈال ڈال لگتے ہیں
عہدِ غم میں سبھی مسکراتے ہیں
جینے والے کمال لگتے ہیں
جب سے وہ ملتفت ہوا شاہد
مختصر ماہ و سال لگتے ہیں



بے بی ناز موتی پوری

روشن اُمّیدیں

ہر شام سورج کی آخری کرنیں سامنے حویلی کی محرابوں پر دم توڑتی ہیں تو محرابوں کی کھوئی ہوئی بے رونق رنگت بہ حسرت اپنا جائزہ لے لیتی ہے۔ ماضی کی کوئی شناخت باقی نہیں۔ دیوار و در اور محرابوں پر گذرے ہوئے لمحوں کی سیاہی مائل کائی نے اصل رنگ بھی چھین لیا ہے۔ سامنے والی چہار دیواری کے اینٹ علیحدگی اختیار کرنے کی صورت میں کہیں کہیں سے بالکل ہٹ گئے ہیں۔ اونچی دیواروں پر جگہ جگہ اینٹوں کا خالی پن آنکھوں کے دائرے جیسی شکل میں تبدیل ہو کر ہر لمحہ حویلی کی شان و شوکت جاہ و حشمت کا چشم دید گواہ ہے۔

ایسے مناظر میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ اپنے دل کی کیفیات چھپاتے ہوئے سائبان میں آنے کے لئے سیڑھیاں طے کرتی ہوں۔ سائبان میں آکر پھر آنگن میں نظر ڈالتی ہوں۔ مکمل سکوت۔ باورچی خانہ سے افروزہ کے گنگنانے کی صدائیں آتی ہیں بس! کہیں کسی شئے میں زندگی نہیں۔ مستقل سکوت مرگ حویلی کا نصیب بن چکا ہے شاید۔ کتب بینی میں مستغرق مراد نے پلٹ کر دیکھتے ہی پوچھ لیا۔

"کچھ ہوا کیا؟"

"جی نہیں..."

"چہرہ کیوں فق ہو رہا ہے؟"

"نہیں تو....."

"تم ہر بات مجھ سے پوشیدہ رکھتی ہو۔ ہاں۔ میں اس قابل ہی ہوں۔"

مراد نے دوسری جانب چہرہ گھما لیا ہے اور میں ان کے اناڑی پن پر اندر اندر ہی کھولتی ہوں۔ بے انتہا کوششوں کے باوجود دلی تاثرات عیاں تھے۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس یونہی ذرا طبیعت خراب ہو گئی۔ آپ آخر سمجھتے کیوں نہیں۔ میرا یہ کون سا پیر ہٹ ہے۔"

"مراد کی انگلیاں میرے بالوں سے کھیلنے لگی ہیں اور میری نیم وا آنکھیں چھت کے اس سوراخ پر ساکت ہو کر رہ گئی ہیں جس میں گوریا دن بھر کی تھکن کے بعد شب گذاری کے لئے آگئی ہے۔ گوریا کی پھڑ پھڑاہٹ نے ذہن کے قفل پر ہلکی جنبش دی۔ تو ذہن کے بند دروازے یکایک کھل گئے اور ایک مختصر عمر کا وہ خوبصورت لمحہ آئینہ دکھا کر غائب ہوتا رہا۔ مئی جون کی تمازت سے بچنے کے لئے جب سب لوگ یو بب والے گھاس کے بنگلے میں چلے جاتے تب کھپریل والے گھر میں گوریا پکڑنے کی عمر بھی کتنی سادہ لوح اور بے فکر تھی اس گھر میں مٹی کی بڑی بڑی ہانڈیوں میں چاول دال رکھے

جاتے تھے جس سے گوریا کی خوراک پوری ہوتی تھی۔ میں اور سکینہ ہمیشہ گوریا پکڑنے کی فکر میں سبھی دروازے کھڑکیاں بند کر ایک کھڑکی کے پٹ کھول کر پٹوں کے پیچھے چھپ جاتے اس گھر کی گوریا میں بڑی ہوشیار ہو چلی تھیں چیں چیں کرتی کھڑکی کی سلاخوں پر آکر پلٹ جاتی تھیں۔ میں اور سکینہ ایک دوسرے کو خموش رہنے کی تاکید کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس گوریا کو خود کرا دیتے تھے لیکن ناکامی کے بعد ایک دوسرے کو الزام دیتے دیتے تکرار کر لیتے تھے۔ پھر صلح ہو جاتی۔

گوریا پکڑنے میں تمام عمر میں اتفاق سے ایک یا دو بار ہی کامیابی ملی تھی۔ کامیابی جب جب ملی جسم پر اچھی خاصی خراشیں آئیں تھی گوریا کھپریل کی چھت کے سوراخ کی روشنیوں پر پھدکتی ہم دونوں ساتھ پھدکتے۔ گوریا ہاتھوں میں ... آتے ہی ایک شور کیساتھ باہر آتے۔ اسی وقت سکینہ کی نیت کا خلل اس کے چہرے سے صاف نمایاں ہوتا تھا۔ جسے میں نے کبھی پورا نہ ہونے دیا۔ سکینہ اصرار کرتی۔ چلو شبو بابو کے پاس انہیں سے حلال کرائیں گے۔ نہیں تو یہ بھاگ جائے گی۔ میری ضد ہوتی۔ نہیں۔ پہلے اسے سرخ رنگ میں رنگ دیں گے۔ پھر جب امی جاگ جائیں گی اور وہ جو کہیں گی وہی ہوگا۔ سکینہ مشکل سے ہی اس پر رضامند ہوتی تھی۔ پروگرام طے پاتے ہی دبے قدموں ابو کی سرخ روشنائی کی ڈبیا اٹھا لاتی۔ تمام روشنائی پیالے میں انڈیل کر گوریا کو خوب اچھی طرح غسل دیتی پھر ٹوکری کے نیچے رکھ کر دھوپ میں ڈال دیتی ___ ہر منٹ پر الٹ کر دیکھتے کہ رنگ چڑھا کہ نہیں۔ جب تک گوریا کے پیروں میں نمی باقی رہتی وہ دبلی پتلی شاخ کی طرح ڈولتی رہتی۔ الٹتے پلٹتے اس کے پیروں کی نمی ختم ہوتی اور وہ آن واحد میں پرواز کر جاتی۔ اس وقت سکینہ کی اچھی خاصی صورت پر نحوست کا غلاف

چڑھ جاتا۔ پھر کبھی ساتھ نہ دینے کی دھمکی دے کر سونے چلی جاتی تھی۔ اس وقت میرے لئے گوریا کی جان بخشی مسرت بن جاتی تھی۔

گوریا کی پھڑپھڑاہٹ سے چھت کے چند سنگریزے میرے پیروں پر گرے ہیں۔ یہ سنگریزے میرے پیروں پر نہیں، اس آئینہ پر گرے ہیں جو حقیقت نہیں۔ حقیقت یہی ہے جو سامنے ہے۔ ہم اس سے دل برداشتہ کیوں ہوں؟ تسلی بخش جواب نہ پا کر مراد کو مخاطب کیا۔

"اب اٹھو بھی۔ زوال کے وقت بستر پکڑنا نیک فعل نہیں۔"

اپنے کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے آنگن میں جانے کے لئے مڑی ہوں۔ مراد بھی بستر چھوڑ چکے ہیں۔ جبھی اباکی سخت آواز حویلی کی خموشی میں چیخ بن کر ابھری وہ اپنے تحکمانہ انداز تخاطب سے نیم جاں حویلی میں حرکت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے واپس باہر جا رہے ہیں۔

اماں بی اپنی نصف سے زائد کم بینائی کے باوجود ابا کو قہر بھری نظروں سے دیکھتی ہیں۔ اور بے دریغ انہیں مغلظات سے نوازتی ہیں۔ مراد بھی چاہتے ہیں میں نے بھی کتنی بار چاہا کہ اماں بی کو اس عادت سے باز رکھ سکوں مگر باز کیا رکھتی اپنے اندر اتنی جرأت بھی پیدا نہ کر سکی۔ کہ انہیں ہلکا سا اشارہ ہی کر دوں۔ اماں بی کے گرد مسلط ماحول کا تقاضہ میں کیسے فراموش کر جاؤں جو ہر آن وحشتناک صورت میں پھنکار مجھے متوجہ کرتا ہے اور میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر اماں بی کا اتنا بھی حق ہے تو میں انھیں کیسے روکوں؟'

جب تک اماں بی کے قریب جاتی وہ اپنی پناہ گاہ میں جا چکی تھیں۔ مدھم روشنی میں وہ اپنی پوٹلی سرہانے میں محفوظ کرتے ہوئے میری موجودگی کا احساس کرتے ہی پوچھ

بیٹھیں۔

"مراد کہاں گیا، چائے نہیں پی؟"

"ہائے خدا سمجھے ایسے خبیث باپ کو، اس کی برائیوں کے پھل قبر میں ملیں ـــــ!!"

"اماں بی.. چپ بھی رہیئے، ہم لوگ اب چائے پئیں گے ـــــ"

ایسے موقعوں پر اماں بی اپنی بینائی کی طرح اپنی سماعت میں شاید نصف ہو جاتی تھیں جبھی تو میری گذارش کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا ہمیشہ کی طرح اور بھی تیز ہو گئیں، جبھی مراد نے آواز دی ـــــ "اماں بی ٹھیک تو ہیں...؟"

غیر ارادی مسکراہٹ میرے لبوں کو شگفتہ کر گئی۔

"بڑی شگفتہ نظر آ رہی ہو۔"

"سچ....؟"

"اماں بی نے کچھ کہا کیا؟"

ان کے کچھ کہنے کا وقت مقرر تو نہیں۔" مراد یکایک بے حد سنجیدہ ہو گئے۔

احساسِ ندامت سے شرمسار ہوتے ہوئے میری زبان سے یکلخت نکل گیا "میری ہنسی تمہیں اداس کر جاتی ہے۔ حویلی کی کہنہ روایات کے اب تنہا نگہبان تم ہی تو ہو۔ یہاں ہنسنا جرم ہے۔"

مراد نے پلٹ کر ایسی بے بس نظروں سے مجھے دیکھا کہ میرے اندر کہیں کوئی سوتا پھوٹ کر میرے وجود کو سرد کر گیا ہے۔

"تمہیں بہت پچھتاوا ہوا ہے آفریں ـــــ سراب کے پیچھے دوڑنا حماقت ہی تھی تمہاری۔ ہاں میں بھی تم سے...!"

"مراد چپ بھی رہیئے ـــــ" یہ کہتے ہوئے میں نے ان کے شانوں کو زور سے دبا دیا ہے۔ مراد کی آنکھوں میں بے اختیار پھیلے ہوئے سفید جالے ان کی بے بسی کے آئینہ دار تھے۔ بے بس و مجبور مراد کے لیئے کامیابی کے تمام دروازے مقفل ہو گئے ہیں، کتنا عظیم ہے یہ شخص، کتنا معصوم، لیکن مظلوم....

مجبور اور بوڑھی ماں کی تنہا محبت نے نیم جاں حویلی سے جُدا نہ ہونے دیا۔ باپ کے شب و روز بالا خانوں کے چکر کاٹنے کی عادت نے حویلی کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا تھا۔

مراد میری خاموشی سے اکتا کر پوچھ بیٹھے ہیں "آج کون سی تاریخ ہے۔ چاند تا حیر سے اوپر آ رہا ہے۔"

"پندرہ سولہ ہوگی۔"

نظریں آسمان سے اتر کر سامنے والی چہار دیواری پر ساکت ہو گئیں۔ چاند کی پھیکی روشنی خستہ دیواروں کو اور بھیانک بنا رہی تھی۔

دھندلے محراب میں ہے خوابیدہ۔
داستاں، میری زندگانی کی
اپنے دربار میں چراغ جلا
یہ لحد ہے مری جوانی کی

مراد میری سوچوں سے بے نیاز بولے جا رہے تھے "آفریں یہ سامنے کی دیواریں بے حد خستہ ہو گئیں ہیں اب ہم لوگ اسے توڑ کر دوسری نئی دیوار تعمیر کرائیں گے، آنگن بھی چھوٹا رکھیں گے۔"

"ہاں! اتنا بڑا آنگن ٹھیک نہیں۔" کہتے ہوئے میں نے دیر سے چکر کاٹتے ہوئے جگنو کو پکڑ کر مراد کو پکڑا دیا۔ اس نے جگنو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "دیکھو کتنی روشنی ہے!"

جی چاہا کہہ دوں تمہارے دل میں روشن امیدوں سے زیادہ تو نہیں۔ لیکن نہ کہہ سکی۔ میرے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ مراد جگنو کی پھیلتی روشنی کو دیکھ رہے تھے ـــــ!!

غزلیں



ڈاکٹر رانا گنوری

ڈوبنا آنکھوں میں ہے تیراک ہونے کی دلیل
دل جگر کا خوں، گریباں چاک ہونے کی دلیل

اُن کا ہر اچھا برا فرمان ہے سب کو قبول
یہ ہے سب کے دل پر اُن کی دھاک ہونے کی دلیل

ڈھیر پر بارود کے یوں بیٹھنا تن کر ترا
آپ اپنی آگ میں ہے خاک ہونے کی دلیل

وقت کا ایک ایک تیور دے رہا ہے ان دنوں
صورتِ حالات، عبرت ناک ہونے کی دلیل

تیرا اندازِ تکلم ہی تو ہے رانا ترے
صاف گو شفاف دل، بیباک ہونے کی دلیل

لوگ بھی ہو گئے ہیں کتنے تیز
گرڑ نہیں گلگلوں سے ہے پرہیز

آدمی بڑھ گیا درندوں سے
ہو گیا یعنی اتنا ہیبت خیز

حق چبانے کو دوسروں کا وہ
اپنے دانتوں کو کر رہا ہے تیز

ہم کو انگریزیت تو پیاری ہے
کیا ہوا اگر چلا گیا انگریز

جس علاقے[1] سے میں ہوں اے رانا
وہ علاقہ رہا ہے شاعر خیز

[1] تحصیل علی پور۔ ضلع مظفر گڑھ (پاکستان)

ادیب اختر

آبِ حیات

ابھرتا ہوا سورج، ببول کی سوکھی ٹہنیوں میں الجھ گیا تھا، اس کی سنہری کرنیں، بارش نہ ہونے کے کارن دراڑیں پڑے کھیتوں میں آہستہ آہستہ پھیل رہی تھیں۔

ان دِنوں تو کھیتوں میں لہلہاتی گنگناتی فصل کو ہونا چاہیے تھا۔

لاٹھی کے سہارے کھیتوں کے درمیانی راستے سے ہوکر، اپنے کھیت کی جانب بڑھتے ہوئے آباجی کے قدم لمحہ بھر کے لیے رک گئے۔ پیشانی کے پاس ہاتھ لے جاکر اس نے دور تک دیکھا۔ اس کے آگے کوئی پُر امید ماحول نہیں تھا۔ اپنے ذہن میں اٹھتے ہوئے ان گنت خیالات پر، ویران پڑے کھیتوں کو دیکھ کر تن بدن میں لگی آگ پر قابو پاتے ہوئے وہ اپنے کھیت کی جانب بڑھ گیا۔

اپنے کھیت کے وسط میں کھُدتے ہوئے کنویں کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا، اس کے دونوں جوان بیٹے کنواں کھودنے میں مصروف تھے۔ اس نے ذرا ایڑیاں اٹھا کر اپنا سارا بوجھ لاٹھی پر ڈال کر کنویں میں نظر دوڑائی اس کی آنکھوں میں جو اداسی تھی اس میں اضافہ ہوگیا۔

کنواں اب بھی سوکھا تھا۔

کنویں میں پانی نہیں آیا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ یا اس سے زیادہ عرصے سے اس کے دونوں بیٹے کنواں کھود کر پانی نکالنے کا مصمم ارادہ کیے کنواں کھودنے میں لگے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے کی سخت جانفشانی کے باوجود کبھی پانی کے درشن نہ ہونے کے سبب ان کے بازو تو تھک گئے تھے مگر انھوں نے مایوسی کو اپنے دل میں جگہ دینے کی بات تو کیا اپنے اوپر سایہ بھی ڈالنے دیا نہ تھا۔ پانی نکالنے کی خواہش میں انھوں نے اپنا سکھ گنوا دیا تھا، ٹھیک وقت پر کھاتے تھے، نہ لمحہ بھر کے لیے چین کی سانس لیتے تھے۔ ہر دن منہ اندھیرے، ناشتے سے فارغ ہوکر، کھیت پر آکر وہ کنواں کھودنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

معمول کے مطابق آباجی نے کنویں میں جھانکتے ہوئے کہا: "کھودو... کھودو... کل پرسوں تک پانی آجائے گا۔"

اتنا کہتے ہوئے اس نے کوشش تو یہی کی تھی کہ اس کا لہجہ ہمت افزا ہو مگر اُسے ہی لہجے سے ظاہر ہوتے ہوئے کھوکھلے پن کو محسوس کرکے متعجب ہونا پڑا۔

مایوسی کے دائرے میں وہ قید ہوگیا تھا، مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بیٹے بھی اس دائرہ میں قید ہوجائیں۔ وہ اس بات کا متمنی تھا کہ اس کے بیٹے ہمت نہ ہاریں اسی لیے ہر

وقت اپنے بیٹوں کی ہمت افزائی کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔

ڈیڑھ مہینے پہلے آپاجی ہی نے اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر کنواں کھودنے کی ابتدا کی تھی، بارش نہ ہونے کی وجہ سے جب فصل سوکھنے لگی تو اس نے کنواں کھودنے کا فیصلہ کیا تھا، اس کا منصوبہ تو کنویں کے پانی سے کھیت کی سینچائی کر کے فصل اُگانے کا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اس سے ایک نئی راہ پر چلنا سیکھیں۔ اپنی بات اس نے اپنے بیٹوں کو اتنے اچھے ڈھنگ سے سمجھائی تھی کہ اس کے بیٹے اس سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی اُس کے ہم خیال ہو گئے تھے۔

کنویں کا کام ابھی تھوڑا ہی ہوا تھا کہ آپاجی کو بیماری نے آدبوچا تھا، اس کے بعد اس کے بیٹوں پر جو ذمہ داریاں تھیں اُن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کنویں پر کام کرنے، بیمار باپ کی تیمارداری کرنے کے علاوہ وہ خود ہی کھانا پکاتے تھے۔ ان کی ماں کا دو سال پہلے دیہانت ہو گیا تھا۔

بیماری کے بعد کنویں پر کام کرنا، آپاجی کے بس کی بات نہیں تھی، تھوڑی دور پیدل چل کر ہی وہ ہانپنے لگتا تھا۔ کافی صحت یابی کے بعد کھانا بنانے کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی تھی۔

اس کی کمزوری کی ایک وجہ تو بیماری تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ اُسے پیٹ بھر کھانا ملتا نہ تھا۔ بلکہ وہ خود کھاتا نہ تھا، چونکہ اب گھر میں اناج آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا تھا، آپاجی اس بات کا متمنی تھا کہ کنویں کا کام پورا ہونے سے پہلے اناج ختم نہ ہو جائے اس لیے وہ کم کھاتا تھا بلکہ بھوکا رہتا تھا۔

کھیت سے گاؤں لوٹتے ہوئے اس نے اپنے اوپر انتہائی مایوسی کی کیفیت طاری کر لی تھی۔

شام ڈھلے کھیت سے آ کر دونوں بیٹوں نے انتہائی لاپرواہی کے ساتھ پھاوڑا اور کدال کو گھر کے ایک کونے میں پھینکتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ۔۔ کل سے وہ کنویں پر کام کرنے کی بجائے شہر جا کر کوئی نہ کوئی کام کر کے کچھ نہ کچھ کمائیں گے۔

انہوں نے اپنے ارادے کو اتنے مضبوط لہجے میں ظاہر کر دیا تھا کہ آپاجی کی سمجھ میں بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ ان کی ڈھارس کیسے بندھائے۔

بحث تو ان کے بیچ کافی لمبی ہوئی، لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔

آدھی رات کو اچانک آپاجی کے بڑے بیٹے سوامی کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے باپ کو دیوار سے ٹیک لگائے، آنسو بہاتے ہوئے دیکھا۔

"تم ابھی سوئے نہیں" سوامی نے پوچھا۔ مگر اُس نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے بس اتنا ہی کہا۔

"کچھ اور دانے دیکھ لو، اگر پانی نہیں آیا تو، اپنی مرضی سے جو چاہے کرنا، میں روکوں گا نہیں۔"

سوامی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے گا۔

صبح ہوئی، دونوں بیٹوں کو ناشتے سے فارغ ہو کر پھاوڑا کدال وغیرہ لیے کھیت کی جانب جاتے ہوئے دیکھ کر آپاجی کے لیے اپنی آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسوؤں کو روکنا محال ہو گیا۔

اُسی دن دوپہر کو جب آپاجی دونوں بیٹوں کا کھانا لے جانے کی تیاری کر رہا تھا، اسی اثنا میں اس کی نظر سوامی پر پڑی جو اپنے مضبوط بازوؤں میں چھوٹے بھائی کو سمیٹے آ رہا تھا۔ سوامی کے پیچھے کچھ لوگ سر جھکائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔

یہ منظر کچھ اور قریب آیا تو، شیام کی لاش کو دیکھ کر آپاجی منہ سے چیخ نکل گئی۔

شیام، کنویں میں سے اوپر چڑھتے وقت پاؤں پھسلنے سے نیچے گر پڑا تھا، اور نیچے گرتے ہی کدال سے زخمی ہو کر وہیں دم توڑ گیا تھا۔

شیام کی موت کے کوئی مہینہ بھر بعد بھی کنویں میں پانی نہیں آیا تھا۔ سوامی، اکیلے ہی کنویں پر کام کرنے جاتا تھا۔ ایک دن وہ کنویں میں کھودی ہوئی مٹی پھاوڑے سے اٹھا رہا تھا کہ کسی نے اسے اوپر آواز دی۔ سوامی نے کنویں کی تہہ میں سے نظریں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر اس کا پڑوسی کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے؟" سوامی نے پوچھا۔

"اوپر آؤ..." اس کے پڑوسی نے کہا۔

سوامی کے سہارے اوپر آیا تو، پڑوسی نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "تیرے باپ کا دیہانت ہو گیا!"

اپاجی چند دنوں سے بیمار تھا۔

اپاجی کی موت کے بعد لوگوں نے سوچا تو یہی تھا کہ اب کنویں کے کام میں دلچسپی نہیں لے گا۔ مگر باپ کی موت کے بعد سوامی نے کنویں کے کام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔

ایک دن سوامی کے تعجب کی انتہا نہیں رہی، اناج ختم ہو گیا تھا، گھر کا چپہ چپہ ڈھونڈنے کے باوجود بھی اُسے مٹھی بھر اناج ہاتھ نہیں لگا۔ اُس دن وہ کچھ کھائے پیئے بنا ہی کھیت کی جانب روانہ ہو گیا۔

کل ہی سے اُسے مقصد میں کامیابی نظر آنے لگی تھی، کیونکہ کنویں میں اب مٹی سخت نہیں بلکہ کسی حد تک نرم اور گیلی ملنے لگی تھی۔ جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ پانی کے کسی بھی لمحے درشن ہو سکتے تھے۔

شام ڈھلنے تک وہ کنواں کھودنے کے کام میں مگن رہا، اُس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی، پانی کسی بھی لمحے زمین سے اُبل سکتا تھا۔ اس نے کوشش تو یہی کی تھی کہ کنواں کھودنے کا کام آج ہی ختم ہو جائے مگر بھوک اُسے سخت ستانے لگی تو وہ رسّی کو اپنے کمزور ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر آیا۔ کنویں سے باہر آنے کے بعد اُس کا سر چکرانے لگا۔ ویران کھیت اُس کی آنکھوں میں گھومنے لگے۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی انتہائی کوشش کی، مگر قابو نہ پا سکا۔ چکراتے ہوئے کنویں سے کچھ دوری پر کنویں سے نکال کر ڈالی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر گر پڑا۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں آسمان پر پھیل گئی تھیں، آسمان پر پھیلے ہوئے ابر کے ٹکڑے، سمندر کی لہروں کی طرح مچل رہے تھے۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔

گاؤں کی گلیوں میں ابھی سنہری کرنوں کے جال نہیں بچھے تھے کہ اپاجی کے کھیت کے ساتھ والے کھیت کا مالک وِشوا، گلیوں میں جو بھی نظر آتا، اُسے جلدی جلدی یہ بتا رہا تھا کہ ابھی ابھی وہ اپنے کھیت میں گیا تھا — جہاں اُس نے سوامی کو مردہ حالت میں دیکھا ہے۔ اس کی بات پر اعتبار نہ ہونے کے باوجود بھی کچھ لوگ لمبے لمبے قدم اُٹھاتے ہوئے اپاجی کے کھیت کی طرف گئے۔

سوامی کی لاش کے پاس گاؤں کے کچھ لوگ کھڑے افسوس کر رہے تھے اور باری باری جا کر کنویں میں جھانک کر دیکھ رہے تھے، جس میں گھٹنوں اتنا پانی، آسمان پر پھیلی ہوئی سرخ کرنوں کے عکس کے سبب سُرخ ہو گیا تھا۔

اپاجی کے کنبے کا خون!

بقیہ تخلیق کا کرب صفحہ ۲ سے آگے

"اے مسٹر..... مٹھائی کھلاؤ..... تمھیں لڑکا مبارک — اور تمھاری وائف (بیوی) کو وارڈ نمبر ۲ (ایل) میں بیڈ نمبر ۴ پر پہنچا دیا گیا ہے۔"

"تھینکس سسٹر۔ تھینک یو۔" اور میں بڑی تیزی سے وارڈ کی طرف دوڑ پڑتا ہوں۔ ●

قاری محمد اسحاق حافظ سہارنپوری

قطعات

○

محبت میں ہزاروں مرحلے ایسے بھی آئے ہیں
جہاں ہمت نے دم توڑا وفا نے زخم کھائے ہیں
مگر دشواریٔ راہِ محبت ہو گئی آساں
زبانِ شوق پر ہم جب بھی اُن کا نام لائے ہیں

○

محبت دو دلوں میں ایک محشر سا اُٹھاتی ہے
رُلاتی ہے اُنھیں بھی یہ، اگر ہم کو رُلاتی ہے
کوئی کچھ بھی کہے لیکن، حقیقت یہ ہے اے حافظؔ
محبت ہو اگر صادق، اثر اپنا دکھاتی ہے

○

محرومیوں نے کر دیا ہے کامیابِ عشق
میری حیات صبر کا انعام پا گئی
ہر وقت وِرد کرتا ہوں اللہ کے نام کا
حافظؔ جفائے دوست مرے کام آ گئی

موہن ایچلپوری

رُباعیات

○

کیوں آپ کی نظروں سے حیا رُوٹھ گئی
آنکھوں سے محبت کی ادا رُوٹھ گئی
آپ اور سے کیوں اور ہوئے ہو یارو
تقدیر اگر ہم سے ذرا روٹھ گئی

○

بے کار ہے ہر فکر، غلط ڈر تیرا
کیا کوئی بگاڑے گا بگڑ کر تیرا
بدلی ہیں زمانے نے نگاہیں تو کیا
ہے رزق تو موقوف خدا پر تیرا

○

یہ مہر و وفا اور محبت کیا ہے
اے دوست ہمیں پوچھ یہ دولت کیا ہے
مل جائے اگر جان بھی دے کر لے لے
ہے پیار اگر پیار تو قیمت کیا ہے

عمیر عثمانی

بھول

علی الصبح بھکاری کی دستک کی صدا سے میری آنکھ کھل گئی۔ لحاف سے باہر سر نکالا تو سردی کی تیز لہر جسم کے اندر سے گرمی کا رس نچوڑتی ہوئی پرواز کر گئی۔

"یہ بھکاری نہ خود چین سے رہتے ہیں، نہ دوسروں کو چین کی نیند سونے دیتے ہیں۔" امّی کو محوِ تلاوت دیکھ کر میں نے دوبارہ لحاف اوڑھ لیا۔

"بیٹا تیری یہ عادت کب چھوٹے گی۔ بھکاری بھی ہماری ہی طرح انسان ہیں۔ صبح سویرے اللہ کا نام لینا تو درکنار اپنی زبان گندی کر رہے ہو!" امی ناگواری سے اٹھتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

بھکاری اپنے سوال کا جواب پا کر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ اس کی نحیف آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "خدا سلامت رکھے بی بی جی۔ اولاد کا سکھ نصیب ہو۔"

قدرت شاید تمام رات برف کی صورت برستی رہی تھی۔ اس لیے دس بارہ سیاہ گھنٹوں میں سردی میں اتنی شدّت آ گئی تھی کہ ہر چیز منجمد ہو چلی تھی۔ سردی کی شدّت کا اندازہ مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہو چکا تھا۔ دفتر جانے کی مجبوری نے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کی میز پر آیا تو امّی کو اپنا منتظر پایا۔

"نواز بیٹا کسی فقیر کو مایوس نہیں کرنا چاہیے۔ کیا پتہ اللہ ان ہی کے صدقے رزق دیتا ہو۔" چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے انھوں نے پرانی نصیحتیں دہرائیں۔

"اوہ امّی! تم کب سمجھو گی! یہ بھکاری ہیں نا — ہم سب کو بیوقوف بناتے ہیں۔ ان کے پاس ہم لوگوں سے زیادہ پیسہ ہوتا ہے۔ لیکن ہاتھ پھیلانے کی خاندانی عادت ہوتی ہے۔ وہ بڑھیا جو روز تم سے کچھ نہ کچھ اینٹھ لے جاتی تھی، مری تو اس کی جھونپڑی سے بیس ہزار روپے ملے۔" میں نے پیالی اپنی طرف سرکائی کیتلی سے نکلتے نکلتے ہی چائے کی گرمی کم ہو گئی تھی۔

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ یہ بابا مجھے بہت نیک معلوم ہوتے ہیں۔ کتنا نور تھا ان کے چہرے پر۔ بیچارے چائے بھی نہیں پی کر گئے۔" میں امّی کو کیا جواب دیتا۔ یہ تو ان کی عادت تھی۔ ایک میری ماں ہی تو ہے جس کی بھولی بھالی باتیں مجھے بہت بھلی لگتی ہیں۔ امّی ناراض ہو جاتی ہیں تو میں ان کی گود میں سر رکھ کر انھیں منا لیتا ہوں۔ اس وقت ممتا کی آغوش کے مقابلے میں یہ دنیا کتنی چھوٹی اور حقیر ہو جاتی ہے۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر میں دفتر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ دروازے سے باہر قدم رکھا تو جانا کہ برفباری

کتنی زیادہ ہوئی تھی۔ ماحول نے سفید چادر اوڑھ لی تھی۔ دور دور تک سفیدی ہی سفیدی۔ خاموش پرسکون ماحول۔ چنار کی ٹہنیاں نرم برف کو چومتے چومتے تھک کر تھوڑی جھک گئی تھیں۔ میں قدرت کے کتنے قریب تھا۔ بالکل قریب۔ جیسے جسم سے روح قریب ہوتی ہے۔ قدرت کے اس عطیہ کا شکر ادا کرتا ہوا میں دفتر کی طرف چل نکلا۔

اس بوڑھے کا معمول بن گیا تھا۔ صبح سویرے آتا اور کچھ نہ کچھ سمیٹ لے جاتا۔ اس دن بھی وہ صبح صبح آیا تھا۔ "بی بی جی ہو سکے تو کوئی کمبل دے دو۔ اس چادر میں گذارا نہیں ہوتا۔" میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ امّی کو کمرے میں نہ دیکھ کر میں دروازے کی طرف بڑھا اور بوڑھے کو دھکیلتا سا چیخا۔

"شرم آنی چاہیے تجھے۔ اب تک تو چائے اور پیسے تک ہی بات تھی، آج کمبل کی فرمائش بھی ہونے لگی۔ چل دور ہو جا۔ آئندہ ادھر کا رخ مت کرنا۔"

سردی کی وجہ سے میرے ہاتھ پیر شل سے ہو گئے تھے۔ میں جلدی سے لحاف میں گھس گیا۔

تمام دن برفباری ہوتی رہی۔ شام ڈھلے بارش بھی شروع ہو گئی۔ اگلی صبح موسم صاف تھا۔ میں خوش تھا کہ آج بھکاری نہیں آیا۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا دفتر جانے کے لیے میں گھر سے نکلا۔ لان میں وہ بوڑھا برف کا سفید کمبل اوڑھے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ سردی سے تڑپ تڑپ کر اس نے اپنے "محسن" کے مکان کے سامنے جان دے دی تھی۔ اور میں زمین کے اندر گڑھتا چلا گیا۔

اب وہ کبھی نہیں آئے گا کہ مجھے زمین کے اندر سے نکال سکے۔

سراج انور مصطفیٰ آبادی

غزلیں

نیلے سمندروں سے گھٹائیں سمیٹ لیں
سوکھی زمیں کی اس نے دعائیں سمیٹ لیں
سورج نے ہم پہ ڈال دیں ساری تمازتیں
پھر یہ غضب ہوا کہ ہوائیں سمیٹ لیں
ہمراز بن سکا نہ کوئی بے قصور کا !
چپ چاپ اس نے ساری سزائیں سمیٹ لیں
انور ہر اک درخت یہ پوچھے گا دھوپ سے
کیوں سبز پتیوں کی قبائیں سمیٹ لیں

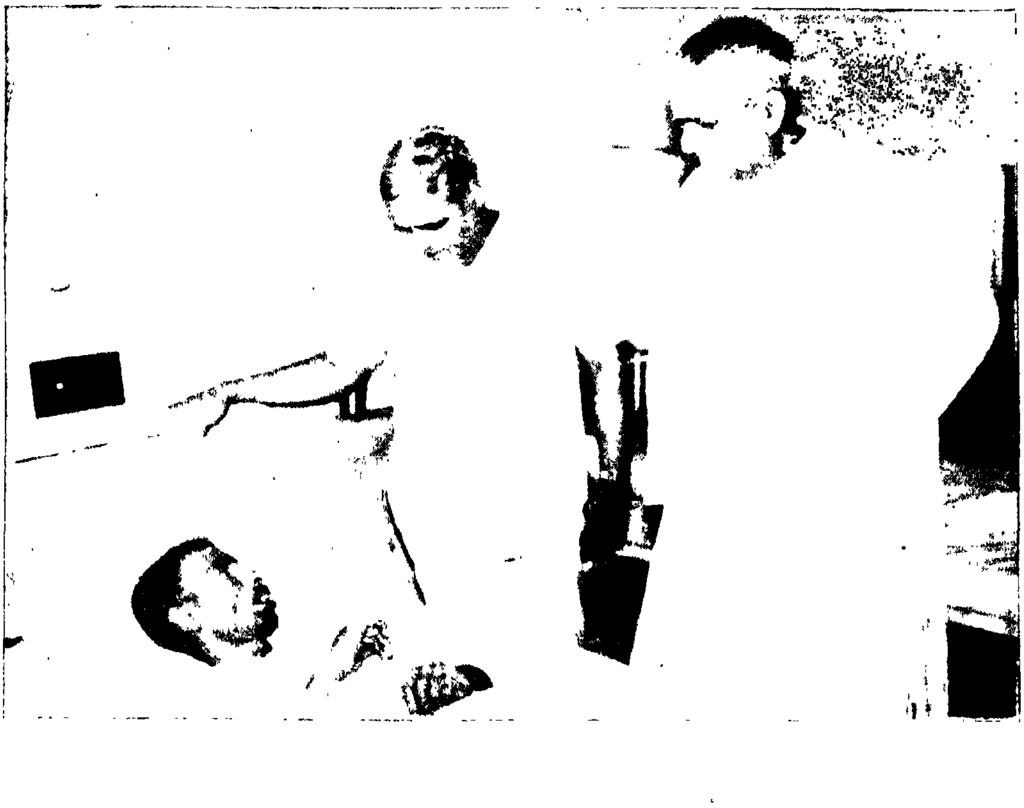
○

افلاک پہ کیا شمس و قمر کاٹ رہے ہیں
ہم خاک پہ صدیوں کا سفر کاٹ رہے ہیں
کردار ابھی زندہ ہیں کچھ کرب و بلا کے
اس دور میں سچائی کا سر کاٹ رہے ہیں
ہم سینچتے آئے ہیں اسے خونِ جگر سے
کچھ لوگ مگر فصلِ ہنر کاٹ رہے ہیں
اِک روز کہیں ہم پہ زمیں تنگ نہ ہو جائے
بستی کے لیے ہم جو شجر کاٹ رہے ہیں

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ارجن داس ملک نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ ایس۔سی۔او نمبر ۱۹۱ - ۱۸۹ سیکٹر ۱۷-سی چنڈی گڑھ سے جولائی ۱۹۸۸ء کے لیے شائع کیا۔ طابع : کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یوٹی۔ چنڈی گڑھ



کورو کشیتر بم دھماکہ (۱۹ر جون ۱۹۸۸ء) کے زخمیوں کی لوک نائک جے پرکاش نارائن ہسپتال، کورو کشیتر میں عیادت کرتے ہوئے (اوپر) گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند بیاری اور (نیچے) وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب چودھری دیوی لال۔

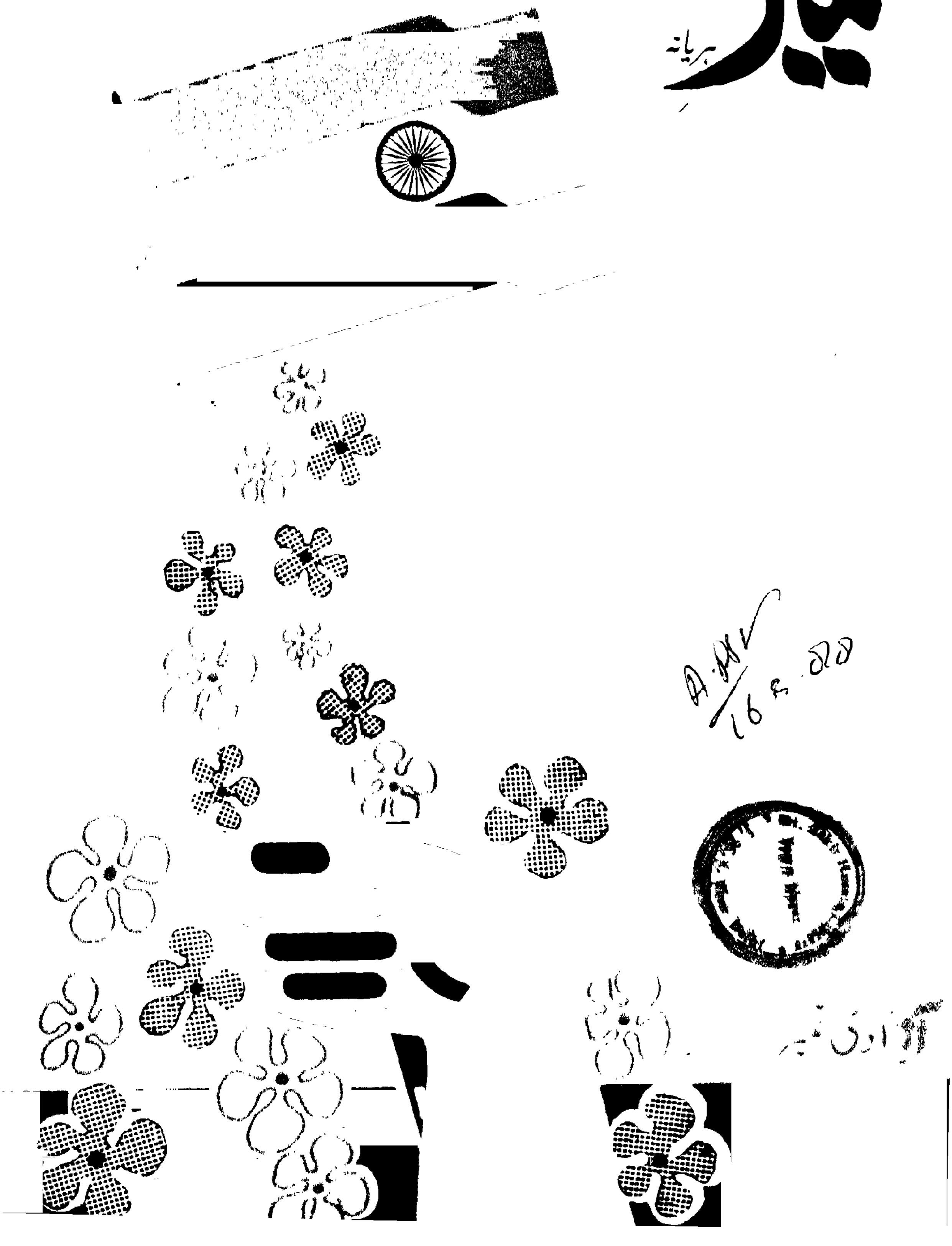




وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۱۹ جون ۱۹۸۸ء کو چنڈی گڑھ میں ایک پریس کانفرنس میں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے حالیہ ضمنی انتخابات کے نتائج سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے۔

تعمیر ہریانہ

اگست ۱۹۸۸ء

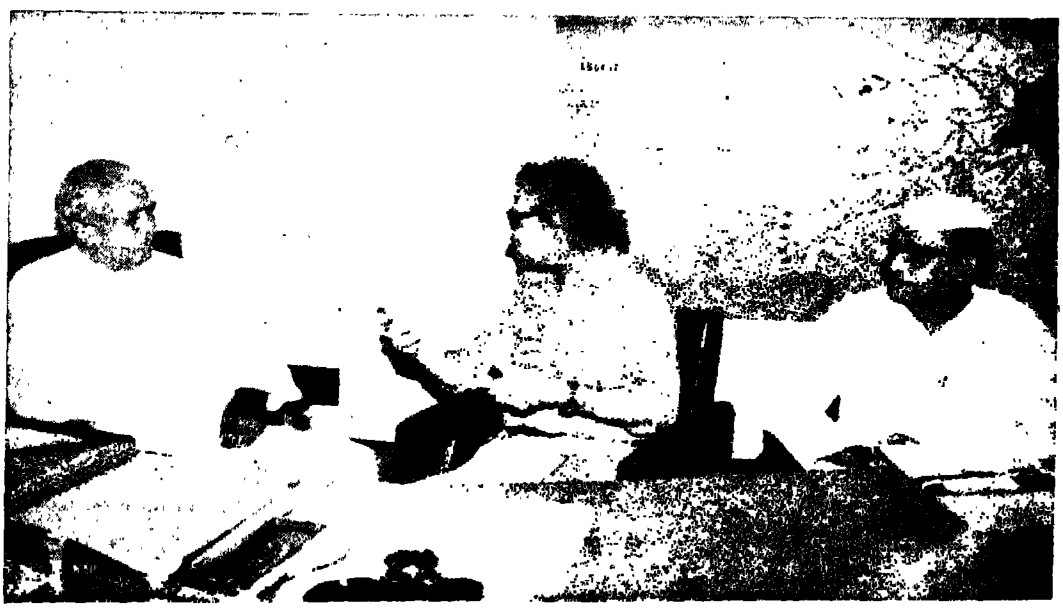


آزادی نمبر



عزّت مآب ہری آنند براری، گورنر ہریانہ، چنڈی گڑھ میں روٹری کلب اور انر وہیل کلب
کے صدروں کی رسم حلف برداری کے موقع پر سووینئر کا اجراء فرماتے ہوئے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال چنڈی گڑھ میں حکومتِ ہند کے منصوبہ بندی کمیشن
کے ممبر جناب عابد حسین سے بات چیت کرتے ہوئے۔ تصویر میں (دائیں جانب)
نائب وزیرِ اعلیٰ جناب بنارسی داس گپتا بھی نظر آرہے ہیں۔



آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

اگست ۱۹۸۸ء شمارہ ۸ جلد ۱۶

ترتیب

مدیرِ اعلیٰ

ارجن داس ملک
آئی۔اے۔ایس

مدیر

سلطان انجم

سرورق : پون کمار

خط و کتابت کا پتہ

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۹۰۱-۱۹۱
سیکٹر ۱۷، چنڈی گڑھ — ۱۶۰۰۱۷

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

مدیر کا مصنفین کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں

یوم آزادی پر

پیغام



ہری آنند براری
گورنر ہریانہ

آج ہم اپنی آزادی کی 41 ویں سال گرہ منا رہے ہیں۔ اِسے حاصل کرنے کے لئے ہم نے تقریباً ایک صدی تک غیر ملکی حکومت کے خلاف سخت جدوجہد کی۔ برطانوی سامراجیت کے چنگل سے ملک کو نجات دلانے کے لئے لڑی گئی آزادی کی پہلی لڑائی میں ہمیں کامیابی نہیں۔ لیکن راشٹر پتا مہاتما گاندھی کی قیادت میں شروع کی گئی طویل تحریکِ آزادی میں ہمیں کامرانی حاصل ہوئی۔ اس مبارک دن ہم تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والے لاتعداد محب الوطنوں کی قربانیوں کو یاد کرتے ہیں۔ ہریانہ نے آزادی کے حصول کی خاطر شروع کی گئی اس تاریخی جدوجہد میں جو رول ادا کیا، اُس پر ہمیں فخر ہے۔

مہاتما گاندھی نے جہدِ آزادی کے دوران سچ، اہنسا، فرقہ دارانہ خیرسگالی اور باہمی اخوت اور یگانگت کے اصولوں پر عمل کیا اور اُن کی تعلیم دی۔ انہوں نے ہمیں ایک ایسی فلاحی ریاست کا تصور بھی دیا جہاں سبھی لوگ ذات، رنگ، نسل اور مذہب کے امتیازات کے بغیر مل جُل کر رہ سکیں اور پھل پھول سکیں۔ بعدازاں پنڈت جواہر لال نہرو نے ہمیں سیکولرزم اور سوشلزم کا راستہ دکھایا۔ انہوں نے منصوبہ بند اقتصادی پروگراموں، سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ دیکر جدید ہندوستان کی بُنیاد رکھی۔ ہمیں اپنے عظیم رہنماؤں کے ذریعہ دکھائے گئے راستے پر چلتے ہوئے خوشحالی کی راہ پر اور آگے بڑھنا ہے۔

الگ ریاست کے طور پر وجود میں آنے کے بعد ہریانہ اپنے عظیم رہنمائوں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مصروف ہے اور سبھی کے لئے سماجی مساوات اور اقتصادی خوشحالی کے نشانے کو حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

سرکار نے کمزور طبقوں کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کئی سماجی۔ اقتصادی ترقیاتی سکیمیں شروع کی ہیں۔ 7 لاکھ 74 ہزار چھوٹے کسانوں، بے زمین مزدوروں، چھوٹے دوکانداروں، دیہی دستکاروں اور درج فہرست ذاتوں، پسماندہ طبقوں کے افراد کے قرضے معاف کر دیے گئے ہیں۔ 65 سال یا اس سے زیادہ عمر کے 7 لاکھ 50 ہزار ضعیف العمر شہریوں کو

۱۰۰ روپے ماہانہ بڑھاپا پنشن دی گئی ہے۔ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو نوکری کے لئے انٹرویو پر جانے کے واسطے ہریانہ روڈویز کی بسوں میں مفت سفر کی سہولیات دی گئی ہیں۔ گزشتہ سال بدترین خشک سالی کے مدِنظر غریب دیہاتیوں اور بے زمین مزدوروں کو روزگار کے بہتر مواقع کی فراہمی کی غرض سے ایک جامع پروگرام ریاست بھر میں شروع کیا گیا۔

ایک علیحدہ ریاست بننے کے بعد ہریانہ نے ترقیاتی سرگرمیوں کے سبھی شعبوں میں لمبے قدم اٹھائے ہیں۔ زرعی پیداوار میں تو ریاست نے بے نظیر ترقی کی ہے۔ سرکار اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ ریاست کی معیشت کی اہم بنیاد زراعت ہے۔ اس لئے گزشتہ سال کے دوران بھیانک قحط سے پیدا ہوئی مشکلات کو دور کرنے کے لئے کسانوں کے مفاد کا پورا خیال رکھا گیا۔ زرعی سیکٹر کو پچھلے سال کے مقابلے میں ۱۹۸۷-88ء کے دوران زیادہ بجلی سپلائی کی گئی۔ کسانوں کو 32 روپے فی کوئنٹل تک گنے کی مناسب قیمت دی گئی۔

نئے دور میں مستحکم معیشت کی بنیاد استوار کرنیکے لئے صرف زرعی پیداوار ہی کافی نہیں ہے۔ ہریانہ میں پہلے سے ہی مضبوط صنعتی بنیاد موجود ہے۔ سرکار نے اپنی نئی صنعتی پالیسی کے تحت ریاست میں صنعتوں کی ترقی کے مزید فروغ کی غرض سے کئی رعایتیں دی ہیں جیسے کہ پسماندہ علاقوں میں سرمایہ کاری پر سبسڈی میں اضافہ، نئے صنعتی یونٹوں کو سیلز ٹیکس سے چھوٹ اور اس کا التوا، سنگل ونڈو سروس اور غیر مقیم ہندوستانیوں کے لئے صنعتی پلاٹوں کی ریزرویشن۔

ہریانہ ٹورزم کی خدمات کو ملک کے اندر اور بیرونی ممالک میں بھی بے حد سراہا گیا ہے، تعلیم، روڈویز اور صحت سروسز میں بھی کافی وسعت آئی ہے اور اُن کے معیار اور نتائج میں بھی سُدھار ہوا ہے۔

ہریانہ کی شاندار ترقی اصل میں یہاں کے لوگوں کی سخت محنت اور تعاون کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے سرکار کے لئے اپنی ترقیاتی سکیموں اور پروگراموں پر عمل کرنا ممکن ہو سکا۔

بد قسمتی سے اس سال ریاست کے کچھ حصوں میں سیلاب آگیا ہے۔ حکومت سیلاب سے متاثرہ لوگوں کی ہر ممکن مدد کر رہی ہے۔

آج دہشت گردی سے ملک کے امن، اتحاد اور سالمیت کو خطرہ درپیش ہے۔ ہریانہ میں بھی دہشت گردی کے کچھ بزدلانہ اور وحشیانہ واقعات ہوئے ہیں لیکن یہ امر تسلی بخش ہے کہ ہریانہ میں ہوئے انتہا پسندی کے تمام واقعات کا سُراغ لگا کر مجرموں کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت دہشت گردی کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے پولیس فورس کو اور مضبوط بنا رہی ہے اور دیگر کارگر اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ ہریانہ میں مختلف فرقوں نے باہمی یگانگت اور بھائی چارے کی مثال پیش کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ دوستی اور اخوت کے یہ رشتے اور بھی مستحکم ہوں گے تاکہ ملک کا اتحاد اور سالمیت مضبوط ہو۔

اس موقع پر میں ہریانہ واسیوں کے خوشحال اور شاندار مستقبل کی دعا کرتا ہوں۔ (س۔ ا)

یومِ آزادی
ایک مبارک دِن



چودھری دیوی لال
وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

یومِ آزادی ایک قومی اور مبارک دِن ہے۔ یہ خوشیاں منانے کے ساتھ ساتھ شکرگذاری اور احسان مندی کے اظہار کا بھی دن ہے۔ ہم ہندوستانی ایک عرصے سے اس دِن کے منتظر تھے ہم نے اس کی خاطر ایک طویل جدوجہد کی۔ ہم نے 1857ء میں غلامی کے بندھنوں سے نجات پانے کے لئے بے پناہ کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ ہمیں آزادی حاصل کرنے میں ۹۰ سال لگ گئے۔ ہزاروں لوگ قربان ہو گئے۔ لاکھوں لوگوں کو قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اُن کے خاندان تباہ ہو گئے اور اُن کے بچے پیار، نگہداشت، اچھی غذا، سہارے، ہمدردی اور مناسب پرورش سے محروم رہ گئے۔ میں ان لفظوں کے مفہوم کو بخوبی سمجھتا ہوں کیونکہ میں بھی تقریباً دو دہائیوں تک آزادی کی لڑائی میں شریک رہا ہوں۔ آزادی کی قدروقیمت وہی لوگ جان سکتے ہیں جو میری طرح قوم کی حالتِ اسیری کو جانتے ہوں۔ ہم کم ازکم اپنے شہیدوں کو نذرانۂ عقیدت پیش کر سکتے ہیں اور ان کے احترام میں اپنا سر جھکا سکتے ہیں جنھوں نے آزادی کے لئے اپنی جان اور تمام آسائشیں قربان کردیں۔

آزادی سے ہمیں خواہ سبھی سہولتیں نہ ملی ہوں تاہم اس سے ہمیں وقار اور خودداری ضرور نصیب ہوئی ہے۔ ہمیں اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ اس کی نگہبانی کے لئے ہمیں ہمیشہ مستعد رہنا ہوگا تاکہ نہ صرف بیرونی حملوں سے بلکہ اندرونی سازشوں اور تخریب کاری سے اسے گنوا نہ بیٹھیں۔

سیاسی آزادی بذاتِ خود بے حد اہم ہے۔ یہ سبھی کے لئے سماجی برابری کے حصول اور اقتصادی خوشحالی کا بھی ذریعہ ہے اور یہی نقطۂ عروج ہے۔ ہمیں یہ کام اُسی جذبہ اور معنویت سے کرنا چاہیئے جس سے ہم نے طویل عرصے تک آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کی تھی۔ ہم نے اس لحاظ سے گزشتہ ایک برس میں ہریانہ میں کوششیں کی ہیں۔

ہم نے 65 سال سے زیادہ عمر کے ضعیف العمروں پر دھیان دیا ہے۔ ریاست کے 7 لاکھ 50 ہزار سن رسیدہ شہری ۱۰۰ روپے ماہوار پینشن حاصل کر رہے ہیں جو منی آرڈر کے ذریعہ انہیں گھر بیٹھے ہی مل جاتی ہے۔ یہ پینشن بے سہاروں کے لئے نہیں ہے حالانکہ بے سہارا بھی اس سے مستفید ہوئے ہیں۔ یہ سمان پینشن ہے جس نے ہمارے بزرگ شہریوں کو وقار اور خودداری عطا کی ہے۔ یہ امدادی رقم نہیں بلکہ اُن افراد کے احسانوں کا اعتراف ہے جنہوں نے ذاتی کاروبار، تجارت اور اپنے کام کاج میں مصروف رہ کر ترقی کے عمل کو تیز کرنے اور مُلک کے لئے اشیاء تیار کرنے کی غرض سے عُمر بھر سخت محنت کی ہے۔

آزادی کا مطلب ہی بھوک اور محتاجی سے نجات دلانا ہے۔ گذشتہ سال کا بدترین قحط ہمارے لئے بہت بڑا چیلنج تھا جس کا ہم نے پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ ریاست بھر میں غریب دیہاتیوں اور بے زمین مزدوروں کو روزگار کے موقعے دلانے کے لئے جامع پروگرام شروع کیا گیا۔ ریاست کے تقریباً سبھی دیہات میں تالاب کھودنے، گلیوں کو پکا کرنے، سڑکیں بنانے اور عوامی اثاثوں کی تعمیر جیسے مقامی پروگرام شروع کئے گئے۔ ہر ایک گاؤں میں اناج، پینے کا صاف پانی، مویشیوں کے لئے چارہ اور جوہڑ کے پانی کا انتظام کیا گیا۔ ہماری ریاست میں قحط کی وجہ سے مرنے یا کسی طرح کی قلت کا کوئی کیس نہیں ہوا۔ اس کے برعکس ہریانہ نے ہمسایہ ریاست راجستھان کے باشندوں اور مویشیوں کو کھانا اور پناہ دی۔

جمہوریت میں لوگ انتظامیہ کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ انتظامیہ لوگوں کی خدمت کے لئے ہوتی ہے۔ ہم نے ریاستی مشینری کو اور زیادہ فعال اور ذمے دار بنانے کے لئے بھرپور کوششیں کی ہیں۔ خود میں، میرے ساتھی وزراء اور افسران لوگوں کی شکائتیں سُننے اور انہیں دُور کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ریاست کے ہر محکمہ کا افسرِ اعلیٰ لوگوں کی شکائتیں سُننے اور اُنہیں دُور کرنے کے لئے روزانہ کھلا دربار لگاتا ہے۔

ہریانہ نے قلیل مدت میں ہی قومی معیشت میں، زراعت اور صنعت دونوں شعبوں میں اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ گذشتہ سال ہمارے تھرمل پلانٹوں میں 50 فیصد بجلی زیادہ پیدا ہوئی۔ زرعی سیکٹر کو روزانہ 70 لاکھ یونٹ بجلی دی گئی تاکہ ٹیوب ویل ہر وقت چلتے رہیں۔ تاہم دوسرے شعبوں کو بھی بجلی کم نہیں دی گئی۔ 88-1987ء کے دوران غیر زرعی سیکٹر کو 274 کروڑ یونٹ بجلی دی گئی جبکہ 87-1986ء میں اسی سیکٹر کو 253 کروڑ یونٹ بجلی دی گئی تھی۔

چونکہ ہماری ترقی پذیر معیشت کی ضرورتوں کو صرف زراعت کے ذریعہ ہی پورا کیا جانا ممکن نہیں۔ اس لئے ترقی کی رفتار تیز کرنے اور روزگار اور "سیلف ایمپلائمنٹ" کے موقعے بڑھانے کی غرض سے مستحکم صنعتی بُنیاد تیار کرنے کی بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں۔ نئی صنعتی پالیسی میں صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے پسماندہ علاقوں میں زیادہ سرمایہ سبسڈی، نئے یونٹوں کو سیلز ٹیکس سے چھوٹ یا مُلتوی کرنا، "سنگل ونڈو سروس" اور غیر مقیم ہندوستانیوں کے لئے صنعتی پلاٹوں کی ریزرویشن جیسی کئی رعایتیں دی گئی ہیں۔ ڈیزل سے چلنے والے پاور جنریٹر سیٹ لگانے کیلئے سبسڈی 50 ہزار روپے سے بڑھا کر 15 لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔ سبھی نئے یونٹوں کو پانچ سال کے لئے بجلی ڈیوٹی سے چھوٹ دی گئی ہے۔

مختلف فارم ختم کر کے، جلد ٹیکس ادائیگی سسٹم کے ذریعہ اور بیاج سمیت طے شدہ ٹیکس کی ادائیگی کے بعد اپیل سُننے کی منظوری دے کر ٹیکس سسٹم کو آسان کر دیا گیا ہے۔ ٹیکس ادا کرنے والوں کی بقایا رقم کی واپسی کی مدت مقرر کر دی گئی ہے۔ پشو چارہ، نمک اور سویابین کے دودھ کو سیلز ٹیکس سے بالکل چھوٹ دے دی گئی ہے۔ کھل،

تیل نکلی کھل، گڑ، شکر، لکڑی کے فرنیچر جیسی مختلف چیزوں پر اور مینوفیکچرروں کو فروخت کئے جانے والے سیمنٹ، ٹائر ٹیوبوں اور پیکنگ کے سامان پر بھی ٹیکس کی شرح کم کر دی گئی ہے۔

ہم نے بے روزگار نوجوانوں کو روزگار کے سلسلے میں انٹرویو پر جانے آنے کے لئے ہریانہ روڈویز کی بسوں میں مفت سفر کی سہولت میسر کرائی ہے۔ دیہاتیوں کو کم فاصلے کے سفر کے لئے ٹرانسپورٹ کی سہولت میسر کرانے کے لئے منی بسیں خریدی گئی ہیں اور خواتین کی سہولت کی غرض سے اُن کے لئے خصوصی بسیں چلائی جا رہی ہیں۔

زیادہ سے زیادہ افراد کو خصوصاً دیہی علاقوں میں حفظانِ صحت کی سہولیات میسر کرانے کی غرض سے 88-1987ء کے دوران 156 سب ہیلتھ سینٹر، 19 پرائمری ہیلتھ سینٹر اور 9 کمیونٹی ہیلتھ سینٹر کھولے گئے۔

سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقوں کی اقتصادی حالت سدھارنے کے لئے ہم فلاح و بہبود کی کئی سکیمیں شروع کر رہے ہیں۔ تاکہ انہیں سماج میں باعزت مقام حاصل ہو سکے۔ پسماندہ طبقوں کی 50 یا اس سے زیادہ آبادی والے گاؤں میں ان طبقوں کے ممبران میں سے ایک ایڈیشنل نمبردار مقرر کیا جائے گا۔ پسماندہ طبقوں اور قبیلوں کو مکان بنانے کی غرض سے دی جانے والی سبسڈی دو ہزار روپے سے بڑھا کر پانچ ہزار روپے کر دی گئی ہے۔ انوسوچت جاتیوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لئے میٹرک، بی۔اے اور پروفیشنل کورسوں کے طلباء کے فائدے کے لئے بلا سودی قرض کی رقم بڑھا دی گئی ہے۔ ہریانہ واحد ریاست ہے جس نے ہریجن کھیت مزدوروں اور غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے کنبوں کو ژالہ باری سے متاثر کسانوں کو دی جا رہی راحت کی پانچ فیصد رقم دی ہے۔

لاکھوں چھوٹے اور درمیانے کسانوں، بے زمین مزدوروں، دستکاروں اور چھوٹے دوکانداروں کے 204 کروڑ روپے کے قرضے معاف کرنے کے بعد ہم نے 14 اگست کو انوسوچت ذاتوں اور پچھڑے طبقوں کو دیئے گئے 8 کروڑ 45 لاکھ روپے کے قرضے اور مارجن منی "معاف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے اوسطاً 650 روپے فی شخص کی شرح سے 33,740 افراد مستفید ہوں گے۔ شروع میں قرضے معاف کرتے وقت یہ شرط لگائی گئی تھی کہ قرض واپس کرنے میں غفلت برتنے والے ہریجن اور پسماندہ طبقوں کے افراد کو یہ فائدہ نہیں ملے گا۔ ان کے معاملوں میں اب یہ شرط ختم کر دی گئی ہے۔

جمہوری روایات کو قائم رکھنے اور لوگوں کے آئینی حقوق کی حفاظت کے لئے میری سرکار نے تقریباً دو دہائیوں کے بعد ریاست میں میونسپلٹیوں کے الیکشن کرانے کا دلیرانہ قدم اٹھایا۔ ہم نے اسی مہینے پنچایت الیکشن کرائے ہیں جو کہ دیہی سطح پر جمہوری اداروں میں ہمارے یقین کا اظہار ہے۔

فرید آباد کے پارلیمانی اور ناروڑ کے اسمبلی ضمنی انتخابات میں لوک دل کی حالیہ فتح ہماری پالیسیوں اور پروگراموں کے تئیں عوام کے اعتماد کا ثبوت ہے۔

ہماری حصولیابیوں کا سہرا خاص طور پر ریاست کے امن پسند عوام کے سر ہے۔ سماج دشمن عناصر کی اشتعال انگیزیوں کے باوجود ریاست میں ہمیشہ فرقہ وارانہ اتحاد اور باہمی یکجہتی کا ماحول برقرار رہا۔

آئیے! اس مبارک موقع پر ہم ایسے سیکولر، خوشحال اور ترقی پذیر معاشرے کی تعمیر کا عہد کریں جہاں غریب سے غریب شخص بھی یہ محسوس کرے کہ سرکار اُس کی امیدوں اور توقعات کے تئیں بیدار ہے۔ (س۔ا)

O



امن اور خوشحالی کا علمبردار

... ہریانہ

آج ہریانہ امن، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، استحکام اور ہمہ پہلو خوشحالی کی شاندار تصویر پیش کرتا ہے۔ سرکار کی مختلف سرگرمیوں کا مقصد سبھی لوگوں کو یکساں مواقع فراہم کرنا ہے۔

جس تیز رفتاری اور خوش اسلوبی سے ریاست میں سماجی ـ اقتصادی انقلاب لانا ممکن ہوا ہے، وہ دیگر ریاستوں کے لیے مثال بن گیا ہے۔

- ہریانہ نے ۶۵ سال یا اس سے زیادہ عمر کے ۷ لاکھ ۵۰ ہزار سن رسیدہ شہریوں کو ۱۰۰ روپے ماہوار کے حساب سے بڑھاپا پینشن دی ہے۔
- درج فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کے ۱,۳۳,۷۴۰ افراد کے ۸ کروڑ ۴ ۵ لاکھ روپے کے بقایا قرضے اور "سیڈ منی" معاف کر دیئے گئے ہیں۔
- ۷ لاکھ ۴۷ ہزار چھوٹے کسانوں، بے زمین مزدوروں، چھوٹے دوکانداروں، دیہی دستکاروں، درج فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کے بینک قرضے معاف کیے گئے ہیں۔
- ہم نے ہریانہ کے بے روزگار نوجوانوں کے لیے روزگار کے سلسلے میں انٹرویو پر جانے کے لیے ہریانہ روڈویز کی بسوں میں مفت سفر کی سہولت دی ہے۔
- گنّا پیدا کرنے والوں کو گنّے کی قیمت ۳۲ روپے فی کوینٹل دی گئی ہے۔
- نئی صنعتی پالیسی میں کئی رعایتوں کا انتظام ہے۔
- ڈیزل سے چلنے والے پاور جنریٹنگ سیٹ لگانے کے لیے سبسڈی فی یونٹ ۵۰ ہزار روپے سے بڑھا کر ۱۵ لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔
- سبھی نئے یونٹوں کو پانچ سال کے لیے بجلی ڈیوٹی سے چھوٹ دی گئی ہے۔
- ٹیکس سسٹم کو آسان بنا دیا گیا ہے۔
- ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۵۴۵ ۳ کروڑ یونٹ بجلی سپلائی کی گئی جب کہ ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۲۵۵۵ کروڑ یونٹ بجلی دی گئی تھی۔
- ۱۱۹ ڈسپنسریاں، ۲۷۴ پرائمری ہیلتھ سینٹر اور ۳۱ کمیونٹی ہیلتھ سینٹر لوگوں کی صحت کی حفاظت کی ذمے داریوں کو پورا کر رہے ہیں۔ ہمیں ۲۰۰۰ء تک "سب کے لیے صحت" کا نشانہ حاصل کر لینے کی توقع ہے۔
- مناسب دام کی ۶,۴۵۱ دوکانوں کے ذریعہ لوگوں کو اشیائے ضروریہ تقسیم کی جا رہی ہیں۔

ڈائریکٹر، محکمہ تعلقات عامہ، ہریانہ

تاروں سے بھری راہ گزر لے کے گئی ہے — یہ صبح چراغوں کا نگر لے کے گئی ہے

تم کو تو پتہ ہوگا کہ ہمراہ تمھیں تھے — دنیا مرے خوابوں کو کدھر لے کے گئی ہے؟

پیاسے تھے تو پانی کو پکارا تھا ہمیں نے — ندّی اِدھر آئی ہے تو گھر لے کے گئی ہے

اِک منزلِ بے مقصد و بے نام کی خواہش — کانٹوں کی سواری پہ سفر لے کے گئی ہے

بے بال و پری اب بھی سرِ دشت ہے محفوظ — آندھی تو فقط برگ و ثمر لے کے گئی ہے

شاید کہ اب آئے تری قُربت کی نئی فصل — اس بار دعا دستِ اثر لے کے گئی ہے

چمکے گا ابھی زیورِ شہزادیٔ مہتاب

اُس تک وہ مری شب کی خبر لے کے گئی ہے

مظہر امام

غزل



رام لعل نابھوی



مجاہدِ آزادی
لال چند فلک لاہوری

ایک زبان زد مصرعہ ہے:

لو کبھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا

یہ مصرعہ لال چند فلک لاہوری کا ہے۔ فلک ایک شاعر، ادیب، صحافی، مترجم اور محقق تھے۔ وطنیت کے جذبہ سے سرشار اس مجاہد آزادی کو انگریزی حکومت نے عمر بھر کالے پانی کی سزا دی تھی۔ آپ ۲۶ کتب کے مصنف و مؤلف تھے۔ جو چھپی ہوئی ہیں۔ بدقسمتی سے نہ اب ان کی سبھی تصنیفات دستیاب ہیں اور نہ ان کے فن اور شخصیت پر کوئی مضمون۔ شاید کسی نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ تذکروں میں بھی ان کا نام نہیں ملتا۔

نام و نمود سے بے نیاز۔ انعامات و اکرامات سے بے پرواہ۔ قید و بند کی مصیبتیں سہہ کر اس مردِ مجاہد نے، جس نے ظالم کے آگے کبھی سر خم نہیں کیا، کچھ سال پہلے دہلی میں انتقال کیا۔ اخباروں میں سرسری خبر چھپی اور کہانی ختم ہو گئی۔

آئیے دیکھیں کہ فلک کون تھے۔ آزادی کی تڑپ کب اور کیسے پیدا ہوئی۔ کتنی بار مقدمے چلے۔ کتنی سزائیں پائیں۔ شاعری میں تلمذ کس سے تھا۔ جرنلزم کس سے سیکھی۔

وہ کون سی ایسی نظمیں تھیں یا وہ کون سے ایسے کارنامے تھے کہ حکومت ان سے خوف کھاتی تھی اور وہ ظلم کیا تھے جو ان پر روا رکھے گئے اور پھر یہ کہ کیا وہ گرم دل سے تعلق رکھتے تھے یا نرم دل سے، وغیرہ۔ یہ قاعدہ ہے کہ جس شخص کا ذکر نہیں ہوگا اس کا فکر نہیں ہوگا۔ جب ذکر اور فکر نہیں ہوگا تو دبیز پردے پڑتے چلے جائیں گے۔

لال چند فلک کے پتا دیوان چند کپور لاہور میں غلے کا کاروبار کرتے تھے۔ فلک ۱۳ر جنوری ۱۸۸۶ء کو حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ فلک کا بچپن لاہور اور حافظ آباد میں گذرا۔ ان کی نانی کے ہاں کوئی لڑکا نہیں تھا۔ وہ فلک کو اپنی اُمیدوں کے گلشن کا مہکتا ہوا پھول سمجھتی تھیں۔ پہلے مہاجنی حروف و ہندسے

سیکھے۔ پھر سناتن دھرم ہائی سکول میں ناگری، اردو سنسکرت فارسی وغیرہ زبانوں اور حساب جبر ومقابلہ۔ اقلیدس۔ سائنس۔ تواریخ۔ جغرافیہ وغیرہ علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اس سکول میں رامائن اور گیتا علمی کورسوں کے طور پر پڑھائی جاتی تھیں مہابھارت کی کتھا بلاناغہ ہوتی تھی جس میں ہر طالب علم کا شامل ہونا لازمی تھا۔ ۱۹۰۲ء میں مڈل اور ۱۹۰۴ء میں انٹرنیس کا امتحان پاس کیا۔ کمسنی میں ہی ان کی شادی لکھنؤ میں گنو مل ملہوترہ کی بڑی بیٹی سے ہوئی۔ فلک کا کہنا ہے کہ اس شادی سے بڑی بڑی اُمیدوں اور شاندار خواہشوں کا خون ہوگیا۔

انٹرینس پاس کرنے کے بعد والدین نے سرکاری ملازمت کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ ایک دفتر میں کام سیکھنے لگے۔ لیکن جب انھوں نے دیسی افسروں کو ذرا ذرا سی بات پر انگریز افسروں سے جھڑکیاں کھاتے دیکھا اور تھر تھر کانپتے دیکھا تو طبیعت اکتا گئی۔ امیریک ایجنسی کے نام سے کاروبار شروع کیا اور "بیزار" عرف ہندوستان گزٹ نامی اخبار جاری کردیا۔ جسے بند کرنا پڑا۔ آخر ایک اخبار گلنار کی ایڈیٹری ملی۔ فلک نے اس کا نام گلنار کی بجائے ہندی رکھ دیا اور اپنے خیالات کا پرچار شروع کردیا۔ گنو شالہ سیالکوٹ کے حساب میں گڑبڑ کے متعلق ایک نوٹ لکھنے پر منتظمانِ گنو شالہ نے اخبار کے مالک، پرنٹر، مینجر کاتب اور فلک پر ہتک عزت کی نالش دائر کی۔ آخر صلح ہوئی۔ فلک نے ایڈیٹری چھوڑ دی اور دسمبر ۱۹۰۶ء میں لاہور آکر لالہ دینا ناتھ کے اخبار "ہندوستان" اور کچھ دن "پیسہ اخبار" میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کیا۔ ۱۹۰۸ء میں اخبار "شکاری" کے ایڈیٹر بن کر آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار شروع کردیا۔

شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ ۱۹۰۵ء میں منشی دوارکا پرشاد کی شاگردی اختیار کی۔ افق صاحب ان دنوں لاہور میں رہتے تھے۔ "زمانہ" اور "ادیب" جیسے نامور پرچوں میں نظمیں اور مضامین شائع ہونے شروع ہوگئے۔

۱۹۰۷ء کے شروع ہوتے ہی پنجاب میں کہرام مچ گیا۔ مسٹر گوکھلے نے پنجاب کا دورہ کیا اور قومی خیالات پھیلائے۔ فلک بھی میدان میں کود پڑے۔ سردار اجیت سنگھ کو ساتھ لے کر اور کچھ نوجوانوں کی مدد سے "انجمن محبانِ وطن" قائم کی۔ پنجاب بھر میں دورہ کر کے ایسی حالت پیدا کردی کہ گورنمنٹ کو جھکنا پڑا۔ لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت کو جلا وطن کر دیا گیا۔ انجمن محبانِ وطن کے ممبروں پر مقدمہ دائر ہوا۔ فلک اپنا کام دھندہ چھوڑ کر جگہ بہ جگہ لیکچر دیتے اور نظمیں پڑھتے تھے۔ چنانچہ پولیس نے ان پر بلوہ کا جھوٹا مقدمہ بنایا۔ پہلی عدالت نے ۹ ماہ قید سخت کی سزا دی۔ چیف کورٹ نے باعزت بری کر دیا۔ اب فلک سورت کانگریس میں شریک ہوئے اور وہاں چوٹی کے محبانِ وطن کو دیکھا اور سُنا۔ ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں متعدد قومی و ملکی جلسوں میں حصہ لیا اور اپنی نظمیں سنائیں۔

۵ نومبر ۱۹۰۹ء کو گورنمنٹ آف پنجاب نے فلک پر بغاوت کے آٹھ مقدمات بنائے۔ تین مقدمات میں بری ہوئے۔ پانچ میں تین سال۔ آٹھ ماہ قید سخت اور پانصد روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اپیل پر سزا کم کردی گئی اور ۱۹ جولائی ۱۹۱۰ء کو رہا کر دیے گئے۔ اخبار اور رسالے تو وہ متعدد بار جاری کرچکے تھے۔ ۵ جنوری ۱۹۱۶ء کو "نظارہ" کا پہلا نمبر شائع کیا۔ ۲ اپریل ۱۹۱۷ء کو گرفتار ہوکر جیل خانہ چلے گئے۔

پنجاب میں ۱۹۰۷ء میں ہوئی جس ہل چل کا ذکر پہلے ہوچکا ہے جس میں فلک نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب کی خفیہ پولیس نے فلک کا نام پنجاب کے مشہور مستند پولیٹیکل شورش پسندوں کی فہرست میں لکھ لیا۔ کڑی نگرانی

ہونے لگی۔ ۹ سال تک مصائب سے دوچار رہنا پڑا۔

جولائی ۱۹۱۰ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ فروری ۱۹۱۲ء میں جب فلک پولیٹیکل تلاشیوں سے تنگ آ گئے تو انھوں نے پبلک زندگی میں ایک امن پسند اور وفا شعار دلیش سیوک کا رول ادا کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا نام اس لسٹ سے خارج کر دیا گیا۔ فلک کے مخالفین اور چند دشمن ملک اور حکومت کے مخبروں نے رپورٹیں دینا شروع کر دیں کہ لال چند فلک کانگریس سے مسٹر تلک کی خاص ہدایات لے کر آیا ہے اور لاہور میں مسٹر تلک کی ہوم رول لیگ کی شاخ کھول دی اور پورے پنجاب میں شاخیں کھول رہا ہے۔ سر میکائل اوڈوائر نے بغیر اطمینان کیے رپورٹوں پر بھروسہ کیا اور پیش بندی کے طور پر پنجاب میں تلک مہاراج اور بابو بپن چندر پال کی آمد کی ممانعت کا حکم جاری کر دیا۔ فلک نے اس امتناعی حکم کے خلاف آواز اٹھائی اور ۵ر مارچ ۱۹۱۷ء کو ایک سخت مضمون لکھا۔ ۲ر اپریل کو فلک کو انڈیا ڈیفنس ایکٹ کے تحت حراست میں لے کر تھانہ میں بند کر دیا۔ مکان اور دوکان کی تلاشی لی گئی۔ ۱۲ر مئی کو جانچ مکمل کر کے ۱۴ر مئی کو لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیا گیا۔ جہاں پھانسی کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ۲۸ر مئی کو فلک کے خلاف مقدمہ کی سماعت جیل کے اندر بیٹھنے والے کمیشن کے سامنے شروع ہوئی۔ استغاثہ نے ایسا جال بُنا کہ فلک کو عمر قید کالے پانی کی سزا دی گئی۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے دس سیر مونج کٹائی کرنے کا حکم سنایا۔ فلک نے انکار کر دیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے ایک [illegible] کے لیے چکی پیسنے کی ظالمانہ سزا دی۔ فلک نے ایک شعر یہاں یہ کہا ؎

فلک صاحب، یہ دونوں صاحبوں نے خاص شفقت کی
کٹائی مونج کی دی ایک نے اور اک نے چکّی دی

مونج بھی کوٹنی پڑتی اور چکی بھی چلانی پڑتی۔

پھر فلک نے کہا ؎

؎ فلک بیکس پہ دونوں سرکلوں میں قہر و آفت ہے
مصیبت مونج کی ہے واں یہاں چکّی کی زحمت ہے

فلک لکھتے ہیں کہ جیل کا داروغہ شعر و شاعری کا قدر شناس ہے۔ ایک دن ان سے کہا ؎

تمھارے عہد میں صد حیف ہے پیسے فلک چکّی
فلک کیا مالکِ ارض و فلک کو سخت حیرت ہے

چکّی پیستے پیستے فلک نے چند شعر کہے ؎

وہ ملزم ہوں جسے قانون کی سنگین چکّی نے
سمجھ کر خشک دانا بے تکلّف پیس ڈالا ہے

پڑے ہیں پیسنے دانے فلک نازک خیالوں کو
کٹائی مونج کی ملتی ہے یاں بھارت کے لالوں کو

فلک کہتے ہیں کہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مادرِ ہند کے لیے کسی بھی سخت کام اور تکلیف کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا جائے درج ذیل اشعار اسی ولولہ اور عزمِ مصمم کا اظہار ہیں ؎

خوش ہو کے مونج کوٹیں گے چکی چلائیں گے
کولہو کنواں خراس خوشی سے پھرائیں گے

درد و محن میں پھنس کے نہ گردن جھکائیں گے
مونچھوں پہ تاؤ دیں گے اکڑ بھی دکھائیں گے

رنج و غم و الم میں بھی خوشیاں منائیں گے
سختی تمام جھیلیں گے کڑیاں اٹھائیں گے

خود سہہ کے ظلم، ظلم کی ہستی مٹائیں گے
بھارت کے حال زار کو بہتر بنائیں گے

فلک لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک مراسلہ انگریزی

سیکھے۔ پھر سناتن دھرم ہائی سکول میں ناگری، اردو سنسکرت فارسی وغیرہ زبانوں اور حساب جبرومقابلہ۔ اقلیدس۔ سائنس۔ تواریخ۔ جغرافیہ وغیرہ علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اس سکول میں رامائن اور گیتا علمی کورسوں کے طور پر پڑھائی جاتی تھیں جہابھارت کی کتھا بلاناغہ ہوتی تھی جس میں ہر طالب علم کا شامل ہونا لازمی تھا۔ ۱۹۰۲ء میں مڈل اور ۱۹۰۴ء میں انٹرنیس کا امتحان پاس کیا۔ کمسنی میں ہی ان کی شادی لکھنؤ میں گنو مل ملہوترہ کی بڑی بیٹی سے ہوئی۔ فلک کا کہنا ہے کہ اس شادی سے بڑی بڑی اُمیدوں اور شاندار خواہشوں کا خون ہوگیا۔

انٹرینس پاس کرنے کے بعد والدین نے سرکاری ملازمت کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ ایک دفتر میں کام سیکھنے لگے۔ لیکن جب انھوں نے دیسی افسروں کو ذرا ذراسی بات پر انگریز افسروں سے جھڑکیاں کھاتے دیکھا اور تھر تھر کانپتے دیکھا تو طبیعت اکتا گئی۔ امیریکن ایجنسی کے نام سے کاروبار شروع کیا اور "بیزار" عرف ہندوستان گزٹ نامی اخبار جاری کردیا۔ جسے بند کرنا پڑا۔ آخر ایک اخبار گلنار کی ایڈیٹری ملی۔ فلک نے اس کا نام گلنار کی بجائے ہندی رکھ دیا اور اپنے خیالات کا پرچار شروع کردیا۔ گنوشالہ سیالکوٹ کے حساب میں گڑبڑ کے متعلق ایک نوٹ لکھنے پر منتظمانِ گئوشالہ نے اخبار کے مالک، پرنٹر، منیجر کاتب اور فلک پر ہتک عزت کی نالش داغ دی۔ آخر صلح ہوئی۔ فلک نے ایڈیٹری چھوڑ دی اور دسمبر ۱۹۰۶ء میں لاہور آکر لالہ دینا ناتھ کے اخبار "ہندوستان" اور کچھ دن "پیسہ اخبار" میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کیا۔ ۱۹۰۸ء میں اخبار "شکاری" کے ایڈیٹر بن کر آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار شروع کردیا۔

شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ ۱۹۰۵ء میں منشی دوارکا پرشاد کی شاگردی اختیار کی۔ افق صاحب ان دنوں لاہور میں رہتے تھے۔ "زمانہ" اور "ادیب" جیسے نامور پرچوں میں نظمیں اور مضامین شائع ہونے شروع ہوگئے۔

۱۹۰۷ء کے شروع ہوتے ہی پنجاب میں کہرام مچ گیا۔ مسٹر گوکھلے نے پنجاب کا دورہ کیا اور قومی خیالات پھیلائے۔ فلک کھلی میدان میں کود پڑے۔ سردار اجیت سنگھ کو ساتھ لے کر اور کچھ نوجوانوں کی مدد سے "انجمن محبانِ وطن" قائم کی۔ پنجاب بھر میں دورہ کرکے ایسی حالت پیدا کردی کہ گورنمنٹ کو جھکنا پڑا۔ لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت کو جلاوطن کردیا گیا۔ انجمن محبانِ وطن کے ممبروں پر مقدمہ دائر ہوا۔ فلک اپنا کام دھندہ چھوڑ کر جگہ بہ جگہ لیکچر دیتے اور نظمیں پڑھتے تھے۔ چنانچہ پولیس نے ان پر بلوہ کا جھوٹا مقدمہ بنایا۔ پہلی عدالت نے ۹ ماہ قید سخت کی سزا دی۔ چیف کورٹ نے باعزت بری کردیا۔ اب فلک سورت کانگریس میں شریک ہوئے اور وہاں چوٹی کے محبان وطن کو دیکھا اور سنا۔ ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں متعدد قومی و ملکی جلسوں میں حصہ لیا اور اپنی نظمیں سنائیں۔ ۵ نومبر ۱۹۰۹ء کو گورنمنٹ آف پنجاب نے فلک پر بغاوت کے آٹھ مقدمات بنائے۔ تین مقدمات میں بری ہوئے پانچ میں تین سال۔ آٹھ ماہ قید سخت اور پانصد روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اپیل پر سزا کم کردی گئی اور ۱۹ جولائی ۱۹۱۱ء کو رہا کر دیے گئے۔ اخبار اور رسالے تو وہ متعدد بار جاری کرچکے تھے۔ ۵ فروری ۱۹۱۲ء کو "نظارہ" کا پہلا نمبر شائع کیا۔ ۲ اپریل ۱۹۱۷ء کو گرفتار ہوکر جیل خانہ چلے گئے۔

پنجاب میں ۱۹۰۷ء میں ہوئی جس ہل چل کا ذکر پہلے ہوچکا ہے جس میں فلک نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب کی خفیہ پولیس نے فلک کا نام پنجاب کے مشہور مستند پولیٹیکل شورش پسندوں کی فہرست میں لکھ لیا۔ کڑی نگرانی

ہونے لگی۔ ۹ سال تک مصائب سے دوچار رہنا پڑا۔

جولائی ۱۹۱۰ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ فروری ۱۹۱۲ء میں جب فلک پولیٹیکل تلاشیوں سے تنگ آ گئے تو انھوں نے پبلک زندگی میں ایک امن پسند اور وفا شعار دلیش سیوک کا رول ادا کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا نام اس لسٹ سے خارج کر دیا گیا۔ فلک کے مخالفین اور چند دشمن ملک اور حکومت کے مخبروں نے رپورٹیں دینا شروع کر دیں کہ لال چند فلک کانگریس سے مسٹر تلک کی خاص ہدایات لے کر آیا ہے اور لاہور میں مسٹر تلک کی ہوم رول لیگ کی شاخ کھول دی اور پورے پنجاب میں شاخیں کھول رہا ہے۔ سر میکائل اوڈوائر نے بغیر اطمینان کیے رپورٹوں پر بھروسہ کیا اور پیش بندی کے طور پر پنجاب میں تلک مہاراج اور بابو بپن چندر پال کی آمد کی ممانعت کا حکم جاری کر دیا۔ فلک نے اس امتناعی حکم کے خلاف آواز اٹھائی اور ۵ر مارچ ۱۹۱۷ء کو ایک سخت مضمون لکھا۔ ۲ر اپریل کو فلک کو انڈیا ڈیفنس ایکٹ کے تحت حراست میں لے کر تھانہ میں بند کر دیا۔ مکان اور دوکان کی تلاشی لی گئی۔ ۱۲ر مئی کو جانچ مکمل کر کے ۱۴ر مئی کو لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیا گیا۔ جہاں پھانسی کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ۲۸ر مئی کو فلک کے خلاف مقدمہ کی سماعت جیل کے اندر بیٹھنے والے کمیشن کے سامنے شروع ہوئی۔ استغاثہ نے ایسا جال بُنا کہ فلک کو عمر قید کالے پانی کی سزا دی گئی۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے دس سیر سونج کٹائی کرنے کا حکم سنایا۔ فلک نے انکار کر دیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے ایک ... کے لیے چکی پیسنے کی ظالمانہ سزا دی۔ فلک نے ایک شعر یہاں پر کہا ؎

فلک صاحب، یہ دونوں صاحبوں نے خاص شفقت کی
کٹائی مونج کی دی ایک نے اور اک نے چکی دی

مونج کبھی کوٹنی پڑتی اور چکی کبھی چلانی پڑتی۔
پھر فلک نے کہا ؎

؎ فلک بیکس پہ دونوں سرکلوں میں قہر و آفت ہے
مصیبت مونج کی ہے واں یہاں چکی کی زحمت ہے

فلک لکھتے ہیں کہ جیل کا داروغہ شعر و شاعری کا قدر شناس ہے۔ ایک دن ان سے کہا ؎

تمھارے عہد میں صد حیف ہے پیسے فلک چکی
فلک کیا مالکِ ارض و فلک کو سخت حیرت ہے

چکی پیستے پیستے فلک نے چند شعر کہے ؎

وہ ملزم ہوں جسے قانون کی سنگین چکی نے
سمجھ کر خشک دانا بے تکلف پیس ڈالا ہے

؎

پڑے ہیں پیسنے دانے فلک نازک خیالوں کو
کٹائی مونج کی ملتی ہے یاں بھارت کے لالوں کو

فلک کہتے ہیں کہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مادرِ ہند کے لیے کسی بھی سخت کام اور تکلیف کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا جائے درج ذیل اشعار اسی ولولہ اور عزمِ مصمم کا اظہار ہیں ؎

خوش ہو کے مونج کوٹیں گے چکی چلائیں گے
کولہو کنواں خراس خوشی سے پھرائیں گے

؎

درد و محن میں پھنس کے نہ گردن جھکائیں گے
مونچھوں پہ تاؤ دیں گے اکڑ بھی دکھائیں گے

؎

رنج و غم و الم میں بھی خوشیاں منائیں گے
سختی تمام جھیلیں گے کڑیاں اٹھائیں گے

؎

خود سہہ کے ظلم، ظلم کی ہستی مٹائیں گے
بھارت کے حال زار کو بہتر بنائیں گے

فلک لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک مراسلہ انگریزی

زبان میں لکھ کر ۸ جولائی ۱۹۱۷ء کو داروغہ جیل کے حوالے کیا جو اوڈوائر کے نام شملہ روانہ کیا گیا۔ لیکن اس سے پہلے ہی فلک کی عمر بھر کالے پانی کی سزا میں تخفیف کر کے ۱۴ سال کالے پانی کی کر دی گئی۔ جب سپرنٹنڈنٹ جیل نے سرکار کی اس مہربانی کا ذکر کیا تو فلک نے کہا کہ واقعی یہ بڑی مہربانی ہے جو عمر کے بیس سال چھین کر اس میں سے ۶ سال واپس کر دیے ہیں۔

فلک کی مندرجہ ذیل شکوہ آمیز غزل اسی واقعہ کی یادگار ہے جس کے لفظ لفظ سے غم و اندوہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بیگناہوں کو ستا کر کوئی سکھ پاتا نہیں
یہ حقیقت میں کہے دیتا ہوں خود سرکار کو

٭

باغِ بھارت میں چہکنے دے مجھے کچھ اور دن
بند پنجرے میں نہ کر مجھ مرغِ خوش گفتار کو

٭

ٹال دے میری بلا کو مجھ کو پنجرے سے نکال
دیکھنے دے مجھ کو پھر جا کر گل و گلزار کو

٭

میرا وہ ایشور نکالے گا مجھے بھی جیل سے
دی رہائی جس نے اُگرّ بے بس و لاچار کو

٭

بیس سالہ قید کٹنی ہے بہت مشکل مگر
سہل کر دے گا پربھو اس منزلِ دشوار کو

میری قیدِ غم کو آزادی بنا دے گا وہی
تھا بنایا جس نے سالگرام زہری مار کو

٭

توڑ ڈالا جس نے ظالم کنس کا راون کا سر
توڑ دے گا وہ ہی آ کر ظلم کی تلوار کو

فلک نے قید کے دوران بہت بار بھوک ہڑتال کی۔ مونج کوٹنے اور چکی پیسنے سے انکار کیا۔ ان پر سختی بھی بہت ہوئی۔ لیکن اس جیالے نے کبھی سرِ خم نہیں کیا۔

فلک کے جس مصرعہ سے اس مضمون کا آغاز ہوا تھا اس طنزیہ نظم (منظومہ اپریل ۱۹۱۱ء مطبوعہ ۱۹۱۴ء) کا مقطع ملاحظہ فرمائیے ؎

بدلا ہے پنڈی داس نے، جیتے نے رنگ ڈھنگ
تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا

لالہ پنڈی داس پنجاب کے بیحد بیباک اخبار "انڈیا" گوجرانوالہ کے دلیر دل ایڈیٹر تھے ——— اور مہتہ نند کشور انجمن محبانِ وطن کے پُر جوش سکریٹری تھے۔

فلک کی تصنیفات بھی دیکھیے :

(۱) کلامِ فلک (۲) پیامِ فلک (۳) جامِ فلک
(۴) مسدسِ فلک (۵) مخمسِ فلک (۶) آئینۂ فلک
(۷) مہابھارت بطرزِ ناول (۸) بھرتری ہری شتک
(۹) تربیتِ اطفال (۱۰) خیالاتِ گوکھلے
(۱۱) خیالاتِ لاجپت (۱۲) خیالاتِ دادا بھائی
(۱۳) خیالاتِ سیاجی (۱۴) دولت پیدا کرنے کا ڈھنگ (۱۵) ہندوستان کی کہانی
(۱۶) خیالاتِ گھوش (۱۷) جیل خانہ کی کہانی
(۱۸) تقاریر نوروجی (۱۹) سودیشی تحریک
(۲۰) صحت المستورات (۲۱) گنجینۂ دولت و تجارت
(۲۲) گھر کا حکیم (۲۳) ہندوستان جدید
(۲۴) میری قید کی رام کہانی (۲۵) قومی زندگی
(۲۶) سودیشی گیت و قومی ترانے

امید کامل ہے کہ ناقدانِ سخن اور پرستارانِ وطن ملک کے اس جیالے کے کام کا تجزیہ کریں گے۔ ●●

ہردیال شوق

یومِ آزادی

مسرت خیز و دلکش ہے بیانِ یومِ آزادی
حدیثِ زندگی ہے داستانِ یومِ آزادی

نرالی شان سے لہرا رہا ہے ہند کا پرچم
نشانِ یومِ آزادی ہے شانِ یومِ آزادی

جوانانِ عساکر کے شکوہِ جان بازی سے
نمایاں ہو گئی ہے آن بانِ یومِ آزادی

سنائی ہے صبا نے سب کو آزادی کی خوشخبری
چمن میں جمع ہیں نغمہ گرانِ یومِ آزادی

سپردِ جہدِ آزادی جنھوں نے کر دیا خود کو
وہی ہیں اصل میں روحِ روانِ یومِ آزادی

پہنچ سکتے ہیں تا اوجِ ثریا عزمِ راسخ سے
یہی ہے درحقیقت نردبانِ یومِ آزادی

خیالِ آبروئے خونِ شہدائے وطن رکھنا
ملا ہے جن کے دم سے ارمغانِ یومِ آزادی

جلایا تھا محبانِ وطن کے خون سے اس کو
رہے دائم فروزاں شمع دانِ یومِ آزادی

کیا ہے حق ادا اے شوقؔ تو نے ترجمانی کا
ترا ہر شعر برحق ترجمانِ یومِ آزادی

ایس۔ فضیلت

تکمیل

بمبئی فورٹ میں جہاں چاروں طرف سے آنے والی سڑکیں ایک مقام پر مل جاتی ہیں۔ وہیں ایک دائرہ نما چھوٹا سا مگر خوبصورت پارک ہے۔ اس پارک کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے لوہے کا بارجہ اور بارجے کے ساتھ ساتھ فٹ پیری ہے۔ رات گہری ہوتے ہوتے یہ پیری گندی سندی عورتوں، مردوں اور بچوں سے بھر جاتی ہے۔ عورتیں چولہے جلاتی ہیں۔ دال، سبزی روٹی بناتی ہیں۔ بچے آپس میں لڑتے ہیں۔ کھیلتے ہیں۔ اور مرد ٹانگیں پسار کر کھلے آسمان کی رفعتوں میں اپنے سنہرے خوابوں کی اچھوتی کائنات ترتیب دیتے ہیں۔ فٹ پاتھ کے اس طرف بس اسٹاپ ہے اور اس سے تھوڑی ہی دور ہے گرینڈلے اینڈ گرینڈلے ملٹی پرپز اسٹور! پہلی بار میں نے تمھیں یہیں دیکھا تھا۔ میں اپنی گاڑی کھڑی کرکے یوں ہی دو گھڑی کے لیے پارک میں بیٹھنے کی غرض سے اُتری تھی کہ اچانک مجھے تم نظر آئے تھے۔ تم عجیب سی نظروں سے شوکیس کے قدِ آدم شیشوں کے پیچھے لٹکے ہوئے سفید بالوں والے ایک لیڈیز کوٹ کو دیکھ رہے تھے۔ میں آج بھی سوچتی ہوں تو فیصلہ نہیں کرپاتی کہ وہ تمھارے خدوخال کی جاذبیت تھی یا تمھاری آنکھوں میں اُبھرتی ہوئی ایک عجیب سی حسرت اور مایوسی کا امتزاج جس نے مجھے انجانے ہی میں تمھاری طرف متوجہ کر دیا تھا۔ تم مجھے تعلیم یافتہ، مہذب اور کچھ منفرد سے نظر آئے۔ میں آہستگی کے ساتھ تمھارے قریب چلی آئی تھی اور میں نے شوکیس کے شفاف کانچ پر اپنی ناک ٹیک دی تھی۔ سفید افریقی لومڑی کی کھال کا بنا ہوا وہ کوٹ واقعی بہت پیارا تھا لیکن تمھیں کیا معلوم کہ وہ میری دسترس سے باہر نہیں تھا، میں جب چاہتی اسے خرید سکتی تھی۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں، تم نے وہ چاکلیٹ کلر کی امپورٹڈ کار کہاں دیکھی ہوگی جس سے میں تھوڑی دیر پہلے ہی اُتری تھی تم تو یہی سمجھے ہوں گے کہ میں بس کا انتظار کرتی ہوئی ملازمت پیشہ لڑکی ہوں اور اس قیمتی کوٹ کو چاہت کی تشنگی کے ساتھ دیکھ رہی ہوں ــــ

تم روز ہی اس بس اسٹاپ کے سامنے ملٹی پرپز اسٹور کے پاس مجھے دکھائی دیتے تھے۔ پہلے تو میں یہ سمجھی کہ شاید تم وہاں کھڑے ہو کر کسی بس کا انتظار کرتے ہو۔ لیکن بعد کو جیسا کہ تم نے بتایا تھا تم گرینڈلے کے شوکیس میں سجی ہوئی خوبصورت چیزوں کو حسرت سے تکا کرتے تھے اور میرا انتظار کرتے تھے

تم نے مجھے کسی آفس میں کام کرنے والی ایک عام ٹائپسٹ لڑکی ہی سمجھا تھا جو کسی دفتر کے بابو سے شادی کر کے عملی زندگی کی مشینری میں سیکنڈ ہینڈ پرزے کی طرح فٹ ہو جاتی ہے اور وقت سے پہلے REJECTED کا لیبل اپنے ماتھے پر چپکائے زندگی کی ساری لطافتیں کھو بیٹھتی ہے۔

پھر رفتہ رفتہ تکلف کے دائرے سمٹتے گئے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کو پہچاننے لگے۔ قربتیں بڑھتی گئیں۔ تم کسی کالج میں پڑھ رہے تھے اور بی۔ اے۔ فائنل میں تھے۔ میں روز تم سے اس جگہ ملتی تھی۔ تم کبھی پارک میں بیٹھ کر گپیں مارتے یا پھر شوکیس میں رکھے ہوئے اس سفید بالوں والے کوٹ کو تکا کرتے۔ اس کوٹ کو روز دیکھنا تمہارا معمول بن گیا تھا۔ وہ کوٹ کیا تھا۔ ایک عزیز ساتھی جسے دیکھے بغیر تمھیں چین نہیں آتا تھا۔ تم اکثر کہا کرتے۔

"میری زندگی کا وہ حسین ترین دن ہوگا جب یہ کوٹ خرید کر میں تمھیں اپنے ہاتھوں سے پہناؤں گا۔"

اپنے خیالوں میں تو تم روز ہی مجھے کتنا سجاتے تھے، سنوارتے تھے، — — — — — آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیتے تھے لیکن تمھارے پاس صرف خواب تھے۔ ان کی تعبیر نہیں۔ خواب جو انسانی ذہن پر دھنک کی طرح تن جاتے کسی رنگین حباب کی طرح انسانی سوچ کی سطح پر جنم لیتے ہیں اور آزمائش کے ایک ہلکے سے جھونکے کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔ بھک سے اڑ جاتے ہیں۔ تم صرف خواب دیکھتے رہے اور میں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کے لیے ترستی رہی۔

ہماری دوستی بڑھتی جا رہی تھی اور تمہاری بے تابیاں بھی! تم مجھے جوہو پر ملے تھے۔ اس دن میں نے بلیو جینز پر پنک کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی، بالوں کو سمیٹ کر باندھنے کے بعد یوں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بیچ پر ٹہلنے جاؤ تو بالوں کو ربن میں جکڑ کر جانا مجھے بالکل پسند نہیں۔ سمندر کی پاگل ہوا میں ادھر اُدھر لہراتے بال کبھی شانوں پر بکھرتے ہوئے کبھی گردن اور رخساروں کو چھپاتے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ یہ تازگی اور وارفتگی کا ایک عجیب سا احساس جگاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے اُس شام تم مجھے تکے چلے جا رہے تھے میں تمھاری ان نگاہوں سے پریشان ہو اُٹھی تھی۔

"اب دیکھ بھی چکو اور بھی بہت کچھ ہے یہاں دیکھنے کے لیے وہ دور سمندر کی آخری حد پر رکھا ہوا اتنا بڑا سا سورج، سمندر کی مچلتی ہوئی لہروں میں جیسے کسی نے لال رنگ گھول دیا ہو، یا جیسے کسی سہاگن کی مانگ میں سیندور کی لالی دور دور تک پھیلی ہوئی ریت، ناریل کے پیڑوں کے جھنڈ، سرگوشیاں کرتے ہوئے —"

"اور ڈوبتے سورج کا تمام تر سونا پگھل کر تمھارے بالوں پر تیرتا ہوا..." تم لوٹ پھر کر وہیں آ گئے تھے۔ میں جھنجھلا گئی تھی، تم ہنس پڑے تھے۔

تم نے کہا تھا "حسن کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو، اس کا ایک مرکز ہوتا ہے کسی پہاڑ پر کسی دریا کے کنارے، پھولوں سے لدی کسی وادی میں — ہر منظر میں ایک مقام ایسا ضرور ہوتا ہے جہاں کائنات کی تمام تر خوبصورتی جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔"

"اور یہاں، اس سمندر کے کنارے —؟"

"یہاں —؟" تم آگے بڑھے تھے۔ بڑی احتیاط سے تم نے میرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے پیچھے ہٹایا تھا۔ تمھاری انگلیاں سلاخوں کی طرح جل رہی تھیں۔ تم نے میرا چہرہ یوں اپنی ہتھیلیوں میں لے لیا تھا جیسے کوئی پجاری اپنے ہاتھوں میں کنول کا بڑا سا پھول رکھ کر بھگتی کی دھاراؤں میں کھو جائے تم بھی کہیں کھو گئے تھے اور تم نے کہا تھا "یہاں سمندر کے کنارے کائنات کے تمام تر حسن کا مرکز یہ ہے۔" پھر تمھارے ہونٹ میرے اوپر جھکتے چلے گئے تھے لیکن میں نے سر جھکا لیا تھا اور تمھارے سینے سے لگ گئی تھی۔ وہ لمحے وہ پاگل لمحے، گمراہی

کے تمام تر تقاضوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑے تھے لیکن اچانک ہی میں اٹھ بیٹھی تھی اور چند قدم دور جاکر کھڑی ہوگئی تھی۔ میرے سینے میں جذبات کا ایک مہیب سمندر تھا۔ میں کانپ گئی۔ کہیں یہ مجھے نگل نہ جائے۔ میرا وجود ایک حقیر سی کشتی کی طرح ڈولنے لگا۔

"تم نے مجھے آواز دی تھی۔" رجو!"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خاموشی سے پیٹھ موڑے کھڑی رہی تھی۔

"رجو — رجو —" تم بے تاب ہوئے جارہے تھے لیکن میں ہلی نہیں، اپنی جگہ کھڑی رہی۔ جھنجلا کر تم خود اٹھ آئے — قریب آکر میرے بازو پکڑ لیے۔ "کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو؟"

میں ہنس پڑی تھی۔ "جو ہوں وہی سمجھتی ہوں — اور کیا سمجھتی؟"

"میرا خیال تھا کہ تم پڑھی لکھی اور مہذب لڑکی ہو ..... لیکن تم ....؟"

"مہذب ہونے کا معیار اگر تمھاری نظر میں یہ ہے کہ کوئی لڑکی سمندر کے ویران ساحلوں پر، ہوٹلوں کی تنہائیوں میں، پارکوں کے گوشوں میں اپنے تقدس کا آنچل تار تار کراتی پھرے تو مجھے افسوس ہے کہ میں ایک انتہائی غیر معیاری، ناشائستہ اور غیر مہذب لڑکی ہوں۔"

وہ چٹان جو میرے پیروں تلے سے ابھی تھوڑی دیر پہلے کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اچانک اپنی جگہ مضبوطی سے جم گئی۔ تم زبردستی پر اتر آئے تھے۔ تم نے کھینچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ میرے گالوں پر اپنے گال رکھ دیے تھے۔ اُف! تم تو جیسے بخار میں جل رہے تھے میں ڈر گئی تھی۔ سہم گئی تھی۔ تم خوشامد پر اُتر آئے تھے۔

"رجو .... رجو تم نہیں جانتیں کہ تم کتنی حسین ہو، تمھارے سامنے میں کتنا کمزور ہو جاتا ہوں۔ اس بھڑکتی ہوئی آگ کو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ رجو پلیز۔"

"تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو ...." میں تڑپ کر تم سے الگ ہو گئی تھی۔

"اب میں تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔"

"میں شادی کے لیے ڈیڈی سے بات کروں گا۔"

"لیکن کیا ماں باپ کا آسرا تکنا دانشمندی ہوگی پرکاش؟" میں آج پوری طرح دانشمندی حقیقت بیانی پر اتر آئی تھی۔ تم نے حیرت سے میری طرف دیکھا تھا۔

"میرے ممی ڈیڈی کو تم نہیں جانتیں رجو۔ وہ عام قسم کے ماں باپ سے بہت مختلف ہیں۔ کیا میری خوشی کے لیے وہ دو وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکتے؟"

مجھے تمھاری اس بات پر ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔ زندگی کے لیے تمھارے خیالات کس قدر کمزور بنیاد پر قائم تھے۔ تم خود تو کچھ نہیں کرتے تھے۔ دو روٹیوں کے لیے بھی ماں باپ کے محتاج تھے۔ میں تمھیں اب کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی —

"لیکن تم کوئی سروس کیوں نہیں کرتے، دوسروں کی طرف تکنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر جوڑا سا بنا لیا تھا اور ریت پر بیٹھ گئی تھی۔ تم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دھیرے سے تھپتھپایا تھا۔

"سروس اس دور میں اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے رجو؟"

"دنیا میں کام کی کمی نہیں ہے، اکفین کرنے کے لیے دو ہاتھ چاہئیں۔ ایک اعتماد، بھروسہ، حوصلہ اور جد و جہد کا جذبہ چاہیئے۔ تمھارے اندر تو مجھے ان میں سے کوئی بات بھی نظر نہیں آئی۔"

اسی لمحے سمندر کے کنارے اس ریت پر جوہو بیچ کے اس رومان پرور سناٹے میں ناریل کے چھدرے جھنڈ کے نیچے پہلی بار میں نے تمھارا اصلی روپ دیکھا تھا۔ میں نے اپنا اور تمھارا موازنہ بھی کیا تھا۔ میں بے پناہ دولت

کی مالک ہوتے ہوئے بھی ایک خود مختار دوسروں کی محتاجگی سے آزاد زندگی کی متلاشی تھی۔ ایک ایسی زندگی جہاں مجھے کچھ زیادہ نہیں چاہیے تھا۔ ایک چھوٹا سا گھر، پھولوں اور کتابوں سے سجا ہوا، میری ایک ایک مسکراہٹ پر جان دینے والا مرد، اپنی محنت اور جفاکشی پر بھروسہ رکھنے والا مرد — ایک تم تھے حالات کے سامنے بے بس مجبور اور قسمت کے شاکی۔

اور تب ہی مجھے ایسا لگا جیسے ہر طرف سے کانچ کی بے شمار کرچیاں چیخ چیخ کر اڑی ہیں اور میری آنکھوں میں، میرے گالوں پر، میرے ہاتھوں میں میری ساری روح تک میں چبھی ہیں۔ میں رونے لگی ہوں۔ کوئی میرے آنسو پونچھنے والا بھی نہیں۔ کتنے ہی پل یوں ہی گذر گئے خاموش، اداس، بھاری۔ پھر ہم خاموشی کے ساتھ وہاں سے واپس لوٹ پڑے۔ راستہ میں تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لنک روڈ کے کنارے کھڑے ہو کر تم نے میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا، دھیرے سے "رجنی" کہا تھا اور پھر کسی طرف کو چلے گئے تھے۔ روشنیوں ہنگاموں اور آدمیوں کے اس سیلاب میں کتنی دیر تک وہاں کھڑی رہی تھی۔ پھر اچانک ہی ایک جانی پہچانی سی کار دھیرے دھیرے میرے قریب آگئی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا تھا۔ ڈیڈی تھے۔

"گھر چلو۔"

انھوں نے ایک عجیب سی آواز میں کہا تھا۔ اور میں بے جان سی پچھلی سیٹ پر گر گئی تھی۔ راستہ میں ڈیڈی نے مجھ سے کوئی لمبے چوڑے سوالات نہیں کیے۔ صرف اتنا ہی کہا تھا۔ "زندگی کے الٹے سیدھے تجربے کرنے کے لیے تمھاری عمر بہت چھوٹی ہے رجنی کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے ہاتھ زخمی کر بیٹھو۔"

اس دن کے بعد تم مجھے کبھی نہیں ملے لیکن تمھارا انتظار میرا مقدر بن گیا۔ میں اکثر اس پارک میں اس بس اسٹاپ پر یا پھر اس شوروم کے سامنے بے مقصد ہی گھومتی رہتی اور انتظار کرتی رہتی اس دن کا جب تم میرے لیے ہزاروں خوشیاں لے کر آؤ گے اور دھیرے سے میرے کان میں کہو گے۔ "رجنی میں تمھیں ایک مستقبل دے سکتا ہوں، ایک زندگی دے سکتا ہوں، ایسی زندگی جو پوری طرح ہماری اپنی ہوگی۔"

لیکن میں جانتی تھی تم نہیں آؤ گے تمھیں میرے جسم کا تقدس چاہیے تھا۔ وہ تمھیں ملا نہیں اور حقیقتوں کا سامنا کرنے کی ہمت تم میں تھی نہیں مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں تمھارا تجربہ کتنا ناقص اور تمھارے سوچنے کا ڈھنگ کس قدر عامیانہ تھا۔ ایک خریدی ہوئی زندگی تو میں بھی تمھیں جب چاہوں سوغات میں دے سکتی ہوں۔ ڈیڈی تو آج بھی میرے اشارے کے منتظر ہیں۔ جس کو چاہوں ان کے سامنے جا کر کھڑا کر دوں۔ وہ اسے زندگی کی ہر ضرورت سے مالا مال کر دیں گے لیکن میری سوچ الگ ہے میرے نظریات مختلف ہیں۔ تم مرد ہو کر بھی میری بات نہیں سمجھ سکتے۔ ایک عورت کے غرور کی حدیں کہاں، کہاں ہوتی ہیں، تم مرد ہو کر بھی میری بات نہیں سمجھ سکتے۔

تم مجھے وہ سفید بالوں والا کوٹ خرید کر نہیں دے سکے، مجھے اس کا دکھ نہیں۔ میں تو جب چاہوں اسے خرید سکتی ہوں لیکن میری خواہش تھی کہ وہ کوٹ تم اپنی محنت سے کمائے ہوئے پیسے سے خریدو اور مجھے پہناؤ۔ عورت کے دل کو تم نہیں جانتے۔ وہ لاکھ پیسے والی ہو، سرمایہ دار ہو لیکن مرد کی کمائی سے خریدی ہوئی ایک حقیر سی شے کو بھی پا کر بڑی مغرور ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسے ہی ارمان تھے میرے! لیکن یہ سارے تجربے کی آگ میں جھلس کر رہ گئے۔

تمھیں یاد ہوگا، پارک میں جس جگہ بیٹھ کر ہم تم باتیں کیا کرتے تھے، وہاں سے تھوڑی دور ایک آرٹسٹ

اپنی پینٹنگ لگاتا تھا۔ اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا وہ اکثر غیر ملکی لڑکے لڑکیوں سے گھرا رہتا۔ وہ لوگ اس سے اپنے پینسل اسکیچ بنواتے تھے۔ تم ہمیشہ ہی اس کا مذاق اڑاتے تھے۔" ہنہ! صورت نہ شکل اور قسمت دیکھو!"

وہ بھی اکثر تمھارے طنز آمیز فقرے سن لیتا اور ہنس دیا کرتا تھا۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ وہ آرٹسٹ اپنی ٹانگوں سے محروم ہے۔ اپنی مصنوعی ٹانگوں پر زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا اور نہ ہی محنت کا کوئی کام کر سکتا ہے۔ یہ نوجوان آرٹسٹ تمھیں بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ ایک تو معمولی سے خدوخال اور پھر اپاہج ---! یاد ہے اس نفرت کی ابتدا کہاں سے ہوئی تھی۔ ایک دن تم مجھے ساتھ لے کر اس کے قریب گئے تھے۔ اور تم نے اس سے کہا تھا۔" ایک تصویر ہم دونوں کی ایک ساتھ پینٹ کر دو۔"

"آپ دونوں کی تصویر، ایک ساتھ ---؟"

نہ معلوم وہ کیا کہنا چاہتا تھا، لیکن بعد میں جب وہی بات میں نے دہرائی تو تمھارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ تم نے غصے سے کہا تھا۔

"لنگڑا --- سالا۔"

ہاں یاد آیا، تم ہی نے تو مجھے بتایا تھا۔" یہ ارُن کمار گوئل ہے۔ ٹرین کے حادثے میں اپنی ٹانگیں کھو بیٹھا ہے۔"

مجھے کرید ہو گئی تھی۔ میں اکثر تم سے پوچھا کرتی "کیسے ہوا تھا وہ حادثہ تمھیں تو معلوم ہوگا؟"

تم اس موضوع پر چڑ جاتے۔ میرے اوپر غصہ کرنے لگتے۔" رجو تمھیں تو ہر وقت ایک ہی رٹ لگی رہتی ہے۔ ارن کمار گوئل، ارُن کمار گوئل، ارُن کمار گوئل۔ ٹرین کا حادثہ..... وہیل چیئر۔"

یاد ہے تم نے ہی ایک بار مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ ارُن کمار گوئل پوسٹ گریجویٹ ہے لیکن تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ ریلوے لائن پر ایک خودکشی کرتے ہوئے نوجوان کو بچانے کی کوشش میں وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ اس کا بوٹ پٹری کے کنارے میں الجھا اور وہ گر گیا۔ اگلے ہی لمحہ ایک ڈیزل انجن اسی کی ٹانگوں کو پیستا ہوا آگے نکل گیا تھا۔ یہ سب باتیں تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئیں۔ تمھیں اس کی پینٹنگز بھی بالکل پسند نہیں تھیں۔ اس کی تصویروں میں تھا بھی کیا۔ میلے میلے رنگ، بھدے نقوش، اداسی، دکھ اور سوگواری کا احساس لیے ہوئے ایک عجیب سا کرب، یوں محسوس ہوتا جیسے ان تصویروں کو بنانے کے لیے فنکار خود آزمائش کی تپتی ہوئی آگ سے گزرا ہے۔ اس کی تصویروں میں اور تو کچھ نہیں اس کا اپنا کردار، اس کی شخصیت، اس کی سوچ کا ڈھنگ تھا جس میں انسان کے دو ہاتھوں کی بے پناہ طاقت اور عظمت کی عکاسی کی گئی تھی۔ بے جان پتھر سوکھے ہوئے پیڑ، کانٹے دار جھاڑیاں اور ان کے بیچ کھلا ہوا ایک ننھا سا پھول، امید کی کرن بن کر جگمگاتا ہوا۔ غم اور خوشی کا بڑا حسین امتزاج تھا اس کی پینٹنگز میں!

ایک دن کی بات تمھیں بتاؤں۔ ارُن کمار گوئل اتفاق سے تنہا تھا۔ میں پہلے تو گھوم پھر کر اس کی پینٹنگز دیکھتی رہی۔ پھر میں نے خود ہی بات کرنے میں پہل کی۔ کچھ عجیب سی کشش ہے اس شخص میں کہ خود بخود متوجہ ہونے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"میرے بارے میں یا میری پینٹنگز کے بارے میں؟"

الٹا اس نے مجھ ہی سے پوچھ لیا۔ عجیب آدمی ہے یہ!

مجھے اس کا سوال اچھا نہیں لگا۔ میں نے اس سے کہا۔" آپ کی تصویروں میں کہیں رنگوں کی شوخی، فطرت کا حسن اور زندگی کی دلکشی --- میرا مطلب ہے آپ کی اپنی عمر نظر نہیں آتی۔"

"یہ تصویریں میں نے خود ہی بنائی ہیں محترمہ۔" اس نے بہت ٹھوس لہجہ میں جواب دیا اور ہر تصویر میں صرف میں ہی ہوں۔ یہ تصویریں میری طرح ادھوری نہیں ہیں۔"

اس کی بات میں ایک سوگواری تھی۔ ایک ایسا درد جو میرے سینے میں کہیں چبھ گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ مجھے یہ بات پوچھنی نہیں چاہیے تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی بولا۔"اگر میں یہ کہوں کہ زندگی سے جو کچھ بھی مجھے ملا ہے وہی میں نے اپنی تصویروں کو دیا ہے تو یہ کوئی حیرت انگیز انوکھی بات نہیں ہوگی۔ ہر فنکار اپنے ایک خاص ماحول کی دین ہوتا ہے۔"

ماحول ایک دم بھاری ہوگیا تھا۔ میں نے موضوع بدلنے کی غرض سے کہا۔" ایک تصویر میری بھی پینٹ کر دیجیے"

"آپ کی؟" اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔

"ہاں میری ---- آپ حیران کیوں ہوگئے۔ کیا میں اتنی بدصورت ہوں۔"

وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا۔ بولا۔" میں اگر ان بے جان رنگوں کو آپ کے خوبصورت خدوخال کی شکل دے بھی دوں تو آپ کے اندر چھپی ہوئی اس بے چین روح کو کیسے پینٹ کروں جو تشنہ ہے، نامکمل ہے۔"

میں خاموش ہوگئی۔ یہ شخص غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔ اس نے میری ویران زندگی کے سناٹوں میں دستک دی تھی۔ میری روح کی تشنگی کو کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ میں وہاں زیادہ دیر کھڑی نہ رہ سکی اور چلی آئی۔ اس دن تم مجھے ایک بار پھر بہت یاد آئے۔ یادیں بڑی بے رحم ہوتی ہیں۔ یہ اپنے ناخن انسانوں کے ذہن میں گاڑ کر اس کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔ میری روح ان ظالم یادوں کے کرخت پنجوں میں تلملا رہی ہے۔ ہر سوال کا تعلق ایک دوسرے سوال سے ہوتا ہے۔ اس لیے اب میں نے سوال کرنا چھوڑ دیئے ہیں۔ ورنہ ڈر ہے کہ کہیں الجھتی نہ چلی جاؤں۔ اور اب سوال کروں بھی کس سے؟

آج ایک بار پھر اس فٹ پاتھ پر کھڑی اپنی ریزہ ریزہ شخصیت کو چن رہی ہوں۔ تمہارے پیار نے اور اس کے انجام نے ایک ایسی کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے جس کو میں کوئی نام نہیں دے سکتی۔ اپنے آس پاس کے لوگ یہ شہر کے ہنگامے سبھی کچھ کھوکھلا سا محسوس ہوتا ہے کتنی دیر سے سڑک پار کرنے کے لیے کھڑی ہوں لیکن اس بے پناہ رش سے سہم کر رہ گئی ہوں۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔ سڑک پار کرنے کے لیے میں نے کبھی ریڈ لائٹ کا انتظار نہیں کیا۔ ناکامی نے میرے اعتماد کو کیسی ٹھیس پہنچائی ہے نا۔ الیکٹرک پول پر بیٹھی ہوئی کسی ننھی منی چڑیا کی چونچ سے گھاس کا ایک تنکا گرا ہے اور میرے بالوں میں الجھ گیا ہے۔ ہائے، کتنی حسرت سے وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ کاش میرے ہاتھ اتنے لمبے ہو جائیں کہ میں بلندیوں پر بنے ہوئے گھونسلوں میں بھی تنکے سجا سکوں اور کوئی گھونسلہ میری آنکھوں کے سامنے نہ اجڑے۔

سڑک پار کر کے پارک میں پہنچی تو دیکھا کہ ایک فرانسیسی لڑکی اڑن کمار گوبل کا دماغ چاٹ رہی ہے۔ اڑن اس سے فراٹے دار فرانسیسی بول رہا تھا۔ یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ فرانسیسی تو مجھے بھی نہیں آتی۔ میں تو اسے کینوس پر رنگ پوتنے والا ایک آرٹسٹ ہی سمجھی تھی لیکن وہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ وہ دونوں باتیں کرتے رہے، میں سنتی رہی۔ اتنا اندازہ تو مجھے ہوا کہ یہ باتیں تصویروں یا رنگوں سے متعلق نہیں تھیں۔ کوئی اور ہی موضوع تھا۔ کیونکہ بار بار لڑکی کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں سی ابھرتیں اور ڈوب جاتیں۔ اڑن کے سانولے چہرے پر بھی کئی رنگ آئے اور گئے۔ یکایک لڑکی کا تیز لہجہ سمجھوتے کے سے انداز میں تبدیل ہوگیا۔ اب وہ انگریزی بول رہی تھی۔ اڑن بھی اسے انگریزی ہی میں جواب دے رہا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی انگریزی بھی بول سکتا ہے میں دھیرے دھیرے ان دونوں کی بات سمجھنے لگی۔ چند منٹ ہی میں پورا قصہ سمجھ میں آگیا۔ لڑکی کے ہاتھ میں اڑن کا

بنایا ہوا پینسل اسکیچ تھا جسے اس نے تہہ کرنا شروع کر دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے دیکھا اس کی گہری نیلی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ چند لمحوں تک وہ اس کے قریب کھڑی ہوئی کانپتی رہی۔ پھر بڑے پیار سے جھک کر اس نے اُرن کے گالوں کو اپنے گالوں سے چھوا اور تیزی کے ساتھ پارک سے باہر چلی گئی۔ میں نے اسے دور تک سڑک پر جاتے ہوئے دیکھا۔ اُرن بہت الجھا ہوا اور پریشان سا نظر آتا تھا۔ میں نے قریب آکر اس سے کہا۔ "تم اس لڑکی سے سمجھوتہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

اپنی بے تکلفی پر مجھے خود حیرت تھی۔ میں نے پہلی بار اسے "تم" کہا تھا۔

وہ بولا۔ "تم نے میری پوری بات سن لی ـــــ اوہ سوری، آپ نے میری پوری بات سن لی۔"

میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولا۔ "ایسی بات نہیں ہے ... " اس نے پہلی بار میرا نام جاننا چاہا۔

"رجنی ـــ" میں نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں تو مس رجنی۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میں اک سادل توڑ کر لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ وہ ایک مالدار باپ کی بیٹی ہے فرانس لے جانا چاہتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ اس کی پسندیدگی کا جذبہ ہے یا رحم کا ـــــ؟ ممکن ہے وہ مجھے فرانس والوں کے لیے ایک اچھی 'نمائشی چیز' بنا کر لے جانا چاہتی ہو۔ یا پھر اس کے رحم و کرم پر پلنے والا ایک اپاہج شوہر ـــ!"

اس کی باتیں میں نے سنی تھیں۔ اس کے لہجے سے اس کی بے پناہ چاہت کا اظہار ہی ہوتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے یہ ٹھیک ہی ہو، ممکن ہے میرے جسمانی ادھورے پن نے اس کے دل میں رحم اور پیار کی ملی جلی شمعیں روشن کر دی ہوں مگر میں ہندوستان چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں جا سکتے؟"

"یہ کھٹی میٹھی مجبوریوں، دکھوں اور خوشیوں میں رچی ہوئی زندگی تو صدیوں سے ہمارا مزاج رہا ہے۔ میں کروڑوں میں کھیل کر کیا کروں گا اور پھر اپنے کردار کی اس خرید و فروخت کے بعد کمتری کا جو احساس پیدا ہوگا وہ کیا مجھے کبھی چین سے بیٹھنے دے گا۔ مجھے اپنی موجودہ زندگی سے کوئی شکایت نہیں، محرومی یا مایوسی کا ہلکا سا احساس بھی نہیں کیونکہ جو کچھ مجھے میسر ہے، لاکھوں کو وہ بھی حاصل نہیں۔"

اُرن کے اس جواب پر میں حیران رہ گئی۔ یہ شخص کس قدر مکمل ہے۔ اس لمحہ پارک کے سبزہ زار پر کھڑے ہو کر ایک بار پھر میں نے تمہاری ادھوری شخصیت کے بارے میں سوچا تھا، مجھے محسوس ہوا تھا کہ تمہارے ہاتھ تمہاری اپنی ہی تشکیل کی ہوئی سکالی نے کاٹ لیے ہیں۔ تمہاری دونوں ٹانگوں پر سے وقت کا دیو قامت انجن دندناتا ہوا گذر گیا ہے اور تم کسی اپاہج کی طرح بڑی مایوس نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے ہو۔ اچانک ہی میرے احساس کی سطح پر تمہارا چہرہ کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ اور ایک سانولا چہرہ مردانہ وقار اور خود اعتمادی کی چمک لیے ابھرتا ہے۔ اُرن کمار گوبل کا چہرہ ـــــ اس کا قد اچانک ہی مجھے آس پاس کے تمام انسانوں سے زیادہ بلند نظر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ آسمانی رفعتوں کو چھو رہے ہیں۔ اس کے ماتھے پر حوصلہ مندی کا سورج چمک رہا ہے۔

میں اس سے کہتی ہوں۔ "حکومت نے 'ڈس ایبلڈ' لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے پروگرام شروع کیے ہیں۔ آپ ان سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟"

میں نے دیکھا کہ اچانک ہی اس کے تمام جسم کا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر، اس کی آنکھوں میں آگیا ـــ اس کی مٹھیاں تن گئیں۔ اس نے وہیل چیئر کے بازو کو

زور سے پکڑ لیا۔ اور بولا۔

"آپ کی نظر میں ایک اپاہج شخص کی کیا پہچان ہے؟ کیا وہ اپاہج ہیں جو کسی اتفاقیہ حادثہ میں اپنے ہاتھ پیر توڑ کر معذور ہو گئے یا وہ جو ہاتھ پیر سلامت ہوتے ہوئے بھی اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگا رہے ہیں جو محنت کی عظمت اور خودی کی لذّت سے واقف نہیں۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ میں مبہوت سی، نادم سی کھڑی تھی اور اس کے اٹھے ہوئے چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر مایوسی کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہیں تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ریل کے اس حادثے نے میری ٹانگیں لے لیں، لیکن وہ میرا حوصلہ نہیں لے سکا۔ اس آہنی انجن کے پہیے میری ہمت، میرے ارادے اور میرے عزائم کو نہیں کچل سکے۔ بھگوان کا شکر ہے کہ میرے دونوں ہاتھ سلامت ہیں اور ان ہاتھوں سے میں آسمان کو بھی نیچے جھکا سکتا ہوں۔"

اس وہیل چیئر والے اپاہج نوجوان کے لیے میرا رحم کا جذبہ کسی اور ہی جذبے میں بدلتا جا رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم لیکن مجھے لگتا ہے جیسے سامنے فٹ پاتھ کے سیاہ پتھروں پر ہزاروں شمعیں ایک ساتھ روشن ہو گئی ہیں اور ان کی مقدّس روشنی میں مجھے ایک راستہ نظر آ رہا ہے، ایک منزل دکھائی دے رہی ہے۔ میں اس کی وہیل چیئر کے بالکل قریب آ گئی ہوں۔ اس کے بالکل سامنے آ کر میں نے چیئر کے دونوں بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے ہیں۔ میری آنکھوں میں سے چند قطرے ڈھلک کر اس کے دامن پر گرے ہیں۔ اس نے دھیرے سے میرے ٹھنڈے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ جانتے ہو وہ لمحہ ــــ وہ لمحہ بڑا فیصلہ کن تھا۔ وہ لمحہ میری ویران زندگی کو کیا کچھ دے گیا، تمھیں کیا معلوم۔ میں نے اُن کے پُر وقار چہرے پر اپنے بہت سے سوالوں کے جواب پا لیے ہیں۔ اب میں تمھیں کیسے بتاؤں کہ مجھے تمھارا بالکل بھی انتظار نہیں ہے۔ ایک خوشگوار سا جھونکا میرے اندر زندہ رہنے اور پیار کرنے کی ایک عجیب سی خواہش کو پھر سے جگا گیا ہے۔ وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا یہ شخص میرا ہاتھ پکڑے افق کے اس پار لیے جا رہا ہے۔ جہاں ایک چھوٹا سا گھر ہے ــ ڈھیر پھولوں پتیوں اور کتابوں سے بھرا ہوا۔ وہاں کوئی امپورٹیڈ کار نہیں، غیر ملکی کپڑوں اور سینٹوں کی بھرمار نہیں بلکہ اس سے بھی بلند ایک ایسی زندگی ہے جو صرف اپنے دو ہاتھوں کا آسرا تکتی ہے، دوسروں کے ہزاروں بازوؤں کا نہیں۔

مغربی افق پر شام گہری ہو گئی ہے۔ میں بڑے پُر اعتماد قدموں سے چلتی ہوئی اس کی وہیل چیئر کے پیچھے آ کھڑی ہوتی ہوں اور دھیرے دھیرے اسے آگے کی طرف سرکاتے ہوئے اس سے کہتی ہوں۔

"شام ہو گئی ہے۔ آؤ اب ہم سڑک پار کر لیں۔"

○○

بقیہ اختلافِ اوزان بربنائے تلفظ ص ۲۶ سے آگے

؎ مانا مری حالت اب رَدِی ہے
بہتر ہے وہی جو کچھ بَدی ہے

(مثنوی گلزارِ نسیم)

وزن: مفعولُ مفاعی لن فعولن
اخرب سالم محبوب

بحر ہزج مسدّس اخرب، سالم، مجبوب

"رَدی" بروزن فعل آیا ہے

حالؔی اور نسیمؔ دونوں کے یہاں تلفُّظ الگ الگ۔

ان الفاظ کے علاوہ اور بھی بہت سے الفاظ ایسی نوعیت کے ہیں جن کے تلفُّظ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسی شکل میں جب ایک لفظ کے تلفُّظ میں اختلاف آ جاتا ہے تو یہی زیبا ہے کہ جو روش بھی اختیار کی جائے پورے کلام میں شروع تا آخر قائم رہے۔ یہ نہیں کہ کہیں کچھ ہو اور کہیں کچھ۔

○○

غزلیں

تسنیم فاروقی

عکس تو اپنا دیکھا لیکن خود کو نہیں پہچانے لوگ
پانی کی لہروں پر بیٹھے لکھتے رہے افسانے لوگ
بیگانی بیگانی راہیں بیگانے بیگانے لوگ
شہر کی گلیوں میں پھرتے ہیں دیوانے دیوانے لوگ
حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہو اس دنیا کی ریت ہے یہ
جاتے ہیں دھوکا کھا کے یہاں سے آتے ہیں دھوکا کھانے لوگ
دھوپ کو پھیلے عرصہ گذرا، سورج لال سے زرد ہوا
کتنے اطمینان سے لیکن سوتے ہیں چادر تانے لوگ
اے تسنیم محبت اب بھی مل جاتی ہے چہروں میں
جانے پہچانے لگتے ہیں اکثر کچھ انجانے لوگ



جن کی کوشش ہو کہ دنیا جان لے
کون ایسوں کا کوئی احسان لے
بیچنے نکلا ہوں میں دل کا چراغ
چاہتا یہ ہوں کوئی نادان لے
پار اترنے کا کرے وہ فیصلہ
جو خوشی سے اپنے سر طوفان لے
پھر تو صحرا میں مکاں ہو جائے گا
شہر کی خاک اور کچھ دن چھان لے
چھوڑ دے تسنیم دل کا کاروبار
باز آجا میرا کہنا مان لے

ڈاکٹر زار علامی

اختلافِ اوزان بربنائے تلفظ

اُردو زبان ایک ایسی زبان ہے جس نے اپنے دامن میں بہت سی زبانوں کے الفاظ سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس زبان کا دوسری زبانوں کے مقابلے میں عربی اور فارسی سے کچھ زیادہ ہی علاقہ رہا ہے۔ اس لیے عربی اور فارسی کے الفاظ کی بہتات پائی جاتی ہے۔ اس زبان کو عربی اور فارسی کا لب ولہجہ کبھی راس نہیں آیا۔ اسی لیے اس کے یہاں عربی اور فارسی کا وہ لب ولہجہ نہیں ملتا جو عرب اور ایران میں سنائی دیتا ہے۔ اعراب کی تبدیلیوں نے اصل الفاظ کی صورت ہی بگاڑ دی۔ زبر کی جگہ زیر یا پیش اور زیر یا پیش کی جگہ زبر آجانے سے تو اوزانِ الفاظ میں کوئی فرق نہ پڑا مگر متحرک حروف کے ساکن ہو جانے پر الفاظ کے اوزان کچھ سے کچھ ہو گئے۔ مثلاً "جَجْم" اصلاً یہ لفظ بہ سکون جیم صحیح ہے۔ یعنی "جَجْم" بروزن فاع۔ لیکن ہمارے یہاں عام طور پر بہ تحریک حرفِ دوم یعنی "جَجَم" بروزن فَعَلَ ہی سننے میں آتا ہے۔

"خَفَقان" میں اصلاً پہلے تینوں حروف پر زبر ہے یعنی بروزنِ "فَعِلان" مگر سننے میں "خفْقان" بروزن "فعْلان" آتا ہے۔

پڑھے لکھے اصحاب بھی ہمارے یہاں ایک روش کے پابند نہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو اصل تلفظ میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہیں کرتے۔ اور دوسرے وہ ہیں جو اپنے یہاں بدلی ہوئی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

اُردو زبان میں یہ بھی ہوا کہ کچھ الفاظ کے معنی، اصل معنی کے علاوہ دوسرے معنی میں استعمال ہونے لگے مثلاً "روزگار" اصلاً زمانہ کے معنی میں ہے مگر ہمارے یہاں 'پیشہ' کے معنی میں آتا ہے۔ "تردُّد" اصل معنی "آمد و رَفت" مگر ہمارے یہاں "تشویش" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

ان صورتوں کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی تبدیلیاں آئیں مگر اس مقام پر ہمارا موضوعِ گفتگو صرف اختلافِ اوزان ہے لہٰذا ہم اسی پر بات چیت کریں گے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوزان کے معاملہ میں کس روش کو اختیار کیا جائے۔

ہر لفظ کا ایک وزن ہوتا ہے۔ اس وزن کے تعیّن کا دار و مدار اس کے تلفّظ پر ہے کہ وہ کس ڈھنگ سے بولا جاتا ہے۔ اردو زبان میں عام طور پر زیادہ خَبط انھیں الفاظ کے تلفظ سے متعلق ہے جو اِدھر اُدھر سے وارد ہوتے ہیں۔ اصل زبان میں یعنی جس زبان سے وہ الفاظ ہمارے یہاں آئے ہیں اُن کا تلفّظ کچھ اور ہے اور ہمارے یہاں کچھ اور۔ ایسی شکل میں اگر ہم اصل زبان کے تلفّظ کو سامنے رکھ کر بحث کرتے ہیں اور اس تلفّظ کو

سامنے رکھ کر بحث کرتے ہیں اور اُس لفظ کی بدلی ہوئی صورت کو (یعنی جو ہمارے یہاں بکثرت پائی جاتی ہے) غَلَط قرار دیتے ہیں تو یہ اس لیے درست نہیں کہ ہماری زبان ایک زندہ زبان ہے اور ہر زندہ زبان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دوسری زبان کے الفاظ کو اپنے مزاج کے مطابق اپنے سانچے میں ڈھال لے۔

اصل صورت سے انحراف اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ صحیح صورت کو من وعن وہی رہنا چاہیے جو اصل زبان سے متعلق ہے۔

ان دونوں باتوں کو جب ہم سامنے رکھتے ہیں تو اوزان کے تعین کا معیار لڑکھڑا جاتا ہے۔ اور کوئی واضح صورت ہمارے سامنے نہیں آتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقے پر اعتراضات کرتا ہے اور دونوں فرقے ایک دوسرے کو غلط سمجھنے لگتے ہیں۔

کسی حد تک قافیہ کے معاملہ میں دونوں فرقے ہم خیال ہو جاتے ہیں مگر یہاں بھی کچھ الفاظ میں حرفِ دری سے ماقبل حرف کی حرکت کا جھگڑا سامنے آتا ہے۔ مثلاً "گھائل یا گھایل" اس لفظ کا اِملا جب ہمزہ سے لکھا جائے گا تو دِل اور بِسمل کا ہم قافیہ کیا جا سکے گا۔

اور اگر اس کا اِملا 'ی' سے کیا جائے گا تو "بادَل۔ جَل تھَل۔ کا جل" کا ہم قافیہ کیا جا سکے گا۔ اب یہاں بھی وہی تلفظ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ایسے مقامات پر دونوں فریق اپنی بات کے ثبوت میں اساتذہ کے کلام سے اسناد پیش کرتے ہیں اور کوئی بھی حتمی فیصلہ اس لیے نہیں ہوتا کہ دونوں قسم کی اسناد سامنے ہوتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اَشْرَفی [illegible] ۔ اَشَرْفی [illegible]

دونوں صورتوں میں اعداد یکساں مگر اوزان الگ الگ ہیں

شعر ملاحظہ ہو ؎

ہوا سے اَشْرَفی کے پھول سبزے پر گرے جس دم
عروسِ باغ نے اوڑھا دوپٹا کامدانی کا
(اماؔنت)

یہ شعر بحرِ ہَزَج مثمن سالم میں تخلیق ہوا ہے اور اَشْرفی کا شین ساکن ہو کر آیا ہے۔ یعنی اَش رَ فی [illegible]

تقطیع دیکھیے:

ہوا سے اش رفی کے پھو ل سبزے پر گرے جس دم
مَفَاعی لُن مَفَاعی لُن مَفَاعی لُن مَفَاعی لُن

سہ مانی ہوں ملیں بھی سو سو کروڑ ڈھب کی
دھو دھو روپے اَشَرفی نذریں اُٹھائیاں ہوں (اِنشاؔ)

یہ شعر بحر مضارع مثمن "اخرب، مکفوف، مکفوف مخنق، سالم" میں تخلیق ہوا ہے۔ دوسرے مصرعے کی تقطیع دیکھیے:

دھو دھور پے اَشَرفی نذریں اُ ٹھاءِ یاں ہوں
مفعولُ فاعِلاتُ مفعولُ فاعِلاتن
اخرب مکفوف مکفوف مخنق سالم

اماؔنت اور انشاؔ دونوں ہی استاد۔ دونوں استادوں کا تلفظ الگ الگ۔ یہ اشعار دیکھیے:

وہ تقویم پارینہ یونانیوں کی
وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی
یقیں جس کو ٹھہرا چکا ہے نِکمّی
عمل نے جسے کر دیا آ کے ردّی

یہ بند بحرِ متقارب مثمن سالم "فعولن، فعولن، فعولن، فعولن" حاؔلی میں تخلیق ہوا ہے۔

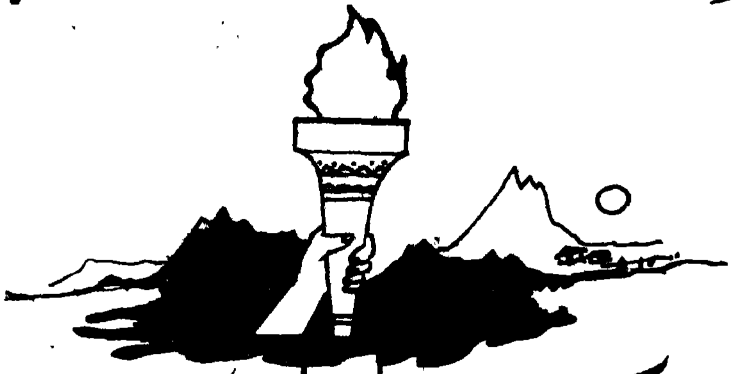
چوتھے مصرع کی تقطیع دیکھیے:

عمل نے جسے کر دیا آ کِ رَدّی
فعولن فعولن فعولن فعولن

رَدّی کے دال پر تشدید۔ ردّی بروزن فعلن آیا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

دیوان تصوّر



لمحۂ فکریہ

ان نفرت کی دیواروں کو تم کب تک اور اٹھاؤ گے
تم کب تک خونِ معصوماں دیوانہ وار بہاؤ گے
کیوں روندتے ہو ان پھولوں کو یہ آپ کا اپنا گلشن ہے
سوچو تو سہی کچھ اہلِ وطن گھر اپنا آپ جلاؤ گے
کچھ سوچ رہے ہیں ہندوستاں جاگیر ہے ان کے باوا کی
یہ سب کا چمن ہے سب کا وطن مِل جُل کر ہی رہ پاؤ گے
تلسی، گوتم، نانک، خسرو تم سب کے نغمے بھول گئے
شیطان کی باتیں یاد رہیں دیکھو اِک دن پچھتاؤ گے
کچھ پریم کے نغمے گاؤ تم کچھ پریت کے گیت سناؤ تم
اس دیش کو سورگ بناؤ تم کل عالم پر چھا جاؤ گے
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی گر مِل کے رہو گے بھارت میں
کہتا ہے تصوّر سودائی دُنیا کو راہ دکھاؤ گے

مہندر پرتاپ چاند

ایک ہیں ہم...

اپنا رستہ ایک، منزل ایک ہے
ہے عقیدہ ایک، محفل ایک ہے
دشمنِ مکر و ریا ہیں دل سے ہم
عاشقِ صدق و صفا ہیں دل سے ہم
سرکشی ہے کفر اپنے دین میں
زرکشی ہے کفر اپنے دین میں
کعبہ و دیر و کلیسا کی فصیل
کوہسار و دشت و دریا کی فصیل
روک ہی سکتی نہیں ہرگز ہمیں
ٹوک ہی سکتی نہیں ہرگز ہمیں
راست گو ہیں، خوش عمل ہیں، نیک ہیں
ایک ہیں ہم، ایک ہیں ہم ایک ہیں

راجندر

جنگِ آزادی
میں
اُردو صحافت کا مقام

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو صحافت نے قربانی کے میدان میں جس ثابت قدمی کا ثبوت دیاہے اس کی مثال ہندوستان میں تو کیا ہندوستان کے باہر ممالک کی انقلابی تحریکوں میں ملنی محال ہے۔

کہا جاتاہے کہ زارشاہی کے زمانے میں روس کے دو انقلابی اخباروں پراودا اور اسکرا کو زندہ رکھنے کے لئے سینکڑوں انقلابیوں نے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ اردو صحافت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جب ایک ایک اداریہ کو جسے حاکمان وقت نے باغیانہ قرار دیا۔ چھاپنے پر اخبار کے مالک یا پرنٹر یا ایڈیٹر (اس زمانے میں اخبار کے مالک ہی ایڈیٹر ہوتے تھے۔ کیونکہ اخبار وہی لوگ نکالتے تھے جن کے دل میں آزادیٔ وطن کے لئے تڑپ ہوتی تھی) کو سزائے موت دی گئی۔ یا زندگی بھر تڑپ تڑپ کر مرنے کے لئے اسے انڈیمان کی دوزخ میں جھونک دیا۔

ہمارے ملک میں اردو زبان میں ایک ایسا اخبار بھی تھا جس کا ذکر تاریخ صحافت کی درسی کتابوں میں بھی نہیں ملیگا کیونکہ انگریزی سرکار کو اس کا نام تک سننا بھی گوارا نہیں تھا لیکن اس اخبار کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ صرف ڈھائی برس کی قلیل سی مدت میں یکے بعد دیگرے اس اخبار کے چار ایڈیٹروں کو انقلابی مضامین اور نظمیں شائع کرنے کی الزام کی پاداش میں حبسِ دوام کے لئے کالے پانی کے زنداں میں ٹھونس دیا گیا۔ اس ہفتہ وار اردو اخبار سوراجیہ (الہ آباد) کو ۱۹۰۷ء میں لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک کے آشیرواد سے انقلاب پسند نوجوانوں نے شروع کیا تھا۔ اس اخبار کو شروع کرنے کا پس منظر یہ تھا۔ کہ لالہ لاجپت رائے اور ان کے ساتھیوں نے قومی پرچار کے لئے لاہور (پاکستان) میں بھارت ماتا سوسائٹی کے نام سے

ایک تنظیم قائم کی۔ اس کے ایک لیڈر تھے مہاتما شانتی نارائن۔ مہاتما شانتی نارائن کو امرت بازار پتریکا ایڈیٹر بابو موتی لال گھوش نے اس بات کے لئے رضامند کرلیا کہ انقلابی تحریک کو مضبوط کرنے کے لئے اردو زبان میں ایک رسالہ شائع کیا جائے۔ یہ واقعہ ۱۹۰۷ء کا ہے۔ اسی سال ہی ہندوستان اور غیر ممالک میں مقیم انقلاب پسند ہندوستانیوں نے ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کی ۵۰ سالہ یاد منانے کی خفیہ تیاریاں کر رکھی تھیں۔ سوراجیہ اخبار کے اجرا کے لئے الہ آباد کو چنا گیا کیونکہ اتر پردیش (اس زمانے میں اسے صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کہا جاتا تھا) میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے سب سے زیادہ زور پکڑا تھا۔ مہاتما شانتی نارائن کو بھیجنے کے لئے اپنے پیغام میں بابو موتی لال گھوش نے یہ مشورہ دیا تھا اگر آپ سوراجیہ کو انقلابی راستے پر چلانا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنا ایک قدم جیل میں رکھنا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی اپنے کسی رفیق کار کو بھی اس بات کے لئے تیار کرنا ہوگا تاکہ وہ آپ کی عدم موجودگی میں آپ کی جگہ لے سکے۔"

بنگال کے ایک انقلابی نوجوان خودی رام بوس کو جب تختۂ دار پر جام شہادت نوش کرایا گیا تو مہاتما شانتی نارائن نے ایک ولولہ انگیز نظم شائع کی اور اس جرم کی پاداش میں آپ کو ساڑھے تین سال کی قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔ اس زمانے میں دیش بھگتوں کے ساتھ اخلاقی قیدیوں سے بھی بدتر سلوک ہوتا تھا کیونکہ انگریزی سرکار کا رویہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی حد تک انتقامی ہوتا تھا۔

مہاتما شانتی نارائن کی سزایابی کے بعد لدھارام کپور نے سوراجیہ اخبار کی کرسی ادارت کو سرفراز کیا۔ آپ نے اس اخبار میں ایک نرالی ہی قسم کا اشتہار شائع کیا۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا۔

"سوراجیہ اخبار کے لئے ایک ایسے ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو مشاہرہ کی صورت میں عمر بھر کے لئے جیل کی مصیبتیں اور مشکلات برداشت کرنے کے لئے تیار ہو۔" لدھارام کپور کو جو سزا دی گئی وہ وحشیانہ حد تک طویل تھی۔ یعنی دس یا بیس نہیں بلکہ پورے تیس سال۔ لدھارام کپور کے بعد بابو رام ہری نے سوراجیہ کا چارج سنبھالا۔ آپ نے ۱۸۵۷ء کے واقعات پر ایک شعلہ بار نظم کو اپنے کالموں میں جگہ دی نتیجتاً آپ کو ۲۱ سال قید بامشقت کی سزا ملی۔ ان کو بھی انڈیمان کی کالی کوٹھریوں میں عمر بھر کے لئے بند رکھا گیا۔

اور پھر اس وقت انگریز حکمران حیران و ششدر رہ گئے جب انھوں نے دیکھا کہ لدھارام کپور کے اشتہار کے جواب میں ملک کے مختلف حصوں کے بے شمار حضرات نے سوراجیہ اخبار کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ ان میں پنڈت رام چند بھاردواج اور لالہ خوشحال چند کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

سوراجیہ اخبار کا وجود بھی انگریزی سرکار کے لئے ناقابل برداشت تھا اور آخر کار ایک خاص حکم کے تحت اس اخبار کے دفتر کو سربمہر کر دیا گیا اور اس کے جملہ اثاثے اور ذرائع بحق سرکار ضبط کر لئے گئے۔

انگریزی سرکار اردو یا دیگر ہندوستانی زبانوں کی صحافت سے محض اس لئے خائف تھی ...... اور دشمنی کی حد تک اس کی مخالفت کرنے پر اتر آئی ہوئی تھی... کہ تحریک آزادی میں اردو صحافت عوام کے ہاتھوں میں برٹش سرکار کے خلاف ایک زبردست حربہ ثابت ہو رہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کسی بھی صورت میں اپنی سلطنت میں بیدار اور مؤثر رائے عامہ کو ابھرنے کا موقع دینے

کے حق میں نہیں تھی یہاں تک کہ کمپنی کے حاکموں نے شروع شروع میں جن اخبار نویسوں کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا۔ وہ انگریز ہی تھے اور ان لوگوں کے اخبار انگریزی میں ہی چھپتے تھے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا کمپنی سرکار نے ان انگریزی اخباروں کے ایڈیٹروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بنانے شروع کئے کیونکہ جو کچھ ان اخباروں میں چھپتا تھا اس کا اثر انگلینڈ کی رائے عامہ اور برٹش پارلیمنٹ کے ممبروں پر بھی پڑتا تھا۔ اور کمپنی کے حاکم ہر قیمت پر انگلینڈ کی سرکار کی مدد حاصل کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ انگریز جرنلسٹوں کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھے لکھے ہندوستانی "بابو" طبقہ کے مفادات بھی جڑ گئے۔ "کالے صاحب" حکومت برطانیہ کی وفاداری کو اپنا جزو ایمان سمجھتے تھے۔ ان اخباروں کے نمائندوں ایڈیٹروں اور نامہ نگاروں کو حکومت خاص رعایتیں اور سہولتیں دینے کو تیار رہتی تھی۔ سرکاری اشتہارات اور دیگر نوازشات کی بارش بھی ان پر لگاتار ہوتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ قانون کی جو شرائط ہندوستانی زبان کے اخباروں کا ناک میں دم کئے رکھتی تھیں۔ انگریزی اخباروں کی خاطر خاص طور سے نرم کردی جاتی تھیں۔ انگریزی اخبار اگر کہیں حکومت کی کسی کارگزاری پر بے خیالی میں نکتہ چینی کر بھی دیتے تھے تو انگریزی سرکار نہایت فراخدلی سے اسے درگزر کردیتی تھی۔ حکومت سے ان انگریزی اخباروں کی نوک جھونک کو عوام عاشق اور معشوق کی لڑائی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے کمپنی سرکار یہ جانتی تھی کہ انگریزی اخباروں کا اثر عوام پر نہ کے برابر ہوتا تھا کیونکہ اس زمانے میں انگریزی پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ تاہم کچھ انگریزی اخبار ایسے بھی تھے جنہوں نے عوام کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملائی۔ مثلاً مدراس کا اخبار ہندو (قائم شدہ ۱۸۷۵ء) کلکتہ کا امرت بازار پتریکا (قائم شدہ ۱۸۶۸ء) لاہور کا ٹریبون (قائم شدہ ۱۸۸۱ء) ٹائمز آف انڈیا، بمبئی (قائم شدہ ۱۸۳۸ء) البتہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان اخباروں کی تحریروں کی وجہ سے عوام بھڑک اٹھیں اور سڑکوں اور بازاروں کو میدان کارزار میں بدل دیں۔ اس کے برعکس اردو اخباروں کی تحریروں میں اتنی طاقت ہوتی تھی کہ ایک موقع پر ایک انقلابی اخبار کو بازار میں آواز لگا کر بیچنے والے ایک "ہاکر" یا پھیری والے کو بھی پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی کیونکہ وہ مجمع لگا کر باآواز بلند اس میں شائع کی گئی نظموں کو ترنم کے ساتھ گا کر لوگوں کو قانون کی نظروں میں مشتعل کیا کرتا تھا۔

ایک انگریز پادری جے لانگ صاحب نے ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔ "ہندوستانی اخباروں کی شکل بظاہر حقیر سی ہوتی ہے لیکن قومی گیتوں کی طرح ان کا اثر جادو کا سا ہوتا ہے جہاں انگریزی اخبار ناکام رہتے ہیں وہاں اردو اخبار رائے عامہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انگریزی مطبوعات کے مقابلہ میں دیسی زبانوں کے اخباروں کی اشاعت بہت کم ہونے کے باوجود ان کا دائرہ اثر بہت وسیع ہوتا ہے۔ جب کہ انگریزی اخباروں کی پہنچ بہت ہی محدود طبقوں تک ہوتی ہے"۔ ان حالات کے لئے انگریزی سرکار خود ذمہ دار تھی کیونکہ ان کا وطیرہ دیسی اخباروں کے تئیں دشمنانہ تھا۔ ویسے بھی انگریزی سرکار نہیں چاہتی تھی کہ ہندوستان میں پریس ایک ایسا مضبوط ستون بن جائے جس پر رائے عامہ ایک ٹھوس اور زبردست طاقت کی شکل میں دنیا کے سامنے آئے۔

ایک انگریز حاکم تھامس منرو نے ۱۸۲۲ء میں جو خیالات ظاہر کئے تھے اس سے انگریز حکمرانوں کے

سوچنے کا ڈھنگ اور بھی صاف دکھائی دیتا ہے جو مسٹر ہیسٹنگز کے الفاظ میں "ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رُو سے رعایا کو پریس کی آزادی نہ کبھی دی گئی ہے اور نہ کبھی دی جائے گی۔ اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن (یعنی انگریز) ہوتی تو اخباروں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جاتی اور میں خود اس آزادی کے لئے جدوجہد کرتا۔ لیکن چونکہ ہندوستان ہمارا وطن نہیں اس لئے اس ملک میں اس سے زیادہ کوئی اور خطرناک بات نہیں ہو سکتی کہ یہاں پریس کی آزادی دی جائے۔ اخباروں کی آزادی اور بدیشی حکومت دو ایسی متضاد باتیں ہیں جو ایک ساتھ اکٹھی رہ ہی نہیں سکتیں یا ان کا اکٹھے چلنا ناممکن ہے۔

انگریزی حکومت کو پریس سے اس قدر خوف تھا کہ ایک بار نظام حیدرآباد دکن کو کسی غیر ملکی سیاح نے ایک چھاپہ خانہ بطور تحفہ پیش کیا۔ قدرتی طور پر نظام نے اس چھاپہ خانے میں بڑی دلچسپی دکھائی اور خواہش ظاہر کی کہ حیدرآباد ریاست میں بھی اخبار نکالے جائیں اور کتابیں چھپیں۔ انگریزی سرکار نے اسے پسند نہیں کیا اور ایک سازش کر کے نظام کے توشہ خانے سے اس پریس کو خرد برد کر دیا اور بعد میں اسے تلف کرا دیا۔

ہندوستانی اخباروں کے سامنے ایک اور مشکل ہوتی تھی۔ نہ صرف ان پر سخت سے سخت قانون عائد کئے جاتے تھے بلکہ ان پر عمل بھی حد سے زیادہ سختی سے کیا جاتا تھا۔ مثلاً شروع ہوتے ہی ان سے بھاری ضمانتیں مانگی جاتی تھیں اور کوئی بھی ایسا وقت نہیں ہوتا تھا جب اردو صحافیوں کے سر پر ضبطیوں، جرمانوں، قید و بند، نظربندی اور شہر بدر کئے جانے کی تلوار نہ لٹکتی ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انگریز حاکم ہمیشہ اس شبہ اور اندیشہ میں مبتلا رہتے تھے کہ اردو اخبار کسی وقت بھی ان کی تحریروں سے ملک میں دھماکہ کروا سکتے ہیں۔

صورت حال یہ تھی کہ دار و رسن ان قلم کے سپاہیوں کے منتظر رہتے تھے۔ وطن کے شیدائیوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سردار کرتار سنگھ سرابھا (۱۸۹۶-۱۹۱۶) کو لاہور کے سازش کیس ۱۹۱۴-۱۵ میں دوسرے الزامات کے علاوہ اس وجہ سے بھی سزائے موت دی گئی۔ کیونکہ آپ "غدر" پارٹی کے مشہور انقلابی اخبار "غدر" کے ایڈیٹر تھے۔ چنانچہ آپ نے عین عالم شباب میں لاہور سنٹرل جیل میں پھانسی کے پھندے کو چوما۔

اردو صحافت کی تاریخ ہندوستانی اخبار نویسی (جس میں انگریزی اور ہندوستانی اخباروں کا جرنلزم بھی شامل ہے) کی سرگذشت بنیادی طور پر ایک ہی کہانی کے دو نام ہیں۔ گجراتی، بنگالی، ہندی اخباروں کا سلسلہ ۱۹ ویں صدی کی تیسری یا چوتھی دہائی میں شروع ہوا۔ سب سے پہلا اردو اخبار جام جہاں نما جو اسی نام کے فارسی اخبار کے ایک ضمیمہ کی صورت میں ۱۸۲۲ء میں جاری ہوا۔ ۱۸۲۲ء سے لے کر ۱۹۴۷ء یعنی حصولِ آزادی تک ہندوستانی جرنلزم میں کئی مد و جزر آئے تاہم اس فیصلہ کن دور میں اردو اخباروں کی ہمدردیاں ہندوستانی عوام کی امیدوں اور امنگوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ازراہِ مصلحت کسی اخبار نے قومی تحریک کی سرگرم مدد کرنے سے عارضی طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی ہو۔ انگریزی اخباروں کی بہ نسبت اردو اخباروں کا ہاتھ عوام کی نبض کے زیادہ نزدیک ہوتا تھا اور یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ عوام اپنی تمام خیرسگالی، تعاون اور دوستی اردو اخباروں کو ہی پیش کرتے تھے اور عوام

کی سچی محبت اردو اخباروں کا سرمایۂ حیات تھی۔

ہمارے ملک میں ان دنوں جب کہ مجالس قانون ساز اور پبلک کے نمائندوں کے انتخاب کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ہندوستانی اخبار ہی نقادان کو پورا کرتے تھے اور رائے عامہ کا اظہار یا اس کی تنظیم کا سب سے اہم ذریعہ ہندوستانی جرنلزم ہی تھا۔ اس لئے عوام کی نگاہوں میں اردو صحافت کی خاص قدر و منزلت تھی۔ اس کے برعکس انگریزی اخبار محض ایک سطحی اور مصنوعی ماحول میں اپنے اثر و رسوخ کی خوش فہمی میں غلطاں رہتے تھے۔ اس مقام پر اردو اخباروں کا فرداً فرداً تو ممکن نہیں تاہم ..... اردو صحافت کو زندہ و جاوید رکھنے والی کچھ نامور ہستیوں اور ان کے کارہائے نمایاں کی طرف اشارہ کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

اردو صحافت کی تاریخ کے ۷۰ یا ۷۵ برس گذر جانے کے بعد آج بھی دو اردو جرائد کا نام عزت احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہ جرائد ہیں الہلال (اجراء ۱۹۱۲ء) اور البلاغ (اجراء ۱۹۱۶ء) ان رسالوں کے ساتھ کاروان حریت کے سالار اعظم ..... فرزند بخت محی الدین ابوالکلام آزاد کی ذات اقدس وابستہ تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد دنیائے اسلام کے ممتاز ترین مفسر القرآن بھی تھے۔ مولانائے ممدوح نے ان رسالوں کو شائع کیا اور ان کے ذریعہ ہندوستانیوں کو عموماً اور اسلامیان ہند کو خصوصاً آزادئ وطن کا روح پرور پیغام دیا اور ان کی اس مہم نے انگریزی حکومت کے ایوانوں میں کھلبلی مچادی۔ نتیجتاً مولانا محترم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تاہم اس مرد مجاہد کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔

اب ہم اپنے گرد و پیش یعنی پنجاب اور ہریانہ کی ۱۹۴۷ء سے پہلے کی اردو صحافت پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں

۱۹۴۷ء سے پہلے لاہور شہر اس علاقہ کا سب سے اہم اور تعلیمی اور ثقافتی مرکز تھا اور ایک لحاظ سے وہ دہلی پر بھی سبقت لے گیا تھا۔

لاہور سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بہت سے اردو اخبار شائع ہوتے تھے جو اپنے اپنے موقف کے مطابق خبریں اور مضمون چھاپتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ان سبھی اخباروں کی کسی نہ کسی سوال پر انگریزی حکومت سے ٹکر ہو ہی جاتی تھی اور ان کے مالکوں یا ایڈیٹروں کو جیل یا جرمانے کی سزا بھی بھگتنی پڑتی تھی۔

لاہور کے ایک مشہور اردو اخبار روزانہ زمیندار کے مالک اور ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کی شعلہ بیانی مشہور تھی۔ مولانا ایک جادو بیاں مقرر اور زبردست شاعر بھی تھے۔ لہٰذا باغیانہ تقریروں اور تحریروں کی وجہ سے انگریزی سرکار کی نظر التفات ان پر رہتی تھی اور آہنی سلاخوں کے سرکاری مہمان خانے ان کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار زمیندار کی پیشانی کو اپنے نصب العین سے مزین کرنے کا دستور بنا رکھا تھا جو آپ کی مضبوط قوت ارادی کا مظہر تھا۔ نصب العین کے الفاظ یہ تھے ؎

نور خدا ہے کفر کی حرکت پر خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

اسی طرح لاہور سے مہاشہ کرشن (بچپن کا نام رادھاکشن) کا اردو اخبار روزانہ "پرتاپ" بھی نکلتا تھا۔ مہاشہ کرشن کو آج ہم بابائے صحافت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پرتاپ اخبار ہمیشہ انگریزی سرکار کے زیر عتاب رہا ہے۔ حصول آزادی کے بعد پرتاپ جالندھر اور دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ آج کل شری ویریندر اپنے سورگیہ پتا کی جگہ پر اس اخبار کو جالندھر سے نکال

رہے ہیں۔ دہلی میں پرتاپ اخبار کے ایڈیٹر شری ویریندر کے برادرِ صغیر شری کے نریندر ہیں۔ ان کے علاوہ لاہور کے جن اردو صحافیوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیکر اپنے قلم کی لڑائی کو چار چاند لگائے۔ ان میں میلارام وفا نانک چند ناز، مولانا مظہر علی اظہر، بلدیو متر بجلی شورش کاشمیری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

جناب میلارام وفا صاحب ایک ممتاز شاعر بھی تھے اور ان کا ہر شعر انگریزی سرکار کے لئے ایک چیلنج ہوتا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

برطانیہ سے کہہ دو ہم ذلت غلامی کرتے نہیں گوارا
ہندوستان ہمارا
برطانیہ سے کہہ دو ہندوستان کے ہم ہیں
برطانیہ تمہارا۔ ہندوستان ہمارا
برطانیہ تمہارا۔ ہندوستان ہمارا

وفا صاحب کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک باغیانہ نظم شائع کرنے کے الزام میں جب آپ کو عدالت میں پیش کیا گیا تو مقدمہ کی کارروائی سے آپ بالکل بے نیاز رہے۔ اس دوران آپ نے ایک اور باغیانہ نظم کہہ کر انگریزی سرکار کے قانون کا منہ چڑھایا۔

ہفتہ وار اردو "ہریانہ تلک" اجرا ۱۹۲۱ء کے بانی مالک بے خوف ایڈیٹر اور ہریانہ کے بزرگ دیش بھگت پنڈت شری رام جی شرما کا ذکر ہونا چاہئے۔

"ہریانہ تلک" پچھلے ۶۷ برسوں سے پنڈت شری رام جی شرما کی محنت، محنت اور قربانیوں کی بدولت ہریانہ کی خدمت کر رہا ہے۔

پنڈت جی نے ہریانہ تلک کے کالموں میں قومی تحریک کے پرچار کے لئے زبردست مضامین لکھے اس دوران پنڈت جی کو کئی بار جیل یاترا کرنی پڑی۔ ان دنوں ہریانہ تلک کا بلند ہو جانا قدرتی بات تھی لیکن جیسے ہی پنڈت جی جیل سے رہا ہوتے ان کے رفقاء کار اس اخبار کی دوبارہ اشاعت کا انتظام کر دیتے۔ عوام کی ہمدردی اور دوستی کی مثال ہریانہ تلک ہی پیش کر سکتا ہے۔

جنگ آزادی میں اردو صحافت کے رول کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ جب کسی اخبار کو قانوناً ضبط کر لیا جاتا یا اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی جاتی تو اس اخبار کو چلانے والے اپنی تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی اخبار کی اشاعت اور تقسیم خلافِ قانون اور خفیہ طور پر جاری رکھتے۔ عام طور پر پوری اخبار کی جگہ ایک پرچہ یا اشتہار یا بلیٹن ضرور چھاپتے تھے اور انقلابی کارکن اسے تقسیم کرتے تھے اور انقلابی پیغام کی تشہیر کرتے تھے۔ اخبار نویسی کی اس صنف پر بالتفصیل لکھنا کافی مشکل ہے۔ کیونکہ خلافِ قانون شائع کئے گئے اشتہاروں، پمفلٹوں کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ خفیہ لٹریچر لکھ کر تقسیم کرنے والے انقلابی لوگ ایک مجاہدانہ جذبہ رکھتے تھے اور لوگ انھیں ہیرو سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے انقلابی لٹریچر کی ایک ایک سطر کا عوام پر زبردست اثر پڑتا تھا اور اسی باعث انگریزی سرکار کے زمانے میں پولیس کی حوالاتوں اور تفتیش کے دوسرے مراکز میں سیاسی کارکنوں کو بے پناہ اذیتیں دی جاتی تھیں تاکہ خفیہ لٹریچر کے لکھنے والوں اور تقسیم کرنے والوں کے متعلق پولیس کو سب حالات معلوم ہو جائیں۔ اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگریزی حکومت کی نظر میں انقلابی لٹریچر میں وہی پمفلٹ یا اشتہار سب سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے تھے جو اردو یا ہندی یا دوسری دیسی زبانوں میں چھپے ہوئے ہوتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ انگریزی زبان میں انقلابی اشتہاروں کو عوام میں بہت کم لوگ سمجھ سکتے تھے۔ اس

غزلیں

حسن نظامی



اپنے اندر محترم ہوں میں شکستہ مطمئن
دوسرا آئینے میں ہے کون مجھ سا مطمئن

تکتی ہیں ممتا کی آنکھیں راہ میری دور تک
دن ڈھلے جب تک نہ لوٹوں لے کے چہرہ مطمئن

ہُو کا عالم ذہن میں چاروں طرف بِکھرا ہوا
شاہراہوں سے گذرتا میں اکیلا مطمئن

میرے حق میں جتنے تھے روشن وہ لمحے بجھ گئے
اب نظر آتا نہیں ہے کوئی چہرہ مطمئن

بے حِسی غالب ہوئی ہے نفس پر جب سے حسنؔ
مجھ کو آتا ہے نظر ہر ایک لمحہ مطمئن

رائیگاں مجھ کو بہر طور یہاں ہونا تھا
منحرف خود مِرے حِصّے کا ہر اِک لمحہ تھا

گرم جوشی سے قبول اس نے کیے تھے تحفے
صبح کوڑا کھ میں پھینکا ہوا گلدستہ تھا

زندگی کیوں تری چوکھٹ کا پتہ بھول گئی؟
میری آنکھوں نے حسیں خواب کہاں دیکھا تھا

اب بکھرنے پہ ندامت بھی نہیں ہے مجھ کو
لوٹ کر چاہا اسے یہ بھی قصور اپنا تھا

اپنی تہذیب سے اب تک نہیں وہ ہم آہنگ
لوٹ کر ملنے کا انداز مگر کیسا تھا

لئے پولیس والے ان کے خلاف کارروائی کرنے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دیسی زبانوں میں لکھا ہوا انقلابی پرچہ یا پمفلٹ پولیس کے لئے مادہ آتشگیر سے کم نہیں ہوتا تھا۔

حصول آزادی کے بعد ہماری صحافت بالخصوص اردو صحافت کو ان شاندار روایات کو زندہ و تابندہ رکھنا چاہئے۔ جن کے فضل و فیض سے ہمارے ملک میں آزادی کا سورج جلوہ گر ہوا ہے۔ ہمارا ملک غیر ملکی سامراجی غلامی سے تو بلا شبہ آزاد ہو چکا ہے۔ تاہم سوشلزم اور سیکولر جمہوریت کے قیام کے لئے جنگ ابھی جاری ہے اور ہم سے اسی اخلاقی جرأت اور جذبۂ ایثار کی طلب گار ہے جس کی راہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں دکھائی ہے کیا ہم اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں؟

OO

ڈاکٹر محمد احمد

شام ہونے تک

کردار: فیاض (کلودِنگ فیکٹری اکاؤنٹ آفس میں ملازم)
بیگم فیاض (امورِ خانہ داری میں ماہر خاتون)
پپو اور گڈو (دو لڑکے عمر ۱۲ اور ۸ سال)
پنکی (لڑکی عمر ۶ سال)

پہلا ہفتہ:

پردہ اٹھتا ہے۔ سامنے ایک کمرے کا منظر ہے۔ ایک کونے میں پلنگ پڑا ہوا ہے جس پر سفید بیڈ شیٹ بچھی ہوئی ہے۔ دوسرے کونے میں ایک چھوٹی میز اور دو کرسیاں پڑی ہیں۔ مشرق کی سمت ایک کھڑکی ہے جو اس وقت بند ہے لیکن دریچوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر کمرے میں فرش پر روشنی کی لکیریں بنا رہی ہیں۔ صبح کا وقت ہے۔ فیاض کرسی پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے ہیں۔ بیگم فیاض ٹرے میں چائے اور ناشتہ لیے اندر داخل ہوتی ہیں۔

بیگم فیاض: لیجیے۔ ناشتہ کر لیجیے.... ذرا اخبار سے نظریں اٹھا کر گھڑی کی طرف بھی دیکھ لیا کیجیے۔ ساڑھے نو بجنے والے ہیں اور دس بجے آپ کو آفس پہنچنا ہے۔ جلدی سے ناشتہ کرکے تیار ہو جائیے۔

فیاض: (اخبار سے نظریں ہٹا کر مسکراتے ہیں) کیا بات ہے بیگم! آج بہت چہک رہی ہو؟

بیگم: (پلنگ پر بیٹھتے ہوئے) آج پہلی تاریخ جو ہے۔ آج آپ کو تنخواہ ملے گی.... ! اس مرتبہ آپ کہہ رہے تھے فیکٹری بونس بھی دے رہی ہے۔

فیاض: ہاں.... اس بار بونس بھی ملے گا (چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے) بھئی بیگم تم یاد نہ دلاؤ تو میں سب کچھ بھول ہی جاؤں۔

بیگم: اب مجھے ہی تو ہر بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ صبح تڑکے اٹھتی ہوں پھر گھر کی صفائی ستھرائی پھر میں چولہا چوکا کرنا، بچوں کو نہلا دھلا کر اسکول کے لیے تیار کرنا اور پھر آپ کی فکر... !

فیاض: ہاں ہاں... بہت کام کرنا پڑتا ہے ہماری بیگم کو!
فیاض نے سنجیدگی بھری ہمدردی دکھائی اور خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر بیگم فیاض چائے کے برتن سمیٹ کر کچن کی جانب چلی جاتی ہیں اور فیاض تولیہ سے ہاتھ صاف کر کے کپڑے تبدیل کرنے لگتے ہیں۔

(منظر بدلتا ہے)

شام کا وقت ہے۔ فیاض کچھ پیکٹ سنبھالے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔

فیاض: اے بیگم کہاں ہو... ! دیکھو میں تمھارے لیے کیا لایا ہوں

(بیگم [illegible] ساڑی کے پلّے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتی ہیں)

فیاض: (ایک پیکٹ انھیں پکڑاتے ہوئے) تم ہی تھیں شکایت کرتی تھیں کہ کافی دنوں سے تم نے نئی ساڑی نہیں پہنی ہے۔ میں تمھاری ہی پسند کی ہوئی ساڑی لے کر آیا ہوں۔

تین بچے شور مچاتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔

پپّو: پاپا — میرے لیے بیٹ بال لائے ... ؟

فیاض: ہاں بیٹا تمھارے لیے کرکٹ کا پورا سامان لے آیا ہوں۔ (چھوٹے بیٹے گڈّو کو فٹ بال دیتے ہوئے) لو یہ تمھاری فرمائش۔

پنکی: (فیاض کے گلے میں لٹکتے ہوئے) اور پاپا — میرا فراک ... !

فیاض: (ایک پیکٹ کھولتے ہوئے) دیکھو اپنی لاڈلی بٹیا کے لیے کتنا پیارا فراک لایا ہوں۔

بیگم: آپ ہاتھ منھ دھو کر کپڑے بدل لیجیے۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔

کچھ گنگناتی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہیں

(منظر بدلتا ہے)

فیاض ہاتھ میں قلم اور کاغذ لیے بیٹھے ہیں۔
بیگم پاس ہی بیٹھی سویٹر بُن رہی ہیں۔

فیاض: اب ذرا اپنا یہ سویٹر ایک طرف رکھیے اور بتلائیے کہ کیا کیا سامان بازار سے آنا ہے۔

بیگم: (ذہن پر زور دیتے ہوئے) کوئی ایک دو چیز تو ہے نہیں پورے مہینے کا سامان آنا ہے۔

فیاض: اسی لیے تو کاغذ قلم لے کر بیٹھا ہوں۔

بیگم: اچھا لکھیے۔ گیہوں، چاول، دالیں، مرچ مسالے، صابن، کریم پاؤڈر .... !

فیاض: (پیار بھرے انداز میں) ذرا آہستہ بولو بیگم۔ تمھیں [illegible] میری اردو کتنی کمزور ہے۔

بیگم اُن کو فہرست اور کچھ غیر ضروری سامان کی ایک لمبی فہرست لکھوا دیتی ہیں۔ فیاض ماتھے پر شکنیں ڈالے ہوئے فہرست کو غور سے کئی مرتبہ پڑھتے ہیں۔

فیاض: ایسا کرو بیگم، تم بھی تیار ہو جاؤ۔ سارا سامان خرید کر کسی کی دوکان پر رکھ دیں گے۔ پھر ہم دونو کچھ اور شاپنگ کر لیں گے۔ تم کہہ رہی تھیں کہ میری ٹائی کچھ پرانی سی لگتی ہے اور تمھیں اپنے لیے ایک سینڈل بھی تو خریدنی ہے۔

بیگم: (بنا کسی احتجاج کے) ٹھیک ہے۔ میں ابھی تیار ہو جاتی ہوں۔

دوسرا ہفتہ

فیاض فیکٹری جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ بیگم اُن کے کوٹ پر برش کر رہی ہیں

بیگم: آج آفس سے ذرا جلدی آ جائیے گا۔

فیاض: کیوں ... ؟ آج کوئی خاص بات ہے ؟

بیگم: بس یونہی (مسکراتے ہوئے) بہت دنوں سے فلم دیکھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ کل پڑوسن کے وہاں گئی تھی وہ کہہ رہی تھیں ... کی فلم بہت اچھی لگی ہوئی ہے

فیاض: ابھی کچھ دن پہلے تو فلم دیکھی تھی۔

بیگم: وہ کوئی فلم میں فلم تھی۔ میرے تو سر میں درد ہو گیا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ ہوٹل کے کھانے میں لطف آ گیا ورنہ فلم نے تو حد سے زیادہ بور کر دیا تھا

فیاض: اچھا بھئی — میں شام کو ٹکٹ لیتا آؤں گا۔ خفا کیوں ہوتی ہو۔

بیگم: (کوٹ کا بٹن لگاتے ہوئے) آپ کتنے اچھے ہیں...

فیاض صاحب حیرت سے بیگم کو تکنے لگتے ہیں جو
ایسے موقعوں پر اپنی والہانہ محبت نچھاور کرنے
میں کوئی کنجوسی نہیں دکھاتی ہیں۔
(منظر بدلتا ہے)
آج اتوار ہے۔ دفتر کے ساتھ اسکول کی بھی
چھٹی ہے۔ اس لیے آج صبح کو ناشتہ سب
ایک ساتھ بیٹھ کر رہے ہیں (سروس کرنے
والوں کو ہفتہ میں یہی تو ایک تو دن
ایسا ملتا ہے جس میں گھر کے سبھی
چھوٹے بڑے اکٹھا ہو کر خوش فعلیاں
کرتے ہیں)۔

پپو : پاپا! آپ کو اپنا پرامس یاد ہے۔ آج شام کو
سب کو ایکزیبیشن (نمائش) دکھانے لے چلنا ہے
(پنکی اور گڈو بھی بیک آواز پپو کی بات کی تائید
کرتے ہیں)

فیاض : ارے ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا اور آج میں
ہم سب کو گاندھی پارک بھی گھمانے لے چلوں گا۔
مگر پپو بیٹا (مسکراتے ہوئے) تمھاری ممی کو تو
یہ سب گھومنا پھرنا بالکل پسند نہیں۔
(بیگم فیاض کچھ کہنے کے لیے منھ کھولتی ہیں کہ
اتنے میں پنکی بول اٹھتی ہے)

پنکی : پاپا۔ اگر ممی نہیں جانا چاہتی ہیں تو ہم لوگ اکیلے
ہی گھومنے چلیں گے۔

گڈو : (بڑوں کے سے انداز میں) اور کیا۔ اتنے بڑے
گھر کو ممی اکیلا کیسے چھوڑ سکتی ہیں۔

فیاض : (پنکی کو پیار کرتے ہوئے) کیا تمھیں پارک میں
نمائش میں ممی کی یاد نہیں آئے گی اور پھر ـــ
(شرارت بھری نظروں سے بیگم کو دیکھتے ہوئے) اکیلے
میں تمھاری ممی رونے لگیں تو...!

پپو : تب تو ممی کو ساتھ لے جانا بہت ضروری ہے پاپا۔

(گڈو اور پنکی ممی کے گلے میں بانہیں ڈال
دیتے ہیں)

گڈو اور پنکی : آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہی پڑے گا۔
(بیگم فیاض جو کچھ خفا سی معلوم پڑتی ہیں
ایک دم سے مسکرا اٹھتی ہیں)۔

بیگم : (فیاض سے مخاطب ہو کر) تم نے بچوں کو خوب
سر پر چڑھا رکھا ہے۔

فیاض : (چونک کر اپنا سر ٹٹولتے ہوئے) نہیں تو...!
سب بچے تو نیچے ہی بیٹھے ہیں۔
(سب کے ملے جلے قہقہوں کی آواز فضا
میں گونجنے لگتی ہے)۔

تیسرا ہفتہ :

فیاض پلنگ پر لیٹے اخبار پڑھ رہے ہیں۔
بیگم فیاض کمرے کی صفائی کر رہی ہیں۔

بیگم : اب اٹھ بھی جائیے۔ چھٹی کا یہ مطلب تو نہیں
کہ دن بھر پلنگ ہی توڑتے رہیے۔

فیاض : بھئی بیگم! آج تو بستر سے نکلنے کو من ہی نہیں
کر رہا ہے (اخبار پر نظریں جمائے ہوئے) ارے
بیگم تمھیں تو اپنے جھاڑو برتن سے فرصت ہی
نہیں ملتی۔ کبھی کبھی اخبار پر بھی نظر ڈال لیا کرو۔
دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ اس کی بھی خبر ہے تمھیں؟
(بیگم کی طرف اخبار بڑھاتے ہوئے) آج اپنے
شہر میں پردھان منتری جی آ رہے ہیں۔ تمھیں تو
انھیں دیکھنے کی بہت تمنا...!

بیگم : (بیچ سے بات کاٹتے ہوئے) شہر میں تو پردھان
منتری آ رہے ہیں مگر (مسکراتے ہوئے) اپنے یہاں
کون آ رہا ہے اس کی بھی کچھ خبر ہے آپ کو...؟

فیاض : ارے ہاں...! آج تو تمھارے ممی ڈیڈی آ رہے
ہیں یعنی کہ میرے ساس سسر (پلنگ سے نیچے اترتے

ہوئے) اب آرام کہاں کرنے کو ملے گا۔ اسی لیے آج صبح سے صفائی میں جٹی ہوئی ہو۔

بیگم: (خفگی آمیز لہجہ میں) ویسے تو گھر میں گندگی کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں...!!

فیاض: اچھا بولیے میرے لیے کیا حکم ہے سرکار کا۔

بیگم: بس آپ جلدی سے تیار ہو جائیے۔ کچھ ضروری چیزیں بازار سے آنی ہیں۔ کتنے دنوں بعد تو میرے والدین آرہے ہیں۔

فیاض: کیوں نہیں .... (ایک لمبا سانس لیتے ہوئے) والدین کی خدمت میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ جنت کے دروازے انھیں کے قدموں کے نیچے کھلتے ہیں۔ (فیاض تولیہ لے کر غسل خانہ کی سمت چلتے ہیں)۔

(منظر بدلتا ہے)

کال بیل بجتی ہے۔ بیگم فیاض کچھ سوچتے ہوئے دروازہ کھولتی ہیں۔ فیاض اندر داخل ہوتے ہیں۔

بیگم: (تعجب سے) ارے آپ...! آفس سے اتنی جلدی کیسے چلے آئے۔

فیاض: (ہاتھ کا تھیلا پکڑاتے ہوئے) لو اس میں مرغ کا میٹ لایا ہوں۔ بہت دنوں سے کئی دوست پیچھے پڑے ہیں۔ میں نے سوچا یہ ہفتہ تو مہمان نوازی میں گذر ہی رہا ہے، انھیں کیوں محروم رکھا جائے۔

بیگم: کئی روز کے بعد آج کچھ آرام کا موقع ملا تھا کہ آپ کے دوست آٹپکے (چہرے پر کچھ جھنجھلاہٹ ہے)

فیاض: عادت تو تم نے ہی خراب کی ہے۔

بیگم: کیا مطلب....؟؟

فیاض: تمھارے پکوان ہی اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ میرے دوست ہر ماہ کسی ساہوکار کی طرح اپنا قرض لینے آپہنچتے ہیں اور میں تو ہوں ہی تمھاری زلف کا اسیر!

بیگم: (شرماتے ہوئے) بس.... بس.... اب زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں۔

فیاض: اجی مہمان بھی تو خوش قسمت لوگوں کے گھر ہی آتے ہیں۔ اب اپنے پڑوس میں ہی دیکھ لو۔ کتنے مہمان آتے ہیں.... ایک تم ہی ہو جو اکثر بن بلائے چلی جاتی ہو۔

بیگم: خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ اب آخری ہفتہ کی بھی کچھ فکر کیجیے۔ آٹا بھی تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ دالیں مسالے وغیرہ بھی ختم ہی سمجھو۔

فیاض: (فکرمند انداز میں) ارے جب ضرورت ہوگی دیکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔ اس نے رزق دینے کا بندے سے وعدہ کر رکھا ہے۔

بیگم: وہ تو سب ٹھیک ہے مگر نوالہ منھ تک لے جانے کے لیے ہاتھ تو ہلانا ہی پڑے گا۔ میں نے پہلے سے ہی آپ کو بتلا دیا ہے۔ ہاں (یہ کہتے ہوئے وہ کچن کی طرف چل دیتی ہیں اور فیاض اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتے ہیں)۔

آخری ہفتہ:

فیاض آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔

بیگم: اجی سنتے ہو...! آج شام کے لیے آٹا نہیں ہے۔ دوکاندار کہہ رہا تھا کہ جب تک پچھلا حساب نہیں دیں گے آگے کچھ نہیں ملے گا۔ اور وہ پپو کو آج تو میں نے سمجھا بجھا کر اسکول بھیج دیا ہے لیکن کل اگر وہ نئی کتاب لے کر نہیں گیا تو ٹیچر اس کو کلاس سے نکال دیں گے۔ گڈو اور پنکی کی ہوم ورک کی کاپیاں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ (بیگم فیاض کافی فکرمند نظر آرہی ہیں)

فیاض: بس صبح صبح تم نے پھر دماغ چاٹنا شروع کر دیا اور روز ہی کھانا پکانا، آج یہ نہیں ہے کل وہ ختم ہو گیا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا (ذرا تیز لہجہ میں)

(بقیہ صلا پر)

ندیم انصاری شاہجہانپوری

صلیب سے رہائی

رات بیحد سرد اور تاریک تھی۔ میری کار لکھنؤ کی حد سے نکل کر پچھم کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ میرے ہاتھ اسٹیرنگ پر دستانوں کے ہونے کے باوجود ٹھٹھرے جا رہے تھے۔ میں سندیلہ کی سرحد میں داخل ہوگیا تھا اور ساتھ ساتھ پچھتا رہا تھا کہ مجھے اس ناخوشگوار موسم میں اتنا طویل سفر کار سے نہیں کرنا چاہیے تھا مگر جمال کا فون سن کر میں اتنا بے چین ہوگیا تھا کہ کار سے ہی چل پڑا تھا۔

"آج ہی میرے پاس پہنچ جاؤ۔ میں نے تمھارے مشورے کے مطابق اپنی آئندہ زندگی کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

اتنی بڑی دنیا میں جمال ہی میرا سب کچھ تھا۔ ہم دونوں نے ایک ہی اسکول اور کالج میں تعلیم پائی تھی۔ دونوں کے مزاج میں یکسانیت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں کے تعلقات میں آج تک معمولی سی دراڑ بھی نہیں پڑی تھی۔ تعلیم مکمل کر لینے کے بعد انشورنس کمپنی میں میرا اپائنٹمنٹ ہوگیا تھا اور پوسٹنگ لکھنؤ میں ہوگئی تھی جب کہ جمال شاہجہاں پور کے ایک کالج میں لکچرر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

میری کار کی ہیڈ لائٹس سنسان اور تاریک سڑک کو جھنجھوڑتی چلی جا رہی تھی اور میرا ذہن ان باتوں میں الجھا ہوا تھا جو میرے اور جمال کے درمیان اس وقت ہوئی تھیں جب وہ اپنی بیوی رضیہ کی اچانک موت کے ایک سال بعد اپنے دونوں بچوں کے ساتھ لکھنؤ آیا تھا۔

"جمال تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"اب مستقبل کے بارے میں کیا سوچنا ہے۔ مجھے زندگی میں جتنی خوشی ملنا تھی، مل گئی۔ مجھے اب اپنے دونوں بچوں کے لیے جینا ہے۔ دوسری شادی کرکے میں بچوں کے تئیں اپنی ذمہ داری کو نبھا نہیں سکوں گا۔ اپنی نئی بیوی کے بچوں اور اپنے ان بچوں کے درمیان احساس کا خلا ایک فطری بات ہوگی اور اس خلا کو پُر کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوگا۔"

"تمھارا یہ سوچنا غلط ہے۔ تمھیں اپنی پہاڑ سی زندگی اور فطری تقاضوں کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ مگر میری ایک بات یاد رکھنا کہ کنواری لڑکی سے شادی نہ کرنا۔ کسی ایسی عورت کو تلاش کرکے اسے سہارا دینا جو تمھارے ان دونوں بچوں کی ہی ماں بن کر دکھائے اور ایسی عورتوں کا قحط نہیں، بس بات پرکھ کی ہے۔"

جمال نے میری بات سنی تھی اور خاموش ہوگیا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر غم کی لکیریں گہری ہو رہی تھیں اور آنکھیں ویران تھیں۔

پھر وقت پگھلتا گیا یہاں تک کہ دس سال گذر گئے۔ مگر جمال نے شریکِ سفر کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ خوش اور مطمئن تھا مگر اس کا فون

پا کر ایک سوال فوراً میرے سامنے تھا کہ اپنی زندگی کے دس سال انتہائی پریشانیوں میں گزارنے کے بعد اس نے اچانک دوسری شادی کا فیصلہ کیسے کر لیا؟

میں جس وقت جمال کے گھر پہنچا تو گھر میں چہل پہل دکھائی دی۔ جمال کی دونوں بہنیں اور کئی رشتہ دار عورتیں اور بچے موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی جمال جوشِ مسرت سے مجھے لپٹ گیا۔ پھر ایک صوفے پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے جمال سے مسکراتے ہوئے پوچھا "تمھیں فون پر مارشل لا جیسا آرڈر دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

جمال سنجیدہ ہو گیا اور بولا "تمھیں تو معلوم ہے کہ میں شادی نہ کرنے کے فیصلے پر اٹل تھا مگر حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ مجھے رخسانہ کے حق میں اپنا فیصلہ دینا پڑا۔"

"کس مجبوری کے تحت؟"

"مجبوری نہیں، ہمدردی سمجھ لو۔"

"چلو۔ دیر آید درست آید۔ مجھے تمھاری اور بچوں کی ہر وقت فکر لگی رہتی تھی مگر اپنے فیصلے کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتاؤ۔"

"تفصیل فرصت میں بتاؤں گا۔ اب تم کھانا کھا کر آرام کرو۔ مجھے کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

دوسرے دن نہایت سادگی سے جمال کا رخسانہ سے عقد ہو گیا۔ مجھے جمال کا گھر بسنے کی بہت خوشی ہوئی لیکن ایک تجسس مجھے بے چین کیے ہوئے تھا کہ رخسانہ کون ہے اور جمال کے دل میں اس کے تئیں ہمدردی کا جذبہ کیوں کر پیدا ہوا۔

اگلی صبح میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ جمال آ گیا۔ اس کے ساتھ رخسانہ بھی تھی۔ ان دونوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خوشبو کا ایک جھونکا میرے دماغ کو معطر کر گیا۔ رخسانہ کے جسم پر گلابی غرارہ اور جمپر تھا۔ سر پر دوپٹہ تھا جو کسی قدر چہرے پر جھکا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

جمال نے رخسانہ کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔

"آپ کو میں جس سے ملانے لایا ہوں۔ اس دنیا میں ہم دونوں ایک دوسرے کے واحد دوست ہیں۔ ان کے سامنے پردہ وغیرہ نہیں چلے گا۔"

رخسانہ نے گھونگھٹ الٹ دیا۔ اس کا رنگ گورا اور چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ جسم بھرا بھرا تھا۔ عمر بیس پچیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس نے اپنی نوکیلی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ ایک نظر مجھے دیکھا تو میری نگاہ خود بخود جھکتی چلی گئی۔ رخسانہ جیسی خوبصورت عورت کو جمال کی بیوی کے روپ میں دیکھ کر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا مگر میرے چہرے کا رنگ اتر گیا۔ کیونکہ جس بات سے میں ڈرتا تھا جمال نے وہی کیا تھا۔ اس نے میرے مشورے کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ واقعی مرد کے قول کا کوئی اعتبار نہیں جوان اور خوبصورت عورت کو دیکھ کر اسے پھسلتے دیر نہیں لگتی۔ جمال بھی ایک مرد ہے۔ اس نے یقیناً رخسانہ کے حسن اور جوانی سے متاثر ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ ہمدردی کا تو محض اس نے بہانہ بنایا ہے۔ میرے دل و دماغ میں جمال کے لیے غصہ بھر گیا تھا۔ تب ہی جمال کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ رخسانہ سے مخاطب تھا۔

"آپ کچن میں جائیے اور ناشتہ وغیرہ بھجوائیے۔"

رخسانہ کمرے سے چلی گئی تو جمال نے میری طرف غور سے دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا "تم چپ کیوں ہو گئے! کیا تمھیں میری بیوی پسند نہیں آئی؟"

جمال کے الفاظ نے آگ پر تیل کا کام کرتے ہوئے میرے غصے کو اور بھڑکا دیا مگر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت پسند آئی۔ بالفرض نہ بھی پسند آتی تو میں اعتراض کرنے والا کون ہے؟"

میرے لہجے میں طنز کی جھلک تھی۔

"بکواس!" جمال جھلا کر بولا۔ "میں جانتا ہوں

کہ تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو۔ مگر میں نے جو بھی فیصلہ کیا ہے تمھارے مشورے کی روشنی میں کیا ہے۔"

"تم نے یہ فیصلہ میرے فیصلے کی روشنی میں کیا ہے یا اپنی خواہش کے مطابق، اس بارے میں تم سے کچھ نہیں پوچھنا چاہتا۔ اس لیے کہ اپنی اچھائی یا برائی انسان خود سمجھتا ہے۔ شادی تم نے کی ہے۔ زندگی تمھیں گذارنی ہے پھر بھلا میں اس بارے میں کیوں سوچوں گا۔"

"کیوں نہیں سوچوگے۔" جمال میرے بالکل قریب بیٹھتا ہوا بولا۔ پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یقین مانو لطیف، دس سال گذر جانے کے باوجود میں تمھاری بات نہیں بھولا۔ اس درمیان مجھ پر کئی بار شادی کے لیے دباؤ پڑے۔ جن میں کنواری لڑکیاں بھی شامل تھیں مگر میں نے اصول پر نفس کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ پھر رخسانہ کا سلسلہ چلا۔ میں نے اسے بھی رد کر دیا مگر اس کے حالات جان کر میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی اور میں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ جانتے ہو کیوں؟ اس کا جواب تمھیں یہ خط دے گا۔ لو اسے پڑھ لو پھر بتاؤ کہ میرا اٹھایا ہوا یہ قدم درست ہے یا نہیں؟" جمال نے یہ کہہ کر ایک پرچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور صوفے کی پشت سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

میں نے پرچہ کھولا۔ لکھا تھا:

جمال صاحب!

میں آپ کو خط لکھ کر ایک نازیبا حرکت کی مرتکب ہو رہی ہوں کیونکہ آپ نے مجھے شریک حیات کی شکل میں قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اخلاقی اعتبار سے مجھے آپ کو خط نہیں لکھنا چاہیے تھا مگر آپ کے ان الفاظ نے "میں جوان عورت سے شادی نہیں کروں گا۔" مجھے ایک بار پھر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنی زندگی میں کئی بار ٹوٹی ہوں، بکھری ہوں مگر میں اپنے روح کے کرب کو زبان پر نہیں لائی۔ اب میرے بارے میں آپ جو چاہے رائے قائم کر لیں مگر سچ تو یہ ہے کہ میرا پیمانۂ ضبط لبریز ہو گیا تو میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آپ کو خط لکھنے کا قصد کیا۔ میری تقدیر نے پل پل میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔ بچپن میں والدین کا سایہ اٹھ جانے کے بعد چچا رحم کھا کر اپنے گھر لے گئے۔ چچا کے گھر آ کے روٹی کپڑا ملنے لگا مگر اس کے عوض دن رات کام کرنے کے باوجود چچی کے ہاتھوں جسمانی اذیت کی سوغات بٹورتی رہی۔ ان ہی اذیتوں کے درمیان کب جوانی کی سیڑھی پر قدم جا پہنچا، مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر ایک دن مجھے پتہ چلا کہ مجھے کسی لڑکے کی ماں اور بہن نے پسند کر لیا ہے وہ مجھے جہیز کے بغیر اپنے گھر کی بہو بنا کر لے جانا چاہتی ہیں۔ میری چچی کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ انھوں نے فوراً 'ہاں' کر دی اور دو مہینے میں ہی نکاح پڑھوا کر گھر سے ٹال دیا۔

سسرال پہنچی تو مجھے لگا جیسے جہنم سے نکل کر میں دنیوی جنت میں آ گئی ہوں۔ ساس، سسر کی شفقت اور شوہر کے پیار نے زندگی سے محبت پیدا کر دی اور میں خوشیوں کے جھولے میں جھولنے لگی مگر کہتے ہیں خوشیوں کے دنوں کے پر لگ جاتے ہیں۔ تین سال ایسے گذر گئے کہ پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ تو میں اس وقت چونکی جب ساس اور سسر اور رشتے داروں میں

چہ میگوئیاں ہونے لگیں پھر یہ چہ میگوئیاں میرے شوہر کے کانوں تک پہنچیں اور وہ مجھے لے کر کئی ڈاکٹروں کے پاس گئے جہاں انھوں نے میرے ساتھ ساتھ خود کو بھی چیک اپ کرایا۔ پھر جیسے ہی یہ انکشاف ہوا کہ میں ماں نہیں بن سکتی، بانجھ ہوں تو سسرال والے سناٹے میں آ گئے۔ آہستہ آہستہ مجھ سے شفقت اور محبت کی دولت چھین لی گئی اور میں نفرتوں کی تیز دھوپ میں تپنے کے لیے چھوڑ دی گئی۔ اس پر ہی بس نہیں۔ کچھ دن بعد میرے شوہر نے مجھے پھر چچا کے گھر پہنچا دیا۔ اب میں ہوں اور چچی کا عتاب۔ بہر حال زندگی اور موت تک کا فاصلہ تو کسی نہ کسی طرح طے کرنا ہی ہے۔

میرا بچپن حالات کے ظلم و ستم کا شکار ہو گیا۔ شادی کے بعد کی پُر مسرت زندگی بانجھ پن نے ہڑپ کر لی اور بچی کھچی جوانی آپ کے فیصلے کے آڑے آ گئی۔ کاش میں جوان نہ ہوتی ....

آخر میں اتنا کہنا چاہوں گی کہ اس خط سے یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ میں آپ سے رحم کی طالب ہوں۔ ہاں اتنی التجا ضرور ہے کہ میں نے آپ کا جو قیمتی وقت ضائع کیا ہے، اس کے لیے آپ مجھے معاف کر دیں۔

رخسانہ

خط پڑھ کر میرا ہاتھ بے اختیار جمال کی پیٹھ پر پہنچ گیا۔ پھر اسے تھپتھپاتے ہوئے میرے منہ سے نکلا۔ "جمال، میں تمھارے فیصلے کی قدر کرتا ہوں۔ تم نے رخسانہ کا انتخاب کر کے نہ صرف میرے مشورے پر عمل کیا ہے بلکہ ایک مظلوم کو صلیب سے رہائی دلا دی۔"

بقیہ شام ہونے تک صفحہ ۳۸ سے آگے

تمھیں تو گھر کا نظام سنبھالنا ہی نہیں آتا۔ تین بچوں کی ماں بن گئی ہو پھر بھی گھر کو چلانا تم نہ سیکھ سکیں!!

بیگم : (روہانسی ہو کر) ہاں ساری غلطی میری ہی تو ہے۔ اپنی فضول خرچی کی طرف نہیں دیکھتے۔ دن رات میں جانے کتنی سگریٹ پھونک ڈالتے ہو۔ دوست آ جائیں تو پھر کیا کہنا۔ یہ بھی ہونا چاہیے، وہ بھی ہونا چاہیے۔

(بیگم فیاض کی آواز بولتے بولتے کافی تیز ہو جاتی ہے)

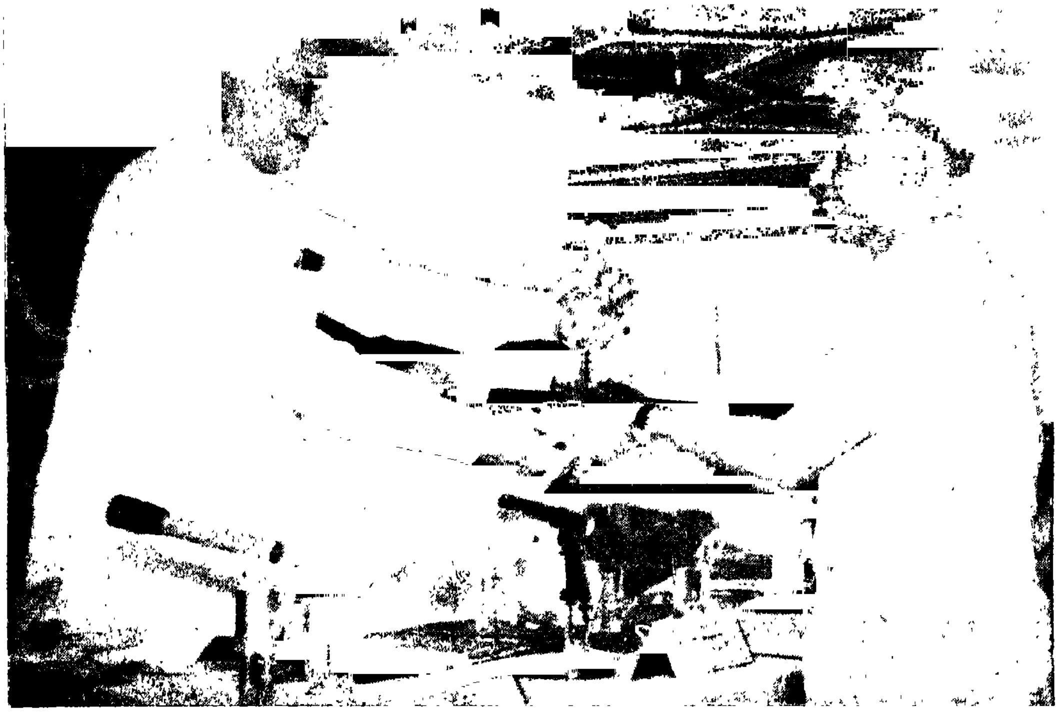
فیاض : تمھیں میرے دوستوں سے تو ہمیشہ سے چڑ ہے لیکن جب میکے والے آ جائیں تو انھیں باندھ کر بھی دینے سے نہیں چوکتیں!

بیگم : آپ کو میرے میکے والوں سے کیوں اتنا بغض ہے۔ کوئی بھی بات ہو، انھیں بیچ میں گھسیٹ لانا تو آپ کی عادت بن گئی ہے۔ میں انھیں کیا عنقا کھلا دیتی ہوں .... کیا دے دیتی ہوں۔ (بیگم فیاض کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں)

فیاض : اچھا بند کرو اپنے یہ مگر مچھ کے آنسو ...! آج پڑوس وڑوس سے مانگ کے کام چلا لینا اور اگر وہاں سے بھی انکار ملے تو پھر اپنے لاڈلے بچوں کو لے کر میکے چلی جانا! ذرا سی تنخواہ میں پورے گھر کا نظام، بچوں کی پڑھائی اور اوپر سے آئے دن کے مہمان ..... میرا تو ناک میں دم ہو گیا ہے۔

(فیاض یہ کہتے ہوئے گھر سے باہر نکل جاتے ہیں۔ کمرے میں بیگم فیاض کی ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔) (پردہ گرتا ہے) OO

پبلشر اور چیف ایڈیٹر راجن داس ملک نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس سی او نمبر ۱۸۹-۱۹۱ سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ سے اگست ۱۹۸۸ء کے لیے شائع کیا۔
طابع : کنٹرولر گورنمنٹ پریس ہریانہ چنڈی گڑھ



عزت مآب ہری آنند براری گورنر ہریانہ چنڈی گڑھ میں منعقدہ ریجنل آفیشل لینگویج کانفرنس میں ہندی زبان کے فروغ کے لئے کام کرنے والوں کو ایوارڈ سے نوازتے ہوئے۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال چیکوسلاواکیہ کے سفیر ڈاکٹر میلوسلاو جازیل کے ساتھ محوِ گفتگو۔





چنڈی گڑھ میں ہریانہ ڈیفنس اینڈ سیکورٹی ریلیف فنڈ کمیٹی کی میٹنگ کی صدارت فرماتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال گزشتہ دنوں ٹیگور تھیئٹر چنڈی گڑھ میں روس کے لشکبر ڈالز تھیئٹر کی جانب سے پیش کئے گئے کٹھ پتلیوں کے تماشہ میں بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے ۔



ماہنامہ

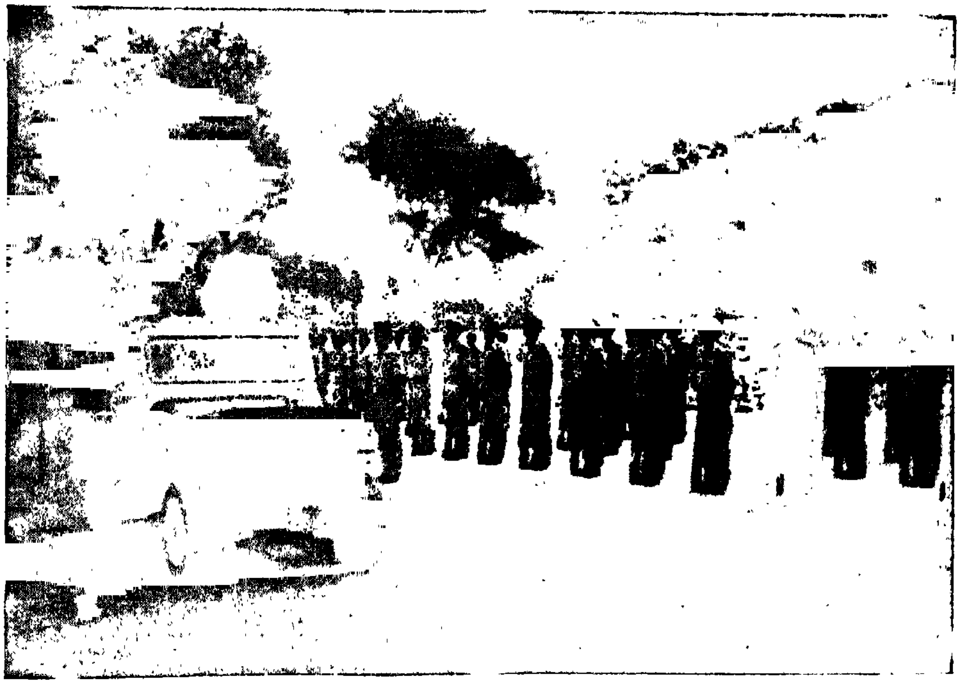
تعمیر





یوم آزادی کے موقع پر
عزت مآب ہری آنند براری
گورنر ہریانہ نے ۱۵ اگست ۱۹۸۸ء
کو بھوانی میں قومی پرچم لہرانے کی
رسم ادا کی۔

پرچم کشائی کے بعد گورنر ہریانہ
گارڈ آف آنر کا معائنہ
کرتے ہوئے۔



آپ کا محبوب مصوّر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

ستمبر ۱۹۸۸ء شمارہ ۹ جلد ۱۶

ترتیب

مدیرِ اعلیٰ
ارجن داس ملک
آئی۔اے۔ایس

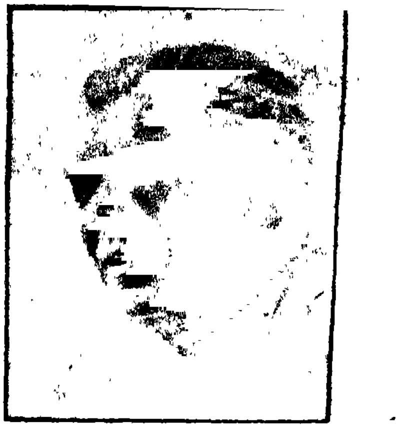
مدیر
سلطان انجم

خط و کتابت کا پتہ
مدیر تعمیر ہریانہ، ایس۔سی۔او ۱۸۴-۱۹۱
سیکٹر ۱۷سی، چنڈی گڑھ — ۱۶۰۰۱۷

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

مدیر کا مصنفین کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں

سرورق : پون کمار



یومِ اساتذہ کے موقع پر

پیغام

ہمارے ملک میں ہر سال ۵ ستمبر "یوم اساتذہ" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ دن آنجہانی ڈاکٹر رادھا کرشنن کا یوم ولادت ہے، جنھوں نے نہ صرف صدر جمہوریہ کے اعلیٰ ترین منصب کو عزت بخشی بلکہ ایک عظیم فلسفی اور معلم کے طور پر بھی ہندوستانی فکر و فلسفہ اور تعلیم کی روشنی پھیلائی۔ آج کے دن تمام قوم انھیں یاد کرکے، ملک کے ہر معلم کی خدمات کے تئیں احسان مندی کا اظہار کرتی ہے۔

معلم قوم کا معمار ہے۔ ملک کی نئی نسل کی تعمیر اور ملک و قوم کی ترقی میں اس کا رول نمایاں ہے۔ ہریانہ مہان گورووں، معلموں اور رشی منیوں کی سرزمین ہے۔ یہیں پر مہرشی وید ویاس، گورو وششٹ اور درون آچاریہ جیسے مہان گورووں نے علم و عرفان کی شمع روشن کی۔

ہریانہ سرکار تعلیم کے معیار کو بلند کرنے، اعلیٰ نصب العین، اخلاقی اقدار اور صحت مند روایات قائم کرنے کے لیے پُرعزم ہے۔ ہم ناخواندگی کی لعنت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی غرض سے خواندگی اور تعلیم بالغاں کے پروگراموں پر زور دے رہے ہیں۔

ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اساتذہ کو ان کے شایانِ شان احترام ملے جس کے وہ حقدار ہیں اور ان کے مفادات کا بھرپور تحفظ ہو۔ اس کے لیے ریاستی حکومت جامع اقدامات کر رہی ہے۔

یوم اساتذہ کے مبارک موقع پر میں ریاست کے سبھی اساتذہ کو مبارکباد دیتا ہوں اور انھیں آج کے دن کی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

—— دیوی لال
وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

۵ ستمبر ۱۹۸۸ء

تعمیرِ ہریانہ ۴ ستمبر ۱۹۸۸ء



رباعیات

باواکرشن گوپال مغموم

لشکر سے مصائب کے گذرتے رہیے
دم گردشِ ایام کا بھرتے رہیے
ہوجائیے آلام کے خوگر، یارو!
امواج و تلاطم میں اترتے رہیے

ماضیٔ بعید میں پہنچ جاتا ہوں
یادوں کی گھنی چھاؤں میں سستاتا ہوں
بدلا نہیں کیا میری محبت کا جہاں؟
ہر چیز کو اپنی ہی جگہ پاتا ہوں!

میں صبح کو جب نغمہ سرا ہوتا ہوں
حسن اور محبت کی ادا ہوتا ہوں
ہوجاتی ہے معمورۂ غم ساری فضا
ہر درد بھرے دل میں رسا ہوتا ہوں

بے راہ روی کا ہے یہ طوفانی دور
یہ درد و غم و کرب کا ہیجانی دور
انسان ہے انساں کے لہو کا پیاسا
دیکھا نہ تھا ایسا کبھی شیطانی دور

شعروں کے توسط سے مجھے مانا ہے
کچھ لوگوں نے کچھ کچھ مجھے پہچانا ہے
افسوس ہے اس بات کا مجھ کو مغموم!
اربابِ نظر ہی نے نہیں جانا ہے

عارف خورشید

خوشبو کا سفر

اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پر پڑے ہوئے ہلکے نیلے پردے ایک طرف سرکا دیئے اور نگاہیں میدان کے آخری کناروں پر سر اٹھاتے چوٹیوں پر جما دیں۔ شام آخری سسکیاں لے رہی تھی اور اجالا بڑی تیزی سے کہیں گھلا جا رہا تھا ــــ میدانوں کے سینوں سے گذرتے ہوئے کچے راستوں سے دھول اٹھ کر فضا پر چھاتی جا رہی تھی ــ وہ چند پل دھندلی نگاہوں سے منظروں کے یہ گھاؤ سہتی رہی۔ لمحوں کے یہ گھاؤ کس قدر گہرے ہوتے ہیں۔ خوشیوں اور مسرتوں کے راستوں سے کس بے رحمی کے ساتھ ان راستوں پر کھینچ لے جاتے ہیں جہاں صرف دکھ، کسک اور درد باہیں پھیلاتے جیسے منتظر رہتے ہیں۔ چند لمحہ پہلے وہ خوشیوں اور مسرتوں کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دیئے نیلوفر کے ساتھ گذرے دنوں کی چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر قدم اٹھاتی رہی تھی۔ نیلوفر کی ہر بات کے ساتھ یادیں نہاں خانوں سے نکل کر جیسے ساتھ چلتی رہی تھیں مگر وہی نیلوفر جب اٹھ کر اس کے پاس سے گئی ہے تو وہ اپنے ساتھ ہر خوشی کا رنگ لے گئی اور اسے جلتے سلگتے راستوں پر چھوڑ گئی۔ جہاں وہ اکیلی کھڑی بجھی نظروں سے اپنے آپ کو ملبوس شعلوں میں دیکھ رہی ہے۔ آگ اور صرف آگ۔ خیالوں کا سلگتا سفر اور سفر۔ اپنے پیروں کے آبلے بھلا وہ کس کو دکھا پائے گی۔ پیروں میں سلگتے آبلے اور بجھتی نگاہوں میں ہر خوشی کا راستہ چھپا جا رہا تھا۔ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر کرسی کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اس نے خود کو بیحد تھکا ہوا محسوس کیا۔ گیلری کے آخری سرے پر شاذ کے کمرے سے اٹھتی ہوئی گنگنانے کی آواز سے دھیان ہٹا کر اس نے ایک بار پھر نیلوفر کی ڈائری پر نگاہ دوڑائی جو میز پر پڑی پھڑپھڑا رہی تھی جو وہ بھول گئی تھی۔ کیا عجیب اتفاق ہے جو شے نیلوفر کو مجھ سے زندگی بھر چھپائے رکھنا چاہیئے تھی وہ اپنے ہاتھوں سے میرے پاس چھوڑ گئی ہے

بھلا ایسا کیوں ہوتا ہے جو شئے ہماری خوشیوں کی قاتل ہوتی ہے اس طرح کیوں اچانک سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ چند لمحوں میں ہم اپنی زندگی تمام مسرتیں کھو دیتے ہیں۔ اس نے نگاہ اٹھا کر کھڑکی کے شیشوں سے باہر میدانوں میں پھیلی کہر کو دیکھا۔ اور ایک بار پھر نگاہیں پلٹا کر ڈائری کے پھڑپھڑاتے اوراق پر جمادیں۔ پھڑ پھڑانے کی تیز اور مدھم آواز۔ بے رحم قاتل پھڑپھڑاہٹ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈائری ایک بار پھر اٹھالی۔ اور نگاہیں پلٹے اوراق پر جمادیں ڈائری کے کچھ اوراق بالکل سادہ ہیں گویا زندگی میں کوئی رنگ، کسی خوشبو کا گذر نہیں ہوا ہے۔ نہ کسی محرومی اور دکھ کے ہاتھوں نے اپنے وار کیے ہیں۔ شب و روز بس گذرتے رہے ہیں۔ کچھ صفحات پر تاریخ لکھی ہے مگر کوئی تحریر نہیں ہے، شاید زندگی کچھ عام ڈگر سے ہٹ کر کچھ نئے راستوں پر چل پڑی ہے۔ کسی دکھ یا گہری مسرت کا کوئی نشان نہیں۔ اس کی انگلیاں صفحات پلٹتی رہیں ایک صفحہ پر اس کی انگلیاں تھم گئیں۔ دن اور تاریخ کے ساتھ تحریر میں سمٹ آنے والے چھوٹے چھوٹے لفظوں کی لکیریں شاید زندگی کے اس حادثہ کی ابتداء ہو چکی ہے۔

پہلا ورق

کانپتے ہاتھوں کی تحریر۔ وہ بڑے غور سے نگاہوں کے ذریعہ الفاظ میں چھپے جذبوں کو تلاش کرنے لگی۔ "پہلا ورق" میں نے سوچا تھا۔ میری ڈائری کے تمام صفحات میری زندگی کی طرح بے تحریر گذر جائیں گے۔ سارے صفحات

مگر نہیں یہ میرا محرومی کا احساس تھا جو مجھے اس طرح سوچ کی ڈگر پر لیے چلتا رہا۔ میں اکثر تنہائی میں سوچا کرتی تھی۔ وہ لوگ کیسے ہوتے ہوں گے۔ جن کی زندگی صبح سے لے کر شام تک رنگ و بو میں گھری رہتی ہے۔ مگر آج اس خاموش اور اداس شام کو وہ اچانک میرے سامنے آکھڑا ہوا ہے تو لگتا ہے یہ راستے دھیرے دھیرے مجھے اس کی طرف دھکیلنے لگے ہیں۔ میں جیسے ان کی منتظر تھی۔ اس اداس شام کو بھیا کے لوٹنے سے پہلے مجھے زندگی میں پہلی بار شدید بے بسی اور محرومی کا احساس ہو رہا تھا۔ آس پاس کے مکان سناٹوں میں ڈوبے کھڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے یہاں آوازیں تھیں۔ خوشیوں سے بھری آوازیں تیز آوازیں۔ اور اب وہ سب ہاتھوں میں ہاتھ تھامے اپنی چمکتی موٹروں، اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر شہر کی گہما گہمی میں گم ہو جانے کے لیے چلے گئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت بچے رنگ برنگ کے کپڑوں میں ایک دوسرے کے پیچھے چلڈرن پارک کی پتلی پتلی روشوں پر دوڑ رہے ہیں۔ ان کی آیائیں درختوں کے نیچے بیٹھ کر اپنے اپنے مالکوں کی ڈھکی چھپی باتیں ایک دوسرے سے کہہ رہی ہیں۔ یہ چھوٹا سا چلڈرن پارک جس کی ہر روش پر میرے قدموں کے نشان ثبت ہیں۔

ابو اور امی کے حادثے میں اچانک کھو جانے کے بعد بھیا جنھیں میں نے کبھی پوری طرح گھر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ جو کبھی کبھی اچانک گھر میں دکھائی دیتے تو تنہا نہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کے دوست بھی ہوتے۔ کچھ دنوں تک گھر میں خوب ہنگامہ

مچا رہتا رات گئے تک باتوں قہقہوں اور مسرتوں سے بھری بلند آوازیں گھر میں گونجا کرتیں۔ امی اور ابو ان دنوں کتنے خوش رہتے، میں بھی کتنی خوش ہوتی۔ حالانکہ بھیا مجھے کبھی پوری طرح دیکھ بھی نہیں پاتے۔ بس کچھ دیر کے لیے متوجہ بھی ہوتے تو کچھ چھیڑ چھاڑ کی۔ بالوں کو بگاڑا اور دوستوں کے ساتھ پکنک پر نکل گئے۔ مگر امی اور ابو کے کار حادثے کے بعد بھیا گھر آتے تو لگتا ہے جیسے وہ پرشور ہنگامہ پرور شب و روز۔ جیسے بھیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے تمام دوستوں کو بالکل بھول چکے ہیں۔ دن بھر ابو کے کاروبار میں الجھے رہتے ہیں اور شام سے پہلے گھر لوٹ آتے ہیں۔ میں نے کتنی بار چاہا بھی ہے کہ بھیا کبھی کبھی اپنے دوستوں میں چلے جائیں یا کلب ہو آئیں مگر میری بات سن کر وہ چند لمحہ مجھے دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر دھیرے سے کہتے ہیں۔ نیلو جانے دل اب خواہشوں کا اسیر کیوں نہیں۔ تجھے چھوڑ کر جانے کو اب دل بالکل نہیں چاہتا۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر دل کانپ اٹھتا ہے تیرے جانے کے بعد یہ چھت تجھے کس طرح پناہ دے سکے گی۔ بھیا نیچے اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور میرا دل گھنٹوں انجانے جذبے کی گرفت میں جکڑا رہتا ہے۔ بھلا ایسی باتوں کے درمیان خوشیوں اور امنگوں کا تصور ممکن ہے؟ وہ کون سے ہاتھ ہوں گے جو مجھے حالات کی اس گہری دھند سے نکال کر اپنے ساتھ کچھ نئے راستوں پر لے جائیں گے۔ جانے دل انجانے راستوں کی تلاش کیوں کرتا ہے اس اداس شام کو بھیا اسے اپنے ساتھ لیے گھر میں داخل ہوتے تو جانے میں کن خیالوں کی اسیر تھی؟ بھیا میرے پاس اسے چھوڑ کر اس کے بارے مختصراً بتا کر باتھ روم میں چلے گئے۔

" میرا سب سے اچھا رفیق اور میرے کاروبار کا ساتھی اب اپنے ہی ساتھ رہے گا"۔۔۔ مختصر مگر طویل اور کبھی نہ ختم ہونے والا تعارف چند پل خاموشی اور سناٹا، سانسوں کی آواز اچٹتی نگاہوں کا تصادم، اور پھر ایک دوسرے سے بے نیازی۔ میں اکثر سوچا کرتی ہوں جو لوگ آگے چل کر ہماری رگ و پے کا ایک جز بن جاتے ہیں ابتدا میں اس قدر اجنبی کیوں ہوتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں آگے چل کر ہمیں پھر سے اجنبی بن جانا ہوتا ہے۔ ایسا تو ہوا ہے۔

دوسرا ورق

خوشیوں سے بھرے پرے دنوں کا ذکر

خوشیوں مسرتوں زندگی کے قوس قزح کے۔ رنگوں کا سلسلہ خوشیوں کا سفر۔ طویل اور بے انت سفر۔

اس کی نظریں ڈائری کے صفحہ پر تیزی سے دوڑتی رہیں" کوئی ایسی ہستی ہو جو ان مسرتوں کی رازدار ہو" نیلوفر کی خواہش۔ جی چاہتا ہے کوئی ہو جس کے سامنے اپنے دل کی کیفیت کا اظہار کر سکوں۔ جانے دل اس قسم کی خواہش کیوں کرتا ہے۔؟" اس کی نگاہیں بڑی تیزی سے نیلوفر کی تحریر پر دوڑتی رہیں۔" آج میری سب سے پیاری سہیلی میری خوشیوں کی رازدار بنی۔ اس کی نگاہیں اپنے نام پر۔۔۔۔۔۔ کچھ دیر کے لیے رک گئیں۔ نیلوفر نے اپنی تحریر میں

کس والہانہ انداز میں میرا ذکر کیا ہے۔ کس قدر اپنائیت ہے اس کے ان جملوں میں۔ اس نے ایک پل کے لیے ڈائری کے صفحہ پر سے نگاہیں ہٹا کر سوچا اور پھر متوجہ ہوگئی۔ "زوبی میری خوشیوں اور اداسیوں کی ساتھی آج میری رازدار بنی میں نے کسی پراسرار انداز میں زوبی کے سامنے اپنے اور اس کے بارے میں ایک ایک پل کی روداد سنائی ہے۔ جب تک میں اپنی بات کرتی رہی بیچ بیچ میں زوبی اسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش کرتی رہی۔ مگر میں اسے زوبی کو کس طرح دکھا پاتی۔ وہ تو بھیا کے ساتھ کاروبار کے سلسلہ میں ان دنوں شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ جب وہ واپس ہوگا تو زوبی کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گی۔ پھر ہم دونوں مل کر اس کے بارے میں مزید باتیں کریں گے۔ زوبی کا یقین ہے کہ مجھ جیسی ہستی کسی معمولی شخصیت کی اسیر نہیں ہوسکتی۔ اور میں سوچتی ہوں زوبی کا خیال کس قدر ٹھیک ہے۔ جانے اب تک میری زندگی میں کوئی ایسی ہستی کیوں نہیں آئی تھی۔ کیا میری ذات اس قدر مختلف ہے؟ زوبی کے اس خیال پر تنہائی میں میں نے اپنے بارے میں اکثر سوچا ہے۔

آگے صفحہ پر کچھ ذاتی باتوں کا ذکر ہے جن کا اصل واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔

تیسرا ورق

کچھ بے التفاتی اور اداسیوں کا ذکر۔ مختصراً مگر شدید کیفیت کا اظہار۔ نیلوفر نے لکھا تھا — بھیا ہر چیز سے بے خبر بڑی تندہی سے کاروبار چلانے میں مصروف ہیں۔ اور اکثر شہر سے باہر رہنے لگے ہیں۔ شہر کے کاموں کی دیکھ بھال اب وہ کرنے لگا ہے۔ وہ دن بھر گھر سے باہر رہتا ہے اور رات گئے لوٹتا ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں ان دنوں اچانک وہ بجھ سا گیا ہے۔ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ میں بے چین ہوں، میں نے اس کی روح میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس نے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں۔ میں کس طرح قدم رکھ پاؤں گی۔ میں نے اس کی نگاہوں میں کسی دکھ کی تحریر کو تلاش کرنا چاہا۔ مگر ہر تحریر صاف ہے بس الجھن کے کچھ نقوش، ایسا کیوں ہے؟ وہ کیوں بدل رہا ہے، یہ کیسی تبدیلی ہے۔ اس کے بعد کے کئی صفحات سادہ ہیں۔ کچھ صفحات پر تاریخ اور دن کا اندراج بقایا صفحات سادہ ہیں۔ بالکل سادہ۔

گیارہواں ورق

مختصر سی تحریر۔ بے چینی اور اداسی کا شدت سے ذکر۔ آگے بہت سے صفحات سادہ ہیں۔

زوبی اوراق تیزی سے پلٹنے لگی۔

اگلا صفحہ —

آج کی شام ہر شام سے کچھ زیادہ ہی اداس ہے۔ جانے دل ہر چیز سے بیزار کیوں رہنے لگا ہے وہ جب تک نہ آیا تھا تب بھی سینے میں یہی دل تو تھا۔ اب وہ مجھ سے اس قدر اجنبی کیوں ہونے لگا ہے۔ اب ہر دھڑکن بیزاری کی طرف کیوں لے جا رہی ہے مجھے۔ جانے دل اس قدر اسیر کیوں ہو جاتا ہے کس کا کہ پھر خود اپنے آپ کو انسان اجنبی سمجھنے لگتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے ایسا سب کچھ۔؟

ایک اور ورق

تنہائی اور تنہائی کا شدت [illegible] کر۔ دو روز سے وہ گھر نہیں لوٹا پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ میں نے آفس فون کیا۔ معلوم ہوا ہمیشہ کی طرح شام کو وہ آفس سے نکل جاتا ہے۔ کہاں جاتا ہے مجھے کوئی خبر نہیں۔ رات بستر پر لیٹتی ہوں تو فلیٹ کے نیچے سے گذرتی ہوتی ہر کار کی آواز پر گماں ہوتا ہے کہ وہ آگیا ہے۔ مگر جب آواز تیزی سے گذر جاتی ہے تو دل اپنے اس جذبے پر مسکرانے لگتا ہے۔ تنہائی۔ محرومی اور اداسی میرا مقدر ہے۔

آگے کا ورق

دو دن بعد آج وہ گھر لوٹا ہے۔ میں فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں گل مہر کے درخت کے نیچے بیٹھی اس کا سوئیٹر بن رہی تھی کہ وہ آگیا۔ میرا دل ایک دھڑک اٹھا ہے دو دن بعد اسے دیکھا ہے، دل بھی کتنا بے تاب ہے۔ چاہتا ہے دو دنوں کی پیاس پوری کر لے۔

کار سے نکل کر وہ ایک پل کے لیے رکا ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر تیز تیز قدم اٹھاتا، سیڑھیاں چڑھ کر صحن سے گذر گیا۔ میں اپنی گود میں اون کا بنڈل ڈالے انگلیوں میں تھمی سلائیوں سے بے خبر اس راستے کو دیکھ رہی ہوں جس پر سے ہو کر وہ گیا ہے۔ یہ راستہ جس پر میں کبھی قدم ملا کر اس کے ساتھ چلی ہوں لگتا ہے جیسے کسی اجنبی کی طرح مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہاں پہنچ کر مجھے لگتا ہے جیسے میں نے اپنی تمام خوشیاں تمام مسرتیں کھو دی ہیں۔ کیا ایسا ہوا ہے؟ جانے دل اس موڑ پر پہنچ کر کیوں کانپ اٹھتا ہے۔؟

پھر ایک ورق

بڑی انوکھی اور بڑی پر اثر تحریر، آج شام کی چائے پر وہ بھی موجود تھا کتنے دنوں بعد اسے قریب سے دیکھا ہے۔ دل بیتاب ہے، جی چاہتا ہے اسے دیکھتی ہی رہوں۔ صاف شفاف چہرہ، گہری سیاہ آنکھیں، خوبصورت چمکتے ہو دار بال جو ہمیشہ کی طرح بڑے سلیقے سے جمے ہیں۔ پیشانی پر سوچ کی لکیریں۔ میں نے خاموشی سے چائے پی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی چلتے چلتے میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ نگاہیں اٹھائے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ نگاہ ملتے ہی اس نے آنکھیں جھکا لیں اور میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنے آپ کو ایک کرسی پر گرا دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں کمرے میں خاموشی اور سناٹا۔ چند پل خاموشی سے گذر گئے۔ مجھے دروازے کے پاس قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا وہ دروازے کے پٹ تھامے میری طرف دیکھتا کھڑا تھا۔ آنکھوں کے ملتے ہی اس کی نگاہ میں شدید الجھن اور کشمکش کے نقوش دکھائی دینے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آنکھیں جھکا لیں اور پلٹ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں پھر خاموشی اور سناٹا۔ اور میرے گھائل دل کی دھڑکن۔"

ایک اور ورق کی تحریر۔

مختصر اور انوکھی۔ آج شام کی چائے کے بعد اٹھ کر میں اپنے کمرے کی طرف چلی تو میں نے ایک مختصر سی تحریر اس کے پاس چھوڑ دی۔ کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا

وہ ایک ٹک میری تحریر دیکھ رہا تھا۔ میں نے لکھا تھا۔

" ان دنوں میں تمہیں شدید الجھن اور اداسی میں گھرا دیکھ رہی ہوں اگر تم کچھ دیر کے پلٹ کر ان دنوں کی طرف دیکھنا چاہو گے جو ہم گذار آتے ہیں تو شاید تمہیں میری کتنی باتیں یاد آئیں گی۔ باتوں باتوں میں میں نے تمہارے سامنے بیدی کی کہانی کا ذکر کیا تھا۔ جو مجھے بیحد پسند آئی تھی۔ مجھے اس کہانی کی کردار کا وہ جملہ آج بے حد یاد آرہا ہے۔ اور اسی کی طرح آج میں تم سے ایک بات کی خواہش کروں گی۔ اگر تمہاری زندگی میں کچھ دکھ درد اور اداسی ہے تو مجھے دے دو اور میری تمام خوشیاں تم لے لو۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے لگا جیسے میں نے ایک طویل مسافت طے کی ہو میں منتظر تھی کسی بات کی۔ چند پل شدید بے چینی میں گذر گئے۔ مگر میں نے تھوڑی دیر بعد کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اور پھر شاید یہیں سے میری زندگی کے سناٹا پر ور درد کا آغاز ہوا ہے۔

اس کی انگلیاں اگلے صفحات پر تحریروں کو تلاش کرتی رہیں۔ کچھ صفحات پر بے ربط جملے۔ چند اداس شعر۔ بے کیف شاموں کا ذکر۔

آگے کا ورق۔

کتنی دن بعد آج اچانک زوبی کی یاد آتی ہے میں بھی کتنی ناسمجھ ہوں کہ اداسیوں کے ان شب و روز میں اپنی سب سے اچھی رفیق کو بھلا بیٹھی ہوں۔ آج شام اس کے پاس جاؤں گی اور وہ تمام آنسو جو آنکھوں میں چھپے ہیں بہا آؤں گی۔ ایک بوجھ تو ہلکا ہوگا۔

کچھ دیر تک اس کی انگلیاں اگلے صفحے پر پہنچنے سے پہلے رک گئیں۔ شاذ کے کمرے سے گنگنانے کی آواز بند ہوگئی ہے۔ شاید اب وہ کپڑے تبدیل کر رہا ہے۔ چند لمحہ بعد وہ مسکراتا ہوا آئے گا۔ اور اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اسے لے کر چل پڑے گا۔

اس کی انگلیوں نے اگلا صفحہ پلٹا۔

شام زوبی کے پاس گئی سوچا تھا کہ اسے اپنے تمام دکھوں کے بارے میں بتاؤں گی۔ اس کے ساتھ مل کر آنسو بہاؤں گی کہ کچھ بوجھ ہلکا ہو۔ مگر وہاں پہونچ کر اسے بے حد خوش اور مگن دیکھا تو جی نہ چاہا کہ اس کی خوشیوں کو پامال کروں — خوشیوں کے پامال ہونے کو بھلا مجھ سے زیادہ کوئی محسوس کر سکتا ہے ؟ سوچا تھا کہ آج اس سے بہت کچھ کہوں گی اس کا نام بھی بتا دوں گی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آج تک بے خودی میں زوبی کو اس کا نام تک نہیں بتا سکی۔ مگر جب زوبی کی مسرت بھری باتیں سنیں تو اپنے تمام تر دکھ بھول گئی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ میں کچھ دیر ٹھہر جاؤں وہ مجھے اس سے ملانا چاہتی تھی۔ مگر جانے میں کیوں ٹک نہ سکی۔ جانے دل اب کسی کی خوشیوں میں شامل ہونا کیوں نہیں چاہتا۔ کیا میں خود غرض ہوگئی ہوں، شاید۔

اگلے ورق کا درد۔

زوبی کے پاس سے لوٹی تو بھیا کو گھر پر موجود پایا۔ جی چاہا لپٹ کر خوب روؤں۔ بھیا میری بے اختیاری دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے —

اگلے دن بالکل سویرے انھیں پھر باہر جانا تھا۔ انھوں نے اس کے بارے میں مجھ سے پوچھا اور میں نے جواب دیا وہ کئی دنوں سے گھر پر نہیں ہے۔ کہاں ہے مجھے بالکل خبر نہیں ہے۔ پھر میں نے بھیّا سے ضد کی اب میں انھیں چھوڑ کر نہیں رہ سکتی۔ بھیّا نے مجھے بہت سمجھایا مگر میں نہ مانی اور بھیا مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ کل صبح میں بھیّا کے ساتھ باہر چلی جاؤں گی۔ دل یہ کہتا ہے یہاں سے نکل جاؤں تو بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ شاید اس سے دور جا کر اسے بھول سکوں کیا ایسا ہو گا؟

بھیّا نے نوکروں کو بلا کر تیاری کرنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ بھیا اپنے کمرے میں ہیں اور میں اپنے کمرے میں اپنے ٹیبل لیمپ کی دھندلی روشنی میں جھکی چند لمحوں میں گذرے دنوں کے ویرانوں کو کھنگال آتی ہوں۔ میرے بالوں میں دھول ہے کیا یہ میرا مقدر رہے؟ میں سوچتی ہوں کیوں نہ اپنے باہر جانے کی خبر زوبی کو دے دوں تاکہ دور جا کر بھی اس کی خوشیوں کے بارے میں مجھے پتہ چلتا رہے۔ میری تمنا ہے کہ زوبی کی امنگیں کبھی لہولہان نہ ہوں۔ وہ سدا خوش رہے۔ خوشیوں کے راستے پر اس کے قدم آگے کی طرف بڑھتے ہی رہیں۔

میں نے چھٹی لکھ کر نوکر کو دے دی ہے کہ وہ زوبی تک پہنچا دے۔ بھیا سے نئے مقام کا پتہ پوچھ کر چھٹی میں لکھ دیا ہے۔ تاکہ اس کے خطوط آتے رہیں۔

اگلے ورق کا سفر۔

نئی جگہ، بے شمار لوگ، اجنبی چہرے انجانے، ان گنت، بھیّا آتے ہی کاروباری لوگوں میں گھر گئے ہیں۔ میں دن بھر کتاب پڑھتی رہتی ہوں۔ یا طبیعت اکتا جائے تو ڈرائیور کے ساتھ نئی نئی جگہ دیکھنے نکل جاتی ہوں۔ یہ جگہ مجھے بیحد پسند آئی ہے۔ بڑا سکون ملا ہے مجھے۔ یادیں، جنھیں میں نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب کبھی کبھی ہی میرے راستوں میں آتی ہیں۔ اچھا ہو کہ میں ان یادوں سے اپنا دامن چھڑا سکوں۔

اگلے ورق کا گھاؤ ــــ

شدید دکھ کے راستوں پر لے جانے والا۔

زوبی کا خط آیا۔ ساتھ میں

بھی ہے۔ بس چند لمحہ ساکت بیٹھی کارڈ دیکھتی رہی ہوں۔ خوبصورت کارڈ کئی رنگوں سے سجا۔ کل کے بعد سے یہ تمام رنگ زوبی کی زندگی میں گھل مل جائیں گے۔ میری خواہش ہے کہ یہ رنگ کبھی ہلکے نہ ہوں۔ ان کا رنگ ہر نئے دن کے ساتھ گہرا ہوتا جائے۔ اس طرح کہ زوبی جب بھی نگاہ اٹھا کر اپنے اطراف دیکھے ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے نظر آئیں۔ رنگ گہرے ان مٹ خوشیوں کے رنگ۔

اس نے ڈائری بند کر کے میز پر رکھ دی اور اداس نگاہوں سے شاذ کے کمرے کی طرف دیکھا کھڑکی سے باہر میدانوں میں اندھیرا اتر آیا ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور شاذ مسکراتا ہوا قریب آ کھڑا ہوا ہے۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی ہے۔ شاذ کی کی نگاہ اس کے چہرے سے ہٹ کر میز پر پھڑپھڑاتی ڈائری پر پڑتی ہے۔ اور اس نے آگے بڑھ کر ڈائری اٹھالی ہے۔

فضا ابن فیضی

غزل



اپنے اس کے درمیاں اک رابطا بن جاؤں گا
رفتہ رفتہ میں کوئی دستِ دعا بن جاؤں گا

خواب ہوں، شب بھر تو پلکوں پر سجائے رکھ مجھے
صبح تک میں بھولا بسرا ماجرا بن جاؤں گا

کیا خبر تھی، دوستوں کی مہربانی کے طفیل
اس طرح جینا پڑے گا، حادثا بن جاؤں گا

دیکھنے میں ہوں بہت بے وضع، پتھر کی طرح
بس سلیقے سے تراشو! آئنا بن جاؤں گا

سانحہ ایسا نہیں کچھ یہ شکستِ التماس
بس یہی ہوگا کہ آشوب انا بن جاؤں گا

وقت کے اس بے اماں موسم میں مجھ کو ساتھ رکھ
دھوپ پھیلے گی تو سائے کی قبا بن جاؤں گا

تہمتوں کی بے لباسی، دیکھتی رہ جائے گی
میں ترے شانوں پہ مریم کی ردا بن جاؤں گا

کیا تمہارا میرا رشتہ، لفظ کے صورت گرو!
نقش میں تو ڈھل نہ پاؤں گا، صدا بن جاؤں گا

ایک شاعر کا قلم ہوں آج، لیکن اے فضاؔ
وقت آنے پر پیمبر کا عصا بن جاؤں گا

"کیا ہے یہ زوبی؟"

اس نے دھیرے سے پوچھا۔ اور پھر اوراق پلٹتے ہی اس نے دیکھا کہ شاذ کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ پل بھر کے لیے صاف و شفاف چہرے گہری سیاہ آنکھوں اور خم دار چمکیلے بالوں پر کہر سی چھا گئی۔

اس نے آہستہ سے ڈائری میز پر رکھ کر زوبی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر گیلری کی طرف بڑھا تو زوبی نے محسوس کیا کہ وہ بے حد تھکا تھکا سا چل رہا ہے۔

جسونت سنگھ راز

اورنگ زیب کے زمانے کا فارسی شاعر نند لعل گویا

ادبیات فارسی کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ اورنگ زیب کے دور کے عظیم فارسی شاعر بھائی نند لعل گویا جنھوں نے چمنستان شاعری میں برسوں اخلاقیات تصوف اور معرفت کے رنگا رنگ پھول بکھیرے ہیں کے نتائج افکار تین صدیاں بیت جانے کے باوجود گلدستۂ طاق نسیاں بنے ہوئے ہیں۔ سوائے ان کے دیوان کے جو لغیر چھان بین کے ایک ٹیکٹ بک کمیٹی نے شائع کیا ہے ان کی بیس کے قریب تخلیقات ابھی تک تشنۂ اشاعت ہیں۔ نہ کسی تذکرہ نویس نے انہیں دنیائے فارسی سے روشناس کرانے کی زحمت گوارا کی ہے اور نہ ہی کسی ادبی انجمن کو انہیں کتابی صورت دینے کی توفیق ہوئی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ گویا کا سرمایۂ کمال ابھی تک محفوظ ہے۔ تاہم ان کی شاعرانہ نکتہ آفرینوں کی مہک گوردواروں کی چار دیواری تک ہی محدود ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ ان کے نظمیہ کلام کا محور ان کے پیر و مرشد اور سکھوں کے آخری گورو کی مدح سرائی ہے۔ جیسے ڈھاڑھی سکھوں کے جتھے ستار یہ اور تار بجی گوردواروں میں راگی بسا اوقات شبد کے طور پر گاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھائی نند لعل گویا کی نظمیں غلط یا درست زندہ و تابندہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بھائی نند لعل گویا کا کلام تاش کے پتوں کی طرح بکھرا ہوا ہے قلمی نسخے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد دستیاب ضرور ہو سکتے ہیں مگر فارسی بھارت کے لسانی افق سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اس عظیم شاعر کی فکر انگیز عارفانہ شاعری افسانہ ہوئی جاتی ہے نہ اسے سمجھنے والے ہیں نہ سمجھانے والے۔ جو دیوان منظر عام پر آیا ہے وہ بھی مستند نہیں اس کے جو اشعار میری نظر سے گزرے ہیں ان میں جزوی طور پر ایسے مصرعے ہیں جو ایران کے سر برآوردہ شعرا کے دواوین میں ہیں۔ کچھ نمونے ملاحظہ

ہوں:

گویا: ہم در ایں دنیا بیابی کام را
خاک بر سر کن غمِ ایام را

حافظ ساقیا بر خیز و در دہ جام را
خاک بر سر کن غمِ ایام را

مرا در منزلِ جاناں ہمہ عیش و ہمہ شادی
جرس بے ہودہ می نالد کہ بربندید محمل ہا

حافظ: مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

مولانا روم:

گر تو خواہی خرمیٔ دل بندگی
بندگی کن، بندگی کن۔ بندگی

گویا:

دولتِ جاوید باشد بندگی
بندگی کن، بندگی کن۔ بندگی

میں نے گویا کے شائع شدہ شعری مجموعہ میں کچھ ایسے مصرعے بھی دیکھے ہیں جو حافظ، سعدی۔ عطار اور مولانا روم کے دواوین میں بھی ہیں۔ بحر اور وزن ایک طرف انداز تخیل اور ترتیب و بندش بھی ایک جیسی ہے ایسے صاحب فن اور صاحبِ کمال سخنور کے بارے میں یہ کہنا ستم ہوگا کہ انھوں نے دوسرے شعرا کے کلام کو اپنے سے منسوب کیا ہو۔ بات صاف ہے کہ ان کا کلام بے التفاتی کا شکار رہا ہے۔ فارسی صدیوں راج دربار کی زبان رہی۔ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد تک اس کا سکہ چمک دمک سے رواں رہا لیکن زمانہ نے اتنی بھی مساعدت نہ کی کہ اس عظیم شاعر کی تخلیقات کو جوں کا توں برقرار رکھے۔ ان کی تصنیفات ہیں دیوانِ گویا۔ زندگی نامہ۔ گنج نامہ۔ توثیف وثنا۔ نصائح گویا اور بے شمار قطعات فارسی ادبیات کی جان ہیں لیکن چھان بین کے محتاج ہیں ان کے خالص اشعار پر مشتمل ان کی تخلیق اول زندگی نامہ کو پڑھا جائے تو ہر شعر کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاں اینجا است کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ روانی۔ لطافت۔ الفاظ کی موزونیت اور علمیت کا طنطنہ جو گویا کے اشعار میں ہے وہ کسی بھی ہندو اور سکھ فارسی اور اردو کے شاعر میں نہیں۔ کلام میں سوز و گداز۔ زبان کی شگفتگی۔ برجستگی۔ پاکیزگی اور لطافت ان کی قادر الکلامی کی مظہر ہے۔ تمام تر کلام صوری و معنوی اوصاف سے آراستہ ہے۔ کاش ان کے کلام کو کوئی درست اور مستند صورت دے کر اس فاضل اجل کی انفرادیت کے نقوش اجاگر کرنے کی کوشش کرتا جو ادبیات فارسی پر یک گونہ احسان ہوتا۔

ایک اور ستم یہ ہے کہ اس عظیم شاعر کے سوانح حیات کے بارے میں بھی تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ ان کے آبائی شہر ملتان سے ان کے خاندان کے ارکان کچھ قلمی نسخے وہاں سے پاکستان بن جانے پر ہجرت کرتے وقت ضرور لاتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۶۳۳ء میں غزنی کے حاکمِ اعلیٰ کے میر منشی چھجو رام کے ہاں تولد ہوئے جو عربی و فارسی کے بڑے عالم تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو ہر دو زبانوں میں طاق کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ بھائی نند لعل نے

طلعت عرفانی

جہاد

میں نے دیکھا ہے
کہ پانی کے مخالف تیرنا
مچھلی کی مجبوری ہے۔
ورنہ
بہتے پانی کے سفر میں
چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو
عمر کا حاصل نہ ہو کوئی مقام
مرحبا! اے زیست کے دلکش خرام۔
مرحبا! اے خواہشِ عمرِ دوام۔

آگرہ میں اورنگ زیب کے بڑے شہزادے معظم بہادر شاہ کی میر منشی کے طور پر ملازمت کی ______ اور اپنے فرائض منصبی اس خوبی سے سرانجام دیتے کہ شہزادہ اور اس کے درباری ان کے خلوص علمیت اور دیدہ وری کی بے حد قدر کرنے لگے۔ چونکہ اپنے آبائی شہر سے جدائی گوارا نہ تھی اس لیے آگرہ کو چھوڑ کر ملتان آئے مگر چند سال قیام کے بعد اپنے پیر و مرشد سے محبت اور روحانی تشنگی انہیں آنند پور صاحب لے آئی۔ دنیا کے سب کام ترک کر دیئے اور فانی المرشد ہوگئے گورو دشمیش سے ان کا جنون کی حد تک عشق تھا اس کا بین ثبوت یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

دین و دنیا در کمند آں پری رخسار ما
ہر دو عالم قیمتِ یک تار موئے یار ما
قدرِ لعل او بجز عاشق نداند ہیچ کس
قیمت یاقوت داند چشم گوہر بار ما

اور پھر ذرا انتہائے عشق دیکھئے۔

ہر جا کہ دیدہ ایم جمالِ تو دیدہ ایم
ما جز جمال دوست نظارہ نمے کنم

نظمیہ اور غزلیہ کلام کے علاوہ انھوں نے پچاس کے قریب رباعیاں بھی لکھیں۔ ہر ایک رباعی اس دنیائے فانی کے لیے چراغ راہ ہے نمونہ ملاحظہ ہو۔

گویا تا کہ ایں سرائے معدوم
گاہے لازم شوی و گاہے ملزوم
تا کے چوں سگاں بر استخواں جنگ کنی
دنیا معلوم و اہلِ دنیا معلوم

یقین جانئے اگر بھائی نند لعل کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ ان کے اشعار میں سعدی کی سادگی۔ حافظ کا بانکپن اور خسرو کی علمیت کا طنطنہ ہے۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے دشمیش کے دربار کا یہ ملک الشعراء مرشدِ کامل کی حضوری میں کم و بیش تیس سال گذارنے کے بعد ضعفِ پیری کی تاب نہ لاکر پھر واپس ملتان آگیا اور وہیں ۱۷۰۵ء میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اب جب کہ فارسی شاعری برصغیر ہند و پاک میں قصہ پارینہ بن کر رہ گئی ہے۔ آئندہ شاید ہی ایسا کوئی دیدہ ور اس سرزمین پر جنم لے جو قد و قامت کے اعتبار سے سعدی و حافظ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے یا ان کا سا رنگ جما سکے۔ یہ سعادت بھائی نند لعل گویا کے ہی نصیب میں تھی۔

غزلیں

ڈاکٹر نریش

وہ لوگ کیا ہوئے اونچا مکان چُپ کیوں ہے
بڑے میاں کا بڑا پیچوان چپ کیوں ہے
مرے وجود سے منکر ہیں بام ودر کیوں کر
چلے گئے ہیں جو بچّے مکان چپ کیوں ہے
شرف عطا جو کیا ہے مجھے نیابت کا
مری صدا پہ ترا آسمان چُپ کیوں ہے
اگر یہ شہر ہے ناآشنا فسادوں سے
جرس خموش ہے کیونکر اذان چپ کیوں ہے
صدائے گوتم وچشتی خموش کیوں ہے نریش
جدید دور کا ہندوستان چُپ کیوں ہے

سیّد قیصر قلندر

بادۂ نیم رس نگاہوں میں
یا شفق خواب کی پناہوں میں
چارسُو مشکلوں کی یلغاریں
عمر کے کارواں کی راہوں میں
ان چراغوں کی روشنی سے جُدا
خون جلتا ہے عیش گاہوں میں
دل زدوں کا بہار سے کیا کام
وہ تو جلتے ہیں اپنی آہوں میں
اِک تمنائے بے کراں کی طرح
وصل کی آرزو ہے بانہوں میں
گل کھلیں یا چھلک پڑیں ساغر
وہ سسکتے رہے کراہوں میں
وہ قلندر کی بات کیا سُن لیں
مست ہیں عیش کی پناہوں میں



آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر

عزّت کا سوال

وہ حضرات رخصت ہو گئے تو چارپائی پر آکر لیٹ گیا۔ بیحد مضطرب، اداس و مایوس!! ان لوگوں سے ابھی کچھ منٹ پہلے ہوئی گفتگو کا اثر تھا یہ۔ ہر چند کہ مجھے فی زمانہ اس طرح کے واقعہ کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ جو باتیں ہوئیں تھیں وہ غیر متوقع نہیں تھیں۔ پھر بھی دل کو ایک دھکا سا لگا تھا۔ ایک ذہنی چوٹ جسے میں اب سہلا رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے بار بار یہ خیال آرہا تھا اور اذیت دے رہا تھا کہ ایسے برگزیدہ و محترم بزرگوں کو اس طرح کا رویہ نہیں اپنانا چاہیے تھا۔ جس "مشن" پر وہ میرے گھر آئے تھے اس سے جو ذہنی کوفت ہوئی اس سے بھی بڑھ کر اذیت ناک و افسوس ناک تھا وہ ڈھنگ جس سے انھوں نے بات چیت کی تھی۔ ان کے طرزِ عمل نے میرے پورے وجود کو جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ کتنی بیباکی بلکہ ڈھٹائی سے انھوں نے اپنا مطمحِ نظر مجھ پر واضح کر دیا تھا۔ کوئی جھجک نہیں۔ کسی طرح کے احساسِ ندامت کا شائبہ تک نہیں۔ ان کی بات چیت میں دھونس کا عنصر بھی صاف تھا۔ میرے لیے جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا!! اُف!! کتنی بے بسی سے میں اُن کی باتیں سُنتا گیا تھا۔ انھیں کچھ بھی جواب نہیں دے پایا تھا۔ اپنے اصلی جذبات کو زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔ شاید مجھ میں اخلاقی جرأت کی کمی تھی۔ آخر کار میں نے جھوٹ بول کر جان چھڑائی تھی۔ لیکن یہ بھی تو ایک اخلاقی ہار تھی۔ میں نے یہ کہہ کر صریحاً جھوٹ بولا تھا کہ میرے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ساتھ تعلقات بے حد کشیدہ ہو چکے ہیں۔ چھ سات ماہ پہلے وہ یقیناً میرے نزدیک ترین دوستوں میں تھے لیکن اچانک کچھ ایسی بات ہو گئی کہ ہماری بات چیت بند ہو چکی ہے۔ اور سبھی طرح کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ اب حالت یہ ہے کہ اگر ان کے سامنے میرا نام لیا گیا تو کام بننے کی بجائے بگڑ جائے گا۔ ورنہ مجھے آپ صاحبان کے ساتھ جانے میں کیا عذر یا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بلکہ میرا فرض تھا۔ آپ بہ نفسِ نفیس تشریف لائے ہیں اس غریب خانے

پر؟ وغیرہ وغیرہ۔ میری زبان کچھ زیادہ ہی کھل گئی
تھی۔ جھوٹ بولنا بھی ایک فن ہے۔ ورنہ آپ کی
چوری پکڑی جاتی ہے۔ آپ کا چہرہ آپ کے باطنی
جذبات کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ کچھ
ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے انکار پر اُن لوگوں نے
اس انداز سے میری طرف دیکھا تھا جیسے زبانِ حال
سے کہہ رہے ہوں۔

"ہوں! بہت خوب!! ہم جیسے کایاں زمانہ شناس
جہاں دیدہ لوگوں کو بنانے کی کوشش کر رہے ہو!
برخوردار! ہم سب سمجھتے ہیں۔ تم جیسے ہر لیش
چند ہم نے بھوکوں مرتے ہی دیکھے ہیں۔ ویسے
اس وقت کون سی بہتر حالت ہے تمہاری۔
خود کو افسر کہتے ہو اور ایک پُرانی سائیکل گھسیٹتے
پھرتے ہو۔ افسر لفظ کی توہین ہی تو کر رہے ہو۔

وہ لوگ جا چکے تھے۔ میں بیحد افسردہ اُداس
اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُن تینوں حضرات
میں صرف ہیڈ ماسٹر صاحب نے نسبتاً ڈھنگ
سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُن کے الفاظ
میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"دیکھیے، بھائی صاحب! ہمیں خود احساس
ہے کہ اس وقت آپ کو زحمت نہیں دینی چاہیے
تھی۔ آپ آرام فرما رہے تھے لیکن یہ کام ہی کچھ ایسا ہے
ہمارا ذاتی مفاد کوئی نہیں۔ یہاں آنے میں قطعاً
کوئی خود غرضی کا جذبہ کار فرما نہیں ہے، یہ ہماری
درس گاہ کی عزت کا سوال ہے، ہمارے منیجر صاحب
کے وقار کا سوال ہے، اسکول کی نیک نامی داؤ
پر لگی ہوئی ہے ورنہ ہم آپ کو کبھی تکلیف نہ دیتے"
اور پھر یکایک ہیڈ ماسٹر صاحب کے یہ الفاظ
مجھے آج سے تیس برس پہلے کی دُنیا میں لے گئے تھے
لیکن عجیب اتفاق تھا، ہو بہو وہی الفاظ!! ہوبہو!!

جس اسکول سے ہم نے دسویں تک تعلیم حاصل کی
تھی، اس میں یہ ہمارا آخری دن تھا۔ آج الوداعی
پارٹی تھی۔ پندرہ بیس دن بعد امتحان شروع ہونے
والا تھا۔ ہم خوش بھی تھے اور اُداس بھی تھے
دسویں جماعت کے بچے خوب بن ٹھن کے آتے تھے
اپنے اپنے والدین کی بساط کے مطابق۔ ہم نے خود بوسکی
کی ایک دم نئی قمیض سلوائی تھی۔ ہمارے والد
صاحب نے ہماری فرمائش پر معاشی تنگدستی کے
باوجود مہنگے سے مہنگا کپڑا خرید کر دیا تھا۔ ایسی
لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے میں لطف آتا تھا۔
اور ہمیں ان کی اس ادا پر ناز تھا۔ ورنہ اڑھائی
روپے گز کا کپڑا خریدنا اُن کے بس میں کہاں تھا
نجانے کہاں سے ہم نے کلائی کی گھڑی کا انتظام
کر لیا تھا۔ غالباً گاؤں بھر میں یہی ایک گھڑی
تھی جو صرف زیب و زینت کے لیے ہی تھی۔ گھڑی
ہر وقت دیکھنے کی ضرورت کسے تھی۔ اس کے
لیے تو کئی اور طریقے تھے اور اُسی روز پہلی
بار اپنی بھاری بھر کم پگڑی کو خیرباد کہہ کر
بالوں کو شہری لڑکوں کی طرح سنوارا تھا اور
ٹیڑھی سی مانگ نکالی تھی جسے دیکھ کر گاؤں کے
بزرگ نمبردار نے منہ میں انگلی دبا کر فرمایا تھا
سرزنش کے لہجے میں۔

"اچھا تو پترو! لگ گئی نا آپ کو بھی شہر کی
ہوا، افسوس، صد افسوس" ہم اپنی دھن میں
تھے، ان کی بات کا الٹا اثر لیا تھا۔ اُسے یکسر
درگذر کر دیا تھا۔ یہ بزرگ کیا جانیں اس دن

کی اہمیت۔

شام کو پارٹی کے بعد تقاریر ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے میزبان طلبا کی نمائندگی کرنے والے ایک لڑکے نے جذبات میں ڈوبی ہوئی باتیں کہہ کر ماحول کو بے حد سنجیدہ کر دیا تھا۔ ہمیں یکایک یہ احساس ہوا تھا کہ اس درس گاہ سے اس ارضِ پاک سے ہمارا رشتہ ختم ہو رہا تھا۔ زندگی کے دس سال جہاں گذر گئے ہوں یوں آنکھ جھپکتے جہاں بے لوث محبتوں کے رشتوں کی بُنیادیں پڑی تھیں۔ جہاں کے ذرّے ذرّے سے ہماری شناسائی تھی، عقیدت تھی، آج ہم اس درس گاہ کو خیرباد کہہ رہے تھے۔ زندگی کے کتنے اہم موڑ پر کھڑے تھے۔ آج کے بعد ہم لوگ سب کے سب الگ الگ ڈگر پر محوِ سفر ہوں گے۔ ایک خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

ماحول انتہائی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ دسویں جماعت کے طلبا کی طرف سے ہمارے نمائندہ نے بھی اتنے ہی موثر ڈھنگ سے میزبان طلبا کا شکریہ ادا کیا اور اپنے استاد صاحبان کے قدموں میں گلہائے عقیدت پیش کیے۔

اور آخر میں ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی باری آئی۔ وہ ایک جادو بیان مقرر تھے۔ جو کہتے تھے، اُن کے دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہوا آتا تھا اور تیر کی طرح سُننے والے کے سینے میں پیوست ہو جاتا تھا۔ آج تو خاص موقع تھا۔ ہم ان کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش رہتے تھے۔ انھیں اپنے طلبا کی بہبود سے والہانہ لگاؤ تھا۔ بلا مبالغہ وہ سوتے جاگتے اپنے طلبا کی بھلائی کے بارے میں سوچتے تھے۔ ایک بے پناہ لگاؤ ایک عمیق لگن تھی انھیں اپنے کام سے، اپنے فرض کے تئیں یہ جذبہ اُن کی شخصیت کا ایک جزو لاینفک تھا۔ اپنے طلبا کی زندگیوں کو سجانے سنوارنے کے لیے وہ ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ ان کی تمام سرگرمیوں میں ذاتی دلچسپی اور حصّہ لیتے تھے جو طلبا سے متعلق ہوتیں تھیں۔ طلبا کے دل میں بھی اپنے اس سچّے محسن کے تئیں بے پناہ عقیدت کا جذبہ تھا۔ گاہے گاہے سکول کے کشادہ ہال میں طلبا اکٹھے ہوتے۔ بچّے پھر بچّے ہیں۔ ذرا سا موقع دیکھا، باتوں میں لگ جاتے۔ شور وغل کا ماحول سا بننا دکھائی دیتا تو ہیڈ ماسٹر صرف کھنکار دیتے سب نظریں اُن کے چہرے پر گڑ جاتیں۔ وہ چند لمحوں کے لیے طلبا کی طرف دیکھتے رہتے۔ سرزنش اور ناراضگی کے ملے جلے..... انداز میں۔ مجمع میں موجود ہر طالبِ علم کو محسوس ہوتا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی نظریں اسی پر گڑی ہیں۔ ان کی خفگی کا نشانہ وہی ہے۔ اُن کی ناراضگی اور غصّہ اس کے غلط رویّہ کے تئیں ہے۔ ہال میں سنّاٹا چھا جاتا ایک ناقابلِ بیان خاموشی اور ضبط کا ماحول۔ ہیڈ ماسٹر صاحب مسرور و مطمئن اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

آج تو دن ہی بیحد اہم تھا۔ ایک تاریخی دن۔ طلبا کی جذبات سے لبریز آواز کی تقاریر سے ہمارے ذہن تیار ہو چکے تھے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب گویا ہوئے۔ اپنے مخصوص انداز میں پُرسکون ٹھہرے لہجے میں اپنے گہرے وسیع تجربے کی بنا پر کہے گئے ان الفاظ میں کس قدر دانائی، کیسی سوجھ بوجھ چھپی تھی، یہ صرف محسوس کرنے کی چیز

تھی۔ آدھ پون گھنٹے بات چیت کے انداز میں وہ ہمیں زندگی کے عمیق رموز کے بارے میں سمجھاتے رہے اور پھر یکایک وہ بھی جذبات کی رو میں بہہ گئے "اگر یہ طور پر احسب موقع ان کے الفاظ زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔

چمنستان ہندوستان کے شگفتہ وشاداب غنچو! تم اس عظیم دیش کا سرمایہ ہو۔ اس کی امانت ہو۔ اس کا مستقبل ہو۔ ایک لمبی جدوجہد کے بعد دیش آزاد ہوا ہے یہ ہمارے عظیم رہنماؤں وشہیدوں کی لافانی قربانیوں کا صدقہ ہے۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے۔ زمانے کو دکھانا ہے کہ ہم ان بزرگوں ان جاں نثاروں کے وارث کہلوانے کے حق دار ہیں۔ ہماری رگوں میں وہی مقدس خون رواں دواں ہے۔ پیارے بچو!! میری ایک بات گانٹھ باندھ لو اس دیش کی ترقی وخوشحالی کسی کام کی نہیں ہوتی۔ جس دیش کے لوگوں کا کردار اعلیٰ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد ان کی آواز بھرا گئی۔ انھوں نے اپنی اچکن کا پلو سا بنا کر بمشکل تمام یہ الفاظ کہے۔

"آخر میں.... ایک درخواست، ایک التجا اپنے بچوں سے ایک باپ کی فریاد ایک گورو کا استفسار۔ کچھ روز بعد تمھارے امتحانات شروع ہو رہے ہیں۔ ہماری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ تمھاری محنت کا پھل تمھیں ملے گا ہر حال میں ملے گا اپنے امتحانات میں تمھاری طرف سے کوئی حرکت کوئی کارروائی بھول کر بھی ایسی نہ ہو جس سے تمھاری درس گاہ کے نام پر حرف آئے۔

یہ اس درس گاہ کی عزت کا سوال ہے میری عزت کا سوال ہے۔ تمھارے مینجر صاحب کے وقار کا سوال ہے، تمھاری درس گاہ کی نیک نامی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ امتحان دوسرے امتحان سے بھی کڑا ہے لیکن اگر ہم نے آپ کو صحیح تعلیم دی ہے تو یقین ہے کہ آپ لوگ اس آزمائش میں سے بھی سرخرو ہو کر نکلو گے! ہماری دلی نیک خواہشات!!"

ہیڈ ماسٹر صاحب کا چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا اور ہم سب پر بھی ایک رقت سی طاری تھی۔

اور آج تیس برس بعد ابھی کچھ دیر پہلے میرے پاس ایک بڑی تعلیمی درس گاہ کے ہیڈ ماسٹر صاحب اور شہر کے ایک معزز وانتہائی بارسوخ شہری آئے تھے۔ ایک دو روز بعد امتحانات شروع ہونے والے تھے۔ انھیں صحیح طور پر یہ اطلاع ملی تھی کہ متعلقہ امتحان کے سپرنٹنڈنٹ صاحب میرے بے حد نزدیکی دوست تھے۔ یہ لوگ، یہ معززین میرے پاس اس لیے آئے تھے کہ میں اُن کے ساتھ چلوں۔ اُن سپرنٹنڈنٹ سے یہ درخواست کرنے کہ وہ اُن کے طلبا کی امتحانات میں مدد کریں۔ یعنی انھیں نقل مارنے کی کھلی چھٹی دیدیں۔ آج ان ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی اپنی درس گاہ کی عزت اور مینجر صاحب کی عزت ہی کا واسطہ دیا تھا۔

بدر نظیری

غزلیں

میرے درد و کرب کی پہنائیاں لے جایئے
آیئے چپکے سے یہ پُروائیاں لے جایئے

پھر نہ دے آشفتگی مجھ کو یہ صحرائے جنوں!!
یہ صدائے تلخ یہ رُسوائیاں لے جایئے

یا مرے دِل پر برس بھی جایئے کُھل کر ذرا
یا تو صبح و شام چھائی بدلیاں لے جایئے

یا خزاں میں تارِ داماں کو رفو تو کیجیے
یا بہاروں کی سبھی اٹھکیلیاں لے جایئے

وسعتِ تنہائی میں رکھنے کے لئے دِل کے قریب
کچھ سُلگتے جِسم کی پرچھائیاں لے جایئے

آئینے میں جو عکس تھے حُسن و جمال کے
وُہ آج ان کو پی گیا شیشے میں ڈھال کے

اے تشنہ لب ٹھہر! کہ نہ چھلکے شرابِ ذات
ترسا رہا ہے پھر کوئی ساغر اُچھال کے

پھر کودک خیال مچلتا ہے رات دِن
پھر مانگتا ہے مجھ سے کھلونے سفال کے

ساحل سمجھ کے موج سے ٹکرا نہ جائے دِل
گرداب سے بچا اِسے لے چل نکال کے

پھر دے رہا ہے دعوتِ نظارہ دِل کو شوق
اے بدرؔ دِل کی دُنیا کو رکھنا سنبھال کے



ہمارے درمیاں رکھیو تو اِتنا فاصلہ رکھیو
جُھلس جائے چمن دِل کا نہ ایسا رابطہ رکھیو

برہنہ دُھوپ میں عُریانیت کی گرم لہروں پر
حیا رنگ میں بھگو کر ایک ٹھنڈی سی رِدا رکھیو

فضا میں جو اُبھرتی جا رہی ہے تیرگی شب کی
کہیں دِن کی کہیں سے اس پہ تھوڑی سی ضیا رکھیو

فصیلِ رشتۂ جاں پر اگر پہرے بٹھاتے ہو
دریچہ اپنے دِل کا دوستو! تھوڑا کُھلا رکھیو

لکیریں پھر نہ اُبھریں دیکھنا اے بدرؔ نفرت کی
نگاہ و دل کے اندر ایک حُسنِ زاویہ رکھیو

ڈاکٹر صغیر افراہیم

مجنوں بحیثیت افسانہ نگار

اردو افسانہ کو رومانی رجحان کے ساتھ مغربی خیالات سے روشناس کرانے میں احمد صدیق مجنوں گورکھپوری نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے مغربی افکار و نظریات کا بخوبی مطالعہ کیا تھا جس کی بنا پر ان کے افسانوں میں ہمیں مشرق کی فضا میں مغرب کے حسین رنگوں کا دلکش امتزاج ملتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری حسن سے محبت کے قائل ہیں اور تمام عمر اس پر نثار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس جذبۂ دو آتشہ کو ایک فلسفی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو زندگی کا تہہ در تہہ مطالعہ کرتا ہے۔ مجبوری اور بے بسی کی تاویلیں پیش کرتا ہے اور رشتۂ محبت کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھتا ہے۔ محبت کی حقیقت پر وہ اپنے افسانوی مجموعہ "سمن پوش" میں 'گریز' کے عنوان سے روشنی ڈالتے ہیں۔

"میں کبھی اپنے فسانے میں قصد و اہتمام کے ساتھ کوئی نکتہ یا عقدہ نہیں پیش کرتا۔ لیکن زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نظر کے سامنے ضرور رکھتا ہوں اور مشاہدہ و مطالعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کی تلخ ترین حقیقت محبت ہے جو اور حقیقتوں پر محیط ہے چنانچہ میرے بیشتر افسانے محبت کے افسانے ہیں۔" ص ۲۲

اسی حقیقت بیانی کی بنا پر ان کے افسانوں میں درد و غم کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ یہ غمناک پہلو کبھی کبھی ان کے افسانوں کی فضا کو بری طرح بوجھل کر دیتا ہے اور متحرک کردار بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مجنوں نے پہلا افسانہ "زیدی کا حشر" لکھا جسے نیاز فتحپوری نے تعریف کے ساتھ 'نگار' مئی تا جولائی ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ یہ افسانہ

انھوں نے مہدی افادی کی بڑی بیٹی جمیلہ بیگم کے تاؤ دلانے پر نیاز کے افسانہ "شہاب کی سرگذشت" کی ضد میں لکھا۔ وہ اس کے متعلق افسانوی مجموعہ "خواب وخیال" کے دیباچہ میں" ناچار مسلمان نشو" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

" میرا سب سے پہلا افسانہ یقیناً 'زیدی کا حشر' ہے اور اس کو میں نے ایک دوست کی تحریک سے لکھا اور یہ دوست ایک عورت تھی جو نیاز صاحب کے فسانہ" شہاب کی سرگذشت" سے بہت مرعوب تھی۔" ص ۲۱

مجنوں کا طبعزاد، طویل اور پہلا افسانہ فنی اعتبار سے بیحد کمزور ہے۔ اس کی قدر وقیمت کے بارے میں وہ بذاتِ خود" خواب وخیال" میں رقمطراز ہیں۔

" مجھے اس کو اپنے نام سے منسوب کرتے ہوئے بھی شرم معلوم ہوتی ہے... میں نے ایسا افسانہ کیوں لکھا؟ جس کے کسی پہلو سے کوئی معنی ہی نہیں نکلتے۔ اس قسم کی چیزیں محض اعصاب کے ایک غیر معمولی تناؤ کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں اور اس لیے عموماً بے نتیجہ ہوتی ہیں۔" ص ۲۲

فنی اعتبار سے مجنوں کا پہلا کامیاب افسانہ 'گہنا' قرار دیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ نگار بابت جون ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ 'گہنا' کا مرکزی کردار رادھا ہے جو ایک گوالے کی لڑکی اور غریب رام لال کی بیوی ہے۔ شادی کے بعد اسے اپنے حسن کا احساس ہوتا ہے اور زیورات سے رغبت پیدا ہوتی ہے۔ رام لال اپنی مفلسی کو دیکھتے ہوئے اسے سمجھاتا ہے مگر رادھا کا گہنوں سے عشق بڑھتا ہی جاتا ہے۔ آخر رام لال اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کلکتہ چلا جاتا ہے اور جلتے وقت تاکید کرتا ہے کہ پورے چار سال تک میرا انتظار کرنا اگر اس درمیان نہ لوٹ سکا تو سمجھنا کہ زندہ نہیں ہوں۔ چار سال بیت جاتے ہیں مگر وہ واپس نہیں آتا ہے۔ اسی بیچ رادھا اور ہریش چندر میں محبت ہو جاتی ہے۔ ہریش چندر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دولت مند ہے۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے۔ وہ سماج کی مخالفت کے باوجود رادھا سے شادی کر لیتا ہے۔ اچانک ایک دن رام لال واپس آتا ہے۔ اور رادھا کو ہریش بھون میں دیکھ کر جان دے دیتا ہے۔ ہریش چندر خود کو اس کا قاتل سمجھتا ہے اور پاداش کے طور پر سب کچھ تیاگ کر رام لال کے مکان میں تنہا رہنے لگتا ہے۔ افسانہ اسی المیہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

مجنوں کا دوسرا کامیاب افسانہ "سمن پوش" نگار، جولائی ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ حالانکہ 'تعمیر ہریانہ' کے" میرا پہلا افسانہ نمبر" اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۸ء کے مطابق ایڈیٹر نے اسے مجنوں کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے جو کسی طرح درست نہیں ہے۔ المناک حادثات سے پر یہ افسانہ طرزِ ادا کے اعتبار سے مجنوں کا اہم افسانہ ہے۔ عالمِ ارواح سے متعلق محض قیاس آرائی پر مبنی افسانہ 'سمن پوش' میں انھوں نے ایک بے قرار روح کو رومانی لب ولہجہ میں پیش کیا ہے۔ افسانہ کی ہیروئن ناہید کو اس کا شوہر

جمال غلط فہمی کی بنا پر قتل کر دیتا ہے اور چھ ماہ بعد خود بھی حرام موت مر جاتا ہے۔ چونکہ جمال ناہید کو دغاباز سمجھتا تھا اس لیے اس کی مزار کی لوح پر 'بیوفا' کندہ کرا دیتا ہے۔ ناہید کی روح اپنے محسن سے چاہتی ہے کہ وہ 'بیوفا' مٹا کر 'وفا' لکھوا دے۔

مجنوں کے اہم افسانے "خواب وخیال" "شکست بے صدا" "بازگشت" "محبت کی قربانیاں" "ہتیا" "حسن شاہ" "تم میرے ہو" اور "من در چہ خیالم وفلک در چہ خیال" ہیں۔ ان افسانوں میں فکر کی بلندی اور فن کی پختگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ "خواب وخیال" بیانیہ طرز کا کامیاب افسانہ ہے۔ یہ افسانہ واحد متکلم کے صیغے میں لکھا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار نسیم ہے۔ افسانہ نگار نے نسیم کے سہارے زمانہ کی ستم ظریفی کو بیان کیا ہے کہ اس کی زندگی کے تاریک خلا کو منور کرنے کے لیے ریحانہ نمودار ہوتی ہے اور اس کو محبت کی لذت سے آشنا کرتی ہے۔ جب نسیم اس کی طرف ملتفت ہوتا ہے تو وہ کسی اور سے منسوب ہو جاتی ہے۔ نسیم ناکامی اور نامرادی کی دنیا میں لوٹ آتا ہے کہ اتفاقاً ثریا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ اس کے حواس پر قابو پا لیتی ہے۔ وہ اس کی قلبی شورش اور روح کے غیر واضح خروش کو کم کرتے ہوئے احساس دلاتی ہے کہ:۔

"محبت ایک لطیف اور پاکیزہ جذبہ ہے جس کو دنیا کی کثافتوں سے کوئی سروکار نہیں۔" (نگار جنوری ۱۹۳۱ء ص ۱۱۸)

فلسفہ، محبت کے نازک مسائل کو مجنوں نے افسانہ "شکست بے صدا" میں وضاحت سے پیش کیا ہے۔

افسانہ کا ہیرو ناصری عشق کو "تہذیب النفس" کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ مگر مناکحت یا کسی دوسری رسمی زنجیر" کا پابند ہو کر رہنا، اس کے خیال میں مناسب نہیں ہے۔

مجنوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی مسائل پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے وہ افسانہ "شکست بے صدا" میں عورت کی ناگفتہ بہ حالت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ہندوستان بھی عجیب جگہ ہے جہاں
عورت اپنا کوئی ذاتی وجود نہیں رکھتی
جب تک شوہر اس کی دلجوئی کرتا ہے
تب تک سب ہی دلجوئی پر آمادہ
رہتے ہیں۔ شوہر کے منحرف ہوتے ہی
ساری دنیا بیچاری سے برگشتہ
ہو جاتی ہے۔"

(مجموعہ "خواب وخیال" ص ۱۸۴)

ان کا افسانہ "محبت کی قربانیاں" انسانی ہمدردی اور جذبہ حب الوطنی سے معمور ہے۔ یہ افسانہ تحریک آزادی کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی حیثیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ سرفروشی کے جذبہ سے سرشار نسیم مختلف تاویلوں کے سہارے کملاوتی کو سمجھاتا ہے۔

"کملاوتی کم از کم مجھ میں اتنی ہٹ
دھرمی نہیں ہے کہ جہاں لوگ بھوک
کی مار کا رونا رو رہے ہیں، جہاں

غلامی پر ماتم کیا جا رہا ہو، جہاں آزادی کی ایک سانس بھی لینے کو لوگ ترستے ہوں۔ وہاں میں محبت کے ایک دکھ کو دکھ سمجھوں اور اس پر آنسو بہاؤں !!!"

(مجموعہ خواب و خیال۔ ص ۲۰۱)

وہ اس سے کہتا ہے کہ اپنے غم کو بھلا لینے کی بہتر صورت یہ ہے کہ زمانے کے درد کو اپنے دل میں سمیٹ لو۔ جیل جاتے وقت وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے۔

"میں چلا لیکن تم لوگ ہو، یہ حریت اور غلامی کی جنگ، یہ فاقہ کشی اور شکم سیری کی لڑائی رکنے نہ پاتے۔ جب تک تمہارے جسم میں ایک قطرہ لہو بھی باقی ہے اس وقت تک پیچھے نہ ہٹو۔ تمہاری زندگی یہی ہے۔ تمہاری نجات اسی میں ہے۔"

ص ۲۵۷

مجنوں گورکھپوری نے متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال کرداروں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر اردو افسانہ کو ایک مخصوص لب و لہجہ عطا کیا ہے اور پہلی بار افسانہ کو فلسفیانہ میلان سے آشنا کرایا ہے۔ وہ اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میرے افسانے رومانی مدرسے کی چیزیں ہیں اور ان کا تعلق نفسیاتی انفرادیت (PSYCHOLOGICAL INDIVIDUALISM) سے ہے میں نے اب تک جتنے افسانے لکھے ہیں سب کا تعلق بظاہر محبت سے ہے لیکن اگر غور سے پڑھا جائے تو رومانیت اور جذباتیت کے ساتھ ساتھ میرے افسانوں میں فکر و تامل کا ایک میلان ضرور ملے گا جو غالب اور حاوی ہوگا۔"

(تعبیر ہریانہ، اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۸ء۔ ص ۲۰)

مجنوں کے افسانوں کی دنیا بڑی محدود ہے۔ محدود اس اعتبار سے کہ انھوں نے فضا اور ماحول کے لیے جس کائنات کا انتخاب کیا ہے اس پر قنوطیت غالب ہے۔ وہ رنج و الم کے جذبہ کو تیز تر کرنے کے لیے عموماً اپنے افسانوں میں عشق کی ناکامی کا سہارا لیتے ہیں اور افسانہ کا اختتام المیہ پر کرتے ہیں۔ کہانی کو المناک بنانے کی شعوری کوشش تکنیک کو مجروح کر دیتی ہے اور اس کی یکسانیت قاری کو اکتاہٹ کا شکار بنا دیتی ہے حالانکہ ان کے افسانوں میں سوجھ بوجھ کے ساتھ فلسفیانہ میلان، وحدت تاثر، مشاہدہ کی باریک بینی، فضا اور ماحول کا احساس قدرے موجود ہے مگر پھر بھی ان کے افسانوں میں فنی جھول پایا جاتا ہے۔

●●

ڈاکٹر گل انبالوی

مرے وطن کی سرزمیں

بہارِ امنِ جاوداں مرے وطن کی سرزمیں
محبتوں کا گلستاں مرے وطن کی سرزمیں
ہر اک زباں کی قصہ خواں ہر اک زباں کی داستاں
ہر اک زباں کی ترجماں مرے وطن کی سرزمیں
وطن پرست و خوش بیاں قدم قدم پہ گلفشاں
مرے وطن کا نوجواں مرے وطن کی سرزمیں
یہ لہلہاتی کھیتیاں حیات بخش جاوداں
قدم قدم پہ درفشاں مرے وطن کی سرزمیں
یہ ایکتا کی بزم ہے یہ ایکتا کی انجمن
ہرا بھرا ہے گلستاں مرے وطن کی سرزمیں
مرے وطن کا ذکر کیا مرے وطن کی بات کیا
حیاتِ نو کی داستاں مرے وطن کی سرزمیں
فلک سے بھی عظیم تر نشانِ عظمتِ گراں
کُلاہِ کوہِ بردّشاں مرے وطن کی سرزمیں
صداقتوں کی انجمن کرامتوں کا بانکپن
حقیقتوں کا گلستاں مرے وطن کی سرزمیں
یونہی رہے یہ گلستاں یونہی رہے یہ باغباں
یونہی رہے یہ گل فشاں مرے وطن کی سرزمیں

منوہر لال ہادی

سانیٹ

شوق کس کو ڈھونڈتا ہے صحنِ لالہ زار میں
پوچھتا ہے لالہ و گل سے، صبا سے بار بار
قیس کی مانند، رانجھے کی طرح دیوانہ وار
سوز کی جلوہ گری ہے اس کے استفسار میں

شاید اس کی کھوج ہے اس صورتِ مستور کی
جس کے دم سے گردشِ ایام ہے حرکت پذیر
اور میری فکرِ خام و ناتواں جرأت پذیر
سنتا رہتا ہے کہانی برقِ کوہِ طور کی

لوگ کہتے ہیں کہ جب یہ کامراں ہو جائے گا
جھلملائے گا فلک پہ انجمِ فوق الشعور
زندگی پہ سایہ افگن ہوں گے نورانی طیور
وقت کا دھارا بشر پہ مہرباں ہو جائے گا

شوق وہ شاگرد ہے جبریلِ پختہ کار کا
جس کی خاطر جی رہا ہے فیضِ لالہ زار کا

رؤف خوشتر

دیوانے آم

جنت نشان و راحت فزاں ہندوستان میں جتنے فرقے، عقائد اور تہوار ہیں اتنی ہی تعطیلات ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں ہر چھٹا دن تعطیل کا دن ہوتا ہے۔ بقیہ پانچ دن ہم اپنے طور پر تعطیلات مناتے رہتے ہیں، اونگھتے ہوئے چلتے سگریٹ پیتے اور گپ بازی کرتے ہوتے۔ عام تعطیلات سے ہمارا نہ جی بھرتا ہے نہ پیٹ مگر گرمائی لمبی تعطیلات عام سی نہیں آم کی تعطیلات ہوتی ہیں جبکہ جی بھی بھرتا ہے اور پیٹ بھی۔

خطا معاف ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کرکٹ کو کھیل کا بادشاہ اور آم کو پھلوں کا بادشاہ مان کر تعظیم کے پیش نظر صرف دو چار رن بنانے اور دو چار آم کھانے پر ہی اکتفا کرلیں۔

کرکٹ میں ہم سنچری بنائیں یا نہ بنائیں ہماری مرضی۔ بلکہ اب تو سنچری بنانا بلّہ بازوں سے زیادہ امپائر کی مرضی پر منحصر ہے۔ شہادت کی انگلی سے وہ بلّہ باز کو ۹۹ رن پر بھی شہید قرار دے سکتا ہے۔ لیکن آم کے موسم میں اگر ہمارے صحن میں بکھری ہوئی گٹھلیوں کو گنا جائے تو یقیناً ہمارا اسکور اظہر الدین کے اسکور سے زیادہ ہوگا۔

محکمہ تعلیمات کے پیش نظر گرمائی تعطیلات کا مقصد کچھ اور رہا ہوگا لیکن فی زمانہ ان لمبی تعطیلات کا مصرف صرف اور صرف آم کھانا اور گٹھلیوں سے کھیلنا ہو کر رہ گیا ہے۔ طلبا پڑھیں یا نہ پڑھیں، کامیاب ہوں یا فیل ہوجائیں۔ اساتذہ پڑھائیں یا ٹیوشن چلائیں، اس موسم میں ہر ایک کو آم نصیب ہوجاتے ہیں۔

آمدم برسرِ آم۔ آموں کو اب تک لال پٹی پسند تھی اور کالے لوگ بھلتے تھے۔ مگر اب معاملہ بدل گیا ہے۔ آموں کو اب سرو ممالک

اور گورے لوگ پسند آرہے ہیں۔
جی ہاں آموں کو شاید ہندوستان کی گرم اور فرقہ وارانہ ہوا راس نہیں آرہی ہے اس لیے وہ یورپ اور امریکہ کا رخ کر رہے ہیں۔ اب تو آم اور خاص لوگ ہی باہر جارہے ہیں۔ سنا ہے باہر کے لوگ ہندوستانی آم کو ہاتھوں ہاتھ اور ہندوستانی عوام کو آڑے ہاتھ لے رہے ہیں۔ ہمارے ایک آم فروش دوست باذوق اور حاضر جواب واقع ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے مہنگے اور اعلیٰ قسم کے آم فروخت کرتے ہیں۔ اب ان کی شکایت ہے کہ کوئی ان کے آم نہیں خرید رہا ہے۔ چنانچہ وہ " یہ دنیا یہ محفل میرے آم کی نہیں " کہتے ہوئے اپنے آم بیرونی ممالک کو بھیج رہے ہیں۔

مرزا غالب نے جہاں اردو دنیا کو پرتگالی شراب، نرالی خطوط نگاری چوسر بازی اور بلند پایہ شاعری سے روشناس کیا، وہاں انھوں نے آموں کی خوبیوں کو اتنے اچھوتے انداز میں پیش کیا کہ اس موضوع پر دوسروں کے لیے کہنے کو کچھ نہ رہا۔ ایک آم ہی کیا غالب نے ایسا کچھ لکھا اور کہا ہے کہ اکثر شاعر اور نثر نگار حضرات نے غالب کی شاعری اور خطوط نویسی کے مطالعہ کے بعد اپنے اپنے قلم رکھ دیئے اور آم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی اس شعر و سخن سے کام و دہن کی طرف منتقلی کو شعر و ادب کی بڑی خدمت قرار دیا گیا۔ البتہ آموں کو خطرہ لاحق ہو گیا۔

اس دور کی ایک علت ہر چیز کی قلت ہے اسی لیے آج کل ہر کوئی مرزا غالب کی طرح یہ آرزو کرتا ہے کہ آم بہت ہوں اور میٹھے ہوں۔ لیکن ہمارے بچپن لڑکپن اور انیس سو پچپن کے وقت قلت نام کی کوئی چیز نہیں تھی ہمیں یاد ہے کہ اس وقت بھائی جان صحن میں ہر وقت پھلوں کے بھرے بھرے ٹوکرے رکھتے اور چھت پر کھڑے ہو کر ٹارزن کی طرح زور زور سے پکارتے ہوئے ہمیں بلاتے تھے!

آجا، آجا رے
کل جامن کا ڈھیر ملا تھا،
اب آموں کا ڈھیر پکارے

اور ہم ٹارزن کے سدھاتے ہوتے جانور کی طرح دوڑ پڑتے،
یہ کہتے ہوئے کہ
ہم کو آنا پڑے گا، آموں کو کھانا پڑیگا

کثرت میں وحدت کے مصداق آم تو ہر جگہ ملتے ہیں مگر الگ الگ ناموں سے جیسے قلمی آم فلمی آم (وہ آم جو فلموں میں رکھے ہوتے ہیں)۔ لنگڑا دسہری، چوسہ، فضلی، ثمر بہشت، گلاب خاص، سفیدہ وغیرہ وغیرہ جنوبی ہند میں ایک آم ہوتا ہے جس کو آپوس کہتے ہیں۔ یہ اتنا میٹھا ہوتا ہے گویا کہہ رہا ہو آپ چوس۔

پہلے آم صرف آم کی شکل میں ملتے تھے۔ اب آم جام کی شکل میں بھی مل رہے ہیں۔ آم کا جام آم کی جیلی اور آم کا مشروب۔ جب لوگ ایک چہرے پر کئی چہروں کے نقاب لگا سکتے ہیں تو پھر موجودہ دور کے آم بھی کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں؟ سو وہ بھی بدلی ہوئی شکلوں کے ساتھ آرہے ہیں آم کی خوبی یہ ہے کہ یہ خربوزے کی طرح اپنا رنگ

نہیں بدلتا۔ آم کے چھلکے کیلے کے چھلکوں کی طرح کسی کو گراتے نہیں ہیں۔

آم کا پودہ خوص کا پودہ ہے عام درختوں کے ساتھ نہیں اگتا۔ ہمارے ایک دوست کے باغ میں ہر قسم کے پھل کے درخت ہیں۔ جب انھوں نے آم کے درخت لگوانے تو ہم نے کہا " جناب یہاں آم کے درخت نہیں اگ سکتے تو انھوں نے جواب دیا۔ بادام ہوتے تو کیا آم نہیں ہوں گے۔ موجودہ دور میں بڑے ملک ایک دوسرے کو ہتھیار بم دیتے رہتے ہیں اس لیے ہم کہتے ہیں ؎

اے مرے دل کہیں اور چل
بم کی دنیا سے دل بھر گیا

ہندوستان چونکہ صدیوں سے امن پسند ملک رہا ہے۔ اس لیے وہ خلوص و محبت کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کو آم بانٹتا ہے بلکہ کئی ممالک کے مہمان تو محض آموں کی خاطر اپنے دورے آم کے موسم میں مقرر کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے ہندوستان کے ساتھ میٹھے شیریں تعلقات بنے رہتے ہیں اور آم بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ ایسے دوروں کو وہ ہر لحاظ سے ثمر آور کہتے ہیں۔ اس عالمی سیاست کو آم کے آم گٹھلیوں کے دام کہتے ہیں۔

اس طرح موجودہ دور میں جو کام ہوشیار اور قابل سفیر نہیں کر پاتے وہ کام میٹھے آم خاموشی سے کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے جب کوئی میٹھے آم کھائے گا تو وہ جنگ تشدد اور نفرت کی بات نہیں کر پائے گا۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں مندوبین کے ہاتھوں میں آم تھما دینے چاہئیں۔ ظاہر ہے وہ جارحانہ باتیں چھوڑ کر آم چوسنے میں لگ جائیں گے۔ اس طرح سرد جنگ ٹل جائے گی اور مندوبین کی تقریروں میں بھی مٹھاس آجائے گی۔ جوہری لڑائی، دور مار میزائل سے نزدیک مار گٹھلی جنگ بہتر ہے کیچڑ اچھالنے سے آم کا رس اچھالنا اچھا ہے۔ آموں کی بات ہو رہی ہو اور بوم الدولہ کا ذکر نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم آم چوس رہے تھے کہ دبے پاؤں آکر پکے آموں کی طرح آموں کی ٹوکری پر گر پڑے اور دونوں ہاتھوں سے آموں کو چوستے چوستے فرمانے لگے۔

" اماں یار عوام الناس کا حال بھی اب آم کے درخت جیسا ہو گیا ہے۔ آم کا درخت بونے اور نگرانی کرنے والوں کو پتھر مل رہے ہیں اور پتھر مارنے والوں کو آم مل رہے ہیں۔ گویا جو بڑھ کے تھام لے آم اسی کے ہیں۔ اچھا ایسے آموں کو کیا کہیں گے جو پردہ نشیں اور باحیا خواتین کی طرح خود کو چھپائے رکھتے ہیں اور شریر بچوں کے ہوس زدہ پتھروں سے محفوظ رہتے ہیں۔

ہم نے کہا " ایسے آموں کو سیانے آم کہیں گے۔" تب بوم الدولہ نے ایک اور سوال داغ دیا۔" اور ایسے آموں کو کیا کہیں گے جو جدید نسل کی فیشن ایبل خواتین کی طرح خود کو آشکار کرتے رہتے ہیں۔ اور یوں وہ آوارہ اور شریر بچوں کے پتھروں کا نشانہ بن بن کر ان کی گود میں آگرتے ہیں۔" ہمارا جواب تھا " دیوانے آم "۔ ●

ایم۔ایس۔رحمٰن

شہرِ حنا۔ فریدآباد

شہرِ حنا فریدآباد قدیم اور تاریخی جگہ ہے۔ ۷اریں صدی سے لے کر ۲۰ریں صدی تک کا سفر اس نے کبھی روشنی میں طے کیا ہے تو کبھی تاریکی میں۔ شہرت و گمنامی کی آنکھ مچولی نے کبھی اسے شاہی دربار میں عزت بخشی ہے تو کبھی باغی کا خطاب پاکر حیوانیت و درندگی کو شرما دینے والی اذیتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ شاہی بیگمات کے بیچ حنا اور پھل کے لیے مشہور رہا ہے، امرا کے بیچ شکار و تفریح کے لیے اور انگریزوں کے بیچ نعرۂ بغاوت بلند کرنے کے لیے۔ شاہی فرمان دربارِ مغلیہ کی تعمیل ہو یا فرنگیوں کی خلاف ورزی یہ پیش پیش رہا ہے۔ اس کے سپوت ملک کے مختلف جیلوں میں کبھی بڑے فخر سے گاتے تھے۔

ع یہ جھنڈا ہے ہماری عظمت و ایمان کا جھنڈا

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے متوالوں کی پکار ہو یا گاندھی جی کی تحریکِ آزادی کے لیے قربانی دینے کی گھڑی، اس کے ویر جانباز سپوتوں نے ہمیشہ لبیک کی صدائیں بلند کی ہیں۔ کبھی شیر شاہ سوری قومی شاہراہ پر سائمن کے لیے کالے جھنڈوں کا رواں دواں قافلہ، تو کبھی "انگریزو بھارت چھوڑو" کا ولولہ خیز نعرہ تاریخ کا لافانی حصہ بن چکا ہے۔ آج بھی بلب گڑھ کا قلعہ، بلرام کا قلعہ، قدیم شاہی مسجد فریدآباد، قدیم مندر فریدآباد اور کوہِ اراولی کی وادی میں بسا بڑکھل اور پانی کے سینے میں چھپی تاریخ اُن دنوں کی یادیں تازہ کر دیتا ہے جب فریدآباد کبھی دہلی انتظامیہ کی تحویل میں تھا جس کی تباہی و بربادی کا ذکر ہریانہ کے سپوت مولانا حالیؔ نے مرثیہ دہلی میں ان الفاظ میں کیا ہے ؎

ع لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

بلاشبہ فریدآباد کی سرزمین مختلف جہتوں سے اہمیت و افادیت کی حامل رہی ہے اور اب بھی ہے۔ مولانا حالیؔ کے الفاظ میں ع

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک

مہندی کا یہ شہر دہلی سے ۱۶ میل دور قومی شاہراہ شیر شاہ سوری مارگ پر ۲۵´ ۔ ۲۸° شمال اور ۲´ ۷۷° مشرق میں آباد ہے۔ یہ ہریانہ کے دارالخلافہ چنڈی گڑھ سے ۲۷۴ کلومیٹر دور ہے۔ شہنشاہ نورالدین سید مرتضیٰ خاں بخاری فرید عمدہ دولت نے اسے آباد کیا تھا۔ آپ بخارا کے رہنے والے تھے اور شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر و شہنشاہ نورالدین

جہانگیر کے دورِ حکومت میں دربارِ مغلیہ میں مختلف عہدوں کی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دے چکے تھے۔ دستاویزی ثبوتوں کے مطابق جب شہزادہ سلیم کو افغانوں نے قید کر لیا تھا تو انھیں آزاد کرانے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ شہنشاہ اکبر کے دربار میں مجدد الف ثانیؒ آپ کے رابطے سے متعارف ہوئے۔ یہ آپ کی انفرادی شخصیت کا کمال تھا کہ آپ "فریدِ عصر و ملت" کے خطاب سے نوازے گئے۔ فنِ سپہ گری میں اپنی بے مثال شجاعت کی بنا پر آپ کو کئی فوجی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ کانگڑہ کے سخت اور دشوار کن قلعہ کو فتح کرنے کے لیے اپنے تمام جانباز سپہ سالاروں میں شہنشاہ جہانگیر نے آپ کا انتخاب کیا۔ بخارا کے معزز خاندان کے باوصف و باکمال فرد ہونے کی وجہ سے دربار مغلیہ میں آپ کو الشیخ اور الشیخ فرید کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ حکومت کے کئی انتظامی امور میں آپ کا مشورہ لیا جاتا تھا اور آپ کی ذہنی صلاحیت اور تجربات و مشاہدات کی بناء پر آپ کے مشورے کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

سید مرتضیٰ خاں بخاری فرید عصر و ملت نے شہنشاہ جہانگیر کے جاری کردہ ۱۲ فرمانوں میں سے دوسرے فرمان کے تحت فرید آباد کو آباد کیا تھا۔ شہنشاہ نے حکم نامہ جاری کیا تھا کہ ایسی سڑکوں پر جہاں رہزنی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور جو آبادی سے دور ہوں تو پڑوسی جاگیردار کو چاہیے کہ وہاں سرائے قائم کرے عبادت گاہ کی تعمیر کرے اور کنواں کھدوائے جو انسانوں کو آباد کرنے کا سبب بنے اور انسان اس سرائے میں آباد ہو سکیں۔ یہ حکم شہنشاہ نے ۳۸ سال کی عمر میں جاری کیا تھا۔ شہزادہ سلیم کی جب ۱۶۰۵ء میں تاج پوشی ہوئی تو آپ کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ اس طرح ۱۶۰۷ء میں یہ فرمان جاری ہونا ثابت ہوتا ہے۔

سید صاحب نے سب سے پہلے مٹی اور پانی کی جانچ کروائی۔ ماہرین نے بتایا کہ مٹی اور پانی انسانی آبادی کے موافق ہے۔ پھر آپ نے سب سے پہلے پانچ چیزیں تعمیر کروائی۔ ایک مسجد، ایک مندر، ایک تالاب، ایک عیدگاہ اور ایک باؤلی۔ مسجد اسلامی فنِ تعمیر کا نمونہ تھی تو مندر میں ہندوستانی کلچر کی جھلک۔ آپ نے ۳۰۰ بیگھے زمین مسجد کے نام اور ۳۰۰ بیگھے مندر کے نام وقف کی جس سے کہ یہ عبادت گاہیں خود کفیل رہیں اور اقتصادی بحران کا شکار نہ ہوں۔ نوآباد علاقہ میں آپ نے اعلیٰ نسب کے سید، شیخ، راعین، برہمن، کھتری اور راجپوت و دیگر قوموں کو بسایا اور محلہ کا نام سید واڑہ، شیخ واڑہ، راعین واڑہ، کھتری واڑہ، ٹھاکر واڑہ وغیرہ رکھا۔ محلہ بہت قرینے اور جدید طرز سے بسایا گیا تھا۔ غلہ کی فراہمی کے لیے ایک اناج منڈی بنائی گئی تھی۔ جہاں دور دراز کے گاؤں کے آدمی خرید و فروخت کے لیے آتے تھے۔ نوآباد جگہ کی ترقی و خوشحالی کو دیکھ کر آبادی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جو کالندی ندی کی طرف بڑھنے لگا۔ شیخ پورہ اور فرید نگر گاؤں بسنے لگے۔ اس کی ترقی، خوشحالی اور شاہی قربت کا یہ نتیجہ تھا کہ بلوچستان سے آئے ہوئے لوگوں نے اس کے پڑوسی علاقوں میں آباد ہونا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے پڑوسی علاقوں میں ۲۰ گاؤں بلوچستان کے لوگوں سے آباد ہوئے۔ جن کے نام کے آگے بلوچ لگایا جاتا تھا۔

شاہی قربت کی بنا پر، آگرہ قلعہ کی بیگمات کی فرمائش پر اور شہنشاہ جہانگیر کے مشورے سے سید صاحب نے ایران سے اعلیٰ قسم کی مہندی کا پودا اس خطہ میں لگایا۔ مسٹر برنیئر کے مطابق ملکہ نور جہاں کی والدہ محترمہ ایرانی حنا کی تمنا رکھتی تھیں۔ ان کے اصرار کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مٹی کی جانچ کرائی گئی اور پودا لگانے کی مہم شروع کی

گئی۔ بلوچستان سے بلوچیوں کے آنے سے بھی اس کی باغبانی کو تقویت ملی کیونکہ کرمان اور سیستان کا علاقہ مہندی کی کاشت کے لیے مشہور تھا۔ کہتے ہیں کہ مختلف نسلوں کی مہندی کی باغبانی شروع کی گئی۔ جب دارالخلافہ آگرہ سے شاہجہاں آباد (دہلی) مقرر کیا گیا تو فرید آباد سے مہندی کی باغبانی دہلی کی طرف پھیلی۔ پنجاب، گجرات، مدھیہ پردیش، راجستھان اور دہلی کے خطے میں حنا کی باغبانی کو وہ انفرادی خوبی حاصل نہیں ہے جو فرید آباد کی مہندی کو حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ دورِ جہانگیری میں مہندی کی ۱۰۰ نسلیں فرید آباد میں موجود تھیں جن میں ۲۵ عمدہ اور اعلیٰ نسل کی مہندی ملکہ نورجہاں اور والدہ نورجہاں کی پسندیدہ تھیں۔ جن کی باغبانی پر خاص دھیان دیا جاتا تھا۔

سید صاحب اس نوآباد قصبہ کو قصبہ باغات بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے شہنشاہ کے اور دیگر امراء کے مشورے سے مختلف اقسام کے پھلوں کی قلمیں لگانی شروع کر دیں۔ آم، سنترہ، کاغذی لیموں، لیچی اور کھرنی کے باغات لگائے گئے۔ مختلف دستاویزوں میں قومی شاہراہ کے دونوں طرف دور دور تک پھیلے باغات کا تذکرہ ملتا ہے۔ شاہجہاں آباد کے محل میں یہاں کے پھلوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ امراء، وزراء اور شاہی مہمان یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے تھے۔ اور شکار کا لطف حاصل کرتے تھے۔ ایک طرف دور دور تک پھیلا ہوا کوہ اراولی کا سلسلہ دوسری طرف جمنا ندی کا تٹ اور تیسری طرف حدِ نگاہ تک جاتی ہوئی قومی شاہراہ شکاریوں کو مقناطیسی زد میں لے لیتی۔ گھنے جنگلوں میں شکار، دلکش باغوں کی سیر اور اعلیٰ نسب لوگوں کی مہمان نوازی کا شرف شاہجہاں آباد میں ضرب المثل کی طرح مشہور ہو چکا تھا۔

مسٹر برنیئر نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا ہے کہ حنا اور پھلوں کی باغبانی کے لیے راعین قبیلہ کے لوگوں کو سندھ اور بلوچستان کے آس پاس کے علاقوں سے لایا گیا اور انھیں آباد کیا گیا۔ بلوچ نام کے ۲۰ گاؤں میں ان کی آبادی اچھی خاصی تھی۔ راعین واڑہ میں معزز اور باہنر راعین آباد تھے۔ اس علاقہ کو حسین و خوبصورت بنانے میں اور کاشتکاری و باغبانی کے فن کو فروغ دینے میں قبیلہ راعین کا اہم کردار رہا ہے۔ بلکہ ملکہ نورجہاں کی والدہ کو حنا کی باغبانی کا مشورہ بھی سپہ سالار عبدالجبار راعی کی زوجہ آفتاب جہاں نے دیا تھا۔ آپ کرمان کی رہنے والی تھیں۔ آپ کے مشورے کو نورجہاں اور ان کی ماں دونوں نے پسند کیا اور کرمان سے عبدالخالق راعی بن عبدالحمید، عبدالحئی راعی، کریم الدین راعی اور انعام الحق راعی کو بلا کر راعین واڑہ میں آباد کیا اور سبھوں کو اراضی عنایت فرما کر حنا کی باغبانی اور پھل کی باغبانی کے لیے حکم صادر کیا۔

جنگِ آزادی اور فرید آباد:

جنگِ آزادی میں اس سرزمین کے سپوتوں نے جس حب الوطنی کا ثبوت پیش کیا ہے وہ تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ ۱۸۵۷ء میں جب آزادی کی پہلی جنگ شروع ہوئی اور آزادی کے متوالے ہندوستانی سپاہی جب دہلی کی طرف بڑھے تو اس سرزمین کے سپوتوں نے بھی انگریزوں کا قتل و خون شروع کر دیا۔ فرید آباد کے حریت پسندوں کی بہادری و دلیری کی وجہ سے بدرپور سے بلب گڑھ کے علاقے میں انگریزوں کا آنا بند ہو چکا تھا اور علاقے پر حریت پسند عوام کا قبضہ ہو چکا تھا جس کا رہبر ہونے کا شرف چودھری میاں افتخار راعی کو حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں انگریزی فوجی دستے کو گوڑگاؤں، سوہنا اور بلب گڑھ کے راستے سے بھیجا گیا تھا۔ سوہنا کے پاس دستے کو معلوم ہوا کہ بلب گڑھ تک پہنچنا ان کے لیے آسان ہے۔ اور آگرہ سے پلول کے راستے فوجی دستے بھی آرہے تھے جو پلول تک پہنچ چکے تھے۔ اور بلب گڑھ کی طرف کوچ کرنے والے تھے۔ اس سے انگریزی

فوجی دستے کا حوصلہ بڑھا۔ فریدآباد کی جی۔ٹی روڈ پر ہندوستانیوں اور انگریزی فوج میں ٹکر ہوئی ہندوستانی بہت بہادری کے ساتھ لڑتے رہے لیکن بلب گڑھ چونکہ کمزور قلعہ تھا اور اس راستے انگریزی فوجی دستوں کو مدد پہنچ جایا کرتی تھی۔ اس لیے دھیرے دھیرے فریدآباد کے حریت پسندوں کا حوصلہ پست ہونے لگا۔ اور آخر میں دو دن کی مسلسل جنگ کے بعد حریت پسندوں کا یہ مضبوط اور آہنی علاقہ بھی انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس علاقے پر انگریزوں کا قبضہ ہوتے ہی انھوں نے انگنت افراد کو گولی کا نشانہ بنایا۔ چودھری میاں افتخار راعی کو پھانسی دے دی گئی۔ ان کے بچے مرتضیٰ بن افتخار اور اچھن کو فریدآباد سے بدر پور تک گھوڑے کے پیچھے باندھ کر گھسیٹا گیا جس میں انھوں نے شہادت کا جام پیا۔ راعین واڑہ میں آگ لگادی گئی اور اس کے ملبوں پر گھوڑے دوڑا دیے گئے۔ انگریزوں نے تحریکِ آزادی میں شمولیت کی بنا پر یہاں کے عوام پر جبر و تشدد اور ظلم و تعدی کی انتہا کر دی۔ آزادی کے دیوانوں کو چن چن کر گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون، ۱۹۲۸ء کا سائمن بائیکاٹ اور ۱۹۴۲ء کی بھارت چھوڑو تحریک میں یہاں کے بہادر حریت پسند سپوتوں نے بڑھ کر حصہ لیا اور گاندھی جی کی تحریکِ آزادی کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔ ۱۹۴۲ء میں "انگریزو ہندوستان چھوڑو" تحریک میں یہاں کے ویروں کو گرفتار کرکے پنجاب کی مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ یہی نہیں کراچی، بیجاپور، علی پور، گورکھپور، اور کالا پانی وغیرہ کی جیلوں میں بھی رکھا گیا۔ جہاں انھیں انگریزوں کے جبر و استبداد سے دوچار ہونا پڑا۔ کالا پانی، کراچی اور علی پور کی جیلوں میں فریدآباد کے ویروں پر نگرانی رکھنے کی خاص ہدایت دی گئی تھی۔ کراچی جیل کے واقعات کو عبدالرحیم راعی فریدآبادی نے اپنی مشہور کتاب "آزادی کی جنگ اور جیل" کے صفحہ ۱۵۲ پر لکھا ہے۔

"جیل میں انگریزوں کی سختی بڑھتی جا رہی تھی۔ روزانہ ہدایت موصول ہوتی اور نتیجہ میں جیلر کی سختی بڑھ جاتی۔ لیکن ہم خوش تھے کہ ہماری تحریک آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر نیا انقلابی جب جیل میں آتا تو اس سے جیل کے باہر کی دُنیا کی خبر مل جاتی تھی۔ کراچی جیل میں فریدآباد کے ۵ انقلابی تھے۔ سب سے آخر میں محی الدین کو لایا گیا تھا۔ جس نے آکر ہم لوگوں کو بتایا کہ فریدآباد میں تحریک بہت کامیاب رہی۔"

فریدآباد کی جنگِ آزادی کی تاریخ سید مطلبی کی گراں قدر خدمات کا تذکرہ کیے بغیر مکمل نہیں مانی جا سکتی۔ آپ یہاں کے ہردلعزیز اور جانباز رہبر تھے۔ عزت و دولت کی کمی نہ تھی۔ آپ نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا کہ جب تک انگریزوں سے ملک کو آزاد نہیں کرالیں گے تب تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ پوری یکسوئی کے ساتھ جنگِ آزادی میں کود پڑے۔ تن، من دھن سے آپ نے ملک کی خدمت کے لیے سر پر کفن باندھ لیا۔ یہ سید مطلبی کی ہی ذات تھی جس کی وجہ سے انگریزوں نے فریدآباد کو باغی علاقہ اور سید مطلبی کو باغیوں کا سرغنہ قرار دیا تھا۔

رام لعل سالک

غزل

کچھ اہلِ عشق سمجھے حسن و نور کہتے ہیں
جو بادہ کش ہیں وہ دائم سرور کہتے ہیں

بھروسہ پل کا نہیں اور ہوا پہ پُل باندھیں
اسی کو جہل اسی کو غرور کہتے ہیں

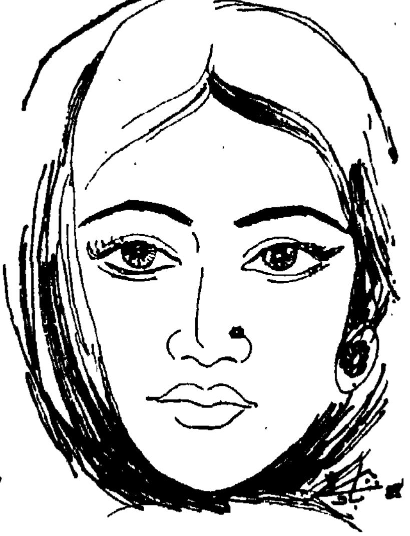
فریبِ دنیا رہِ عشق میں ہے فتنۂ عقل
سنبھل گیا جو اُسے باشعور کہتے ہیں

یہ حق کی بات ہے حق سے نہ ہم جدا ہوں کبھی
اگر ہے شک اُسے ذہنی فتور کہتے ہیں

نہیں گوارا تری پردہ داریاں ہم کو
جو رُو برو ہو اُسی کو حضور کہتے ہیں

جہاں پہ جلتے ہیں ہوش و خرد کے پر سالک
اسی مقام کو ہم کوہِ طور کہتے ہیں

عزیز پری ہار



غزل

کھلیں گے آج خیالوں کے بادباں دیکھو
چلو خموش جزیروں پہ آسماں دیکھو

وہاں وہاں کبھی نہیں ہے جہاں جہاں ہے وہ
اُسے تلاش کرو تو کہاں کہاں دیکھو

ہے جس کی باتوں میں فکر و عمل کی شعلہ گری
اُسے قریب سے دیکھو تو بس دھواں دیکھو

وہ چار دن ہی کسی اجنبی کے پاس رہا
تمام عمر اُسے خود سے بدگماں دیکھو

بسا ہوا ہے کہیں ان میں دوسرا کوئی
یہ کیوں عزیز اجڑتی ہیں بستیاں دیکھو

عظیمہ اقبال

نیا موڑ

مسز داس کی نظر سامنے دالان پر گئی اور ان کا خون کھول اٹھا۔ ان کی ناز و نغم سے پالی ہوئی بیٹی گڑیا پھر اس چڑیل صفت گندی لڑکی ننو کے ساتھ مٹی کے گھروندے بڑے انہماک سے بنا رہی تھی۔ دونوں کے ننھے ننھے ہاتھ مٹی میں سنے ہوئے تھے۔ گڑیا نے اپنی بیش قیمت کڑھی ہوئی فراک پر خوب گارا سان لیا تھا۔ جگہ جگہ سوکھی و گیلی مٹی کے دھبے پڑے مسز داس کا منہ چڑا رہے تھے۔

مسز داس اپنے کٹے ہوئے بالوں کو جھٹکا دیتی ہوئی لپک کر گڑیا کے نزدیک پہنچ گئیں اور شیر کی سی تیزی کے ساتھ دونوں لڑکیوں کے بال پکڑ کر ایک دوسرے سے الگ کر دیا اور ایک زوردار طمانچہ ننو کے معصوم و نازک سے گال پر جڑ کر بولیں۔

"مردار! تیری یہ ہمت۔ خبردار غلیظ لڑکی جو اب گڑیا کے ساتھ کھیلی۔ اب ادھر آئی تو تیری خیر نہیں۔ چل جا اپنی کوٹھری میں۔" مسز داس کے اس کرخت لہجہ اور تلخ گفتگو سے ننو سہم کر رونے لگی۔ ان کی بدکلامی سے اس کے نازک سے دل کے آبگینے ٹوٹ گئے اور وہ اپنے گال پر ہاتھ پھیر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

گڑیا اپنی سہیلی ننو کے ساتھ کیے گئے ظلم و ستم اور اس کی توہین کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ بھی منہ بسورنے لگی۔ اس کے پھول سے رخسار پر آنسو ڈھلک آئے اور چہرہ کمہلا گیا۔ کمرے کے اندر جانے کے بعد مسز داس کے لاکھ منانے پر بھی گڑیا کے چہرہ پر وہ تازگی اور شگفتگی نہ لوٹی جو گھروندے بناتے وقت مسز داس نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی۔

مسز داس کا تعلق رئیس گھرانے سے تھا۔ برسہا برس سے ان کے یہاں زمینداری چلی آ رہی تھی۔ دولت کی فراوانی نے ان کی آواز کو کرخت بنا دیا تھا۔ آواز میں رئیسانہ رعب اور دبدبہ تھا۔ غرور، تمکنت ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کو وہ ان کی اوقات پر ہی رکھتی تھیں۔ ان کے شوہر کے بڑے بڑے فارم تھے۔ پچاسوں لوگ ان کے فارم پر کام کرتے تھے۔ جی حضوری، کرنے والے بہت تھے۔ اس کی عادت مسز داس کو خوب پڑ گئی تھی۔

مسز داس ویسے تو زمانہ کے نشیب و فراز سے ناواقف سی تھیں۔ رئیسانہ ٹھاٹ تھے۔ ضرورت کی ہر شے وقت سے پہلے موجود ملتی۔ پھر بھی انسان ہونے کے ناطے چند باتیں ان کی

زندگی میں بھی تھیں جو بعض وقت ان کو مغموم
کر دیتیں۔ ان کے سال پیچھے ایک کے بعد ایک
دو لڑکے ہوئے لیکن دونوں طفلی میں ہی ان کو
داغ دے گئے۔ اس کے بعد دو چار سال یونہی
گزر گئے۔ پھر ان کے چمن میں گڑیا بہار بن کر اتر
آئی۔ مسز داس اس کو پاکر خود کو بڑی بھاگیہ وان
سمجھنے لگیں ہر وقت اس کو بناتے سنوارتے رہتیں
جدید فیشن کے خوبصورت قیمتی کپڑے اس کے
لیے خرید کر لاتیں۔ ان پر مختلف قسم کے ڈیزائن
بنواتیں۔ بہترین قسم کی کڑھائی اور گل کاری
دیکھ دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ نمو جب بھی
گڑیا کو دیکھتی اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا
گڑیا کی چیزوں کو وہ للچائی ہوئی نظروں سے
دیکھتی تھی۔ اس سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار
کی ایک چھوٹی سی بچی کے لیے بے دریغ روپیہ
صرف کیا جاتا لیکن بیچاری مفلس وفادار نمو تو
مسز داس کے گھر میں سوکھے ٹکڑوں کی طلبگار تھی
اور اس کے لیے اس کو ہر وقت جھڑکیاں سننے کو
ملتی تھیں۔

نمو جب گڑیا کو کسی نئی فراک میں دیکھتی
تو کبھی اس پر اپنا نازک سا گال رکھ دیتی اور
کبھی اس کے کپڑوں کو ہاتھ سے چھو کر دیکھتی۔ پل
بھر کو ان پر ہاتھ رکھ کر اس کو ایک گونا گوں
سکون ملتا۔ نمو گڑیا کی قسمت پر رشک ضرور
کرتی تھی لیکن حسد اور جلن کا شائبہ تک نہ تھا
وہ گڑیا کو بے حد عزیز رکھتی تھی، مزیدار چٹپٹی
باتیں کرتی، طرح طرح کے نئے نئے کھیل ایجاد
کرتی اور دونوں سہیلیاں مگن اور ایک دوسرے
میں کھوئی ہوئی رہتیں۔ گڑیا کا یہ عالم تھا کہ وہ
اپنی ماں کے امیر اور نفاست پسند دوستوں
کے بچوں ...... کے مقابلہ میں نمو کو پسند
کرتی حالانکہ نمو کی ان لوگوں کے سامنے نہ کوئی
اوقات تھی نہ حیثیت۔ لیکن گڑیا تو ہر بچہ پر نمو
کو ترجیح دیتی اور مسز داس کا غصہ یہ سب کچھ
دیکھ دیکھ کر ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا۔

نمو مسز داس کی خاص نوکرانی کی لڑکی
تھی۔ وہ بیوہ ہو کر اس جگہ آئی تھی اور مسز
داس نے اس کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تھا۔
اس کا شوہر اچانک ایک حادثہ کا شکار ہو گیا
تھا۔ نمو بھی باپ کے مرنے کے دو ماہ بعد پیدا
ہوئی تھی۔ بچپن سے ہی ابھاگن تھی۔ نمو اور
گڑیا کی بڑھتی ہوئی قربت اور انس دیکھ کر
مسز داس سوچتیں کہ وہ نمو کی ماں کو ملازمت
سے برطرف کر دیں لیکن وہ اتنی بے ضرر، محنتی
جفاکش اور ایماندار تھی کہ مسز داس اس کو
الگ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ مسز
داس کا ہر کام وہ ان کی منشا کے مطابق کرتی۔
اس کے لیل و نہار کولہو کے بیل کی طرح کام میں
جتے ہوئے گزرتے پھر بھی وہ کبھی ماتھے پر شکن
تک نہ لاتی۔ ہر کام وہ خندہ پیشانی سے انجام
دیتی رہتی۔ اپنی بچی پر توجہ دینے کا اس کے پاس
وقت ہی کہاں تھا۔ گئی رات تک کام میں جتے
رہنے کے بعد بے خبر سو جاتی اور منہ اندھیرے ہی
پھر کام میں لگ جاتی۔ نمو کے شبنمی آنسو بہتے اور
دو معصوم بانہیں باپ کے گلے کا ہار بننے کو تڑپ
اٹھتیں۔

فطرت ہر آدمی کو معصوم اور بے گناہ بھیجتی ہے۔ اونچ نیچ، بڑا چھوٹا، امیر غریب کی تفریق سب تو انسانی دماغ اور اس کے فرسودہ ماحول کی دین ہیں۔ بچپن، معصومیت اور بھولپن بڑے چھوٹے، امیر غریب، آقا اور ملازم کے فرق کو نہیں جانتا۔ یہی وجہ تھی کہ گڑیا اور نمو نے اپنی تمام تر چاہت اور محبت ایک دوسرے کے لیے وقف کردی تھی۔ مسز داس گڑیا کو سمجھاتیں کہ نمو میں نہ تہذیب ہے نہ کلچر، نہ وہ اچھے اسکول میں جاتی ہے اور نہ ہی وہ کسی طرح گڑیا کے قابل ہے۔ گڑیا ڈر کے مارے ماں کے سامنے ہاں، ہاں کرتی جاتی لیکن ماں کی ہر بات اس کی عقل سے بالاتر تھی۔ وہ اپنی ماں کی بات کو ان کی بلا وجہ کی تنبیہہ سمجھتی اور احتراماً اور کچھ بربنائے خوف ان سے کچھ کہہ نہ پاتی۔ یہی وجہ تھی کہ مسز داس کی تمام روک ٹوک اکارت گئی اور نمو اور گڑیا کی دوستی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔

مسز داس کا گھر نہایت صاف ستھرا تھا کوٹھی نما بنا ہوا۔ سامنے لان تھا باغیچہ میں رنگا رنگ کے پھول مہک رہے تھے۔ کیاریاں کھلی پڑی تھیں۔ ہر طرف سبزہ تھا۔ گڑیا کے پاس انواع واقسام کے نہایت بیش قیمت کھلونے تھے۔ گڑیا کا کمرہ الگ تھا جس میں ہر چیز گڑیا کی قد و قامت کے لحاظ سے تھی۔ چھوٹی سی میز کرسی، چھوٹا سا پلنگ۔ ایک طرف گڑیوں کا گھر بنا ہوا تھا۔ وہ بھی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ وارڈ روب مختلف ڈیزائن کے کپڑوں سے بھرا پڑا تھا۔ کئی بکس اوپر تک ٹھس گئے تھے۔ لیکن جہاں ماں کی نظر بچتی گڑیا اپنے کمرہ سے نکل بھاگتی اور دم لیتی جاکر نمو کی کوٹھری میں جہاں نہ فرنیچر تھا نہ قالین نہ گڑیاں تھیں نہ کھلونے۔ لیکن گڑیاں اور کھلونے تو بے جان ہوتے ہیں، بولنا تک نہیں جانتے۔ گڑیا کا دل ان سے بھر جاتا اور وہ اوب کر نمو کے پاس بھاگی چلی جاتی۔ اسے نمو بے حد پسند تھی اس کی باتیں، اس کے ایجاد کردہ کھیل گڑیا کی جان تھے۔ یہ بات تو کسی اور بچے میں نہ تھی کہ وہ نت نئے کھیل کھیلے۔ گڑیا کے ممی ڈیڈی کے دوستوں کے بچے گڑیا کو قطعی نہ بھاتے کہ ان میں وہ چلبلاپن اور شوخی کہاں تھی جو نمو میں تھی۔ نمو کی تو بات ہی اور تھی۔ اسی لیے اپنی ماں کے سمجھانے بجھانے اور تنبیہہ کے باوجود گڑیا ان بچوں سے دل نہ لگا سکی۔ اس کا دل تو نمو میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

جب رات کو مسز داس گڑیا کے پاس جاتیں اور گڑیا ان کو گڈ نائٹ کا پیار کرتی تو وہ اس کو اس وقت بھی نمو سے دور رہنے کی ہدایت کرتیں۔ کبھی اگر گڑیا کی طبیعت خراب ہو جاتی تب تو ان کو یقین ہو جاتا کہ نمو کے اندر پلنے والے گندگی کے جراثیم گڑیا کے جسم میں پیوست ہو گئے ہیں۔ ان کا دم خشک ہو جاتا۔ اگر گڑیا کو کچھ ہو گیا تو، وہ لرز جاتیں۔ ان کا جسم کانپ جاتا۔ وہ بے چین اور مضطرب ہو کر بار بار گڑیا کو سمجھاتیں کہ یہ خادم پیشہ گندے لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو اپنے قریب لایا جا سکے۔ ہمیں ان سے بچ کر رہنا چاہیے۔ مسز داس کا دل انسانیت اور انسان دوستی سے بیگانہ نہ تھا۔

انھوں نے جن حالات میں زندگی گزاری تھی اس کا اثر مسز داس پر پڑنا لازمی تھا چونکہ انسان حالات کا غلام ہوتا ہے جس طرح کے ماحول میں رہتا ہے اسی طرح اس کی جسمانی اور دماغی نشوونما ہوتی ہے۔

مسز داس کو ایک شام کسی تقریب میں جانا تھا۔ وہ گڑیا کو نہلا دھلا کر پہلے ہی تیار کر چکی تھیں۔ گڑیا کا ہر کام وہ اپنے ہاتھ سے ہی کرتی تھیں کہ وہ نظر بد سے بچی رہے۔ اب جو وہ خود تیار ہو کر کمرہ سے نکلیں تو گڑیا غائب۔ کئی آوازیں دے ڈالیں مگر بے سود۔ مسز داس نے سوچا ہو نہ ہو گڑیا منو کی کال کوٹھری میں گھسی ہو گی۔ انھوں نے دانت پیسے "کمبخت کسی وقت بھی گڑیا کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔" انھوں نے من ہی من منو کو سیکڑوں گالیاں دے ڈالیں۔ مسز داس ایک سطحی اور نکمّی زندگی بسر کرنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ اپنے سوا دوسروں کے بارے میں کبھی نہیں سوچتی تھیں اور حقیقت سے چشم پوشی ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ ان کا ناقص طرز تخاطب، کرخت لہجہ اور انسانیت سوز الفاظ سن کر طبیعت مکدر ہو جاتی۔

مسز داس گڑیا کو نہ پا کر چیں بہ جبیں ہو گئیں ان کے نتھنے پھڑ پھڑانے لگے اور آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ وہ نہایت چراغ پا تھیں۔ تیز تیز قدم بڑھاتی وہ منو کی کوٹھری کی طرف چل دیں۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ انھوں نے جھانک کر دیکھا مری مری سی روشنی کوٹھری میں ہو رہی تھی۔ ان کو کچھ صاف نظر نہ آیا۔ مسز داس بڑبڑائیں "اس سیلن اور بدبو بھری کوٹھری میں گڑیا جانے کیا کرتی رہتی ہے؟"

مسز داس نے غصہ اور جھنجھلاہٹ میں دروازہ کو اپنی ٹانگ سے ڈھکیلا اور دروازہ کے دونوں پٹ علیحدہ ہو گئے۔ چیل کی سی تیزی کے ساتھ وہ اندر کمرہ میں داخل ہوئیں۔ ایک چیخ منہ سے نکلنے ہی والی تھی کہ ان کے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ چند لمحوں تک وہ ساکت و جامد کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

منو ایک جھلنگے سے پلنگ پر بیہوش پڑی تھی۔ آنکھیں بند تھیں، چہرہ ستا ہوا اور زرد۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ چہرہ پر نقاہت کے ساتھ ساتھ ایک بیچارگی اور درماندگی تھی۔ منو اس وقت افلاس، ناداری اور بے کسی کی مجسم تصویر تھی۔ گڑیا ٹکٹکی باندھے منو کو تکے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے پھول سے رخسار کمہلا کر رہ گئے تھے۔ چہرہ اداس تھا۔

منو کی ماں منو کے پاس کھٹولے پر بیٹھی تھی۔ دروازہ کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ وہ گڑیا کو سمجھا رہی تھی اور اس سے ملتجیانہ لہجہ میں کہہ رہی تھی۔

" تم یہاں سے چلی جاؤ گڑیا رانی۔ میم صاحب ناراض ہوں گی۔ بھگوان نہ کرے جو تم کو کچھ ہو۔ تم سدا تندرست رہو۔ یہاں مت آیا کرو۔ منو کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میری بچی اگر بھگوان کے پاس چلی گئی تو کوئی غم کرنے والا نہیں ہے لیکن تم بھگوان کے لیے یہاں مت آیا کرو۔ تمہارا

صحت مند رہنا بہت ضروری ہے۔ اگر تم کو کچھ ہوگیا تو میں میم صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گی؟"

نمو کی ماں کی بات جاری تھی لیکن مسز داس کی قوت سماعت اور قوتِ گویائی سلب ہوچکی تھی۔ وہ دیدۂ حیراں بنی مجسمہ کی مانند کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ ان کا سارا جسم لرز گیا۔ احساس میں آگ سی جل اٹھی۔ آنسوؤں کا ابال مسز داس کے قابو سے باہر ہوگیا۔ وہ بھی ایک ماں تھیں۔ اولاد کی محبت اور ممتا نمو کی ماں اور مسز داس دونوں میں یکساں تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کے پاس ذرائع کا فقدان تھا اور دوسرا لامحدود ذرائع رکھتا تھا۔

نمو کی ماں رنج وغم کی تصویر بنی اپنی بیٹی کے چہرہ کو تکے جا رہی تھی۔ مسلسل پریشانیوں اور تفکرات نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ جوں جوں امید کا چراغ جھلملاتا اس کے دل کی بے کلی اور کلیجہ کی دھڑک بڑھتی جا رہی تھی۔ نمو ہی تو اس کی راہِ حیات کی شمع اور اس کی درد آگیں زندگی میں امید کی کرن اور سراسیمگی میں ٹھہراؤ تھی۔ ہائے! اگر یہ نازک سا سہارا بھی ٹوٹ گیا تو وہ کیا کرے گی۔ نمو کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

مسز داس اس منظر کی تاب زیادہ نہ لاسکیں۔ وہ مہر بہ لب تھیں۔ مرتعش ہونٹ کچھ کہنے کو بے چین تھے لیکن وہ کچھ نہیں پا رہی تھیں زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وفورِ غم سے گلا رندھ گیا تھا۔ آواز حلق میں اٹک اٹک جاتی مسز داس کو آج احساس ہوا اور وہ سوچنے لگیں میری ہی طرح نمو کی ماں بھی ایک شادی شدہ عورت ہے۔ ایک بچی کی ماں ہے۔ نمو اس کے سہاگ کی امانت ہے۔ اس کی امیدوں اور آرزوؤں کی اسی طرح شمع ہے جس طرح گڑیا ان کی تمناؤں کا مرکز ہے۔ ان کا ضمیر جاگ اٹھا۔ دل سے ایک صدا نکلی جس شخص کو غریبوں، محتاجوں اور مظلوموں کا غم نہیں وہ کچھ بھی ہو انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ وہ تو جانوروں میں ہی شمار کیا جائے گا۔ زندگی اپنے لیے، اپنی خوشیوں کے لیے زندہ رہنے کا نام ہی نہیں ہے، زندگی ایثار کا دوسرا نام ہے۔ اپنا سکھ تو سب ہی چاہتے ہیں لیکن اپنے سکھ کو نظر انداز کرکے اوروں کے دکھ بانٹ لینا ایک بڑی قربانی ہے۔ ایک عظیم تیاگ ہے۔

مسز داس نے بڑھ کر نمو کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ اور اس کی زرد پیشانی پر اپنے پیار کی مہر ثبت کر دی۔ ان کے ہاتھوں میں اشکوں کے کئی موتی گرے اور ٹوٹ کر بکھر گئے۔ نہ معلوم مسز داس کے آنسو اپنی طبیعت میں غرور وتکبر کی فراوانی کی وجہ سے آنکھوں میں بھر آئے تھے یا نمو کی محبت کی وجہ سے۔

اپنی زندگی کا رخ موڑ دینا کتنا کرب ناک مگر کتنا اطمینان بخش ہے اب انھیں احساس ہوا کہ دوسروں کے لیے جینا اور ان کی زندگی سنوارنا کتنا بڑا مقصدِ حیات ہے اور اس مقصد کے لیے مسز داس جی سکتی ہیں۔ ان کا چہرہ نہایت پرسکون تھا غرور وتکبر سے پاک وصاف۔ ●

مطبوعات

تذکرہ غیر مسلم شعرائے بدایوں
مصنف : شاداب ذکی بدایونی
صفحات : ۱۹۲
قیمت : تیس روپے
ملنے کا پتہ : ذکی منزل۔ محلہ سوتھا۔ بدایوں (یو۔ پی)

زیرِ نظر تذکرہ اردو زبان کے ان شعرائے کرام کے حالاتِ زندگی، فنی کارناموں اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے جن کا تعلق ضلع بدایوں (یو۔پی) سے ہے۔

اس تذکرے میں ترانوے شعرا شامل ہیں جن میں چھیاسی ہندو اور سات عیسائی ہیں۔ ان میں بعض جانے پہچانے ہیں اور ان کی تخلیقات درجۂ اعتبار کو پہنچ چکی ہیں۔ مثلاً:

(۱) نرائن پرشاد مہر گوالیاری (تلمیذ داغ دہلوی)
(۲) منوہر سہائے انور (تلمیذ حالی پانی پتی)
(۳) جسونت رائے رعنا (تلمیذ سیماب اکبرآبادی)
(۴) بسنت رائے مخمور (تلمیذ سرور جہان آبادی)

بیشتر شعراء ایسے ہیں جن کے شعری کارناموں پر زمانے کی قدر ناشناسی نے گرد کی دبیز تہیں چڑھا دیں۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ اس گرد کو جھاڑ کر متعلقہ شاعروں کو دنیائے ادب سے دلکش انداز میں روشناس کرایا جائے۔ تذکرہ نگاری کی مقبول روش کے مطابق اس تذکرے کا انداز بھی تنقیدی سے زیادہ تحقیقی ہے۔ البتہ "غیر مسلم شعراء" کی ترکیب ناپسندیدہ اور قابلِ ترک ہے کہ ایسی درجہ بندی اور امتیازات اردو کے لیے ہمیشہ سمِ قاتل ثابت ہوئے ہیں۔

شاداب صاحب نے بہت سا مفید مواد فراہم کر دیا ہے جو مستقبل کے محققین کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا۔ توقع ہے کہ یہ تذکرہ مقبول ہوگا۔

(پرکاش ناتھ پرویز)

تخلیقات بھیجتے وقت اس کی نقل اپنے پاس ضرور رکھیں۔	اور خوشخط لکھیں اور اپنا پورا پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔
تخلیقات کاغذ کے ایک طرف، حاشیہ چھوڑ کر	تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجئے

قارئین کی نظر میں

"تعمیر ہریانہ" مسلسل مل رہا ہے۔ اس معیاری رسالے کے صفحات کی کمی ان دنوں بے حد کھٹکتی ہے۔ براہِ کرم اس کا کوئی مستقل حل ڈھونڈیں قیمت ایک روپیہ ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

—— رونق شہری (دھنباد)

تعمیر (مئی ۸۸ء) میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ "اردو افسانہ ۶۵ء کے بعد"۔

اردو ادب میں کئی سنہ اہم اور تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند ادب کا احیا کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء جب جنگِ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد کے اثرات اردو ادب پر مرتسم ہوئے۔ اور پھر ۱۹۶۰ء جب اردو افسانوں میں نئے اور جدید رجحانات کے نمایاں اثرات ظاہر ہوئے۔

لیکن متعلقہ مضمون میں ۱۹۶۵ء کے بعد کے افسانوں سے متعلق عنوان قائم کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۶۵ء کیوں؟ اس کی کوئی توجیہ مضمون نگار نے نہیں کی ہے۔ اس طرح تو ۶۴ء کے بعد یا ۶۶ء کے بعد بھی لکھا جا سکتا تھا، آخر ۶۵ء ہی کیوں لکھا گیا؟ —— حسنین سجاد (گیا)

چند دنوں قبل مراد آباد جانا ہوا تو ایک بک اسٹال پر "تعمیر" نظر آیا اور خرید لیا۔

نگارشات کے انتخاب میں آپ کی سلیقہ مندی جھلکتی ہے۔ فضا ابنِ فیضی، ڈاکٹر نریش، زاہدہ زیدی، مصور سبزواری اور ایس۔ ایس چاولہ کی شمولیت نے پرچے کو کافی وقیع اور معیاری بنا دیا ہے۔

پرچہ صوری اور معنوی لحاظ سے کافی خوبصورت اور جاذب نظر ہے۔ —ظفر اقبال (فتح پور)

"تعمیر ہریانہ" ہر ماہ بڑی پابندی سے مل جاتا ہے جس کے لیے مشکور ہوں فی الحال جون کا "خصوصی شمارہ" پیشِ نظر ہے۔ تمام مشمولات قابلِ قدر ہیں۔ جناب ابراہیم یوسف کے "قصہ گل بکاؤلی اور اردو ڈرامہ" کی دوسری قسط ذرا دیر سے آئی مگر درست آئی۔ جناب کرشن موہن اور پرکاش ناتھ پرویز کی غزلیں دل کو چھو لیتی ہیں۔ افسانوں میں "اظہارِ ذات" خاصے کی چیز ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اردو کا یہ کم قیمت اور اعلیٰ معیار والا رسالہ آپ کی ادارت میں اسی طرح ہمیشہ اپنی تابناکی دکھاتا رہے۔

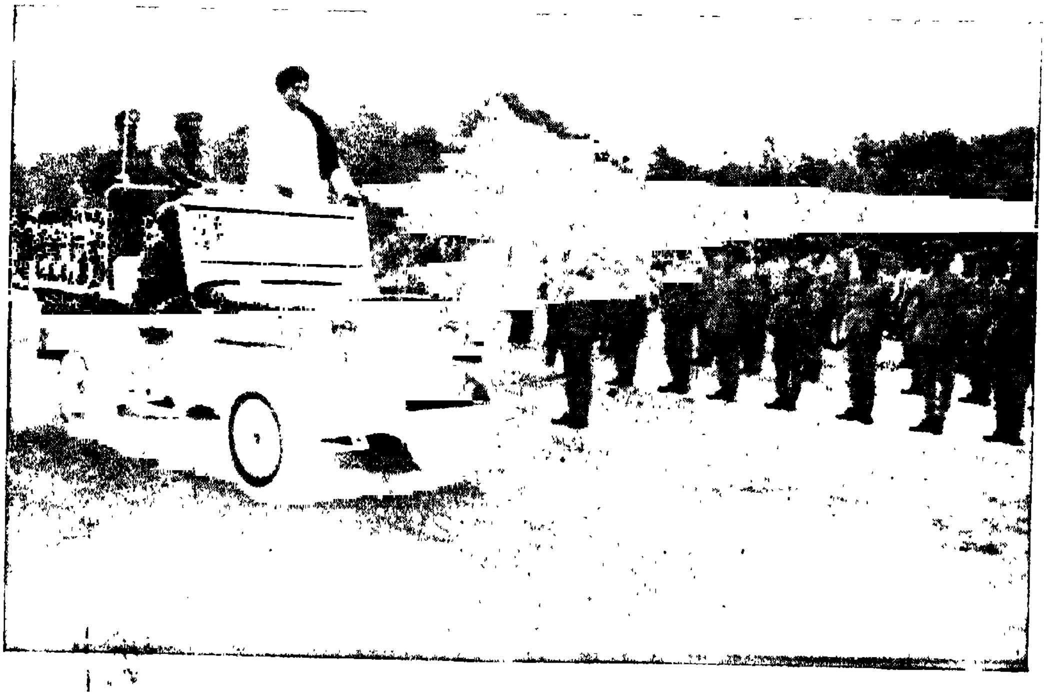
—— صدف جعفری (کلکتہ)

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ارجن داس ملک نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمۂ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او ۱۹۱ - ۱۸۹ سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ سے ستمبر ۱۹۸۸ء کے لیے شائع کیا۔ طابع کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو۔ ٹی۔ چنڈی گڑھ

وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال
نے یوم آزادی کے موقع پر ۱۵ اگست
۱۹۸۸ء کو حصار میں قومی پرچم لہرایا۔



جھنڈا لہرانے کے بعد گارڈ آف آنر
کا معائنہ کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ
ہریانہ۔



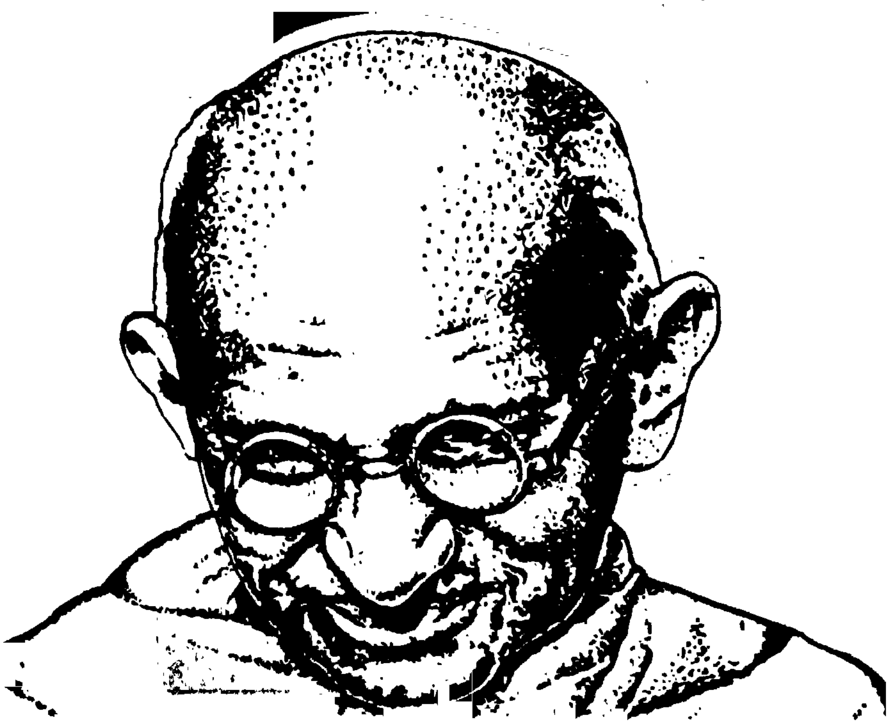


راج بھون میں ہریانہ کی یونیورسٹیوں کی اعلیٰ اختیاراتی نال میبل کمیٹی کی ایک میٹنگ
کی صدارت فرماتے ہوئے عزت مآب ہری آنند براری گورنر ہریانہ۔

مغل باغ پنجور میں انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی کے مندوبین سے محوِ گفتگو
وزیرِ اعلیٰ ہریانہ، عالیجناب دیوی لال۔



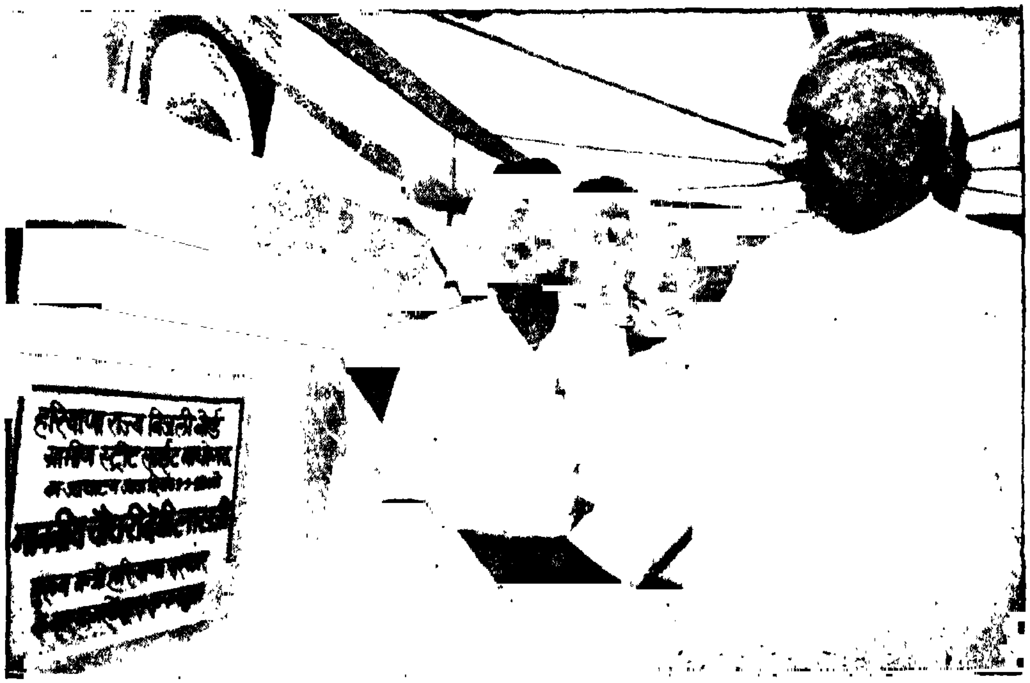






گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند برار دہلی سے تقریباً ۷۰ کلومیٹر دُور سماالکھا میں بلیو جے ٹورسٹ کمپلیکس کے ۲۰ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوئے نئے وِنگ کا افتتاح فرماتے ہوئے۔

وزیر اعلےٰ ہریانہ عالیجناب دیوی لال ضلع مہندر گڑھ کے موضع مادھوگڑھ میں گاؤں کی گلیوں کے لئے بجلی کا افتتاح فرماتے ہوئے۔



آپ کا محبوب معتبر ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

اکتوبر ۱۹۸۸ء   جلد ۱۶   شمارہ نمبر ۱۰

ترتیب

مدیرِ اعلیٰ
ارجن داس مَلِک
آئی۔ اے۔ ایس

مدیر
سلطان انجم

خط و کتابت کا پتہ
مدیر تعمیر ہریانہ، ایس سی او ۱۸۹-۱۹۰
سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

فی شمارہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ ۵ روپے

مدیر کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں

سرورق : پون کمار

حرفِ آغاز



ہریانہ راج بھون میں گاندھی جینتی منائی گئی۔

عزت مآب ہری آنند براری گورنر ہریانہ مہاتما گاندھی کی تصویر پر پھول مالا چڑھا کر بابائے قوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔

۲ راکتوبر ۱۹۸۸ء کو ہریانہ راج بھون، چنڈی گڑھ میں انتہائی عقیدت اور سادگی سے "گاندھی جینتی" منائی گئی۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی کے پسندیدہ منتخب بھگتی گیتوں پر مشتمل "رام دُھن" اس تقریبِ خاص کی ایک اہم کشش تھی۔ ہریانہ بھر سے آئے پچاس جذامیوں نے بھی اس پروگرام میں حصہ لیا۔

عزت مآب ہری آنند براری، گورنر ہریانہ نے حاضرین سے خطاب فرماتے ہوئے بابائے قوم کی دکھائی ہوئی، برادرانہ اخوت، بھائی چارے اور اتحاد و اتفاق کی راہ پر چلنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ ہم آج بھی مہاتما گاندھی کے پیغام اور تعلیمات کی روشنی اور رہنمائی کے سہارے ملک کو درپیش مسائل حل کر سکتے ہیں۔

ستیہ اور اہنسا کے قدیم تصور کا حوالہ دیتے ہوئے گورنر موصوف نے مزید فرمایا کہ مہاتما بدھ، بھگوان مہاویر اور دیگر ممتاز ہندوستانی مفکروں اور سنتوں نے بھی اسی فکر و فلسفہ کی تبلیغ کی۔ مہاتما گاندھی نے حق و انصاف اور عدم تشدد کے اس تصور کو نئے معانی عطا کر کے، بعض نئے پہلو آشکار کئے۔ تحریکِ آزادیٔ وطن کے

دوران باباۓ قوم نے ستیہ اور اہنسا کو نہایت کامیابی سے ایک کارگر حربہ کے طور پر استعمال کیا۔

عزت مآب گورنر ہریانہ نے فرمایا کہ امن و امان برقرار رکھنے اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لئے فرقہ وارانہ خیر سگالی اور باہمی یگانگت و محبت کے رشتوں کو مزید استوار کرنے کی ضرورت آج اور بھی بڑھ گئی ہے۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہی ان مقاصد کا حصول ممکن ہے۔

وزیرِ اعلیٰ نے "حالی ایوارڈ" اور "عباس نگر" کا اعلان فرمایا۔

وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال نے گذشتہ دنوں بیباک اخبار نویس، شہرۂ آفاق فلم ساز، ممتاز کہانی کار اور ناول نگار خواجہ احمد عباس کے فن اور شخصیت پر پانی پت میں منعقد ہونے والے دو روزہ سیمینار کا افتتاح فرماتے ہوئے "حالی ایوارڈ" کا اعلان فرمایا۔ یہ ایوارڈ ہر سال ملک کے ایک ایسے معروف ادیب کو دیا جائے گا جس نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہوں۔ اس سے ملک میں خصوصاً ہریانہ میں اردو کے فروغ کی کوششوں میں اور تیزی آئے گی۔ ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے دیا جانے والا یہ اعزاز دس ہزار روپے زرِ کیسہ، توصیفی سند اور خلوت پر مشتمل ہوگا۔ ہریانہ اردو اکادمی پہلے بھی ہر سال ہریانہ کے ایک ممتاز ادیب کو اکیاون سو روپے زرِ کیسہ، توصیفی سند اور خلوت پر مشتمل "سید مظفر حسین برنی ایوارڈ" سے نوازتی ہے۔

خواجہ احمد عباس مرحوم کی ہمہ پہلو شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ نے فرمایا کہ خواجہ صاحب نے اپنی تحریروں سے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کو فروغ دیا۔ عالمی شہرت کے مالک خواجہ صاحب کی تصنیفات کے دنیا کی کئی زبانوں خصوصاً روسی زبان میں بھی تراجم ہوئے۔ خواجہ احمد عباس پانی پت کے باشندے تھے۔ انہوں نے اپنے وطن پانی پت کو آخری وقت تک یاد رکھا۔ انہوں نے اپنے عظیم کارناموں سے ہریانہ کے تاریخی شہر پانی پت کو دنیائے ادب میں ایک انفرادی حیثیت عطا کی۔ خواجہ صاحب کی ان نمایاں خدمات کے شایانِ شان اعتراف کے طور پر وزیرِ اعلیٰ موصوف نے پانی پت کے اس علاقے کا نام جہاں مولانا حالی اور خواجہ احمد عباس کے آبائی مکان تھے، "عباس نگر" رکھنے کا بھی اعلان فرمایا۔

اس موقع پر وزیرِ تعلیم ہریانہ جناب خورشید احمد نے ہریانہ اردو اکادمی کے آئندہ پروگراموں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ سالِ رواں میں کوروکشیتر کی تاریخی، ادبی اور ثقافتی اہمیت، "میوات کے مجاہدینِ آزادی" اور اردو ادب میں ہریانہ کے ادیبوں کا رول" جیسے اہم موضوعات پر سیمینار ہوں گے۔

اس سے پہلے وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال نے ہریانہ اردو اکادمی کی تین کتابوں اور سہ ماہی جریدے جمناتٹ کی رسم رونمائی ادا فرمائی۔

" خواجہ احمد عباس : فن اور شخصیت سیمینار" میں اردو کے تقریباً چالیس ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ ......

سورج تنویر

مہاتما گاندھی

امن، آزادی، اہنسا کے امانت دار تم
شانتی کے دیوتا تم، ستیہ کے اوتار تم
آدمیت کے پیمبر تم، علمبردار تم
کاروانِ قوم کے سچّے قافلہ سالار تم

تم امام و رہبر و شاہِ شہیدانِ وطن
تم نگہدار و نگہبانِ گلستانِ وطن

آسمانِ حریّت کے آفتابِ ضوفشاں
آشنائے جادہ و منزل امیرِ کارواں
قوم کے رہبر وطن کے ترجمان و پاسباں
درحقیقت بانیٔ آزادیٔ ہندوستاں

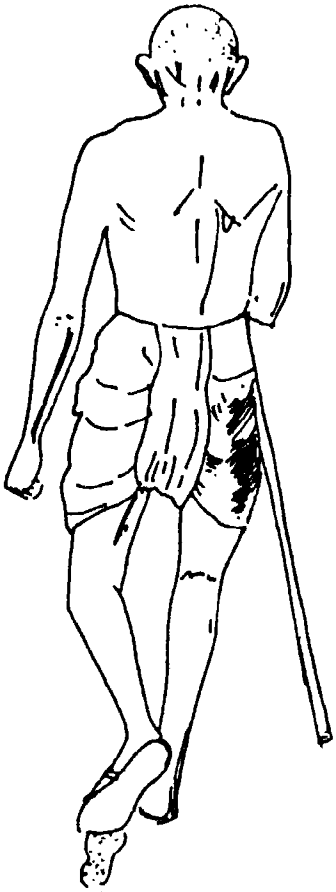
تم نے ارضِ ہند کو جنّت بداماں کردیا
اس کے ہر ذرّے کو رشکِ ماہِ تاباں کردیا

ناتوانوں کے لئے عزمِ جواں تیری عطا
بے زبانوں کے لئے پیغامِ حق تیری نوا
کاروانوں کے لئے رہبر ہیں تیرے نقشِ پا
تو چراغِ راہِ منزل تو ہے خضرِ رہ نما

تیرہ و تاریک راہوں میں اُجالا تجھ سے ہے
دہر میں ہندوستاں کا بول بالا تجھ سے ہے

تم نے کی اس شان سے اہلِ وطن کی رہبری
توڑ ڈالا حکمرانوں کا غرورِ خودسری
بے اثر ہو کر رہی افرنگ کی جادوگری
آخرش تسلیم کرلی سب نے تیری برتری

قوم کی کشتی بچا کر سوئے ساحل لے گیا
تو ہی تھا جو کارواں کو تا بہ منزل لے گیا



یُوسف ناظم

کوئی صُورت نظر نہیں آتی

اب تو خیر حالات اچھے ہیں اور پوری دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہے ورنہ اس دنیا میں ایک زمانے میں ایسا کڑا وقت بھی آچکا ہے جب سبھی لوگ سچ بولنے لگے تھے۔ بوڑھے، بچے، مرد، عورتیں معلوم نہیں انھیں کس کی نظر لگ گئی تھی کہ صبح سے شام تک بلا ناغہ یہ لوگ سچ کے سوا کچھ بول ہی نہیں پاتے تھے۔ ایک وبا تھی جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں بلا ضرورت سچ بولتے اور خوش ہوتے۔ کوشش اس بات کی کرتے کہ یہ سچ خالص ہو۔ انتظامیہ اور عدلیہ جیسی اشیاء اس وقت بھی تھیں۔ لیکن ان کی طرف کوئی شخص آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ کسی کو انھیں تکلیف دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ مگر پولیس کا عملہ تو سخت پریشان تھا کہ لوگ پٹے بغیر سچ بولنے لگے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سچ خود اپنی طرف سے کہی جانے والی چیز نہیں ہے۔ یہ کہلوائی جانے والی چیز ہے اور سچ کہلوانے کے لیے دنیا کے مختلف علاقوں میں وہاں کی آب و ہوا اور وہاں کے باشندوں کی قوتِ برداشت کے لحاظ سے الگ الگ تراکیب استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً الٹا لٹکایا جانا تو ایک عام ترکیب ہے۔ اسے مبادیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ آدمی کو الٹا لٹکایا جائے تو فوراً سیدھا ہو جاتا ہے — اور چند منٹ اپنی حالت پر غور کرنے کے بعد سچ بولنے لگتا ہے — کچھ لوگ تو اس سے بھی کمتر درجے کی ترکیب آزمانے پر سچ بول دیتے ہیں۔ (اسے چیں بولنا بھی کہا جا سکتا ہے) سچ کہلوانے کی ادنیٰ ترین درجے کی ترکیب یہ ہے کہ آدمی کے جسم کے کپڑے اس کے جسم سے رفتہ رفتہ علیحدہ کر دیے جائیں تو سچ برآمد ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس ترکیب کو آزمانے میں دقت یہ پیش آتی ہے کہ ہر شخص کپڑے پہنے ہی کہاں ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تو کپڑے اس لیے نہیں پہنے ہوتے

کہ ان کے پاس کپڑے ہوتے ہی نہیں اور کچھ لوگ تو اس لیے نہیں پہنتے ہوتے ہیں کہ ان کا کا کلچر انھیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔

بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی کے بدن پر نشانات دیکھتے ہی تجربہ کار لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ شخص سچ بول کر چلا آرہا ہے۔ اس خوشی میں اس شخص کی ہلدی اور پھٹکری سے خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ عورتوں اور مردوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ عورتیں خوشی کے موقع پر ہلدی میں رنگی جاتی ہیں۔ مردوں کی قسمت میں بھی ہلدی ہوتی ہے لیکن صرف اس وقت جب ان سے سچ کہلوایا گیا ہو۔

یہ غلط فہمی بہرحال عام ہے کہ آدمی پٹنے پر سچ بولتا ہے۔ نادان بچے ممکن ہے ایسا کرتے ہوں۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد کوئی شخص ایسی نازیبا حرکت نہیں کرتا۔

سچ کے بارے میں کئی جھوٹی سچی باتیں مشہور ہیں۔ جھوٹی زیادہ اور سچی بالکل نہیں۔ سچ بولنے کے لیے آدمی کو صرف سچ بولنا پڑتا ہے بلکہ اعلان بھی کرنا پڑتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے جب کہ جھوٹ بولنے کے لیے یہ سہولت حاصل ہے کہ آدمی جھوٹ موٹ بھی بول سکتا ہے۔ جھوٹ موٹ بھی تو ہے تو جھوٹ ہی لیکن مکمل اور مصفّا جھوٹ نہیں۔ یہ جھوٹ کی ابتدائی شکل ہوتی ہے۔ یہ صرف نومشقوں کی چیز ہے، اور اس سے وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو صحیح النسل جھوٹ سے حاصل ہوتے ہیں۔ جو لوگ ملک و قوم کے وفادار ہوتے ہیں وہ جھوٹ موٹ، جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ صمیم قلب سے اصلی جھوٹ بولتے ہیں۔ چاول میں کنکی رہ جائے تو چاول کھانے کا لطف کرکرا ہو جاتا ہے جھوٹ کو بھی پوری طرح پکنے دیا جائے۔

سچ بولنے کی جزا بھی ہوتی ہوگی لیکن سزا تو بہرحال ہوتی ہے اور کافی معقول ہوتی ہے۔ داستانوں میں ہم ضرور پڑھتے ہیں کہ کسی غریب شخص کو سچ بولنے پر انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ یہ سب زیب داستان کی خاطر کہی ہوئی باتیں ہیں۔ بادشاہوں کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتے تھے مناسب بات نہیں ہے۔ کسی ایک آدمی کی غربت دور کرنے سے دنیا کو کتنا فائدہ پہنچتا ہے سب جانتے ہیں۔

سچ بولنے کے نتائج ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ بات آدمی کی سمجھ میں تو آئی لیکن بہت دیر سے۔ یہ بات اس وقت سمجھ میں آئی جب دنیا میں تہذیب کا چلن شروع ہوا۔ اب تہذیب اور شائستگی کا تقاضا ہے کہ اگر کسی واقعے، سانحے یا حادثے کی حقیقت معلوم بھی ہو جائے تو اسے مشتہر نہ کیا جائے۔ سچ کی تدفین، سچ کی تلقین سے بہتر مانی گئی ہے — دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے چونکہ صرف افراد کا سچ نہ بولنا کافی نہیں تھا — اس لیے اب قومیں عالمی سطح پر سچ بولنے سے بچتی ہیں۔ یہ اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ ہے۔ خیرسگالی اور تدبّر کا تو ہے ہی — تدبّر کو اسی لیے سچ سے علیحدہ رکھا گیا ہے کہ دو مختلف المزاج چیزیں ایک

ساتھ استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔ معدہ
قبول نہیں کرتا۔

سچ بولنے کا صحت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔
شروع ہی سے کوئی شخص سچ بولنے کا عادی
ہو تو یہ الگ بات ہے

لیکن جو لوگ مُنہ کا مزا بدلنے کی خاطر سچ
بولتے ہیں ان کا بیمار پڑنا یقینی ہوتا ہے ـــ
یوں سچ کی اب دنیا کو ضرورت رہی بھی نہیں
ہے ـــ سُنا گیا ہے کہ ڈاکو اور نقب زن قسم
کے لوگ مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقع پر سچ
بولتے ہیں۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ان لوگوں
سے کوئی اچھی توقع وابستہ کرنا کہاں کی دانشمندی
ہے ـــ

جس زمانے میں سچ بولنے کا رواج جڑ پکڑ
چکا تھا اس وقت چند لوگ روزنامچہ بھی
لکھا کرتے تھے۔ روزنامچے میں سچی باتیں درج
ہوتی تھیں۔ روزنامچہ لکھنے کی وجہ یہ بیان
کی جاتی ہے کہ سچ بولنے کے شوقین لوگوں کا
بھی حافظہ نہیں ہوا کرتا۔ جھوٹ بولنے یا لکھنے
کے لیے کوئی حوالہ دینا نہیں پڑتا لیکن سچ کے
ثبوت میں حوالہ دینا ضروری ہوتا ہے۔ ایسے
نازک موقعوں پر بھی یہی روزنامچے کام آتے
تھے۔ اہلِ روزنامچہ حضرات جب بھی اپنے روزنامچے
کی ورق گردانی کرتے انھیں یاد آجاتا کہ آج سے
۲۸ سال پہلے ان کے پڑوسی نے انھیں کیا کیا مغلظات
سُنائی تھیں حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ ان کی
بیگم نے ان کی بیگم کے بارے میں کوئی سچ بات
کہہ دی تھی اور یہ بات بھی جواباً کہی گئی تھی کیونکہ
سچ کہنے کی ابتداءً اُدھر سے ہوئی تھی۔ روزنامچوں
میں چونکہ ہر بات تفصیل سے درج ہوتی تھی اس
لیے مذکورہ مغلظات بھی مطالعے میں آجاتی تھیں
اور روزنامچہ نویس کے خون کا دباؤ خطرناک
حد تک بڑھ جاتا تھا۔ اب روزنامچے اس لیے بھی
نہیں لکھے جاتے کہ پڑوسیوں کے تعلقات صرف
مغلظات کی حد تک رہ گئے ہیں۔ روزنامچوں
کے لیے اتنی اسٹیشنری کہاں سے آئے گی۔

روزنامچوں کے علاوہ مکتوب نگاری بھی
سچ کہنے کی مہم کے لیے مفید ثابت ہوئی ہے ـــ
روزنامچہ صرف شخصی استعمال کی چیز تھی لیکن
خط سے کم سے کم دو افراد تو مستفید ہو ہی
سکتے تھے اور مکتوب الیہ کا دل چاہتا تو وہ
اس خط کو اخبار کی شکل بھی دے سکتا تھا۔
ڈھیروں سچ خطوں میں بھرا پڑا ہے۔ جب بھی
کسی بڑے آدمی کے خط شائع ہوتے ہیں تو مخصوص
علاقوں اور حلقوں میں تھوڑی بہت بے چینی
ضرور پھیلتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو یہ
بے چینی انقلاب تک پہنچ جاتی ہے۔ سچ اب
اس لیے بھی نہیں کہا جاتا کہ کہیں انقلاب نہ
آجائے اور سچ کو بھی اسی طرح رفع دفع کیا
جاتا ہے جس طرح کوئی بغاوت فرو کی جاتی
ہے ـــ لیکن انقلاب ہو یا بغاوت۔ ان دونوں
کا فائدہ ایک ہی ہے۔ دنیا کی آبادی فی الفور
کم ہو جاتی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی
کوئی تدبیر اتنی زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتی۔
یہ نسخہ ہر جگہ استعمال ہو رہا ہے اور بڑی طاقتیں

غزل



زاھدہ زیدی

نئی دِشائیں، نیا سفر ہے نئے ہیں سوچوں کے سلسلے سے
نئی تصاویر بن رہی ہیں، پرانے ایواں ہلے ہلے سے
مجھے نہ معلوم تھا خدایا یہ تیری دُنیا حسین ہے اتنی
حسین نظاروں کے گلستاں میں حسین چہروں کے گل کھلے سے

کسی مسیحا نفس کی نظروں میں حوصلوں کی کرشمہ سازی
کہیں مشینوں کی کارسازی میں حسن کاری کے سلسلے سے
پرانے چہروں کو ہم نے اِک بار پھر انوکھی نظر سے دیکھا
کہیں ہیں نزدیکیاں فروزاں کہیں سمٹتے ہیں فاصلے سے
کہیں رفاقت کی دِلبری ہے کہیں محبت کی دل نوازی
کسی پہ لُطف و کرم کی بارش کہیں تبسم کے گل کھلے سے

خاص طور پر اس نسخے کی ترویج و اشاعت میں دل کھول کر حصّہ لے رہی ہیں۔

جھوٹ کو برا یا معیوب سمجھنا اچھی بات نہیں ہے۔ یہ تو خود قدرت کا انتظام ہے کہ جھوٹ اور سچ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ صبح کاذب کی طرح جھوٹ بھی ہمیشہ برقرار رہے گا۔ بلکہ اس کی اوّلیت بھی قائم رہے گی — صبح کے بارے میں شاعری بھی بہت ہوئی ہے۔ کیا تعجب یہ سارے اشعار صبح کاذب ہی کے بارے میں کہے گئے ہوں۔ صبح صادق کے بارے میں جو شعر کہا گیا تھا اس کا ایک مصرع ہمیں اب بھی یاد ہے کہ "ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا"۔ ویسے یہ شعر بھی غلط بیانی کی پیداوار ہوگا کیونکہ جہاں تک عاشقی کے احوال و کوائف کا تعلق ہے ان میں صرف ہجر حقیقت ہے اور وصال صرف خواب یا خیال۔

سچ کی ویسے کئی صورتیں ہیں لیکن چونکہ موسم بہار کا ہے اس لیے ان میں سے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ●

ڈاکٹر ہارون ایوب

اُردو ناول: ایک جائزہ

ناول ہمارے ادب کی ایک اہم صنف ہے جو زندگی کو بہت خوبصورتی سے اور صحیح انداز سے بے نقاب کرتی ہے۔ کیونکہ ناول کی بنیاد انفرادی تجربات پر رکھی جاتی ہے اور کہانی کی مدد سے زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کا کام اور زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ ناول پڑھنے میں ہم تمام واقعات اور افعال کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں لیکن بعض ناول ہم کو روزمرہ کی زندگی سے نکال کر منطق کی دنیا میں لے جاتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ادبی ناولوں کے دائرے میں رہتے ہیں۔ حالانکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہت خشک ہوتے ہیں لیکن ان سب ناولوں کا مقصد ایک ہی ہے وہ ہے حقیقت کو بے نقاب کرنا۔ اس کے لیے ناولوں میں کئی طریقہ کار اختیار کیے ہیں جو سب کے سب کامیاب ہیں کیونکہ مصنف اپنے تجربات سے سیاسی، سماجی اور معاشی پریشانیوں کو کچھ اس انداز سے پرتا ہے کہ ہم اس میں محو ہو کر رہ جاتے ہیں جو حقیقت کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر منطقی ناولوں کی بنیاد عام انسانی مشاہدے اور تجربات پر مبنی نہیں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کچھ لوگ اسے ناول کے دائرے سے الگ کر دیتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس چار ہزار صفحات کے انبار کو صرف ٹیکنیک کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ معنی کے اعتبار سے بھی دیکھنا چاہیے کہ ناول نگار نے زندگی کے کس پہلو کو اجاگر کیا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں اس کی اچھائیاں اور برائیاں کھل کر سامنے آجائیں۔ آج بھی ہمارے ملک میں بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو پرانی تہذیب اور جدید سائنسی ترقیات سے بالکل ناواقف ہیں۔ اگر کوئی ناول پرانی تہذیب اور پرانے ماحول میں لکھا گیا ہے تو ہمارے بہت سے قاری اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لیے ناول میں موضوعات

کا ذکر بہت اہم ہے جو انسانی عمل اور ردِ عمل پر منحصر ہوں۔ اس رو سے انسانی زندگی کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ پیش کیا جائے۔ جس میں جذبات اور احساسات کی دنیا ہو۔ ایسے ناول ہمارے قاری کے ذہن میں ایک نئی قوت اور نئی آگہی پیدا کرتا ہے جو حقیقت کا صحیح روپ ہے۔ سینے میں احساسات اور جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیتا ہے جو قاری کو ایک راہِ عمل پر گامزن رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

ناول کا کینوس بہت بڑا ہوتا ہے۔ ناول میں زمانے کے اعتبار سے زندگی کے ایک ٹکڑے کو اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ یکجا طور پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ وہ زندگی کا ایک ٹکڑا ایک سو سال کا بھی ہو سکتا ہے اور صرف ایک دن یا ایک رات کبھی۔ ہمارے یہاں اردو میں ایسے بہت سے ناول ہیں جن کی مُدّت کافی طویل ہے۔ ان میں سب سے زیادہ طویل مدّت کا ناول قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" ہے جس میں دس ہزار سال کی تہذیب کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" خدیجہ مستور کا "آنگن"۔ حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول" ایسے ناول ہیں جن کا کینوس ایک لمبی مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف "لندن کی ایک رات" جو سجاد ظہیر کا شاہکار ہے صرف ایک رات کی کہانی ہے جس میں چند دوست ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ کھانا پینا، ناچ رنگ کی محفل اور گفتگو پر پوری کہانی کا دارومدار ہے لیکن ایک رات کی مختصر مدت میں اس ناول میں کیا کچھ نہیں ہے۔ ناول ٹیکنیک کے اعتبار سے بھی کامیاب ہے کیونکہ زمانے کی ساری تبدیلیاں، سیاسی معاشی حالات سب ہی کچھ تو اس میں موجود ہے۔ اس لیے ادبی ناول کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کتنا طویل یا مختصر ہو۔ حالانکہ ناول کے طویل کینوس میں اس بات کی زیادہ گنجائش ہے کہ کسی بھی چیز کو زیادہ وضاحت سے پیش کیا جا سکے۔ زندگی کا ہر پہلو اجاگر ہو سکے۔ لیکن یہ ناول نگاری کی ٹیکنیک کا کمال ہے کہ وہ کم سے کم مدت میں چند کرداروں سے سب کچھ کہلوا دیتا ہے۔ جس کے لیے بعض ناول نگاروں نے ہزار ہزار صفحات کے ناول لکھے ہیں۔

انگریزی ناول کی تقلید میں ہمارے ادب میں ناول آیا ہے۔ اس سے پہلے کہانی، قصہ اور داستانوں کی شکل میں ادبی مواد ملتا ہے۔ یوں تو ہمارے ناول نگاروں نے بہت ترقی کی ہے۔ دراصل یہ ترقی صرف ناول کی ترقی نہیں بلکہ اردو نثر کی بھی ترقی ہے۔ کیونکہ آج کا دور صنعتی ترقی کا دور ہے جس میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش ہے۔ انقلاب آ رہے ہیں تحریکات چلائی جا رہی ہیں۔ ان بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ اردو ناول نے دیا ہے۔ کیونکہ یہ سماجی زندگی کا مظہر ہے لیکن صرف وہ ناول جن میں کسی پرانے تاریخی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہو یا کسی

ہیرو کے بہادری کے کارناموں کو پیش کیا گیا ہو، سماجی ناولوں کے دائرے میں نہیں آتے بلکہ تاریخی ناول کہلاتے ہیں۔ ایسے ناول ہر دور میں اور ہر ملک میں اپنی پرانی شاندار تہذیب کو دہراتے رہتے ہیں اور دہراتے رہیں گے۔ لیکن آج کا دور صنعتی دور ہے۔ کسانوں کی اپنی پریشانیاں ہیں۔ جاگیرداروں اور کسانوں کی طبقاتی کشمکش ہے۔ جب کسان اس کشمکش سے تنگ آکر گاؤں چھوڑ کر شہر آتا ہے تو شہر میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے جھگڑے میں الجھ جاتا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ دونوں زندگیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اس سلسلے کا سب سے کامیاب ناول "گئودان" ہے جو شہری اور دیہاتی زندگی کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کرتا ہے جس کا مقابلہ اردو کا کوئی دوسرا ناول نہ کر سکا لیکن ایک طویل مدت کے بعد ڈاکٹر قاضی عبدالستار نے اپنا ناول "شب گزیدہ" پیش کیا جو "گئودان" کی حقیقت پر پورا اترتا ہے۔ جس میں نئی اور پرانی تہذیب کی جھلک ایک ساتھ نظر آتی ہے جہاں ایک طرف جاگیردارانہ نظام کی شان و شوکت ہے وہاں لکھنؤ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نوجوان نئی امنگوں کے ساتھ ملتے ہیں۔ غرض یہ وہ حقیقی انداز ہے ہماری سوسائٹی کا جس کا ایک روپ "گئودان" کی شکل میں ظاہر ہوا تو دوسرا "شب گزیدہ" کے انداز میں جس میں ڈاکٹر قاضی عبدالستار کامیاب رہے ہیں۔

ناول کا کینوس کیونکہ طویل ہوتا ہے اس لیے اس میں فنکار کھل کر سامنے آتا ہے اور فن کی تمام گہرائیوں کے ساتھ اپنے جذبات کو پیش کرتا ہے۔ ناول کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس میں فنکار یا مصنف پوشیدہ رہتا ہے اور اس کے کردار بولتے ہیں۔ یعنی ناول نگار اپنے سارے جذبات کرداروں کے ذریعہ سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جو ناول نگار کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اب یہ ناول نگار کا کمال ہے کہ وہ کردار کو کتنا ابھارتا ہے۔ ہمارے ناولوں میں بعض کردار ایسے بھی ہیں جو اپنی نمائندگی کے ساتھ ساتھ اپنے طبقہ کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ جس طبقہ کا وہ ایک فرد ہے۔ کردار نگاری کا یہ کمال ہم مرزا رسوا کے ناول "امراؤ جان" میں دیکھتے ہیں۔ ان کا ہر کردار خود بولتا ہے کہ ہم کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناول کا پلاٹ یا کہانی بھی حقیقی ہونا چاہیے کیونکہ ناول نگار اپنی بات جو وہ کہنا چاہتا ہے بہت خوبصورتی سے پلاٹ میں سمو دیتا ہے۔ پلاٹ جتنا خوبصورت اور گٹھا ہوا ہوگا ناول اتنا ہی جاندار ہوگا اگر پلاٹ ڈھیلا ہو تو ناول کی یہ کمزوری ہے اور کردار بکھر جائیں گے۔ پلاٹ کی کمزوری دراصل ناول کی کمزوری ہے۔ اس لیے بعض ناقدین کی رائے ہے کہ ناول میں ہر چیز کو الگ الگ نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ مجموعی طور پر یہ دیکھنا چاہیے کہ ناول کیا ہے۔ کیا وہ حقیقی ہے یا ہم کو کسی طلسمی دنیا میں لے جاتا ہے۔ یا وہ محبت کی دنیا میں کھو کر تاج محل

بنانے کی راہ دیتا ہے۔ ایسے ناول معیاری
اور ادبی ناول نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس
قسم کے ناول انسان کو تصورات کی دنیا
میں لے جاتے ہیں جہاں حقیقت نام کو نہیں
ہوتی۔ ناول کے لیے حقیقت نگاری ضروری
ہے جو انسانیت سے قریب ہو۔

آج کے دور میں ناولوں کو کئی خانوں
میں تقسیم کر دیا گیا ہے جسے کم سے کم میں
ضروری نہیں سمجھتا۔ جیسے رومانی ناول،
جاسوسی ناول، معاشرتی ناول، سیاسی
ناول، جنسیاتی ناول اور مزاحیہ ناول وغیرہ
وغیرہ۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک
ناول صرف ایک ہی موضوع پر لکھا جائے
ایک ناول میں کئی موضوعات ایک ساتھ
ملتے ہیں جیسے کسی ناول میں سیاسی یا
معاشی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے اور
اس میں تھوڑی سی رنگینی پیدا کرنے کے لیے
مزاح نگاری سے کام لیا جاتا ہے یا کسی
مزاحیہ ناول میں جیسے کہ شوکت تھانوی
کے ناول ہیں جن کا زیادہ حصہ مزاحیہ ہوتا
ہے لیکن اس کے پیچھے بھی کسی نہ کسی معاشی
سیاسی یا سماجی پہلو کا ہاتھ ہوتا ہے۔

اس لیے ناول کو خانوں میں تقسیم کرنا کچھ
زیادہ مناسب نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر
تو موضوعات ملتے جلتے نظر آتے ہیں
بس اس بات کا خیال رکھنا چاہیے...
یہ وہ اپنے مرکزی مقصد یعنی حقیقت سے
تو منہ نہیں موڑ رہے ہیں۔ یہ خانے
یورپ کے ناول نگاروں نے بنائے ہیں جو
موضوعات کے بجائے ٹیکنیک سے متعلق
ہیں لیکن اس کے باوجود ٹیکنیک کے کچھ
بھی اصول مقرر نہیں کیے جا سکتے بس انداز
اچھوتا اور نیا ہونا چاہیے جو کوئی اچھوتی
بات کو بیان کرے جو ہمارے رویے کے
لیے ایک غیر معمولی تحفہ ہو بس وہی ٹیکنیک
ہے۔ ایک ٹیکنیک قرۃ العین حیدر کی ٹیکنیک
ہے جس میں کوئی ربط اور سلسلہ نہیں ہے۔

بس جس طرح خیالات دماغ میں آ رہے ہیں
قلم ان کو لکھتا جا رہا ہے جس کے لیے یہ بھی
ضروری نہیں ہے کہ ایک واقعہ پورا بیان
کر دیا جائے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے
سلسلے میں بیچ میں اگر کوئی دوسری بات
یا واقعہ یاد آ گیا تو وہیں سے پہلے واقعہ کو
چھوڑ کر نئی بات شروع کر دی جاتی ہے۔

دوسرے وہ عام روش ہے جس پر تمام
ناول نگار چل رہے ہیں جس کا انداز بیانیہ
ہے۔ بس کہانی کہنے کا انداز الگ ہے۔
کوئی ماضی اور حال کے سہارے اپنی کہانی
کو آگے بڑھاتا ہے اور خطوط اور ڈائری
کا سہارا لے کر اپنے جذبات کی رو میں بہتے
ہوئے لمحات کو پیش کرتا ہے، اس کے علاوہ
بھی ہمارے بعض ناولوں کا انداز صحافتی
ہوتا ہے جن کو پڑھنے کے بعد اکثر تو ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بہت سے اخبار
کی کٹنگ ایک جگہ جمع کر دی گئی ہے ایسے
صرف طرز تحریر کا ایک انداز کہا جا سکتا

غزل

کرشن ادیب



گو بہ ظاہر مرا اِس زیست سے رِشتہ بھی نہیں
مَیں مگر تنہا، اُسے چھوڑ کے جاتا بھی نہیں

سانحہ اُس پہ یقیناً کوئی گزرا ہوگا
بے سبب بھول گیا ہو مجھے ایسا بھی نہیں

چند لمحوں کی جُدائی بھی گراں تھی کل تک
اَب جو بچھڑا ہُوں تو مَیں اِتنا اکیلا بھی نہیں

کون آئے گا اِدھر، بہرِ سیاحت، پڑھنے
درو دیوار پہ لکھا ہیں نوشتہ بھی نہیں

تشنہ لب پھرتا ہُوں میں زہرِ تمنّا پی کر
میری قسمت میں کہیں اوس کا قطرہ بھی نہیں

سرِ مے خانہ بھی تنہائی کا احساس رہا
ہائے یہ شام، کوئی اپنا شناسا بھی نہیں

ہے جو پہلی ٹیکنیک سے کافی قریب ہے۔
غرض موجود ناولوں کی چاہے جو بھی ٹیکنیک ہو بس اس کا حقیقت سے قریب ہونا ضروری ہے۔ ایسے ناول ادب میں ایک اہم مقام پاتے ہیں جن کا اسلوب بیان، پلاٹ، کردار، منظر نگاری اعلیٰ معیار کی ہو۔ زبان سادہ اور عام فہم ہو اور کرداروں کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہو۔ ایسے سارے ناول اردو ادب کے لیے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ●

علقمہ شبلی

شباب للت



غزل

اُس آدمی پہ بھی تیرے کرم کا سایا ہے
جو ناسمجھ ترا شکوہ زباں پہ لایا ہے

یہ کس کا عکس مرے آئینے پہ چھایا ہے؟
کوئی تو ہے جو مری ذات میں سمایا ہے

بہت غرور نہ کر اُس کی مہربانی پر
وہ شخص دھوپ ہے پل میں تو پل میں سایا ہے

ندی کی دھار پہ لکھی ہوئی عبارت ہوں
ہر ایک موجِ نفس نے مجھے مٹایا ہے

وہ سنگ ہوں جو بشر بن سکا نہ صدیوں میں
مری حیات پہ اِک بددُعا کا سایا ہے

غزل

حیراں ہوں میں کیوں آج جزا ہے نہ سزا ہے
کیا وقت پڑا ہے کہ مرے لب پہ دُعا ہے

اِک میں ہوں کہ ٹوٹے ہوئے دل جوڑ رہا ہوں
اِک وہ ہے کہ دیوارِ وفا توڑ رہا ہے

کہنے کو تو سورج بھی ہے مٹھی میں مری بند
ہر سمت مگر رقصِ شبِ تار بپا ہے

دل ہے کہ اِسے کہیے چراغِ رہِ ہستی
بجھ بجھ کے جلا اور یہ جل جل کے بجھا ہے

ہیں پاؤں کہ سو من کے ہوئے جاتے ہیں لیکن
دل اجنبی راہوں میں بھی چلتا ہی رہا ہے

ایم مبین

خواہشِ بےجا

رام داس جی جب گھر آئے تو اُن کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں، ان کے چہرے پر چھائی پُراسرار سنجیدگی اور ہونٹوں سے لپٹی کربناک خاموشی نے سرلا دیوی کو بےچین کر دیا۔ اُس سے رہا نہ گیا تو پُوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے آپ بڑے متفکر نظر آرہے ہیں؟"

"ہاں" کہتے ہُوئے رام داس جی کے چہرے پر بیچارگی کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ "کئی لوگوں سے کئی دِنوں سے یہ باتیں سُن رہا تھا لیکن ابھی تک نظرانداز کرتا آرہا تھا مگر آج ایک ایسی بات سُنی ہے کہ چاہ کر بھی نظرانداز نہیں کر پا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں اب تمہیں بھی صاف صاف اصلیّت بتا ہی دُوں۔ اور گیتا سے بھی دو ٹوک گفتگو کر لُوں۔"

"کیا بات ہے؟" سرلا دیوی نے اپنا کلیجہ تھام لیا، "ایسی کیا بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے تم اِتنے پریشان نظر آرہے ہو؟ کیا کیا ہے گیتا نے؟"

"اُس کے اور اشوک بابُو کے تعلقات کُچھ زیادہ ہی گہرے ہو گئے ہیں۔"

"کون اشوک بابُو؟ گیتا کے باس؟" اُنہوں نے پُوچھا۔

"ہاں" رام داس جی بولے، "اور سُنا ہے گیتا اور اشوک نے شادی کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔"

"گیتا کی عقل ماری گئی ہے کیا جو اس رنڈوے سے شادی کرنے کی سوچ رہی ہے۔" سرلا دیوی چیخ اٹھی۔

"ہاں میری عقل ماری گئی ہے" — اُسی وقت دندناتی ہوئی گیتا بھی کمرے میں گھس آئی۔ "اچھا ہُوا آپ لوگوں کو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ ورنہ مَیں خود اسی سلسلے میں آپ لوگوں سے بات کرنے والی تھی۔"

"لیکن بیٹی۔ کُچھ تو اپنا اور اشوک بابُو کا موازنہ کرو۔ کہاں تم اور کہاں اشوک بابُو..."

"میری عُمر تیس سال ہے۔ اور اشوک بابُو کی عُمر

۴۵ سال۔ اشوک بابو کی ایک شادی ہو چکی ہے۔ گیتا تیز لہجے میں بولی۔

"یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں۔" رام داس جی بولے "تمہارے لئے کیا کنوارے لڑکوں کی کمی ہے جو تم اس ادھیڑ عمر کے رنڈوے سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"

"میرے لئے کنوارے لڑکوں کی تو شاید کمی نہیں ہے۔ لیکن افسوس وہ سارے لڑکے مجھے نہیں آپ کو پسند نہیں ہیں۔ ارون آپ کو اسی لئے پسند نہیں آیا کیونکہ اس کی تعلیم مجھ سے کم تھی۔ وِجے کا رنگ کالا تھا۔ سوم ناتھ بہت دور سروس کرتا تھا۔ اشونی کی تنخواہ کم تھی ـــ رنگ ناتھ کی عمر زیادہ تھی۔ جب میرے لئے پہلا رشتہ آیا تھا تو میری عمر ۲۱ سال تھی۔ آج میں ۳۰ سال کی ہو چکی ہوں۔ اور میرے لئے آخری رشتہ آئے تین سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔"

"بیٹی۔ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" رام داس جی ہکلاتے ہوئے بولے۔

"میں جو کہنا چاہتی ہوں آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں" گیتا کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے برس رہے تھے۔ اس نے اِتنا سے آگے اور کچھ نہیں کہا تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دونوں حیرت زدہ اُسے دیکھتے رہ گئے۔

"دیکھ لیا اِتنی زیادہ آزادی کا نتیجہ ـــ کتنی زبان دراز ہو گئی ہے۔" سرلا دیوی بولیں۔

لیکن رام داس جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اِن کے دِل کا چور اِن کی آواز کا گلا گھونٹ رہا تھا۔

گیتا کی آنکھوں سے ٹپکتا عزم یہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اشوک سے ہی شادی کرے گی۔ چاہے والدین لاکھ اس کی مخالفت کریں۔ اشوک اور گیتا ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے۔ اشوک گیتا کا باس تھا۔ گزشتہ پانچ سالوں سے دونوں ایک ساتھ ایک ہی آفس میں کام کر رہے تھے۔ وہ خود اشوک کے بارے میں سب کچھ اچھی طرح جانتے تھے۔ اشوک ایک بڑا ہی سنجیدہ طبیعت کا مخلص شخص تھا۔ پانچ سال قبل اس کا تبادلہ اسی شہر میں ہوا تھا۔ اس کی بیوی کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی اتنی محبت کہ اس کی بیوی کا مقام کوئی دوسری لڑکی نہیں لے سکی۔ اس طرح سات سال کا وقفہ گزر گیا، اشوک نے دوسری شادی نہیں کی، جبکہ اشوک کے رشتہ داروں نے اس پر دوسری شادی کے لئے بہت دباؤ ڈالا۔ اسے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکیاں دکھائیں لیکن اشوک کو کوئی بھی لڑکی پسند نہیں آئی۔

اس کا ایک ہی جواب تھا۔

"دُنیا کی کوئی بھی لڑکی میری پہلی بیوی کا مقام نہیں لے سکتی۔ اِس لئے میں شادی نہیں کروں گا۔ اپنی بیوی کی یادوں کے سہارے ہی باقی زندگی گزار دوں گا۔ ہاں جس دن مجھے کوئی ایسی لڑکی مل گئی جس سے مِل کر مجھے احساس ہوا کہ یہ میری بیوی کی جگہ لے کر میری زندگی کا خلاء پورا کر سکتی ہے میں اس سے شادی کر لوں گا۔"

تین چار سال تک تو اشوک کے بارے میں کوئی بھی افواہ سُننے میں نہیں آئی، لیکن پھر اشوک اور گیتا کے بارے میں طرح طرح کی باتیں اور قیاس آرائیاں گونجنے لگیں جس نے اُنہیں بے چین کر دیا۔ اُنہوں نے گیتا کے اشوک کے ساتھ گھومنے پھرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن جب اُنہوں نے یہ سُنا کہ دونوں شادی کرنے والے ہیں تو یہ سُن کر وہ سناٹے میں آ گئے۔

اور یہ آج گیتا نے خود اپنا فیصلہ بھی تو سُنا دیا تھا۔

لیکن اُنہیں اِس بات میں گیتا کی جذباتیت اس کے بچپنے کا زیادہ دخل محسوس ہو رہا تھا۔

ممکن ہے اشوک کو گیتا میں اپنی پہلی بیوی کا عکس نظر آیا ہو۔ کیونکہ گیتا بھی اتنی خوبصورت اور اتنی ہی خوبیوں کی مالک تھی۔ لیکن گیتا کو اس قسم کا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہیئے تھا کہ اشوک اور اُس کی عمروں میں کتنا فرق ہے۔ اشوک شادی شُدہ ہے۔ یہ بات سچ ہے جب گیتا کے لئے پہلا رشتہ آیا تھا اس کی عُمر ۲۱ سال ہی ہوگی۔

اس وقت گیتا کو سروس جوائن کئے تین مہینے بھی نہیں ہُوئے تھے۔ گیتا ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔

گیتا سے بڑی دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ لڑکیاں اپنے اپنے سسرال میں خوش تھیں بچوں کی مائیں بن گئی تھیں لڑکے بھی دو دو بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ اور جن شہروں میں ان کی نوکریاں تھیں وہاں بڑی راحت بھری زندگی گزار رہے تھے۔

جب وہ ریٹائر ہُوئے تو اُن کے سامنے اپنی زندگی کا آخری فرض اور سب سے بڑی فکر گیتا کی شادی کی ہی تھی۔ گیتا کالج کے آخری سال میں تھی۔ انہوں نے گیتا کے لئے لڑکے دیکھنا شروع کیئے تو گیتا نے صاف کہہ دیا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کیئے بنا شادی نہیں کرے گی۔ گیتا کے اس فیصلے کے آگے اُنہیں سر جھکانا پڑا۔ اور اُنہوں نے طے کر لیا جب تک گیتا اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتی تب تک اس کی شادی نہیں کریں گے۔

اچانک ان کی بیوی سرلا دیوی سخت بیمار ہو گئیں اتنی سخت کہ بچنے کی کوئی اُمید نہیں رہی۔ علاج پر پانی کی طرح پیسہ خرچ ہونے لگا۔ شاید ان کے بچوں کے سر پر قدرت کو ماں کا سایہ قائم رکھنا تھا اِس لئے سرلا دیوی اچھی ہو گئیں۔ لیکن اس صحت یابی کی انہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

ریٹائر ہونے کے بعد اُنہیں جو کچھ پیسہ مِلا تھا وہ سب سرلا دیوی کے علاج پر خرچ ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ انہیں سرلا کے علاج کے لیئے اپنی پینشن بھی فروخت کرنی پڑی تھی۔

لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھے۔

اِن کے دو بیٹے تھے۔ کیا دونوں ماں باپ کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے؟ اور ایک بہن کی شادی بھی نہیں کر سکتے؟ ایسا تو کبھی ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس وقت ان کے دل کو ایک گہری چوٹ لگی جب دونوں لڑکوں نے اپنا رونا روتے ہُوئے انہیں بتایا کہ کس مشکل سے وُہ اپنا گھر کا خرچ چلا رہے ہیں ایسی حالت میں بھلا وہ کس طرح ان کی مدد کریں۔

بچوں کی یہ بات سُن کر ان کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی۔ اُنہوں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جس اولاد کو اتنی محنت سے پال پوس کر بڑا کیا ایک دِن وہی اولاد انہیں یہ جواب دے گی۔

آمدنی کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ اِس لیئے فاقوں کی نوبت آ گئی۔

اُس وقت گیتا نے طے کیا۔

"پتا جی! آپ کے دونوں بیٹے تو آپ کے بڑھاپے کی لاٹھی نہیں بن سکے لیکن اب میں آپ کے بڑھاپے کی لاٹھی بنوں گی۔ میرے ہوتے ہوئے آپ اور ماں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے" گیتا نے نوکری کی تلاش شروع کی اور جلد ہی اسے ایک اچھی نوکری بھی مِل گئی۔

گیتا ساری تنخواہ لاکر اُن کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ تنخواہ میں ان کی زندگی بڑے آرام سے گزرنے لگی اِس وقت وہ یہ بھول گئے کہ ان کا سب سے بڑا اور آخری فرض جو باقی بچا ہے وُہ گیتا کی شادی ہے۔ اِنہیں

ادون اس لیے پسند نہیں آیا کہ اس کی تعلیم گیتا سے کم تھی بلکہ اس لئے پسند نہیں آیا تھا کہ اگر گیتا کی ادون سے شادی ہوگئی تو وہ اپنے سسرال چلی جائے گی۔ اور گیتا نے اپنی تنخواہ کی جو لاٹھی انہیں پکڑا رکھی ہے جس کے سہارے وہ زندگی کے سفر کی آخری منزلیں طے کر رہے ہیں۔ وہ لاٹھی بھی گیتا کے ساتھ اس کے سسرال چلی جائے گی پھر بھلا وہ کس کے سہارے چل سکیں گے؟

اِس لئے جو بھی رشتہ آتا اس میں مین میخ نکال کر اُسے ناپسند کر دیتے اور گیتا کو اس بات کا یقین دلاتے کہ وہ اس کے لئے کسی قابل لڑکے کی تلاش میں ہیں۔ اس کے لئے ایسا لڑکا ڈھونڈھیں گے جسے دیکھ کر ساری دُنیا ان کی پسند پر عش عش کرے گی۔ اور وہ لڑکا گیتا کی زندگی کو جنت بنا دے گا۔

اِسی طرح دِن مہینے سال گزرتے جا رہے تھے۔ گیتا کے لئے لڑکا ڈھونڈھنے کے نام پر انہوں نے کبھی کسی لڑکے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ نہ کبھی کسی لڑکے اور گیتا کا موازنہ کیا تھا۔

پتہ نہیں گیتا ان کی ان باتوں کو سمجھ پائی بھی تھی یا نہیں۔ کیونکہ گیتا کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن جب سے انہوں نے گیتا اور اشوک بابو کے تعلقات کے بارے میں سُنا تھا ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔

انہیں محسوس ہوتا وہ اور سرلا دیوی سنسان پتھریلے راستوں پر ضعیفی سے جھکی ہوئی کمروں کے ساتھ ہاتھ میں لاٹھیاں لئے دھیرے دھیرے آگے بڑھے جا رہے ہیں۔

اچانک ایک خوفناک شکل کا ڈاکو آتا ہے اور ان کے ہاتھ سے ان کی لاٹھیاں چھین کر چلا جاتا ہے۔ وہ ڈاکو اشوک بابو ہے۔ اب ان کے لئے کھڑا ہونا ہی مشکل ہے۔ وہ جانوروں کی طرح رینگ کر ان پتھریلے راستوں پر چل رہے ہیں۔ ان کے جسم نوکیلے پتھروں سے ٹکرا کر لہو لہان ہو رہے ہیں۔

اس تصور سے ہی وہ کانپ اُٹھتے تھے۔

لیکن آج گیتا نے جو فیصلہ سُنایا تھا انہیں محسوس ہو رہا تھا ان کے ہاتھوں سے اشوک بابو نے نہیں خود گیتا نے لاٹھیاں چھین لی ہیں۔

بے بسی سے وہ دیر تک گم صُم بیٹھے اس کے بارے میں سوچتے رہے پھر اٹھ کر گیتا کے کمرے میں آئے۔ گیتا پلنگ پر منہ کے بل لیٹی سسک رہی تھی۔

"بیٹی" پیار سے انہوں نے گیتا کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ گیتا نے آنسوؤں میں ڈوبے چہرے سے اُنہیں دیکھا اور اِن سے لپٹ گئی۔

پتاجی! میں جانتی ہوں۔ آپ کو اور ماں کو اس عمر میں سہارے کے لئے ایک لاٹھی کی ضرورت ہے جو میں ہوں۔ آپ اس لاٹھی کے بِنا ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ لیکن میں مجبور ہوں پتاجی۔ میری کمر خود اس راستے پر چلتے چلتے جُھک گئی ہے اور مجھے خود ایک لاٹھی کی ضرورت ہے وہ لاٹھی صِرف اشوک بابو ہی بن سکتے ہیں۔ اگر آج یہ موقع میرے ہاتھوں سے نکل گیا تو زندگی بھر اِن پتھریلے راستوں پر رینگ کر اپنے جسم کو لہولہان کر کے مجھے اپنی زندگی کا سفر طے کرنا پڑے گا کیوں کہ میرے بالوں میں چاندی چھلکنے لگی ہے۔

وُہ پیار سے گیتا کی پُشت پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ "تم ہماری پرواہ مت کرو بیٹی۔ ہمارے جیون کا تھوڑا سا راستہ بچا ہے۔ ہم اسے رینگ کر ہی پار کر لیں گے۔ لیکن تجھے ہماری وجہ سے جیون بھر رینگنا پڑے۔ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ تو اپنی لاٹھی تلاش کرے"۔

مشرف آغا

اُردو ڈرامہ کا المیہ

دیگر تمام اصناف قصص کی طرح ڈرامہ بھی حیات انسانی کے واقعات وحالات سے مربوط ہے۔ ڈرامے کے موضوعات بھی انسانی معاشرے کی سرگرمیوں سے ہی اخذ کئے جاتے ہیں۔ اور انہیں اسٹیج کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی ڈرامے کا قصہ واقعات کی بالفعل پیش کشی ہے۔ چونکہ ڈرامے کا قصہ اداکاری کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے اس لیے اس میں جسمانی اعضاء کے حرکات و سکنات کو بڑی اہمیت حاصل ہے ڈرامے کو قاری سے زیادہ ناظرین کی ضرورت ہے ڈرامے کے واقعات کی تراش وخراش اور پلاٹ کی تشکیل ایک خاص اہتمام کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔

ڈرامہ کو زبان وبیان کا مشکل ترین فن تصور کیا گیا ہے واقعات کی پیش کش کے اعتبار سے ڈرامے کا پلاٹ محدود ہوتا ہے ڈرامہ نگار کو وقت مقام اور عمل کی وحدتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ چونکہ ایک ڈرامہ تین چار گھنٹوں سے زیادہ دیر تک نہیں دیکھا جاسکتا اس لیے ڈرامہ نگار — — — — — — اس محدود وقفے کے اعتبار سے اپنے خیالات کی پیش کش میں بڑی مہارت کے ساتھ کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔ ناول نگار ہزاروں صفحات میں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے آزاد ہوتا ہے۔ جبکہ ڈرامہ نگار کے ذہن میں ہمیشہ یہ بات کھٹکتی رہتی ہے کہ اس کا ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے اور کوئی بھی ناظر ایک نشست میں تین چار گھنٹوں سے زیادہ نہیں بیٹھ سکتا لہٰذا اسے اپنے قصے کو کاٹ چھانٹ کر ایسا بنانا پڑتا ہے کہ وہ تین چار گھنٹوں میں دکھلا یا جاسکے ظاہر ہے کہ اس کے لیے ترقی یافتہ تخلیقی شعور کی ضرورت ہے۔ ناول نگار کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ جتنے کردار چاہے استعمال کرے۔ مثال کے طور پر دنیا کے چند

عظیم ترین ناولوں میں سے ایک جنگ وامن (لیو ٹالسٹائی) کو پڑھنے کے دوران قاری یہ بھول جاتا ہے کہ گذشتہ قصے میں کتنے کردار آچکے ہیں۔ کرداروں کے استعمال کی یہ آزادی ڈرامہ نگار کو میسر نہیں۔ ڈرامہ میں کرداروں کی بھیڑ بھاڑ اس کا نقص تصور کیا جاتا ہے۔ ناول نگار ایک ناول میں مختلف ادوار اور دنیا کے مختلف علاقوں اور ملکوں میں پیش آنے والے واقعات کو قلمبند کرسکتا ہے دوسری طرف ڈرامہ کا قصہ کسی خاص دور اور کسی خاص جگہ کے ہی واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔

افسانے کا قصہ ڈرامہ کے قصے سے بھی زیادہ اختصار کا حامل ہوتا ہے کیونکہ اس میں حقیقی زندگی کے محض ایک ہی پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے" ایڈگر ایلن پو نے آدھے گھنٹے سے دو گھنٹے کے درمیان پڑھ لیے جانے والے افسانے کو کامیاب مانا تھا۔ لیکن موجودہ دور میں اس وقفے کو گھٹا کر دس منٹ کردیا گیا ہے۔ کرداروں کی بھیڑ بھاڑ افسانے میں بھی نہیں ہوتی۔ افسانے کے کرداروں کی تعداد ڈراموں کے کرداروں سے بھی کم ہوتی ہے بلکہ موجودہ دور میں بغیر پلاٹ اور بغیر کردار کے بھی کامیاب افسانے لکھے گئے ہیں۔ یعنی ڈرامہ نگار کم و بیش افسانہ نگار کی ہی طرح وحدت عمل، وحدت زمان و مکان اور وحدت تاثر کے برتاؤ کا اہتمام کرتا ہے۔ ہاں وہ افسانہ نگار کی نسبت کچھ زیادہ آزاد ہوتا ہے۔ افسانے کی طرح ہی ڈرامہ کی کامیابی اور ناکامی بھی تاثر کی وحدت کے برتاؤ پر منحصر کرتی ہے۔

گویا ڈرامہ نگار تمام واقعات کو ایک ہی زمانہ میں رونما ہوتا ہوا دکھاتا ہے۔ مقام کے اعتبار سے بھی ڈرامہ نگار اپنے خیالات کا دائرہ محدود کرتا ہے۔ اس طرح ڈرامہ نگار وقت اور مقام کو محدود کرکے عمل کو منتشر ہونے سے بچاتا ہے۔ گرچہ قدیم ڈراموں میں یہ تینوں وحدتیں متحد نہیں کی جاسکی ہیں لیکن دور جدید میں ان تینوں وحدتوں کے برتاؤ نے ڈراموں کو زندگی سے قریب تر کردیا ہے۔ اب جدید ترین دور میں سائنس اور ٹکنیک سے میسر سہولیات کی وجہ سے یہ تینوں وحدتیں پھر توڑ دی گئی ہیں۔

ڈرامے کے قصے کو آگے بڑھانے کے لیے واقعہ طرازی کے دوران بے حد ارتباط و انبساط سے کام لینا پڑتا ہے واقعوں میں زندگی کا شعور بھی موجزن ہو اور ایسی جامعیت بھی ہو تاکہ ناظرین کسی عدم اطمینان میں مبتلا نہ ہوں واقعات کی ظہور پذیری کے لیے کرداروں کی مدد لی جاتی ہے۔ ناول اور افسانوں کے مقابلہ ڈرامہ کے کرداروں کے لیے یہ ایک ضروری شرط ہے کہ ان کے اندر اداکارانہ صلاحیت موجود ہوتا کہ وہ اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکیں چونکہ ڈرامائی واقعات کے ارتقاء کے دوران ڈرامہ نگار

بیانات کا سہارا نہیں لے سکتا بلکہ اعمال و حرکات کے مظاہرے سے ڈرامائی قصے کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس لیے ان کرداروں میں جتنی قوت عمل ہوگی ڈرامہ اتنا ہی کامیاب اور موثر بن سکے گا۔ اسٹیج پر ان تمام واقعات کی کامیاب پیش کش کی علامت یہ ہے کہ واقعات کے مرحلے پر تناؤ و تصادم کی کیفیت موجود ہو یہی عنصر ڈرامائی واقعات میں تجسس اور تحیر کی فضا قایم رکھتا ہے۔ ناظرین کی نگاہیں ہر لمحہ سوال کرتی ہوتی ہیں کہ "اب کیا ہوگا؟" اس طرح ڈرامہ کا قصہ توجہ طلب بن پاتا ہے۔

ان تمام عناصر کی پیش کش کے پس منظر میں ڈرامہ نگار کا اعلیٰ نصب العین ہوتا ہے انسانی قدروں کے فروغ کے مقصد سے ہی وہ ان تمام عناصر کو پیش کرتا ہے۔ انسانی زندگی کے حقائق کی پیش کش ہی ڈرامہ ہے۔ اس طرح ڈرامہ کے فنی لوازم کا اہتمام رکھتے ہوئے عمدہ خیالات کو ایک محدود دائرے میں پیش کر دینا ایک کار مشکل ہے اطہر پرویز اس کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں ڈرامہ کے فن کو پل صراط پر چلنے کا عمل سمجھتا ہوں یہاں توازن قایم رکھنا پڑتا ہے۔ دائیں بائیں دیکھ کر چلنا پڑتا ہے ڈرامہ وہ جن ہے جسے دبا کر بوتل میں بند کر دیا گیا ہے وہ جب نکلتا ہے تو اس کا قد دراز ہو جاتا ہے اور جسم پھیل جاتا ہے۔"

یوں تو ڈرامے کئی قسم کے ہوتے ہیں لیکن ارسطو نے اپنی کتاب بوطیقا میں اس کی دو اہم قسموں کا بیان کیا ہے۔ المیہ ڈرامے اور طربیہ ڈرامے۔ المیہ ایسے ڈراموں کو قرار دیا گیا ہے جن میں کردار کثرت سے رنج والم میں مبتلا ہوتے ہیں اور جن کا انجام المناک ہوتا ہے۔ المیہ ڈراموں کو ارسطو نے زیادہ اہمیت دی ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعہ ڈرامہ نگار خوف، رحم اور ہمدردی کے جذبات کو ابھارتا ہے ایسے ڈرامے انسانیت پسندانہ شعار کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف طربیہ ڈراموں کے کردار شروع سے آخیر تک نشاط و سرور کی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں بہر نوع اسٹیج کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے نہ المیہ ڈرامے لکھے جا سکتے ہیں اور نہ طربیہ۔

اردو ادب پر تین قدیم ادبیات کا نمایاں اثر ہے اوّل سنسکرت پراکرت ادب دوم عربی اور فارسی ادبیات اور سوم مغربی ادبیات۔ سنسکرت اور پراکرت زبانوں میں ڈرامے کی قدیم روایت موجود ہے۔ کالیداس اشو گھوش اور بھو بھوتی جیسے بلند پایہ ڈرامہ نگاروں نے قدیم ہندوستانی ادب کا دامن بھی متمول کیا اور ڈراموں کا ایک بیش بہا ذخیرہ فراہم کیا۔ دوسری طرف عربی و فارسی ادبیات میں ڈراموں کی روایت موجود نہیں۔ مغربی ادبیات میں قدیم یونانی ڈراموں سے لے کر جدید انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں ڈراموں کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ ہومر یو...

چوسر، شیکسپیئر، گوئٹے سے لے کر برنارڈ شا اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ تک کامیاب ڈرامہ نگاروں کی ایک لامتناہی صف موجود ہے۔ اس کے برعکس اردو ادب جو تمام اصناف میں کسی بھی ادب کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ایک بھی ایسا ڈرامہ نگار نہ پیدا کرسکا جو کالیداس اور شیکسپیئر وغیرہ کی صف میں کھڑا کیا جاسکے جب کہ اس میں ڈرامہ کی روایت ناول اور افسانے سے قدیم حیثیت رکھتی ہے۔

اردو میں ڈرامہ لکھنا کب سے شروع کیا گیا؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی تحقیق کے مطابق شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں گوا کے پرتگالی عیسائیوں نے پہلے پہل اردو زبان میں ڈرامے کھیلے تھے جس کا مقصد مذہب کی تبلیغ تھا۔ اس کے بعد آگرے میں گرجا گھر بنا جس میں انجیلی قصوں کی بنا پر ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مرہٹوں اور پارسیوں اور گجراتیوں نے بھی اردو اسٹیج کو اپنا کر تجارتی مقاصد کے تحت ڈرامے کھیلے۔ اسی عہد میں مذہبی، نیم مذہبی اور اخلاقی نوعیت کے ڈرامے بھی پیش کیے گئے۔ ایک قابلِ اعتماد روایت کے مطابق اردو کا پہلا باضابطہ ڈرامہ "راجہ گوپی چند اور جالندھر" ہے جس کے مصنف ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ تھے۔ یہ مذہبی نوعیت کا ڈرامہ تھا جسے ۱۸۵۳ء میں اسٹیج کیا گیا۔

کم و بیش اسی عہد میں لکھنؤ کے شاہی دربار میں بھی ڈرامے کھیلے گئے۔ واجد علی شاہ کے دربار میں یہ ڈرامے بڑے زور شور سے کھیلے جانے لگے۔ ان ڈراموں کا مقصد تفریح طبع کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ اس لیے ان ڈراموں میں ناچ اور گانوں کی بہتات ہوا کرتی تھی لاکھوں روپے کے صرفے پر حسین اور دلفریب مناظر کی تشکیل کی جاتی تھی اور حسن و عشق کی وارداتیں پیش کی جاتی تھیں۔

اس عہد کے تبلیغی اور تجارتی ڈراموں میں محض خیر و شر کا تصادم ہوا کرتا تھا اور شاہی دربار کے ڈراموں میں تفریح طبع کا سامان۔ ان تمام ڈراموں کا کینوس بہت محدود تھا۔ شاہی دربار سے ڈرامہ باہر آیا بھی تو اس کے رنگ میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا۔ عوامی مزاج کے مطابق مصنفوں کو ان میں زیادہ سے زیادہ ناچ گانے بھرنے پڑتے تھے۔ اس طرح ڈرامہ فکر و فن کی بلندی تک نہیں پہنچ سکا امانت لکھنوی کی "اندر سبھا" نے اس دور میں ملک کے ہر خطے اور ہر طبقے میں بے حد شہرت پائی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کی طرز پر متعدد ڈرامے لکھے گئے اور تمام عوام و خواص میں مقبول ہوئے لیکن ان ڈراموں میں ڈرامائی کیفیت سرے سے ناپید تھی۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "ان میں زندگی کی کشمکش بڑی سطحی انداز میں پیش کی ہوتی ملتی ہے۔ دراصل یہ رقص و موسیقی کی ہی توسیع کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں ڈرامائی عناصر اگر مفقود نہیں تو بہت کم تھے۔"

اس کے بعد ۱۸۸۵ء تک اردو ڈراموں

نے کوئی ارتقائی منزل طے نہ کی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ آرام نے شیکسپیئر کے ڈراموں کا چربہ اتار کر اردو اسٹیج کو کچھ تبدیل کرنے کی کاوشیں کیں۔ ۱۸۸۵ء سے اردو ڈرامے کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے لیکن اب بھی یہ تہذیبی زندگی سے دور تھا۔ اس لیے باصلاحیت فنکار ڈرامے کی تصنیف سے ہچکچاتے تھے۔ اس دور میں رونق بنارسی کے ڈرامے "عاشق کا خون" "فریب فتنہ" اور "انجام الفت" ظریف کے ڈرامے "نیرنگِ عشق" "فتنہ خانم" "خدا دوست" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ طالب بنارسی نے ڈراموں میں اردو گانوں اور مکالموں کے استعمال سے ایک نیا حسن پیدا کیا۔ "ہریش چندر" "لیل و نہار" "خزانۂ غیب" "کرشمۂ قدرت" وغیرہ ان کے مقبول ڈرامے ہیں۔

ایک طرف اردو ڈرامہ سطحی زندگی کی عکاسی تک محدود رہ کر بے شمار دشواریوں کے دور سے گذر رہا تھا تو دوسری طرف انگلستان میں برنارڈ شا جیسے ڈرامہ نگار اپنے جدید اور بلند نقطۂ نظر سے زندگی کی حقیقی اور واضح عکاسی ڈراموں کے ذریعے پیش کر رہے تھے۔

اردو ڈرامے کا تیسرا دور ۱۸۹۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں اردو ڈراموں نے ترقی کے چند زینے طے کیے مگر فکر و خیال کی پستی برقرار رہی۔ تاریخی یا غیر فطری پس منظر میں سستی رومانیت کے کاروباری ڈرامے پارسی اسٹیجوں سے پیش کرکے متوسط طبقے کی تفریح کا سامان کیا جاتا تھا۔ اس دور کے ڈرامہ نگاروں میں آغا حشر کاشمیری کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ آغا حشر کاشمیری سے پہلے ڈرامے منظوم ہوا کرتے تھے۔ آغا حشر کاشمیری نے ڈراموں کو اس عیب سے بہت حد تک پاک کر دیا۔ آغا حشر کاشمیری نے اسٹیج کی دلچسپیوں کے ساتھ ڈرامے کی ادبی حیثیت کا بھی خیال رکھا ان کے بعد ہی اردو میں ڈراموں کی ادبی حیثیت تسلیم کی جانے لگی "خوبصورت بلا" "یہودی کی لڑکی" "رستم و سہراب" وغیرہ ان کے مشہور ڈرامے ہیں بلکہ یہی چند ڈرامے اردو ڈراموں کا عظیم سرمایہ ہیں۔

چوتھے دور میں "ٹیپو سلطان" "تلوار کا دھنی" اور "مادر وطن" جیسے ڈرامے لکھے گئے لیکن یہ تمام خالص کاروباری تھے۔ ان میں فنی حیثیت سے ڈرامے کا کوئی ارتقا نظر نہیں آتا۔

پانچواں دور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۶۰ء کا ہے۔ اس دور میں امتیاز علی تاج کا ڈرامہ "انارکلی" پریم چند کا "کربلا" اور پنڈت کشن چند زیبا کا "انقلاب زندہ باد" وغیرہ ڈرامے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی زمانے میں سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبانوں سے اردو میں ڈراموں کے کامیاب ترجمے کیے۔ سید عابد حسین نے بھی جرمن زبان سے گوئٹے کے ڈراموں کے ترجمے کیے۔ اسی دور میں اوپندر ناتھ اشک نے اپنے ڈراموں میں فن و فکر کی بلندی کے ساتھ کرداروں کی پیچیدہ نفسیات

کی عکاسی کی۔ راجندر سنگھ بیدی نے بھی چند ڈرامے لکھے۔ اس کے علاوہ سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری، ساغر نظامی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ ادیبوں نے متعدد ڈرامے لکھ کر اردو ادب کے ذخیرہ میں بھی اضافہ کیا اور اس فن کو خالص کاروباری لوگوں سے بھی نجات دلائی۔ اب اس کی طرف باشعور سنجیدہ ادیبوں نے توجہ دینی شروع کی لیکن تب تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ فلمی صنعت زور پکڑ چکی تھی اس لیے یہ ڈرامے ایک خاص طبقے میں ہی مقبول ہوئے۔

۱۹۶۰ء کے بعد بھی مصنفوں نے اس فن کو جلا بخشی ان میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر محمد حسن کا ہے جن کا تحریر کردہ ڈرامہ "ضحاک" اس دور کا بہترین ڈرامہ تصور کیا جاتا ہے۔ ایمرجنسی کی فضا میں لکھے ہوئے اس ڈرامہ میں حکمراں طبقے کے ظلم و استبداد کی حقیقی منظر کشی کی گئی ہے۔ "موم کے بت" "پیسہ اور پرچھائیاں" "فٹ پاتھ کے شہزادے" وغیرہ ان کے دیگر عمدہ ڈرامے ہیں۔ اس عشرے کے آغاز میں ظہیر انور کے دو ڈرامائی مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے نام "انگاروں کا شہر" اور "صلیب" ہیں۔ مصنف نے ان ڈراموں میں نئی روش اختیار کرنے کی جرأت کی ہے۔ یہ ڈرامے اردو ڈرامے کے خوش آئند مستقبل کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ کمال احمد کے "دو ڈرامائی تجربے" اور "کشکول" بھی اردو ادب کا دامن متمول کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ وارث احمد خان اور دیگر ڈرامہ نگار بھی سرگرم تحریر نظر آتے ہیں۔ تاہم اردو ڈرامہ ابھی ہماری خصوصی توجہ کا محتاج اور مستحق ہے۔

راجیندر کمار موج

غزل



دِل میں بندوں کے بہت خوفِ خدا تھا پہلے
یہ زمانہ کبھی اِتنا نہ بُرا تھا پہلے
ایک اِنسان سے بے وجہ ہو اِنسان کو بیر
یہ وتیرہ کبھی دیکھا نہ سُنا تھا پہلے
قومی یک جہتی کا آدرش تھا یہ بھارت ورش
ہم نے پیغامِ وِلا سب کو دیا تھا پہلے
بادشاہ اَور گدا سب کے برابر تھے حقوق
دنیا میں کوئی بھی چھوٹا نہ بڑا تھا پہلے
راست گوئی تھی یہاں غیر مقفل تھے مکان
دیش میں ایسا بھی اِک دَور رہا تھا پہلے
دیش میں پھر سے محبت ہو رواداری ہو
کاش آجائے زمانہ جو رہا تھا پہلے
مَوج زن رہتا تھا طوفانِ اخوت اے مَوج
دِل میں طوفان محبت کا بپا تھا پہلے

کنول پانی پتی

نئے دَور کی سوغات

فوجی خدمات سے سبکدوش ہو کر میں نے شہر میں کوٹھی بنوالی۔ کچھ سال پہلے یہ زمین بنجر تھی۔ جس پر جنگلی جھاڑیاں اور پیڑ تھے۔ میرے پلاٹ میں بھی ایک نیم کا پیڑ تھا جو اب ایک قدآور درخت بن گیا تھا۔ تمام بنجر زمین ایک جدید اور خوبصورت کالونی میں تبدیل ہو چکی تھی لگ بھگ سبھی کوٹھیوں میں پھولوں سے آراستہ و پیراستہ باغیچے تھے۔ میں نے اپنی کوٹھی کا باغیچہ نیم کے پیڑ ہی کی جانب رکھوایا تھا۔ صبح ہوتے ہی پچاسوں کوّے اسی نیم پر آکر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ سب ادھر اُدھر تانک جھانک کرتے رہتے تھے۔ بولتے بہت کم تھے صرف بار بار آنکھیں مٹکاتے رہتے تھے۔ دُور کسی چھت پر اگر کوئی کھانے کی چیز نظر آتی تو اسے جا اُچکتے تھے۔ اکثر چھینا جھپٹی میں لڑ پڑتے تھے۔ شاخوں پر الگ الگ ہی بیٹھتے تھے۔ اگر کوئی شکاری پرندہ آجاتا تو پتوں میں چھپ جاتے تھے۔ یہ کبھی اکٹھے نہیں ہوتے تھے۔ شام ہوتے ہی ادھر اُدھر اُڑ جاتے تھے۔

مجھے یہ نیم کا درخت اور کوّے دونوں پسند تھے۔ میرا کافی وقت اسی کے نیچے گزرتا تھا۔ میری بیوی میرے اس طریق سے بدظن تھی۔ وہ اس درخت کو کٹوا دینا چاہتی تھی۔ اسے نہ نیم پسند تھا نہ کوّے۔ اکثر وہ مجھ پر طنز کرتی رہتی تھی۔

"نہ جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک تو یہ نیم کا دقیانوسی درخت اور اس پر منحوس پرندے!"

اس کا کہنا تھا کہ کالونی کی تمام کوٹھیوں میں جدید قسم کے باغیچے ہیں۔ میں ہوں کہ پرانی قدروں سے چمٹا بیٹھا ہوں۔ مجھے نیم اور کوّوں سے لگاؤ کیوں تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ گاؤں کے جس مکان میں میرا بچپن گزرا تھا، اس کے صحن میں دادا پردادا کے وقتوں کا بہت بڑا نیم کا درخت تھا۔ اپنی عمر

گے بچوں کے ساتھ میں اس کے نیچے کھیلتا رہتا تھا۔ موسم بہار میں اس پر بے شمار ننھے ننھے پھول آتے جن سے بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف بکھر جاتی۔ ساون کے مہینے میں جھولے ڈلتے۔ گاؤں کی چھوکریاں جھولنے آتیں۔ مجھے یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا۔ لطف کی بات یہ ہے میری شہری کوٹھی کی طرح اس پر بھی صبح ہوتے ہی سینکڑوں کوّے آدھمکتے۔ شاخوں پر ادھر اُدھر پھدکتے، خوب کائیں کائیں کرتے۔ اکٹھے ہی کھیتوں میں اُڑ جاتے اور دانہ دُنکا چُگ کر واپس آجاتے۔ اگر کوئی چیل یا باز اُن پر حملہ آور ہوتا تو سب کے سب مل کر اُسے مار بھگاتے۔ اندھیرا ہوتے ہی گروہ کی شکل میں اُڑ جاتے اور اگلے دن سے پھر وہی سلسلہ جاری ہوجاتا۔

حالانکہ میری کوٹھی میں جدید طرز کے دلچسپی کے ذرائع یعنی ٹیلویژن وغیرہ موجود تھے مگر نیم کا درخت مجھے روحانی تسکین دیتا تھا۔ میرا بچپن لحظہ لحظہ اس سے منسلک تھا۔ اس سب کے باوجود میرے دماغ میں ایک سوال بار بار اُٹھتا رہتا تھا کہ میرے بچپن کے ساتھ جُڑے ہوئے ان گاؤں کے کوؤں اور ان شہر کے کوّوں کی عادات میں اتنا فرق کیوں ہے۔ حالانکہ نفسیاتی نکتہ نگاہ سے ایک قسم کے پرندوں کے خصائل میں فرق نہیں ہوتا خواہ وہ شہر کے ہوں یا گاؤں کے۔ نزدیک کے ہوں یا دور کے۔ اس اُلجھن کا مجھے معقول جواب نہیں مل رہا تھا۔

جون کا مہینہ تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ میں کھانا کھانے بیٹھا ہی تھا کہ میرے کانوں میں کسی عورت کے چیخنے چلانے اور "بچاؤ بچاؤ" کی کربناک آواز آئی۔ میں فوراً ہی اس جانب چل دیا۔ میری کوٹھی سے چند گز آگے ایک مکان سے یہ آواز آرہی تھی۔ یہ مکان کافی بڑا تھا مگر صرف ایک منزلہ۔ باؤنڈری وال کا گیٹ اندر سے بند تھا۔ میں دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ لان سے آگے صرف تین کمرے تھے۔ آواز درمیان والے کمرے ہی سے آ رہی تھی جو اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازہ تھپتھپایا۔ نہ کھلنے پر میں نے زور سے لاتیں لگائیں تو دروازہ دھڑام سے کھل گیا۔ اندر کا نظارہ دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔ ایک بدشکل سا ہٹا کٹا نوجوان۔ ایک ہاتھ میں چھرا اور دوسرے سے ایک عورت کا گریبان پکڑے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب لپکا۔ میرے لئے تو یہ بچوں کا کھیل تھا۔ میں نے اُس کا چھرے والا بازو پکڑ لیا اور اتنی شدت سے مروڑا کہ چھرا دور جا گرا۔ میں نے خوب لاتوں اور گھونسوں سے اُس کی مرمت کی۔ اب وہ بے بس ہوچکا تھا اور میرے پیروں پر گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔ عورت ادھیڑ عمر کی تھی۔ وہ لگ بھگ نڈھال ہوچکی تھی۔ مگر اب اسے راحت مل چکی تھی اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ اکیلی رہتی ہیں۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان میں جواب دیا کہ اس کا نوجوان لڑکا اور بہو بھی اپنے دو بچوں سمیت وہاں رہتے ہیں۔ اور اس روز سویرے کی موٹر سے ہردوار گئے ہیں۔

میں نے اس نوجوان چور کو ڈانٹا تو اس نے جلدی ہی سب کچھ اُگل دیا۔ دراصل وہ ایک رکشا چالک تھا۔ ایک دوسرے رکشا والے سے اس کی دوستی تھی۔ جو عادی چور تھا۔ اُسی کی رکشا سے اس عورت کا لڑکا بس تک گیا تھا۔ وہ مجھے بار بار کہہ رہا تھا "حضور میں چور نہیں ہوں۔ میں نے پہلے کبھی ایسی کوشش نہیں کی۔ مجھے تو رام بھیج رکشا والے نے یہ سب سکیم بتائی تھی ر[illegible] دوست ہے اور یہ چھرا بھی اسی کا ہے۔ میرا اس عورت کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ دھمکا کر نقدی اور زیور اڑانے کا تھا۔ اس میں رام بھیج کا بھی حصہ تھا"۔ میں اسے گھسیٹ کر باہر لان میں لے آیا۔ عورت اب بالکل نارمل ہوچکی تھی۔ وہ بار بار مجھے چھوڑ دینے کے لئے التجا کر رہا تھا۔ میں بدستور اُس پر چلا رہا تھا۔ اُس مکان کے دائیں بائیں اور پیچھے تین تین منزلہ کوٹھیاں تھیں۔ یکایک میری نظر جب ان پر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سب کی چھتوں پر آٹھ آٹھ دس دس اشخاص کھڑے ہیں۔ جن میں بوڑھے جوان عورتیں اور بچے بھی تھے۔ وہ سب کے سب خاموشی سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ جیسے میں کوئی مداری ہوں اور بھان متی کا تماشہ دکھا رہا ہوں۔ وہ آپس میں ہلکے پھلکے اشارے ضرور کر رہے تھے۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کے سب گونگے اور بہرے ہیں۔ سب کے سب اپنی آنکھیں

مٹکا رہے تھے۔ کسی کسی کے ہونٹوں پر ہنسی بھی متحرک رہی تھی
میں نے محسوس کیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ ربڑ یا لکڑی کے پتلے ہیں
انسانی جذبات سے خالی۔ احساس سے عاری۔ دورِ جدید
کے انسانی بت۔

چور کو پولیس کے حوالے کر کے میں واپس لوٹا تو
میری بیوی بڑی بے صبری سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ بچپن کی یادیں
ایک ایک کر کے میرے ذہن میں ابھرنے لگیں۔ گاؤں میں جب
کوئی کبھی بیمار ہوتا تھا تو امیر ہو یا غریب۔ چھوٹا ہو یا بڑا۔
چھوت یا اچھوت سب کے سب اس کی خبر گیری کرتے۔
رات کو اکٹھے ہوتے تو ایک دوسرے کا حال چال پوچھتے۔
کوئی راہ گیر گاؤں سے گذرتا تو اس کو ستانے کو کہا جاتا اور
لسی پانی سے اس کی مدارات ہوتیں۔ مجھے ایسا محسوس ہونے
لگا جیسے کالونی کی بڑی بڑی کوٹھیاں، فیشن ایبل لوگ، عمدہ
عمدہ باغیچے میرا منہ چڑا رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں " ہو
نہ نرے دقیانوسی۔ ابھی تک گاؤں کے بچپن کو سینے سے
لگائے پھرتے ہو۔ جانتے نہیں یہ دورِ جدید ہے۔ جو اونچے
شہریوں کی امارت ہے۔ اتنے دن شہر میں رہ کر جدید نہ بن
سکے۔ جدید وہ ہے جو دیکھتا تو ہے۔ مگر اپنے آپ کو۔
سنتا ہے تو صرف اپنے مطلب کی بات۔ کھاتا ہے تو محض
اپنے پیٹ کے لئے۔ گھومتا ہے تو اپنے ہی چاروں طرف
جیسے ایک لٹو۔

میں نیم کے درخت کے نیچے گیا۔ اسے نیچے سے
اوپر تک دیکھا۔ مالی کو بلایا اور کہا کہ اسے ابھی کاٹ
ڈالو۔ میری بیوی یہ سب دیکھ کر خوش ہو گئی اور حیران بھی
ابھی تک یہ فیصلہ اس کے اور میرے درمیان اٹکا ہوا ہے
کہ وہ راہ راست پر تھی یا میں۔ البتہ مجھے اپنے دیرینہ سوال
کا جواب ضرور مل گیا تھا کہ ارتقا نے نفسیات کے اصولوں
کے اعتبار سے پرندوں کو بھی انسان کے برابر کر دیا ہے۔

غزل

عرش صہبائی



دھوپ میں سایۂ شجر ہوں میں
اک فسانۂ مختصر ہوں میں

اپنی مستی میں ڈوب جاتا ہوں میں
مطمئن خود سے کس قدر ہوں میں

میری فطرت کو کون سمجھے گا
دھول ہوں۔ اوس ہوں۔ شرر ہوں میں

کس قدر ہیں وہ ہم مزاج مرے
جن حوادث کا ہم سفر ہوں میں

کوئی منزل نہیں نگاہوں میں
جیسے اک طے شدہ سفر ہوں میں

آپ ہی خود کو زخم دیتا ہوں
آپ ہی اپنا چارہ گر ہوں میں

عرش جن سے مجھے گزرنا ہے
ان مراحل سے باخبر ہوں میں

نورالحسنین

رنگوں کے اسیر

کلچرل کمپلیکس کی تعمیر کا کنٹریکٹ سائن کر کے جونہی میں باہر نکلا تو وہ مجھے دیکھ کر طنزیہ مسکرانے لگا۔ میں نے اُس کی طرف حقارت اور غصّے سے دیکھا لیکن وہ بڑا ہی بے غیرت ہے اُس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہیں ہوتا چنانچہ اس کے چہرے پر اب بھی ویسا ہی طنز موجود تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور پھر آہستہ سے بولا "دوست کیوں اپنی شکھی جان کو دکھ میں ڈال رہے ہو، یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔" یہ تو وقت ہی بتلائے گا ۔۔ !"

" وقت ۔۔۔ ؟" اس نے قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔ " خیر میں تمہاری خاطر اس وقت کا بھی انتظار کر لوں گا لیکن سنو ۔۔۔ تم وقت سے پہلے ہی بھاگ نکلوگے !"

میں نے سگریٹ سلگالی۔ دو ایک لمبے کش لئے۔ اپنے ارادوں کا جائزہ لیا لیکن مجھے کہیں بھی کوئی کمزوری نظر نہ آئی۔ اس کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی فائل کو کھولا اور پھر میری چشم تصوّر میں کاغذ کی سطح سے سنگ بستہ دیواریں بلند ہونے لگیں ۔۔۔ خوشی کے مارے میں جھوم اٹھا اور پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑا ۔۔۔ وہ شاید وہیں رُک گیا تھا۔ نہیں شاید میرے ساتھ ہی چل رہا تھا، نہیں شاید کہیں غائب ہوگیا تھا۔

کاغذی تیاریوں کے بعد میں جلد از جلد تعمیری کام کی شروعات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جانے کیوں اِس تصوّر کے ساتھ ہی مجھ پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔ عجیب سے وسوسے مجھے اپنے نرغے میں لے لیتے تھے اور میں سوچنے لگتا کہ کیا میں اس عظیم کلچرل کمپلیکس کی تعمیر کر پاؤں گا ؟ یا میرا حشر بھی وہی ہوگا جو مجھ سے پہلے اور ٹھیکیداروں کا ہو چکا ہے کیا میں بھی ایک دن ان ہی کی طرح کام چھوڑ کر بھاگ نکلوں گا ؟

" وہ تو ایک روز ہوگا ہی ۔۔۔ !" پتہ نہیں کیسے وہ آئینے میں در آیا تھا اور میری طرف بے حجابانہ دیکھتے ہوئے کہے جارہا تھا۔" تم کیا سمجھتے ہو ۔۔۔ تم سے پہلے آنے والے کنٹریکٹر بودے تھے ؟ کمزور تھے ؟ ان میں کام کرنے کی صلاحیت نہ تھی ۔۔ ؟ سب کچھ تھا ان میں، لیکن پھر بھی وہ بھاگ نکلے تم بھی ایک دن ایسا ہی کروگے ۔۔ تمہارا حشر بھی وہی ہوگا!"

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میرا جی بے اختیار چاہا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں لیکن میں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اُسے بتلانے لگا۔" سنو ۔ مجھ سے پہلے آنے والے ٹھیکیدار بودے نہ سہی، کمزور نہ سہی، لیکن پھر بھی اُن میں وہ صلاحیت اور تجربہ نہ تھا جو اس کمپلیکس کی تعمیر کے لئے چاہئے تھا۔ میں نے ان کی کمزوریوں سے بہت کچھ

سیکھا ہے، اور پورے شعور کے ساتھ میں اس میدان میں آیا ہوں۔ مَیں کامیاب ہوکر ہی رہوں گا۔"

اُس کے چہرے پر پھر ایک بار طنز اُبھر آیا۔ وہ بولا "یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔ اب تمہیں کیا بتاؤں۔ کتنی کتنی پُر اعتماد پیشانیاں میں نے ان ٹھیکیداروں کے چہروں پر دیکھی تھیں لیکن نتیجہ کیا نکلا ــ؟ وہ آخر بھاگ نکلے ــ کلچرل کمپلیکس کی تعمیر ادھوری چھوڑ کر ہی بھاگ نکلے ــ اچھا بتاؤ ــ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کبھی سوچا ہے تم نے اس پہلو پر ــ؟"

مَیں نے گردن نیچے جھکا دی تو وہ بولا: "لیکن میں جانتا ہوں اس کی وجہ ــ!" اور پھر وہ میرے بہت ہی قریب آ گیا اور مجھ سے پوچھنے لگا، "کیا تم اس راز کو جاننا چاہو گے ــ؟"

مَیں نے اقرار میں گردن ہلائی تو وہ کہنے لگا۔ "اس کلچرل کمپلیکس کی تعمیر کا جو بھی بیڑہ اُٹھاتا ہے موت اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہے۔ اس کا سکون برباد ہونے لگتا ہے بے چینیاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں ــ اور مَیں تو پہلے ہی دن سے تمہارے چہرے پر پریشانیاں دیکھ رہا ہوں مجھے اپنا دشمن نہ سمجھو ــ میں تو تمہارا دوست ہوں، تمہارا بھلا چاہتا ہوں۔ باز آ جاؤ اپنی ضد سے ــ!"

"لیکن ــ؟؟؟" ابھی میں کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک میری بیوی آ گئی اور وہ پھرتی سے غائب ہو گیا۔ مَیں نے بیوی کی طرف دیکھا تو اور پریشان ہو گیا۔ کیونکہ اس کے چہرے پر عجیب سی بوکھلاہٹ نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ میں نے اُس سے اس کیفیت کا سبب پوچھنا چاہا لیکن قاصر رہا۔ جب وہ خود ہی اپنے جذبات پر قابو پا چکی تو کہنے لگی۔ "اس کمپلیکس کی ٹھیکیداری چھوڑ دیجئے۔"

مَیں نے اُس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کہنے لگی، "ساری بستی کہہ رہی ہے کہ وہ جگہ منحوس ہے جان کی قربانی لیتی ہے ورنہ بار بار گِر جاتی ہے اور محض اسی وجہ سے تعمیر نہیں ہو پاتی۔ اب تک کتنے ہی ٹھیکیدار جان گنوا چکے ہیں۔"

اس کی باتوں کو سُن کر اگرچہ میں اندرونی طور پر خاصا پریشان ہو گیا تھا بلکہ خوف زدہ بھی۔ لیکن پھر بھی میں اپنی اس کیفیت کو اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اُسے دلاسہ دینے لگا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں تو حاسدوں کی اڑائی ہوئی ہیں ــ کیا تم اپنے شوہر کے ہاتھوں ایک عظیم کام کی تکمیل نہیں چاہتی ــ؟"

میری باتیں سُن کر وہ چپ ہو گئی لیکن اب بھی اُس کے چہرے پر اطمینان بحال نہیں ہوا تھا۔

رات جیسے جیسے بڑھتی جا رہی تھی میری بے اطمینانی بھی ویسے ویسے ہی بڑھ رہی تھی۔ میں عجیب سی کشمکش میں اُلجھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی سوچنے لگتا کہ واقعی مجھے اس کام کو چھوڑ دینا چاہیئے، لیکن چھوڑوں کیسے؟ میرے اطراف تو ایک بہت بڑا حصار ہے اور میں اس حصار کے باہر ان چہروں کو خوب پہچان رہا ہوں جو منتظر ہیں کہ کب میں ناکام ہو کر ان کی صف میں آ کر شامل ہو جاتا ہوں۔ مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگتی ہے۔ پھر یہ بے چینی رفتہ رفتہ گھبراہٹ کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے۔ میں پریشان ہو کر گیان بابا کی کٹیا کی طرف بھاگ نکلتا ہوں کیونکہ جب جب بھی میں ذہنی طور پر مغلوب ہونے لگتا ہوں تو ان ہی کے چرنوں میں پناہ ڈھونڈنے لگتا ہوں۔ بابا ایک بڑے صوفی منش ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تیاگ کر شہر سے دور ایک کٹیا میں جا بسے ہیں۔

جب میں بابا کی کٹیا میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ بابا میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ "بابا ــ بابا ــ بابا کیا سو گئے ہو؟"

بابا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ میری طرف حیرت سے دیکھا اور پھر اُٹھتے ہوئے بولے: "جب انسان طمع اور خواہشات پر قابو پا لیتا ہے تو اُسے خود بخود میٹھی نیند آنے لگتی ہے۔"

میں اُن کے پائنتی بیٹھ گیا۔ بابا نے پھر ایک بار میرے

پریشان چہرے کی طرف دیکھا اور بولے "بیٹا — پریشانیاں انسان کو پریشان کرنے کیلئے نہیں آتیں — بلکہ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب ایشور انسان کو اعتماد کی کسوٹی پر کستا ہے۔"

"بابا میں نے کلچرل کمپلیکس کی تعمیر کا کنٹریکٹ لیا ہے۔"

"جب لے لیا ہے تو پھر پریشانی کیسی — ؟" بابا کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"لیکن بابا اُس سے متعلق پھیلی ہوئی افواہیں ؟"

انہوں نے میری طرف شفقت بھری نظروں سے دیکھا

"تو تم بھی ان افواہوں پر یقین کرتے ہو ؟ ارے بیٹا — اگر کام میں سچائی ہو، پختگی ہو تو بھلا وہ کیوں کر گر سکتی ہے ؟ اتنا یاد رکھو — کوئی جگہ منحوس نہیں ہوتی۔ کوئی مقام جان کی قربانی نہیں لیتا — ہاں موت برحق ہے اور وہ یقیناً آئے گی — !"

بابا کی باتیں سُن کر میرا اطمینان بحال ہوگیا۔ اب میرے اطراف کسی قسم کے وسوسے نہ تھے۔ میں اپنے آپ کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر کمپلیکس کا پلاٹ اُبھر آیا اور میں اپنے گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن میں سیدھا ایگزیکٹو انجنیئر کے آفس پہنچا اور اس سے پوچھا کہ جناب آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے جس کے باعث مجھ سے قبل اس کمپلیکس کا ٹھیکہ لینے والے کنٹریکٹر اسے مکمل نہ کر سکے اور کام کو ادھورا چھوڑ کر ہی بھاگ نکلے ؟

میری طرف دیکھ کر ایگزیکٹو انجنیئر یوں مسکرایا جیسے شوریدہ بچے چوہے دان میں پھنسے چوہے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں "جناب اس عمارت کی تعمیر کا کنٹریکٹ لینا اپنے آپ کو بدنام کروانے کے برابر ہے۔"

میں نے پھر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اُس نے تفصیلی انداز میں بتانا شروع کیا۔ "سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ کلچرل کمپلیکس کا پلاٹ ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جس کے اطراف بے شمار ایجنسیاں اپنے اپنے تعمیری کاموں میں مشغول ہیں جو ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ کمپلیکس تیار ہو — کیونکہ اگر یہ تعمیر ہوگیا تو پھر ان کی اپنی تیار کردہ عمارتیں ایکدم پھیکی پڑ جائیں گی اس لئے وہ ہر طرح سے اس کی تعمیر میں روڑے اٹکاتے ہیں۔"

"تو کیا ان پر نظر نہیں رکھی جا سکتی — ؟"

"رکھی تو جا سکتی ہے — لیکن وہ بذاتِ خود کبھی کچھ نہیں کرتے بلکہ ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ تمہارے اپنے آدمیوں کے ذریعے کرواتے ہیں۔ اب تم کہو گے کہ کیا اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا ؟ تو میں کہوں گا — پایا تو ضرور جا سکتا ہے لیکن اس کمپلیکس کا رقبہ بہت بڑا ہے اس لحاظ سے کام بھی بکھرا ہوا ہے۔ آدمی کس کس حصے پر اور کس کس پر نظر رکھے گا؟ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے اور مجبوراً کنٹریکٹر رسوا ہو کر بھاگ نکلتا ہے — اب تم آئے ہو۔ دیکھیں تم بھی — !"

اس نے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا لیکن میرے چہرے پر بھرپور طمانیت تھی۔ ایک ارادہ تھا، ایک فیصلہ تھا۔ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میرے لئے یہ چیزیں بہت ہی معمولی ہیں۔ میں یہ بات خوب سمجھتا ہوں کہ کام کس طرح کروایا جا سکتا ہے۔ اور ان ایجنسیوں پر کس طرح نگاہ رکھی جا سکتی ہے۔"

میں اس کے آفس سے اُٹھ آیا اور پھر جونہی باہر نکلا تو وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن اس بار طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر نہیں بلکہ میرے چہرے پر تھی۔

میں نے اپنے اعتماد کے آدمی جمع کئے اور اُن آدمیوں پر خفیہ طور پر کچھ اور آدمی متعین کئے اور پھر کلچرل کمپلیکس کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ مجھے یاد ہے اُس روز آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں اور نیچے مزدور اپنے اپنے مذہبی نعرے لگا رہے تھے۔ میں اچھا خاصا مطمئن تھا کہ اچانک وہ وارد ہوگیا۔ خطرے کی گھنٹی میرے دماغ میں بجنے لگی۔ میں ایک بار پھر وسوسوں کا شکار ہوگیا۔ وہ میری کیفیت کو بھانپ چکا تھا۔ چنانچہ بےخوف میرے نزدیک پہنچ گیا اور مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے بولا۔ "تو تم باز نہیں آئے — ؟"

"کیول اپنی سنکی جان دُکھ کے الاؤ میں گھسیٹ رہے ہو — میں تمہارا دوست ہوں — دشمن نہیں — میری باتوں

پر یقین کرو ـــــ تم کامیاب نہیں ہو سکتے ـــ !"
میں اندر ہی اندر ٹوٹتا جا رہا تھا یہاں تک کہ گھبراہٹ کے مارے میں بھی چیخ اٹھا" .... !"
میری چیخ کے ساتھ ہی مبارک سلامت کا شور بلند ہو گیا۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو کیا ہے۔ وہ بڑا شہتیر اپنی جگہ پر بالکل صحیح طریقے سے نصب ہو چکا تھا۔ اب میری باری تھی اُس پر طنز کرنے کی۔ لیکن وہ تو کب کا بھاگ چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ناریل پہ ناریل پھوڑے جا رہے تھے اور اب بھی وقفے وقفے سے نعرے گونج رہے تھے۔
یہ میری پہلی کامیابی تھی اور اس کے ساتھ ہی کلچرل کمپلیکس سے متعلق پھیلی ہوئی تمام افواہیں وہیں کہیں گہرے کنوئیں میں ڈوب گئیں۔ میں نے فخریہ انداز میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں

کونپلیں نکلنے والی ہوں ـــ یہ کونپلیں ہی تو مستقبل کی امین ہوتی ہیں"
میری اس گفتگو کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور پھر وہ چپ چاپ صوفے میں دھنس گئی اور کچھ سوچنے لگی۔ میں اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور کلچرل کمپلیکس کے پلاننگ میپ (Planning map) پر جھک گیا اور اگلے کام کی نوعیت اور طریقۂ کار پر سوچنے لگا۔
دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ کلچرل کمپلیکس کی عمارت آہستہ آہستہ تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی اور اس کے اطراف بکھری ہوئی تمام ایجنسیاں شش و پنج تھیں۔ ان کی تمام تر کارستانیاں ناکام ہوتی جا رہی تھیں۔ میرا عملہ پوری طرح مستعد تھا اور اپنے کام میں جٹا ہوا تھا۔ میں بھی تو ہر چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں خود

"اگر ہم شراب اور دیگر نشیلی اشیاء کی عادت کے شکار بنے رہے تو ہماری آزادی بھی غلاموں کی آزادی کے برابر ہی ہوگی۔"
ـــــ مہاتما گاندھی

مجھے لگا جیسے پوری عمارت تعمیر ہو گئی ہے ـــ میں خوشی خوشی گھر کی طرف لوٹ پڑا۔ اور جونہی یہ مژدہ اپنی بیوی کو سنایا تو وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی اس کا سارا بدن تھرتھرانے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیا کہوں ـــ رفتہ رفتہ وہ خود ہی سنبھلتی گئی۔ پھر اس نے میرے سینے سے اپنے چہرے کو اوپر اٹھایا اور میری طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے آج کے بعد یا تو وہ مجھے دیکھ نہ پائے گی ـــ یا پھر میں اُسے اس کے بعد نظر نہ آؤں گا۔ میں نے پوچھا" ایسے کیا دیکھ رہی ہو" وہ بولی" تمہارے چہرے کا رنگ کیوں بدلا ہوا ہے؟"
میں نے بڑے خلوص سے اس کے کاندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور پھر مدھم لہجے میں کہنے لگا" گیانی بابا کہتے ہیں کہ جب بارش ہونے والی ہوتی ہے تو آسمان کی رنگت بھی بدل جاتی ہے ـــ لیکن اس وقت ہمیں آسمان سے گرنے والی بوندوں کو نہیں ـــ بلکہ دھرتی کے اُن حصّوں پر نظر رکھنی چاہیئے جہاں

کو شریک رکھتا تھا۔ ایک جنون سوار تھا مجھ پر۔ میں بس رات دن یہی سپنے دیکھتا تھا کہ جیسے وہ عمارت پوری پختگی کے ساتھ تعمیر ہو گئی ہے۔
چنانچہ میری مسلسل جانفشانی اور جد و جہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر کلچرل کمپلیکس کی عمارت مکمل طور پر تعمیر ہو گئی۔ اس کی تعمیر کا مکمل ہونا تھا کہ ساری بستی میں دھوم مچ گئی ابتداً مجھ پر شک کرنے والے لوگ اب میری طرف توصیفی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ میری بیوی کے چہرے پر بھی اطمینان بحال ہو گیا تھا۔ آخر وہ اور اس کی قربانیاں بھی تو میرے کام میں برابر کی شریک تھیں ـــ لیکن وہ ـــ وہ جو مجھے قدم قدم پر ٹوکتا تھا میری طرف دیکھ کر طنزیہ مسکرایا کرتا تھا اب اس کا دُور دُور تک کہیں پتہ نہیں تھا۔ ان دنوں خدا جانے وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔
عمارت کی تعمیر کے بعد اب میرے نزدیک بس ایک

یہی مسئلہ تھا کہ آخر اس کلچرل کمپلیکس کو کونسا رنگ دوں؟ میں نے اس سلسلے میں جب اپنے آرکیٹیکٹ سے مشورہ کیا تو وہ مجھے ایک ایسی کلر اسکیم بتلانے لگا جو میرے مزاج اور میرے کام سے میل نہ کھاتی تھی۔ میں نے اس کی خاطر اور لوگوں سے مشورے کئے۔ رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہوگیا کہ میں کلر اسکیم میں اُلجھا ہوا ہوں تو ہر شخص فکر مند ہوگیا ـــ اب سب کو یہی خوف تھا کہ جانے میں اسے کیا رنگ دینے والا ہوں ـــ یہاں تک کہ میرے اپنے عملے میں بھی بحث و مباحثے شروع ہو گئے۔ ابتداً تو یہ صرف مشورے تھے پھر یہ مشورے ذاتی وقار کا مسئلہ بننے لگے اور پھر اُن میں ذات پات مذہب جماعت کا رنگ گھلنے لگا اور آخر ایک دن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ پوری عمارت میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ وہ ہاتھ جنہوں نے اس عمارت کی تعمیر میں میرا ہاتھ بٹایا تھا مل جل کر اینٹ پر اینٹ اور پتھر پر پتھر جماتے تھے اس قدر مشتعل ہو گئے تھے کہ لگتا تھا کہ جیسے یہی ہاتھ اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے۔ میں ہمت کر کے اُن کے سامنے آیا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا لیکن میری آواز میرے حلق سے باہر کسی کو بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے ایک جانب سے شور اُٹھا ـــ ـــ ـــ ـــ

ہرا رنگ لگ کے رہے گا۔

اس کے ساتھ ہی سیدھی جانب سے آواز اُبھری

ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ لال رنگ ہو کر رہے گا

ـــ اچانک پیچھے سے ایک شور اُٹھا ـــ ـــ ـــ ـــ

ـــ کیسریا رنگ ہمارا ہے۔

اور پھر سارے نعرے گڈ مڈ ہوگئے۔ ایک ہنگامہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے نعروں کی یہ گونج آسمان کو بھی اُڑا دے گی۔ میں وہاں سے بے تحاشہ ایگزیکیٹو انجینئر کے پاس پہنچا اور اُسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بولا "آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا ـــ جناب اس میں بیرونی ہاتھ لگتا ہے ـــ یہ ان ہی ایجنسیوں کی کارستانی ہے ـــ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی پولیس کو مطلع کرتا ہوں، ان سرکشوں پر پہلے لاٹھی چلے گی۔ پھر آنسو گیس کا استعمال ہوگا اور اس پر بھی وہ قابو میں نہ آئیں تو فائرنگ کی جائے گی ـــ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا"

میں نے کہا: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا حق ہے۔ جب انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی تعمیر میں حصّہ لیا ہے تو ان کی مرضی کا رنگ بھی لگنا چاہیئے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا" میں آپ سے کیا چاہوں گا؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ سب کے رنگ جدا جدا ہیں اور کوئی بھی کسی ایک رنگ پر متفق نہیں ہو رہا ہے۔"

"پھر آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔" آپ کا اپنا بھی تو کچھ خیال ہوگا؟"

وہ بولا:" تو پھر یوں کرو، اکثریت جو چاہتی ہے وہی رنگ لگوا دو!"

اس کا یہ جملہ سنتے ہی میرا پورا وجود کانپ گیا۔ میں نے اپنی نظریں نیچی کرلیں اور پھر بولا۔" لیکن جناب اقلیت کی کارکردگی بھی تو اکثریت سے کم نہیں ـــ ؟"

"تو پھر جایئے ـــ اور جو بھی آپ کی سمجھ میں آتا ہے وہی کیجئے۔"

میں وہاں سے مایوس ہو کر سید حاجی بابا کی کٹیا کی طرف لپکا اور جونہی میں نے اُن کی کٹیا میں قدم رکھا۔ بابا نے میری طرف توجہ سے دیکھا۔ میں نے کہا:" بابا ـــ رنگوں میں تصادم ہو گیا ہے۔ اس وقت کلچرل کمپلیکس بارود سے زیادہ خطرناک ایندھن کی زد میں ہے۔"

بابا نے میری طرف بنا دیکھے جواب دیا" اس کے ذمہ دار تم خود ہو ـــ !"

"میں ـــ ؟ میں ـــ ؟" میں نے حیرت سے بابا کی طرف دیکھا۔" بابا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں ۔۔۔!" بابا کی آواز میں مکمل ٹھہراؤ تھا۔ "اس کے ذمہ دار تم ہی ہو ۔۔ اتنے دنوں کے باوجود تم ان میں ایک رنگ کا تصوّر تک پیدا نہ کر سکے ۔۔ تم انہیں محض اینٹ اور گارے کی طرح استعمال کرتے رہے ہو ۔۔ تم نے کبھی اُن کے اندر اُتر کر اُن کی آتما کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش نہ کی ۔۔ افسوس تم خود کلچرل کمپلیکس کے اصلی رنگ سے ناواقف نکلے ۔۔ یہی تمہاری سب سے بڑی غلطی ہے ۔۔!"

"اب کیا ہو سکتا ہے؟" میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا ۔۔!" میری بیوی چیختی ہوئی کٹیا میں داخل ہوئی۔ وہ حد سے زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ "اجی سنیئے تو ۔۔ کلچرل کمپلیکس ملبے کا ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے ۔۔ تمہارا خواب چکنا چُور ہو کر رہ گیا ہے اور تمہارے اپنے خواب کے پہریدار تمہیں شکاری کتّوں کی طرح تلاش کرتے پھر رہے ہیں ۔۔۔ اب کیا ہوگا ۔۔؟"

وہ گھبراہٹ کے مارے میری باہوں میں بے ہوش ہو گئی۔ مجھ پر تو جیسے سکتے کا عالم طاری تھا۔ ناکامی پر بہنے والے آنسو نہ جانے کس ساگر میں جا چھپے تھے۔ میں چُپ چاپ اُسے اُٹھا کر بابا کی کٹیا سے باہر نکل آیا۔

اِس حادثے کے بعد مجھ سے سب نے ملنا جُلنا بند کر دیا۔ اور میں عجیب سی زندگی گذار رہا تھا۔ گھنٹوں اپنے آپ میں قید رہتا یا پھر پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا رہتا۔ سبھی نے تو ساتھ چھوڑ دیا تھا میرا البتہ وہ ۔۔۔ وہ اب بھی کبھی کبھی میرے پاس آتا تھا اور جب جب بھی وہ میرے پاس آتا میرے آنسو نکل پڑتے۔ لیکن اب اس نے بھی طنزیہ مسکراہٹ چھوڑ دی تھی بلکہ اُلٹا وہ مجھے دلاسے دیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک روز اُس نے مجھے کہا۔ "اب میں تم سے باہر کبھی نہیں نکلوں گا ۔۔ بلکہ تمہیں میں سما جاؤں گا ۔۔"

اور وہ سچ مچ میرے اندر اتنی دور تک اُتر آیا کہ میں اپنا چہرہ ہی بھول گیا۔ آئینہ دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہتا۔ میری اس کیفیت سے میری بیوی بہت زیادہ فکر مند رہنے لگی تھی۔ آخر ایک روز اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں گیانی بابا کی کٹیا جاؤں ۔۔۔ میرا دل بھی بہل جائے گا اور مجھے کچھ سکون بھی حاصل ہو جائے گا۔

میں نے کہا۔ "سچ ۔۔ پچھلے کئی دنوں سے ان کا مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" اور پھر میں بابا کی کٹیا کی طرف چل پڑا۔

جونہی میں اُن کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ بابا کے پائنتی ایک اجنبی شخص بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک فائل ہے اور بابا سے کہہ رہا ہے۔ "بابا میں نے کلچرل کمپلیکس کی تعمیر کا کنٹریکٹ لیا ہے۔"

اچانک مجھے اپنی گردن پر اپنے چہرے کا گمان ہوا۔ اور پھر میرے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "دوست کیوں اپنے سکھی جیون کو دکھ میں ڈال رہے ہو؟ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔ اس خیال کو چھوڑ دو ۔۔ تم کلچرل کمپلیکس کی تعمیر نہیں کر سکو گے۔ تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے آنے والے ٹھیکیداروں کا ہو چکا ہے۔"

لیکن اس کے چہرے پر بھرپور طمانیت تھی۔ ایک ارادہ تھا ایک فیصلہ تھا۔ وہ بولا۔ "میں تمہاری طرح بودا نہیں ہوں میں نے تمہاری ناکامی سے سبق سیکھا ہے کہ رنگوں کو کس طرح سے یکجا کیا جا سکتا ہے اور ان کی آمیزش سے کون سا رنگ تیار ہو سکتا ہے!"

بابا نے اُس کی طرف شفقت بھری نظروں سے دیکھا اُس نے فائل اُٹھائی اور پھر اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر نکل پڑا۔

میں شاید وہیں ٹھہر گیا تھا۔ نہیں شاید اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا ۔۔ نہیں شاید اپنے آپ میں کہیں غروب ہو گیا تھا۔

غزل

بودھراج ظفر

رازِ فطرت کی بات کہتے ہو
موت کو جب حیات کہتے ہو

کون سی مصلحت ہے پیشِ نظر
زہر کو کیوں نبات کہتے ہو

سخت حیرت ہے اس زمانے میں
برملا حق کی بات کہتے ہو

جو رِ بے اعتنائی ہے ان کی
تم جسے التفات کہتے ہو

نام کیا دو گے زندگی کو ظفر
موت کو جب حیات کہتے ہو



غزل

سحر سعیدی

منظر نہ کوئی عکس نہ لالہ دِکھائی دے
عالم تمام رُوئی کا گالا دِکھائی دے

اَب کیا سُناؤں اُس کو سفر کی صعوبتیں
جس کو نہ میرے پاؤں کا چھالا دِکھائی دے

سمجھو وہیں سے ذہنِ رسا ماند پڑ گیا
ہر پست جب نگاہ میں بالا دکھائی دے

رنجِ سفر سے ہار کے بیٹھا نہیں ہوں میں
ٹوٹے فصیلِ شب تو اُجالا دِکھائی دے

لہجہ ہی گفتگو کا اگر تلخ ہو سحر
اِک سُوئی بھی نگاہ میں بھالا دکھائی دے

نثار احمد صدیقی

عزم کا پُتلا

"بسکٹ، بسکٹ، گلوکوز والا بسکٹ۔"

"ابے! ایسے نہیں آواز لگا، ورنہ پولیس والے سن لیں گے۔" تقریباً بارہ سالہ بچے کی اس آواز پر کسی مسافر نے کوئی توجہ نہ دی، ایک بار پھر ایک نو سالہ بچے کی آواز بلند ہوئی،

"بسکٹ، بسکٹ گلوکوز والا بسکٹ"

اور پھر ایک طمانچے کی آواز، جس نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے غور سے گھوم کر دیکھا۔ ایک بارہ سالہ بچے نے اپنے نو سالہ ساتھی کی گردن پر طمانچہ مارا تھا۔ لڑکا گردن سہلا رہا تھا۔ اور منہ بسور رہا تھا۔ بارہ سالہ لڑکا اس سے کہہ رہا تھا "ابے تجھے منع کیا تھا کہ آواز اسٹیشن پر جب گاڑی کھڑی ہو تو نہ لگایا کر لیکن تو نہ مانے گا۔ ابھی تیرے باپ پولیس والے آکر پکڑیں گے تو سالے تجھے بھی پیسے دینے پڑیں گے اور تیرے ساتھ میری بھی جیب خالی ہوگی، پھر چل کے رات کو اپنی اماں کو اپنا تھوبڑا دکھانا۔"

چھوٹے بچے کی معصوم شکل نے میرے دل میں ہمدردی کا ایک جذبہ لاشعوری طور پر پیدا کر دیا میں نے قدرے غصہ کے لہجہ میں بڑے لڑکے کو آواز دی اور سوالیہ لہجہ میں اس سے پوچھا۔

"یہ تمہارا بھائی ہے۔؟"

"نہیں صاحب۔"

"تمہارا کون لگتا ہے یہ؟"

"ویسے تو میرا کوئی نہیں ہے۔ اس کی ماں نے اس کو میرے ساتھ کر دیا ہے۔"

"مار کھانے کے لیے۔!"

"نہیں صاحب۔!"

"پھر۔"؟

"دیکھو صاحب! اس کے پتاجی مر گئے ہیں۔ اس کی ماں گھروں میں برتن مانجھتی ہے۔ اس کو ریوڑی بیچنے میں لگا دیا۔ یہ الہ آباد اسٹیشن میں ریوڑی بیچتا تھا۔ وہاں دن بھر بیچتا اور شام کو جو جواری اسٹیشن پر بیٹھتے ہیں وہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر پتے لگاتے تھے۔ اور اس پاگل سے سارے روپے جیت لیتے تھے، تب اس کی ماں نے میرے ساتھ اس کو کر دیا کہ چلتی ٹرین میں سودا بیچے اور میرے ساتھ گھر واپس جاتے۔"

"صاحب، دیکھو چکر یہ ہے کہ اسٹیشن پر جب گاڑی کھڑی رہتی ہے تو آواز لگانے پر پولیس والے سن کر پکڑ لیتے ہیں اور پیسہ مانگتے ہیں نہیں تو کہتے ہیں بند کر دیں گے۔"

"صاحب اب ان کو اگر پانچ چھ روپے دے دیں تو منافع تو گیا اور سارے دن کی محنت برابر۔" لڑکے کی بات میں سچائی نظر آرہی تھی، کیونکہ اکثر و بیشتر میری نظروں نے ہاتھ میں لال پٹی باندھے پولیس والوں کو کمپارٹمنٹ کے باتھ روم کی طرف خوانچے والوں اور دیگر ہاکروں کو لے جاتے اور کان میں راز دارانہ باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے بعد چند نوٹوں کو بطور جزیہ لینے کے بعد نہایت دوستانہ طور پر ان خوانچے والوں سے مفت میں ان کے چنے اور مٹر کو لے کر کھاتے ہوئے بھی دیکھا ہے، دراصل یہ قیمت ہر اس ہاکر کو روزانہ ادا کرنی پڑتی ہے جسے ریلوے سے باقاعدہ طور پر اشیاء بیچنے کا لائسنس حاصل نہیں ہے۔

میں نے لڑکے سے پھر سوال کیا۔" تم بھی بسکٹ بیچتے ہو۔؟"

"نہیں صاحب! چنے بیچتا ہوں"۔ اس نے نیچے رکھی ہوئی ڈلیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

احساس تجسس مجھ پر حاوی ہو رہا تھا۔ اب تک غصہ نے ہمدردی کی شکل اختیار کر لی تھی اور مجھے اس بڑے لڑکے کی بات چیت میں خاصی دلچسپی سا احساس ہونے لگا تھا۔

میں نے پوچھا۔"ویسے تمہارے پتا جی کیا کرتے ہیں۔؟"

"صاحب، ریلوے میں چپراسی ہیں؟"

"تمہارا گھر۔"

"کانپور ریلوے کالونی میں پتا رہتے ہیں۔"

"اور تم۔"

"میں صاحب الہ آباد میں رہتا ہوں۔ وہ آپ نے پریاگ ہوٹل کے پاس کچھ چھوٹے چھوٹے جھونپڑے دیکھے ہیں نا۔ بس اسی میں۔"

"لیکن تم کو تو اپنے پتا کے ساتھ رہنا چاہیئے۔" میرے اس سوال پر اس نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں پھیر لیں۔ احساس کرب اس کے کمسن چہرے پر صاف نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھیں ہلکی سی ڈبڈبا سی گئیں وہ دھیرے سے بولا۔

"صاحب! میری ماں کسی کے ساتھ چلی گئی، میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔"

مجھے اپنے اوپر غصہ آیا کہ ناحق اتنا تلخ سوال کیا۔ مجھے اب اس بچے سے پوری طرح سے انسیت کا احساس ہو چلا۔ میں نے نرم آواز میں پوچھا۔

"تمہارے اور بھائی ہیں۔"

"ہاں صاحب ایک چھوٹا ہے۔ اسکول جاتا ہے۔"

"تمہارے ساتھ ہی ہے۔"

"ہاں صاحب۔ اسے پڑھا رہے ہیں۔"

میں نے اس سے پھر سوال پوچھا۔

"تمہارا یہ چھوٹا ساتھی اب روز جو کماتا ہے اسے جوئے میں تو نہیں گنواتا۔"

"نہیں صاحب۔ اب تو اس سالے سے پورے روپے میں شام تک لے لیتا ہوں اور اس کی ماں کو دے دیتا ہوں۔"

بارہ سال کا وہ بچہ مجھے اب ایک قدآور

درخت نظر آرہا تھا۔ جس نے اپنے سایہ میں بلا امتیاز رشتہ اور کنبے کے ہر شخص کو پناہ دینے کا بیڑا اٹھا رکھا ہو۔

میں نے پورے خلوص سے پوچھا۔ "ہاں تمہارا نام۔؟"

"رامو، صاحب!" بڑے بے توجہی سے اس نے جواب دیا۔

اپنا نام ادا کرتے وقت اس نے جس بے توجہی کا اظہار کیا اس سے مجھے مزید دکھ پہنچا۔ تو گویا اسے اپنے نام میں کوئی دلچسپی نہیں۔

گھر میں بچوں کے نام رکھنے میں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پورے خاندان کی رائے زبانی یا خط کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن اس رامو کے لیے اب نام سے زیادہ معمولی بات شاید کوئی اور نہ تھی۔

میرے دل نے کہا کہ اس بچے کو کیوں نہ اپنے ساتھ میں الہ آباد میں رکھوں، اور اس کو تعلیم بھی دلوا دوں، میں نے اسی جذبہ کے تحت، اس سے پھر پوچھا۔

"رامو میرے ساتھ الہ آباد میں رہوگے تمہارا نام اسکول میں لکھوا دیں گے۔"

"نہیں صاحب۔! مجھے چھوٹے بھائی کو پڑھانا جو ہے۔ میں اگر پڑھنے کے چکر میں پڑ گیا تو اسے کیا پڑھاؤں گا۔"

مجھے اس کی آواز میں بیچارگی اور بے لبسی نہیں، بلکہ عزم کا احساس ہوا۔ اور دل سے ساری نیک خواہشات اس کی کامیابی کے لیے نکل پڑیں۔ سورج نے ابھی ابھی کئی دن بعد بادلوں کی اوٹ سے سر نکالا تھا۔ ٹرین کانپور اسٹیشن سے روانہ ہو چکی تھی، میں نے سوچا کیوں نہ اس رامو سے چنے خریدے جائیں تاکہ اس کی کچھ مدد ہو سکے۔ لہذا اس سے چنے کے دو پتے لگانے کو کہا۔ ایک اپنے لیے اور ایک اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک بزنس کلاس کے موکل کے لیے۔

رامو نے دو پتے قدرے اہتمام سے تیار کیے۔ چنے عام پتوں سے زیادہ ڈال دیئے اور ہمارے ہاتھ میں پتے رکھ کر ڈلیا کو گلے میں لٹکا کر وہ آگے بڑھا۔ میں نے آواز دی۔ "رامو پیسے لے لو۔" اس نے پلٹ کر کہا۔

"نہیں صاحب آپ سے نہیں۔" میں نے دوڑ کر اسے پکڑا اور دو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھا۔ وہ بولا۔ "نہیں صاحب آپ سے نہیں۔!"

مجھ سے کیوں نہیں۔ یہ پوچھنا میں نے ضروری نہیں سمجھا میری بہت منت پر اس نے صرف ایک روپیہ یہ کہہ کر لیا۔ "صاحب میں آٹھ آنے پتہ بیچتا ہوں۔"

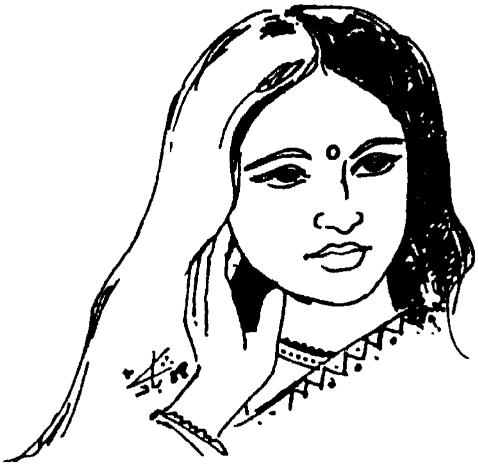
میں سیٹ پر واپس آکر بیٹھا اور اس ننھے فرشتے کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتا تھا اتنے میں میرے موکل کی آواز میرے کان سے ٹکرائی۔

"وکیل صاحب اگر یہ لڑکا بزنس ایسے ہی کرے گا تو پھر کر چکا۔" میرے سامنے آسمان پر ایک بار پھر بادل گھرے ہو چلے تھے۔!! ●

مصطفےٰ مومن

غزل

ٹھٹھرتی بانہوں میں کرنوں کی گرمیاں رکھدے
اُداس لمحوں میں کلیوں کی شوخیاں رکھدے
عجب نہیں کہ شرابِ وفا میں ڈھل جائے
وُہ اِک نگاہ جو آنکھوں میں سُرخیاں رکھدے
مِرا وجود سراپا بہار ہو جائے!
مِرے لبوں پہ گلابوں کی پتیاں رکھدے
بہت دِنوں سے کوئی پھول ہی نہیں کھلتا
ہر ایک شاخ پہ رنگین تتلیاں رکھدے
میں اپنی نرمیٔ گفتار سے پریشاں ہوں
مِری زبان پہ لہجوں کی تلخیاں رکھدے



ذکی تال گانوی

غزل

مَیں اپنی سوچ کی رَو میں جِدھر جِدھر گُزرا
تِرے خیال کا سرسبز اِک نگر گُزرا
اُسی نے داغ دِیئے دامنِ یقیں پہ مِرے
وُہ شخص جو مِری نظروں میں معتبر گُزرا
کِسی نے ڈُوبتے لمحے صدائے دِل نہ سُنی
پھر اُس کے بعد جو گُزرا بہ چشمِ تر گُزرا
خلُوص آپ زمانے میں ڈھونڈتے پھرئیے
اُسے سلُوک جو کرنا تھا وُہ تو کر گُزرا
جواب اُس کا زمانہ کو آج تک نہ مِلا
ذکی یہ سچ ہے کہ اقبال دِیدہ ور گُزرا

نام کتاب : کاروانِ ابرؔ
نام مصنف : شاداب زکی بدایونی
قیمت : بیس روپے
ملنے کا پتہ : زکی منزل۔ محلہ موسقا۔ بدایوں (یو۔پی)

•

شاداب زکی بدایونی نے اس کتاب میں علامہ ابر احسنی گنوری مرحوم کے ضلع بدایوں کے ۵۴ تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ ابرؔ صاحب کے تلامذہ ہند و پاک میں بہت ہیں۔ کتاب کے نام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کے کل تلامذہ کا ذکر ہوا ہے۔

مصنف اس سے پہلے ایک تذکرہ "غیر مسلم شعرائے بدایوں" لکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مصنف مشکل کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں۔ اردو کی خدمت کا دعویٰ جتنا آسان ہے اتنا ہی اس کا پورا کر دکھانا مشکل ہے۔ تذکرہ ترتیب دینا آسان کام نہیں۔ اس تذکرے میں شعراء کے نام کے ساتھ ساتھ مناسب حد تک یا جس قدر انہیں مواد مل سکا اس قدر ہر شاعر کی زندگی کی تصویر ہے اور کام کا احاطہ ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کی قدر شاعری کی حیثیت سے نہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی کی جائے گی۔ مختلف رنگوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ مذاق اپنا اپنا۔ جو بھی پھول پسند آئے۔ چن لیجئے۔

شروع میں علامہ ابر صاحب کی ادبی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی تصانیف کا ذکر ہے۔ ان کے کام اور کلام پر علماء کی آراء ہیں۔

کتابت عمدہ۔ کاغذ سفید۔ غلطیوں سے پاک ہے۔ قیمت صحیح ہے۔

•

نام کتاب : اعتبار
نام مصنف : محمود زکی
قیمت : ۲۵/۸۰ روپے
ملنے کا پتہ : اردو مجلس اے۔جی ۲۵۲ شالیمار باغ۔ دہلی ۱۱۰۰۵۲

•

زیر نظر کتاب میں غزلیں ہیں۔ نظمیں ہیں ایک مرثیہ ہے۔

شاعر شعری ادب کی کلاسیکی روایات سے واقف ہیں۔ بدلتے ہوئے جدید رجحانات سے بھی شناسا ہیں۔ ان کے ہاں مہذب اقدار و روایات کا امتزاج ملتا ہے۔

زبان و بیان دل کش ہے۔ ان کی شاعری عمیق تجربے اور قادر الکلامی پر مبنی ہے۔ شاعری میں جہاں معتدل۔ دھیما اور متوازن لہجہ کار فرما ہے۔ وہاں للکار بھی ہے۔ رفعت اور لطافت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ احساس کی تازہ کاری ہے۔ وطن کی محبت سے سرشار ہیں۔

کچھ اشعار دیکھئے۔

کہیں ایسا نہ ہو افسانہ بن جائیں یہی باتیں
تری بے گانگی ساقی مرا دیوانہ پن ساقی

کہنے کا انداز نیا ہے حُسن کر دل پر بیتے ہے
عشق و وفا کے قصّے یُوں تو لاکھوں سال پُرانے ہیں

٭

بھیم و ارجن کے وارث دلیرو اُٹھو
دشمن آئے ہیں سرحد پہ گھبیرو اُٹھو
اپنی طاقت سے مُنہ ان کا پھیرو اُٹھو
جوق در جوق بھارت کے شیرو اُٹھو

٭

کتابت ۔ طباعت عُمدہ ہے ۔ کاغذ بڑھیا ہے ۔ اغلاط سے پاک اس کتاب کی قیمت صحیح ہے ۔

(رام لعل نابھوی)

سچی کسوٹی

"جب کبھی آپ کسی شک کی حالت میں ہوں ۔ تو کسی ایسے کنگال ترین اور انتہائی بے بس اِنسان کے چہرے کی کیفیت یاد کیجئے" جسے آپ نے دیکھا ہو اور پھر خود سے سوال کیجئے کہ جو کام آپ کرنے کی سوچ رہے ہیں 'کیا اس سے اُسے کوئی فائدہ پہنچے گا؟ کیا اسکی بدولت اُس کو اپنی زندگی اور تقدیر پھر سے اُس کے اختیار میں ہو جائے گی۔"

— مہاتما گاندھی

شہاب اشرف



غزل

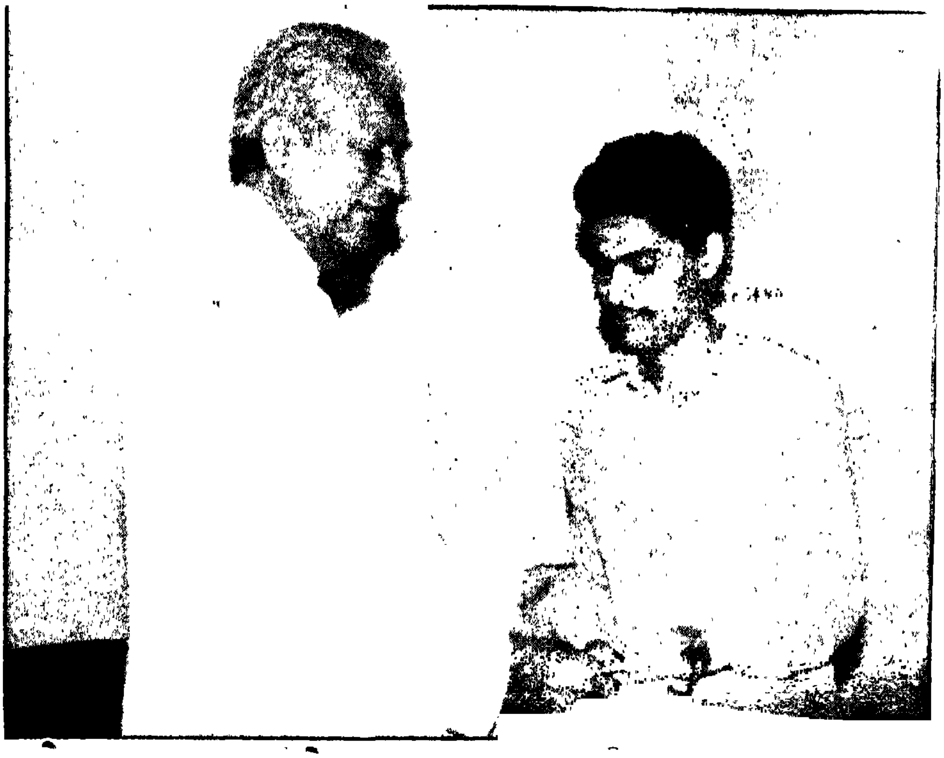
طائرِ نغمہ سرا بھور کا جادُو مانگے
جلوۂ حُسن درخشاں کوئی خوشبُو مانگے

مَیں جِدھر آنکھ اُٹھاؤں ترا جلوہ دیکھوں
دِل ہر اِک لحظہ پُکارے تجھے ہر سُو مانگے

جَیسے شبنم سے ہر اِک پھُول لپک اُٹھتا ہے
میرا ہر شعر مری آنکھ کا آنسُو مانگے

وُہ گھُٹن ہے کہ رُکا جاتا ہے دم سینے میں
زِندگی پھر ترے انفاس کی خوشبُو مانگے

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ارجن داس ملک نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ ایس سی او نمبر ۱۸۹-۱۹۱ سیکٹر ۱۷-اسی چنڈی گڑھ سے اکتوبر ۱۹۸۸ء کے لئے شایع کیا ۔ طابع : کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو ٹی ۔ چنڈی گڑھ۔



وزیر اعلیٰ ہریانہ، چودھری دیوی لال چنڈی گڑھ میں موقر روزنامہ "دی ٹری بیون"
کے کالم نگار جناب سندیپ جوشی کو اُن کے کالم "ناؤ بولیا" سے متاثر
ہو کر ۲۱۰۰ روپے کے چیک سے نوازتے ہوئے۔

ٹیگور تھیئٹر چنڈی گڑھ میں رنگ منچ کی طرف سے پیش کئے گئے پنجابی ڈرامہ
"تلاش اک ہیر دی" سے محظوظ ہوتے ہوئے نائب وزیر اعلیٰ ہریانہ
جناب بنارسی داس گپتا۔





سونی پت میں مجاہدینِ آزادی کی سٹیٹ کنونشن کے موقع پر سابق صدر جمہوریۂ ہند گیانی ذیل سنگھ وزیر اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال کو تامر پتر سے نوازتے ہوئے۔

عالیجناب دیوی لال وزیر اعلیٰ ہریانہ نے ، ہریانہ اردو اکادمی کے "خواجہ احمد عباس فن اور شخصیت" سیمینار کے موقع پر پانی پت میں اکادمی کی مطبوعات کی رسم رونمائی ادا فرمائی۔



تعمیرِ ہریانہ

یومِ ہریانہ مبارک

نومبر ۱۹۸۶ء



وزیرِاعظم ہند، عالیجناب راجیو گاندھی ضلع حصار کے موضع فرمائی کلاں میں سیلاب سے متاثرہ
عوام سے اُن کے مسائل کو توجہ اور ہمدردی سے سُنتے ہوئے۔ تصویر میں گورنر ہریانہ جناب ہری آنند براری
اور وزیرِاعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال بھی نظر آ رہے ہیں۔

آپ کا محبوب معتوب ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

نومبر ۱۹۸۸ء شمارہ : ۱۱ جلد : ۱۶

ترتیب

خط و کتابت کا پتہ

[illegible]

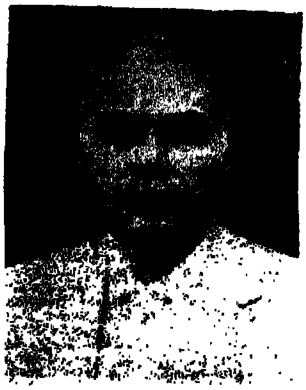
فی شمارہ ۵۰ پیسے
زر سالانہ ۵ روپے

[illegible]

مدیرِ اعلیٰ
ارجن داس ملک
[illegible]

مدیر
سلطان انجم

سرورق : ایم۔ پی۔ بادشاہ



یومِ ہریانہ پر پیغام

——— ہری آنند براری گورنر ہریانہ

میں ۲۳ ویں یومِ ہریانہ کے موقع پر اہلِ ہریانہ کو مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ اس دن ہم ہریانہ کو اور زیادہ متحرک، ترقی یافتہ اور خوشحال ریاست بنانے کا دوبارہ عزم کرتے ہیں تاکہ عوام کے خواب پورے ہوں اور ان کی توقعات بھی پوری ہوسکیں۔

ہریانہ نے ۲۲ سال کی قلیل مدت میں مختلف سماجی واقتصادی شعبوں میں خاطرخواہ ترقی کی ہے ——
بدقسمتی سے ریاست کو پچھلے ۱۶ مہینوں میں قدرتی آفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ گذشتہ سال ریاست میں بدترین قحط پڑا تو ریاستی سرکار نے لوگوں کی مشکلیں آسان کرنے کے لیے فوری اقدامات کیے۔ بدقسمتی سے اس سال بھی ریاست کے مختلف ضلعوں کے بڑے حصے میں سیلاب کا پانی بھر گیا۔ اس کے نتیجے میں بہت تباہی ہوئی اور جان ومال کے علاوہ فصلوں کو بھی بہت نقصان پہنچا۔ گذشتہ برس ہریانہ کے لوگوں نے نہایت دلیری اور حوصلہ کے ساتھ سنگین قحط سالی کا مقابلہ کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ محنت کش اہلِ ہریانہ اس برس سیلاب سے پیدا صورتِ حال اور مشکلات کا بھی اُسی ہمت اور حوصلہ سے سامنا کریں گے۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس آڑے وقت میں بھی سرکار مصیبت میں پھنسے لوگوں کی ہر ممکن مدد کرے گی۔

اگرچہ سرکار کو اپنا بہت دھیان، طاقت اور کوششیں سوکھے اور سیلاب کی قدرتی آفتوں سے پیدا صورت سے نپٹنے پر لگانی پڑیں۔ تاہم اس دوران سرکار نے خصوصاً چھوٹے کسانوں، بے زمین مزدوروں، چھوٹے دوکانداروں، کاریگروں، درج فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح اور ان کے فائدے کے لیے سماجی واقتصادی ترقی کی کئی اسکیمیں شروع کی ہیں۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ امن پسند اہلِ ہریانہ مختلف فرقوں میں باہمی اتحاد، دوستی اور بھائی چارے کی روایات کو قائم رکھیں گے اور قوم یکجہتی اور ملک کی سالمیت کو مضبوط بنائیں گے۔

ایک بار پھر، میں اہلِ ہریانہ کو اُن کے خوشحال اور روشن مستقبل کے لیے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

تعمیرِ ہریانہ ۴ نومبر ۱۹۸۸ء



ہریانہ کی تعمیرِ نو

دیوی لال وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

یکم نومبر اہلِ ہریانہ کے لیے جوش و مسرّت اور ادائے شکر کا دن ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اسی دن ہریانہ ایک الگ ریاست کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ تب سے ہریانہ نے ملک میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا ہے اور اس قدیم سرزمین کو تغیّر کی تازہ ہواؤں نے حیاتِ نو عطا کی ہے۔ عوام کے سرگرم تعاون اور مستعد انتظامیہ کی بدولت ترقی کے سبھی شعبوں میں بے مثل ترقی ہوئی ہے۔

گذشتہ ایک برس سے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ عوام کی توقعات اور ہماری حصولیابیوں کے درمیانی فاصلہ کو کم کرتے ہوئے ایک ایسی فلاحی ریاست کی تعمیر کی جائے جہاں ہر فرد خوشگوار اور مطمئن زندگی بسر کرے۔ ہم نے سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات کے اصولوں پر مبنی ایک ایسا نیا سماج تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ جس میں ہر فرد کا معیارِ زندگی بہتر اور خوشی و خوشحالی سے پُر ہو۔

ہمیں گذشتہ ۱۶ مہینوں کے دوران بہت خراب موسم کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ پہلے قحط سالی تھی اور اب سیلاب ہے۔ زبردست بارش سے جمنا، گھگھر، ٹانگری اور مارکنڈہ ندیوں میں پانی کے بہت زیادہ بہاؤ کی وجہ سے پڑی دراڑوں کے باعث ان کے قریبی علاقوں میں آباد لوگوں کے جان و مال کی بھاری تباہی ہوئی ہے۔ دراڑیں بھرنے اور سیلاب کے شکار لوگوں، اُن کے مویشیوں اور سامان کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے لیے فوج کی مدد لینی پڑی۔ تقریباً ۳۰۸ کروڑ ۱۴ لاکھ روپے مالیت کی فصلیں برباد ہوگئیں۔ کل نقصان ۴۲۳ کروڑ روپے کا ہوا۔ کم از کم ۳۷ افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

حکومت نے مصائب کے اس دور میں لوگوں کا ساتھ دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور عوام کی مشکلات کو کم کرنے کے لیے ہر ممکن تعاون دیا۔ میں اہلِ ہریانہ کو قدرتی آفات کا بیحد دلیری اور نہایت پامردی کے ساتھ سامنا کرنے کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔

ہم نے مختلف فلاحی اسکیمیں شروع کی ہیں اور سماج کے سبھی طبقات پر دھیان دیا ہے۔ ہم نے ۷ لاکھ ۵۷ ہزار غریب کسانوں، دوکانداروں، دستکاروں اور مزدوروں کو قرض کے بوجھ سے نجات دلانے کے لیے اُن کے دس ہزار روپے تک کے کوآپریٹیو قرضے معاف کر دیے ہیں۔ گنا پیدا کرنے والوں کو پچھلے پڑائی موسم میں گنے کی قیمت ۳۲ روپے فی کوئنٹل ادا کی گئی جو ملک میں سب سے زیادہ ہے۔

زرعی پیداوار میں اضافہ کے لیے سب سے زیادہ ضرورت پانی کی ہے۔ پانی کی ایک ایک بوند کے بہتر استعمال اور اسے رسنے سے بچانے کے لیے آبی راستوں کو پختہ کر دینے سے ۱۹۰۶ کیوسک پانی کی بچت ہوئی ہے۔

جدید اقتصادی ترقی کی بنیاد بجلی ہے۔ صنعتوں کے پہیے کو حرکت میں رکھنے اور کھیتوں کی آبپاشی کے لیے پانی میسر کرانے کے ساتھ ساتھ یہ ہمیں زندگی کی تمام آسائشیں بہم پہنچاتی ہے۔ بجلی کی پیداوار اور اس کی تقسیم میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے فرید آباد اور سونی پت کے تھرمل پلانٹوں اور تاجے والا کے پن بجلی پراجیکٹ سے جولائی ۱۹۸۸ء سے ستمبر ۱۹۸۸ء تک ۲۸۱ کروڑ یونٹ بجلی پیدا ہوئی جب کہ گذشتہ برس ۲۴۸ یونٹ بجلی پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح ان پلانٹوں سے اس عرصہ میں ۵۰ فیصد زیادہ بجلی حاصل ہوئی ہے۔

۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران صرف زرعی شعبے ہی ۳۴۵ کروڑ یونٹ بجلی سپلائی کی گئی۔ جب کہ پچھلے سال ۲۵۵ کروڑ یونٹ بجلی سپلائی کی گئی تھی۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں دیگر شعبوں کو ۲۷۰ کروڑ یونٹ بجلی سپلائی کی گئی جب کہ گذشتہ سال ۲۲۳ کروڑ یونٹ بجلی سپلائی کی گئی تھی۔

۸۷-۱۹۸۶ء میں ۱۵,۳۷۰ ٹیوب ویلوں کے مقابلے ۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران ۲۶,۵۸۲ ٹیوب ویلوں کو بجلی دی گئی۔

معیشت کو مستحکم کرنے اور روزگار کے زیادہ مواقع فراہم کرنے کی غرض سے مضبوط صنعتی بنیاد نہایت ضروری ہے۔ صنعتوں کی تیز رفتار ترقی کی خاطر سازگار فضا تیار کرنے کے لیے آجروں کو پرکشش رعایتیں دی گئی ہیں۔ ان مراعات میں پاور جنریٹنگ سیٹوں پر سبسڈی، ہیں اضافہ، پسماندہ شعبوں

میں سرمایہ کاری پر سبسڈی، نئے یونٹوں کو سیلز ٹیکس سے چھوٹ یا اس کا التوا، "ون ونڈو سروس" اور غیر مقیم ہندوستانیوں کے لیے پلاٹوں کی ریزرویشن شامل ہیں۔ الیکٹرانکس یونٹ قائم کرنے کے لیے خصوصی رعایتیں دی جا رہی ہیں۔

۶۵ سال یا اس سے زیادہ عمر کے بزرگ شہری فراخدلانہ بڑھاپا پنشن اسکیم کے تحت ۱۰۰ روپے ماہانہ پنشن حاصل کر رہے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت اب تک تقریباً ۷ لاکھ ۵۰ ہزار بزرگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ یہ صرف بے سہارا لوگوں کے لیے پینشن نہیں ہے بلکہ اُن سن رسیدہ شہریوں کے تئیں احسان مندی کا اظہار ہے، جنہوں نے ہریانہ کو خوشحال ریاست بنانے کے لیے سخت محنت کی ہے۔

ہم ایک ایسے سماج کی تشکیل کے لیے پُرعزم ہیں جہاں سب برابر ہوں، سبھی کو ترقی کے ایک جیسے مواقع اور سہولیات میسر ہوں۔ اسی کے پیشِ نظر ہم نے کمزور طبقوں کی حالت سُدھارنے کے لیے کئی اسکیمیں شروع کی ہیں۔ ہم نے درجِ فہرست ذاتوں، پسماندہ طبقوں اور سماج کے دیگر کمزور طبقات کے ہریانہ ہریجن کلیان نگم، ہریانہ پچھڑے ورگ کلیان نگم اور ہریانہ مہیلا کمزور ورگ وکاس نگم جیسی ریاستی سرکاری مختلف کارپوریشنوں سے لیے گئے ۸ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے کے قرضے معاف کر دیے ہیں۔ اس قدم سے کمزور طبقوں کے ایک لاکھ ۳۴ ہزار افراد کو فائدہ ہوا ہے۔ پسماندہ طبقوں اور درجِ فہرست قبائل کو مکان بنانے کے لیے سبسڈی کی رقم دو ہزار روپے سے بڑھا کر پانچ ہزار روپے کر دی گئی ہے۔

درجِ فہرست ذاتوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ہم نے ان طبقوں کے میٹرک، بی۔اے اور پیشہ ورانہ کورسوں کے طلبا کے فائدے کے لیے بلاسودی قرض کی رقم میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اُن دیہات میں، جہاں پسماندہ طبقوں کی آبادی ۵۰ یا اس سے زیادہ ہو، وہاں پر ان طبقات کے افراد میں سے ایک ایڈیشنل نمبردار مقرر کیا ہے۔ ہریانہ واحد ریاست ہے جس نے ہریجن کھیت مزدوروں اور غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے کنبوں کو، ژالہ باری سے متاثر کسانوں کو دی جا رہی راحت کی پانچ فیصد رقم دی ہے۔

ہم نے بے روزگار نوجوانوں کو ریاستی سرکار کے محکموں، کارپوریشنوں اور بورڈوں میں نوکری کے لیے انٹرویو پر جانے آنے کی خاطر ہریانہ روڈویز کی بسوں میں مفت سفر کی سہولت دی ہے۔ خاتون مسافروں کے مسائل کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے اُن کی آسانی کے لیے ہریانہ روڈویز کی ہر بس میں دس سیٹیں اُن کے لیے ریزرو کی ہیں۔ دیہی علاقوں میں لوگوں کے کم فاصلے کے سفر

کی ضرورتیں پوری کرنے کی غرض سے ہریانہ روڈویز نے منی بسیں بھی خرید لی ہیں۔

ہریانہ اوّلین ریاست ہے جس نے اہم بس اڈّوں پر "فاسٹ فوڈ کاؤنٹرز" کھولے ہیں۔ جہاں مسافروں کے لیے صاف ستھرا تازہ کھانا مناسب داموں پر میسر ہے۔

ریاست میں تقریباً دو دہائیوں کے بعد گذشتہ سال میونسپلٹیوں کے الیکشن کرائے گئے۔ اگست ۱۹۸۸ء میں پنچایتوں کے الیکشن بھی ہوئے۔ اس سے آپ کی حکومت کی جمہوری روایات قائم رکھنے اور لوگوں کے آئینی حقوق کی حفاظت کرنے کی شدید خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔

لوگوں کی شکایتیں فوراً رفع کرنے کی غرض سے ضلع، سب ڈویژن، تحصیل اور دیہات میں کھلے دربار لگائے جاتے ہیں۔ لوگوں نے ایسے درباروں میں بیحد دلچسپی لی ہے۔ یہ دربار لوگوں کے مسائل کو ان کے گھروں پر ہی حل کرنے کا کافی کارگر ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔

ریاست کی برق رفتار ترقی کے لیے امن اور فرقہ وارانہ اتحاد کا ماحول نہایت ضروری ہے۔ ہریانہ کے دانشمند عوام اس امر کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ تخریب پسند طاقتوں کے بارہا اُکسانے، ورغلانے کے باوجود بھی پُرامن رہے۔

ہم حکومت اور عوام کی متحدہ کوششوں سے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ آئندہ برسوں میں ترقی کا یہ عمل اور بھی تیز ہونے کی اُمید ہے۔ ہمیں اپنے خوابوں کے ہریانہ کو حقیقی صورت دینے کے لیے حد درجہ دور اندیشی، عزمِ مصمم، نہایت دلیری اور مسلسل کوششوں کی ضرورت ہے۔

آئیے! ہم اپنے سبھی اختلافات کو بھُلا کر مشترک مفاد کے لیے مل جل کر کام کریں۔

(س۔ا)



ترقی کی راہ پر گامزن ہریانہ

آج خوشیاں منانے اور ادائے شکر کا دن ہے۔ ہریانہ کے وجود میں آنے کے بعد یہاں سبھی شعبوں میں بیحد ترقی ہوئی ہے۔ گذشتہ ایک سال کے دوران نئی اسکیمیں شروع ہونے سے ترقی کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی ہے۔

- ہریانہ نے ۶۵ سال یا اس سے زیادہ عمر کے سن رسیدہ شہریوں کو ۱۰۰ روپے مہینہ کے حساب سے پنشن دے کر دوسری ریاستوں کو راہ دکھائی ہے۔
- ہریانہ اوّلین ریاست ہے جس نے غریب کسانوں، دستکاروں، دوکانداروں اور مزدوروں کے دس ہزار روپے تک کے کوآپریٹو قرضے معاف کیے ہیں۔ اس اسکیم سے تقریباً سات لاکھ ۷۵ ہزار افراد کو فائدہ پہنچا ہے۔
- درجِ فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کے ایک لاکھ ۳۴ ہزار افراد کے ۸ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے کے بقایا قرضے معاف کر دیے ہیں۔
- ہریانہ ملک کی اوّلین ریاست ہے جس نے بے روزگار نوجوانوں کو نوکری کی غرض سے انٹرویو پر جانے کے لیے ہریانہ روڈویز کی بسوں میں مفت سفر کی سہولت دی ہے۔
- سیلز ٹیکس سسٹم کو آسان بنا دیا گیا ہے۔
- ہریانہ نے جولائی ۱۹۸۷ء سے ستمبر ۱۹۸۸ء تک ۲۸۱ کروڑ یونٹ بجلی پیدا کی جو ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اب تک کا ریکارڈ ہے۔
- تقریباً دو دہائیوں کے بعد ریاست بھر میں میونسپلٹیوں کے الیکشن کرائے گئے۔
- سبھی افسران اپنے دفاتر میں ایک گھنٹہ روزانہ لوگوں کی شکایتیں سنتے ہیں۔ لوگوں کی
- شکایتیں موقع پر ہی دور کرنے کے لیے تمام ضلع افسران مل کر مہینے میں ایک بار کسی گاؤں میں کھلا دربار بھی لگاتے ہیں۔

آئیے! اس مبارک دن پر ہم تخریب پسند اور علیحدگی پسند عناصر کا مقابلہ کرنے کا عہد کریں اور ہریانہ کو رہنما ریاست بنانے کے لیے سخت محنت کریں۔

ڈائریکٹر، محکمہ تعلقات عامہ، ہریانہ



غزلیں

ڈاکٹر مظفر حنفی

پرشکستوں کی، نہ چھیڑو داستاں اس مرتبہ
بیٹھ جائے گا یہ خستہ آسماں اس مرتبہ

ڈھا چکی میرا خرابہ لیکن اے ریگِ رواں
اتنا غم تو لے کے جائے گی کہاں اس مرتبہ

بات کرنا جرم ہے امسال میرے شہر میں
اور زوروں پر مری طبعِ رواں اس مرتبہ

کیا خبر اب کے بھنور سے ہاتھ نکلے یا نہیں
دیکھیے کیا گل کھلائے بادباں اس مرتبہ

بے سلاخ اب ایک بھی کھڑکی نہیں ہو جائے گی
ہر طرف سے اٹھ رہی ہیں آندھیاں اس مرتبہ

وہ دریچہ بند ہے، پچھلے برس ایسا نہ تھا
دور کتنی ہو گئی ہے کہکشاں اس مرتبہ

اے مظفرؔ جمع ہوں گے ساری بستی کے چراغ
آگ سے بچتا نہیں کوئی مکاں اس مرتبہ

ان کا حصّہ۔ پھول چمن بھر
میری جھولی میں الجھن بھر

دنیا کو پھر جل تھل کرنا
پہلے آنکھوں کا دامن بھر

چھکوں پھکوں برسے آنسو
بوند نہیں ٹپکی ساون بھر

بھولا پنچھی واپس آیا
کیسا چونک پڑا گلشن بھر

پتھر پتھر پر لکھا تھا
سارے شیش محل چھن چھن بھر

کھڑکی سے جھانکا کرتا ہے
میرا بھی ہے چاند کرن بھر

گہرے شعر، مظفرؔ جیسے
ناگن بل سے باہر پھن بھر

ڈاکٹر نریش

چنڈی گڑھ
کی
سکھنا جھیل

پتھروں کے اس شہر میں ، جسے چنڈی گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہے، بعض ایسے مقامات بھی ہیں جو دیکھنے کے لائق ہیں۔ ان مقامات میں ایک مقام ہے۔ سکھنا جھیل۔ گرمی کے سلگتے ہوئے دنوں میں جب سڑکوں پر پڑی ہوئی تارکول پگھل کر چپچپانے لگتی ہے اور جب شوالک کے دامن سے آنے والی لو، سات دیواروں میں قید آدمی کا جسم بھی جھلسنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، تب سانجھ کے دھندلکے میں اس شہر کے لوگ اس جھیل کی طرف دوڑ نکلتے ہیں۔ دور تک پھیلے ہوئے گدلے پانی کے کنارے خوبصورت لمبے راستے پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ دن بھر کی لو سے جھلسی ہوئی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ بال بچوں کی کلکاریوں سے مسرور ہوتے ہیں کنارے پر بیٹھ کر لہروں کی اٹکھیلیاں دیکھتے ہیں۔ نوجوان لڑکے فلموں کے گیت گنگناتے ہیں، نوجوان لڑکیاں رنگ برنگے کپڑوں کی نمائش لگاتی ہیں۔ ایک بے نیازانہ نظر سے دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی گاؤں میں کوئی میلہ لگا ہوا ہے جس میں گاؤں سے والوں کی نسبت شہر کے لوگ زیادہ تعداد میں شریک ہو گئے ہوں۔ اور پھر اگر کسی وجہ سے میلے کا احساس کم ہونے لگتا ہے تو آوازوں کا وہ شور اس کمی کو پورا کر دیتا ہے، جو جھیل کے صدر دروازے کے سامنے والی سڑک پر موجود خوانچے والوں کی چیخ و پکار سے ابھرتا رہتا ہے۔ "گول گپے"، چاٹ مسالے دار آلو کی ٹکی، آئس کریم وغیرہ کے خوانچوں پر لوٹ پڑتی ہوئی چنڈی گڑھ کی عورتیں بھی اس نظارے کو میلے کا نظارہ

بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ پنجاب کبھی سپت سندھو ہوا کرتا تھا۔ اس کی مردم خیز مٹی سے بڑے بڑے رشی منی، یوگی تپسوی، سادھو سنیاسی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ شوالک کے ان گرمی سے تپتے اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے پتھروں میں رہتے ہوئے بڑے بڑے جوگیوں نے تپ کیا ہے۔ اگر بڑے بوڑھے غلط بیانی نہیں کرتے رہے ہیں تو عین ممکن ہے کہ اس جھیل کے آس پاس کا علاقہ بھی کبھی جوگیوں کا میدانِ عمل رہا ہو اور اس جھیل کا اصلی نام سُکھنا نہ ہو کر شُشمنا رہا ہو۔ اور عین ممکن ہے کہ اِڑا اور پنگلا نام کی دو دیگر ندیاں بھی یہیں کہیں آس پاس بھٹک رہی ہوں۔

سکھنا نام تو اس جھیل کو اس وجہ سے حاصل ہوا کہ جس پہاڑی یا برساتی ندی کے پانی کو پتھر کی دیواروں میں قید کر کے یہ مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے اس کا نام سکھنا تھا۔ لیکن آپ چاہیں تو اس لفظ کو ذرا سا دم لے کر بھی ادا کر سکتے ہیں۔ سکھ نہ۔ یہ نام دو طرح کے لوگوں کو بہت پسند ہے۔ اوّل تو ان کو جو شوقِ ملاحی میں کشتی کرایہ پر لے کر اس کے مٹیلے پانی پر نکل پڑتے ہیں اور نو سکھئے ہونے پر بھی خود کو انتہائی مشاق ملاح سمجھ کر ڈوب مرتے ہیں۔ دوسرے ان کو جو امتحان میں فیل ہونے پر، بیوی سے جھگڑ کر، بچوں کی ضد سے پریشان ہو کر یا ماں باپ سے لڑ کر اس جھیل کے اونچے ویو پوائنٹ سے کود کر خودکشی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس نام سے والہانہ عشق ان نوجوانوں کو ہے جو مجنوں، رانجھا فرہاد یا مہیوال بننے کی آرزو لے کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں اور ان کی جوانی کی آخری منزل یہ جھیل بنتی ہے۔ ویسے ابھی تک کوئی ایسا تاریخی واقعہ سننے میں نہیں آیا ہے جو بصرا کے صحرا، رانجھے کے کھیڑے، ترکی کے پہاڑ یا چناب ندی کی طرح حلقۂ عشق و محبت میں اس جھیل کو بھی لافانی حیثیت عطا کر دے۔

'سکھ نہ' نام کی موزونیت کو اگر جمہوریت کے نقطۂ نگاہ سے پرکھنا ہو تو اکثریت اسی نام کو حاصل ہوگی۔ مہنگائی کی چکی میں پس کر دو جون روٹی کی فکر میں گھل رہے غریب بابو کی بیوی جب اتوار کو جھیل پر چلنے کی ضد پکڑتی ہے تو بابو کے دل پر جو گزرتی ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے سر پر کبھی اچانک شامت منڈلائی ہو۔ اس ضد کا مطلب یہ نہیں کہ بیوی کو اپنے شوہر کی مالی مشکلات کا اندازہ نہیں ہے یا وہ اپنے گھر کے مالی توازن کو بگاڑنا چاہتی ہے لیکن وہ اس وقت مجبور ہو جاتی ہے جب اس کے پاس پڑوس کے بابو لوگ اپنی بیویوں کو سائیکلوں پر لاد کر ہر تیسرے دن جھیل پر لے جاتے ہیں۔ بیوی کی اس ضد پر سرِ تسلیم خم کرنے والے بابوؤں کے چہرے پر غم و غصّہ کی جو لکیریں ابھرتی ہیں اگر کوئی صاحبِ علم ان کو پڑھ سکتا ہو تو ان سے ایک لفظ بنتا ہے۔ شُکھنا۔

جھیل کے کنارے پر بنے گراسی لانز میں سمینٹ کے شیڈ والی ٹیوب لائٹس جب جگمگانے کو اپنے پر پھیلاتی ہیں تب جھیل کے اس پار سے ابھر رہے منشادیوی کے قدیم مندر کی جھلک پھیکی پڑنے لگتی ہے۔ مغربی تہذیب سے متاثر اس پار کی غلاظت کو اور ہندوستانی تہذیب کی علامت اس پار کے

مندر کے زریں کلس کو دور دور تک پھیلا ہوا جھیل کا پانی اس حسن و کمال سے الگ کر دیتا ہے کہ نہ ادھر کے فلمی گانوں کی گنگناہٹ مندر تک پہنچ سکتی ہے نہ مندر سے ابھرتی ہوئی ناقوس و جرس کی آواز یہاں تک آسکتی ہے۔ دونوں تہذیبوں کے بیچ توازن قائم رکھنے کی کوشش میں اس جھیل کا پانی ہہراتا ہے، اچھل کود مچاتا ہے اور اس کی لہریں پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر دونوں تہذیبوں کی آوازوں کو اپنے شور میں مدغم کر لیتی ہیں۔ باقی رہتی ہے صرف ایک آواز جو سکھنا جھیل کی انفرادی آواز ہے۔ اس آواز کو آپ بغاوت کی آواز کہیں یا تباہی کی آواز، ذہنی پراگندگی کی آواز کہیں یا ذہنی اضمحلال کی آواز، دورِ حاضر کے فرسٹریشن کی آواز کہیں یا جدید دوروی کی آواز، یہ آپ کے ذوقِ سلیم پر منحصر کرتا ہے۔

اس جھیل کے بنانے والوں کے ذہن میں نہ تو یہ خیال رہا ہوگا کہ اس سے دو تہذیبیں الگ الگ ہو جائیں گی۔ اور نہ یہ کہ یہ جھیل خطِ تقسیم بنے گی لیکن حسنِ اتفاق دیکھئے کہ جھیل کیا انمٹ خطِ فاصل بن گئی ہے۔ منشا دیوی کے مندر اور چنڈی گڑھ کی نصف یورو پین زندگی کو پاٹنے کے علاوہ یہ جھیل جغرافیائی اور سیاسی تقسیم کی علامت بھی بنی ہوئی ہے۔ اس جھیل کے ایک طرف ہیں پنجاب اور ہریانہ کے سکریٹریٹ اور اسمبلی ہال اور دوسری طرف ہیں ان دونوں ریاستوں کے راج بھون ــ چنڈی گڑھ کی بھیڑ میں اپنی شناخت گم کرنے والے بے شمار شہریوں کو گاؤں کی سیدھی سادی زندگی سے دور رکھنے میں بھی اس جھیل نے بڑی مدد دی ہے۔ شوالک کے قدموں میں آباد اس پار کے دیہات بھی ابھی تک اس جھیل کی بدولت ہی شہری زندگی کی یلغار سے محفوظ ہیں۔ کشتی پر سوار ہو کر جھیل کے اس پار تک ہو آنے والے لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ اس پار کے دیہات ابھی تک اپنے اس کلچر کو زندہ رکھے ہوئے ہیں جسے کبھی ہم فخر کے ساتھ ہندوستانی کلچر کہا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں دل و جان سے شریک ہونے والے محبت کی مضبوط ڈور میں بندھے ہوئے یہ دیہاتی شہر کے تہذیب یافتہ لوگوں سے کس قدر بہتر ہیں اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے پاس چشم بینا ہے۔ ایک لحاظ سے اس جھیل نے خلیج بن کر شہری اور دیہاتی زندگی کو الگ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس پار کی دیہاتی زندگی کو تحفظ بھی بخشا ہے۔ چونکہ اگر یہ جھیل درمیان میں نہ ہوتی تو ان گاؤں میں بھی پانی مانگنے پر دودھ نہ دیا جاتا بلکہ پانی کا ایک گلاس دس پیسے میں دیا جانے لگتا۔

ویسے اگر بہت باریکیوں میں نہ جانا ہو اور آپ کا ذہن پُرسکون ہو تو چنڈی گڑھ میں سکھنا جھیل سے زیادہ خوبصورت دوسرا کوئی مقام نہیں ہے۔ آپ کا جی چاہے تو آنے جانے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو جائیے اور محسوس کیجئے جیسے آپ کسی جلوس یا برات میں چل رہے ہیں، دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے چلئے۔ دائیں بائیں چل رہے لوگوں کی خوش گپیاں سنئے، چھوٹے بچوں کی اٹھکھیلیوں کا مزہ لیجئے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تاک جھانک کا لطف لیجئے۔ اور اگر آپ کی طبیعت تنہائی پسند ہو تو کشتی لے کر پانی میں اتر جائیے۔ دور تک کشتی دوڑائیے۔ بھیڑ کے

آوازوں کے شور سے دور لہروں کے سنگیت کا لطف لیجیے۔ پانی کا سینہ چھو کر آتی ہوئی تیز ہواؤں سے بوچھار کا تحفہ قبول کیجیے، چپوؤں کی تھپتھپاہٹ سے طبلے کی تھاپ کا مزہ لیجیے۔ تب کچھ دیر کے لئے نہ آپ کو چنڈی گڑھ کی لو یاد رہے گی نہ شوالک کے تپتے ہوئے پتھر اور نہ روزمرّہ کی زندگی کے غم و آلام۔ کشتی لے کر نکلنے کی طبیعت بھی نہ ہو تو پانی تک جانے والے زینے پر سے نیچے اتر جائیے آخری پاوان پر بیٹھ کر جوتا اتار دیجیے اور پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ جائیے۔ لہریں آپ کے قدم چومیں گی۔ آپ کے قدموں سے ٹکرا کر سرسراتی ہوئی لہریں آپ کو شاد کام کردیں گی۔ بھیڑ کے بہت قریب رہ کر بھی آپ ان لہروں کے شور کی بدولت بھیڑ سے بہت دور ہو جائیں گے۔ یا پھر جھیل کے پانی کے اندر بنے ویو پوائنٹ پر جا چڑھیے۔ اوپر کی منزل پر پہنچ کر نیچے بہتے ہوئے پانی پر نگاہیں جما لیجیے۔ آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے آپ کسی جہاز پر سوار ہیں اور یہ جہاز آہستہ آہستہ بہتا چلا جا رہا ہے۔ سمندر سے سینکڑوں میل کی دوری پر بھی سمندر کو محسوس کیجیے کہ آپ دور دور تک پھیلے ہوئے پانی کے کشادہ سینے پر بہتے چلے جا رہے ہیں۔ کیسا پرلطف ہے اس طرح بہتے چلے جانا، بے سمت منزلوں کے سفر پر نکلی ہوئی زندگی کی طرح۔ تب یہ جھیل نہ آپ کو خطِ فاصل محسوس ہوگی اور نہ خودکشی کا یقینی مقام۔ اور اگر آپ واقعی اس مصنوعی غیر قدرتی جھیل سے کیف و مستی حاصل کر سکیں تو آپ بصد شوق یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

جی میں آتا ہے یہیں مر جائیے

شِو دیال سحاب

غزل



دیکھ کر پہلے پہل آنکھ اسے پہچانے کیا
جانتے جانتے جانے گی، ابھی جانے کیا

عشق جس دل میں نہ ہو روپ کو پہچانے کیا
جان کو روگ لگایا ہی نہیں جانے کیا

جان لے جو بھی اُسے عین وہی ہو جائے
وہ اگر خود نہ جتائے تو کوئی جانے کیا

عمر بھر اپنی ہی پہچان جسے ہو نہ سکی
وہ ان آنکھوں سے کسی اور کو پہچانے کیا

بے بہا لعل و گہر ہیں تنِ خاکی میں نہاں
جو اُسے خاک ہی مانے وہ اسے جانے کیا

چل کے آئے نہ ہوں وہ جس کے شبستاں میں کبھی
مخملیں چاپ وہ اُن پاؤں کی پہچانے کیا

شکر صد شکر کہ دل میں رہے ارماں گھٹ کر
لب پر آتے تو غضب ڈھاتے خدا جانے کیا

زندگی روح کا پیراہن ہے کہ جلوہ ہے سحابؔ
آج تک راز ہے، یہ راز کوئی جانے کیا

نسیم بن آسی

پلیٹ فارم

ابھی ابھی ایک گاڑی گزر گئی ہے۔ اور اس کی چیخ نکل گئی ہے۔ جب بھی کوئی گاڑی گزرتی ہے۔ لائن کی چیخ نکل جاتی ہے۔ جسے کوئی نہیں سنتا ہے۔ کسی کی چیخ سننے کی فرصت بھی کسے ہے۔ اکثر لوگ زوردار چیخ سنتے ہیں لیکن جو چیخ خاموش اور دبی دبی ہے، اسے کون سنتا ہے؟ گاڑی چلی گئی ہے، اور لائن کی چیخ فضا میں گونج رہی ہے لیکن ٹھہریئے۔ کہیں یہ میری اپنی ہی چیخ تو نہیں...

میں بک اسٹال کی طرف چل پڑتا ہوں۔

ایسا میں اس وقت کرتا ہوں، جب کسی پلیٹ فارم پر گاڑی کا انتظار کرتے کرتے طبیعت بور ہو جاتی ہے۔ کسی پلیٹ فارم پر بک اسٹال نہ ہو تو بے حد پریشانی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ دل بہلانے کا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا ہے۔ ہاں کوئی حسین چہرہ میری ہی طرح جھک مار رہا ہو تو بات اور ہے۔ اس سے پلیٹ فارم کی ساری اداسی اور ویرانی دور ہو جاتی ہے۔ کہنے کو تو وہ کسی اور کی امانت ہوتا ہے لیکن پیچ بلا چھپے تو وہ کسی شاعر یا ادیب کی ملکیت ہے!

میں بک اسٹال پر کتابوں کو الٹتا پلٹتا ہوں۔ اور بک سیلر کو دھوکا دیتے ہوئے اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں۔ مجھے یہاں بھی اپنی ہی چیخ سنائی دیتی ہے۔ جیسے میرے سوا کوئی نہیں سن رہا ہے۔ میں ایک کتاب لے کر اس کی ورق گردانی کرتا ہوں۔ ساتھ ہی ڈرتا بھی ہوں، کہیں کتاب والا مجھے ٹوک نہ دے۔ میں اس بے عزتی کا سامنا کرنے سے پہلے ہی وہاں سے کھسک جانا چاہتا ہوں۔ اکثر شریف لوگ یہی کرتے ہیں۔

کوئی بنچ پر بیٹھے اونگھے یا جاگے، گاڑیاں اپنے وقت ہی پر آتی ہیں۔ کوئی گاڑی غلط وقت پر آتی ہے، تو جاتی بھی ہے غلط وقت پر! جب شروع غلط ہو جاتا ہے تو آخر بھی غلط! میں بنچ پر بیٹھا ہوں۔ پلیٹ فارم پر بنچ ہی ہوتی ہے کرسیاں تو دفتروں میں ہوتی ہیں۔ جن کی فکر ہر ایک کو ہوتی ہے۔ ساری دنیا میں انھیں کے لیے

جھگڑے اور فساد ہو رہے ہیں۔ کرسی ہی کے لیے کرسیاں چل رہی ہیں!

سامنے ایک چھوکرا مونگ پھلی بیچ رہا ہے مونگ پھلی۔ جسے غریبوں کا میوہ بھی کہتے ہیں اور جسے کبھی کبھی امیر لوگ اپنی زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے کھاتے ہیں۔ اس میں وہ غذائیت نہیں ہوتی ہے، جو دوسرے سوکھے میووں میں ہوتی ہے مونگ پھلی میں بس اتنی غذائیت ہوتی ہے کہ اس سے آدمی کی بھوک مٹ جائے۔ اور وہ زندہ رہ سکے!

میں اس چھوکرے سے پچاس گرام مونگ پھلی لیتا ہوں۔ ساتھ ہی اپنے آس پاس بھی دیکھتا ہوں۔ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ مونگ پھلی کھاتے ہوئے جانے کیوں مجھے اپنے پھکڑ پن سا احساس ہونے لگتا ہے۔ سیب اور انگور ہو تو اپنی ذات کچھ بھلی بھلی معلوم ہوتی ہے!

گاڑی آج کافی لیٹ ہے۔ ایک انجن اکیلا ہی چھک چھک کرتا ہوا گزر گیا ہے۔ جو مجھے جھک مارو، جھک مارو، سنائی دیتا ہے۔ لیکن انجن کی اس آواز میں صرف میں ہی شامل نہیں ہوں، میرے ساتھ بہت سارے مسافر بھی ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں، عورتیں بھی! بوڑھے بھی ہیں، بچے بھی! مجھے وہ دن یاد آرہے ہیں، جب گاڑیاں اپنے صحیح وقت پر آتی تھیں۔ کوئی گاڑی لیٹ نہیں ہوتی تھی۔ اور صاحب لوگوں کی دُم اندر ہو گئی تھی۔ جانے کیوں ہم سختی کے قائل ہیں۔ چاہے یہ قانون کی ہو، یا ڈنڈے کی — ! ڈنڈے کی بات سے برامت مانیے گا،

پرانے زمانے سے لے کر آج تک انسان اسی کا عادی ہے — !

میں اس عورت کو دیکھ رہا ہوں، جو گھومتی ہوئی ادھر آنکلی ہے۔ اس کا رنگ سانولا ہے، لیکن وہ جوان اور خوب صورت ہے! اس کی گود میں ایک بچہ بھی ہے، جس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں ہے! وہ ملتجی نگاہوں سے لوگوں کو دیکھ رہی ہے اور لوگ اسے دیکھتے ہی اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔ کوئی عورت جوان اور خوب صورت ہو تو سب اس کی طرف دیکھتے ہیں، لیکن جب وہ لوگوں کی طرف ہاتھ پھیلاتی ہے، تو کوئی اس کی طرف نہیں دیکھتا!

گاڑی آنے کی گھنٹی بج چکی ہے! پلیٹ فارم پر مسافروں کی بھیڑ جمع ہو گئی ہے۔ سب کو کہیں نہ کہیں جانا ہے۔ ایسے ہی دنیا کا بھی پلیٹ فارم ہے۔ ریلوے کا پلیٹ فارم چھوٹا ہے۔ دنیا کا بڑا — ! یہاں بھی مسافر اپنی اپنی گاڑی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ گھنٹی بجے گی، گاڑی آئے گی، اور وہ اپنی منزل کی طرف چل دیں گے — !

منچلے نوجوان یا بوڑھے منچلے اس کے بچے کی بجائے اس عورت کو دیکھ رہے ہیں اور آوازیں کس رہے ہیں۔ وہ عورت بھوکی ہے۔

لوگوں کی باتیں اور مذاق سن کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے!

گاڑی سوں سوں کرتی ہوئی پلیٹ فارم پر آکر رک گئی ہے۔ مسافروں کی بھیڑ ٹرین کے دروازہ پر اڑ گئی ہے۔ پھر گھس پیٹھ — ! ایک جوان اور طاقتور آدمی دروازہ پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور باہر کے آدمیوں

کو اندر آنے سے روک رہا ہے۔ دیکھتے نہیں بچہ ہے لیکن پوری بھیڑ اندر گھس جانا چاہتی ہے۔ ایک عورت ڈبے کے اندر سے چلا رہی ہے۔ لیڈیز کو بھی نہیں دیکھتے؟ پھر بھی باہر سے ایک مسافر چلا رہا ہے۔ آگے بڑھو۔ آگے بڑھو۔ ایک سیٹ میرے لیے بھی! دو جوان عورتیں دھکے کھا کر کسی طرح باہر نکل آئی ہیں۔ ان کی سانسیں پھول رہی ہیں۔ اور ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔

ایک بوڑھا بھی بڑی مشکل سے باہر نکلا ہے۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا ہے۔ جھاگ کے ساتھ گالی بھی! لیکن وہ نہیں جانتا ہے، وہ گالی کسی اور کو نہیں، اپنے آپ کو دے رہا ہے۔!

ڈبوں میں اتنی بھیڑ ہے کہ پیشاب خانہ تک لوگ اٹے ہوئے ہیں۔ مردوں کی تو کوئی بات نہیں۔ وہ لوگوں کو ہٹا کر اپنی حاجت رفع کر لیں گے۔ لیکن عورتیں ۔۔۔؟ کوئی بات نہیں۔ انھیں تو دیکھتے ہی لوگ اپنے آپ ہٹ جائیں گے۔

جو مسافر گاڑی سے باہر اترے ہیں، وہ ابھی پلیٹ فارم ہی پر ہیں۔ اور جو پلیٹ فارم پر تھے، وہ ڈبوں کے اندر ہیں۔ جن کے پاس سامان ہیں، ان سے قلی زیادہ پیسے مانگ رہے ہیں۔ اور مسافر انھیں 'واجب' پیسے دے رہے ہیں۔ جو کسی طرح بھی واجب نہیں ہے۔ انسان کے ذہن سے واجب نکل گیا ہے۔ اور اس کی جگہ پیسہ آ گیا ہے جو کسی طرح نکلتا ہی نہیں! قلی کے بعد ٹیکسی، ٹیمپو اور رکشا والے ہیں، جو مول بھاؤ میں قلیوں سے بھی آگے ہیں۔ وہ جیب کی صفائی دن کے اجالے میں کرتے ہیں۔ پھر بھی جیب ہمیشہ میلی ہی رہتی ہے۔!

میں پھر اس عورت کو دیکھنے لگا ہوں۔ جو کھڑی اپنا بدن کھجلا رہی ہے! شاید وہ بہت دنوں سے نہائی نہیں ہے۔ میل اس کے بدن پر اس طرح جم گئی ہے، جیسے کسی آئینہ پر گرد و غبار۔۔! کھجلی تو بدن میں کبھی بھی ہو سکتی ہے، لیکن بیکاری میں یہ زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اتنی دیر تک مسافروں کے باہر نکلنے اور انھیں اپنی جگہ بیٹھ جانے کا انتظار کرتی رہی ہے۔

وہ ایک ڈبے کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے

"بابا! بھگوان کے لیے!"

"ہٹو جی پرے۔۔! جب دیکھو سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہیں، یہ ..."

"ایک پان ہماری طرف سے اسے بھی دے دو۔" کوئی آدمی عورت کے جوان جسم پر نظر ڈالتے ہوئے کہتا ہے۔

عورت جلدی سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ان کی ہنسی اب بھی اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے۔ پان والا ہنس رہا ہے۔ وہ آدمی رو رہا ہے!

ایک کھڑکی کے پاس کوئی بڑھیا بیٹھی ہے۔ اور گرم گرم چائے پی رہی ہے۔ اس کے ساتھ دو بچے بھی ہیں جو کیلا کھا رہے ہیں۔

"ماتا جی!" وہ عورت اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا کر کہتی ہے۔

بڑھیا پرس میں سے دس پیسے نکال کر اسے دیتی ہے۔ عورت کی گود میں جو بچہ ہے، وہ کیلا کھاتے ہوئے بچوں کو ایک ٹک دیکھ رہا ہے۔ بڑھیا ایک کیلا اسے بھی دیتی ہے۔ بڑھیا کو اس عورت کا بچہ بھی اپنا ہی جیسا معلوم ہوتا ہے۔

رحم اور پیار صرف عورتوں کا حصہ ہے یہ رحم اور پیار کہیں ملے یا نہ ملے، عورتوں کے ہاں ضرور ملے گا!

وہ پھر آگے بڑھ جاتی ہے۔ کتنے چہرے ریل کی کھڑکی سے باہر جھانک رہے ہیں۔ وہ ایک آدمی کے پاس پہنچتی ہے جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے۔ اس کی نگاہیں چائے والے کی طرف ہیں۔ کبھی کبھی وہ ٹھیلے والے کو بھی دیکھتا ہے۔ جو گرم گرم پکوڑے بیچ رہا ہے۔ شاید اس آدمی کو بھوک لگی ہے۔ عورت کا بچہ ایک ٹک اس آدمی کو دیکھ رہا ہے۔ آدمی اپنا سر اندر کر لیتا ہے۔ عورت اسی طرح کھڑی ہے، آخر اسے کہنا پڑتا ہے۔

"کیا دیکھ رہی ہو، آگے بڑھو نا!"

پھر بھی وہ ہٹتی نہیں ہے۔ جیسے وہ کچھ اور سننا چاہتی ہے۔ لیکن آدمی نیک ہے۔ وہ کوئی ناواجب بات نہیں کہتا ہے۔ وہ صرف اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے!

اب اس عورت کے قدم تیز تیز اٹھ رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی چل دے گی۔ وہ ہر ڈبے سے ہوتی ہوئی ایک دم آگے نکل جاتی ہے آگے انجن ہے، جس کے سامنے آکر بہت سے لوگ ایسے حالات میں خودکشی کر لیتے ہیں۔ لیکن عورت بزدل نہیں ہے۔ عورتیں بزدل ہوتی بھی نہیں ہیں!

ایک چائے والا چلا رہا ہے۔ میں اس سے چائے لیتا ہوں۔! جو گرم تو ہے لیکن چائے نہیں ہے۔ میں جب بھی کسی ریلوے اسٹیشن پر چائے پیتا ہوں، محسوس ہوتا ہے، گرم پانی پی رہا ہوں۔ گھر پر اس سے اچھی چائے بنانے پر بھی میں اپنی بیوی کو ڈانٹ دیتا ہوں۔ جس سے وہ خفا ہو جاتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ کتنی بھی اچھی چائے بناؤں، انھیں تو جچتی ہی نہیں۔ باہر کی جو مُنہ لگ گئی ہے۔ اور وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگ جاتی ہے! ہائے میں کس کے پلے پڑ گئی!

میں گھڑی دیکھتا ہوں۔ گاڑی لیٹ ہو رہی ہے ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ باہر آگئے ہیں اور یہاں وہاں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کر رہے ہیں چاٹ والا جلدی جلدی چاٹ بنا رہا ہے۔ ایک عورت اپنی ساری شرم و حیا کھو کر جلدی جلدی چاٹ کھا رہی ہے۔ جیسے وہ ازل سے بھوکی ہے عورتیں گھر میں بھی بھوکی رہتی ہیں، باہر بھی!

جو لوگ پکوڑے کھا رہے ہیں، ان سے وہ عورت دور کھڑی ہے۔ شاید اب وہ تھک کر مایوس ہو گئی ہے۔ جب ہی ایک اپ ٹو ڈیٹ آدمی اس کے پاس سے گزرتا ہے۔

"بابو جی!" وہ کہتی ہے۔

"جوان ہو کر بھیک مانگتی ہے۔ ہمارا ہندوستان چوپٹ ہو گیا ہے! تمہارا آدمی کیا کرتا ہے؟"

"آدمی ہوتا تو کاہے کو، بابو جی!"

"اچھا۔ اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ لیکن بھیک مانگنے سے کام نہیں چلے گا۔ کوئی کام کرو۔"

وہ اسے صرف مشورہ دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

عورت ایک جگہ بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا بچہ رونے لگتا ہے۔ شاید اسے بھوک لگی ہے۔ لوگوں کو کھاتے ہوئے دیکھ کر ایسے بھی بھوک بڑھ جاتی ہے۔ وہ میلے کپڑے کی ایک پوٹلی کھولتی ہے۔ اور اس

میں سے ایک سوکھی ہوئی روٹی نکالتی ہے۔ وہ آدھی روٹی بچے کو دیتی ہے، آدھی خود کھانے لگتی ہے۔!

گارڈ ہری جھنڈی دکھا رہا ہے۔ پانی کے نلکے کے پاس بھیڑ لگ گئی ہے۔ لوگ جلدی جلدی پانی پی کر اپنے ڈبوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ وہ عورت کھڑی ہو گئی ہے۔ شاید اب وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے۔ میں جلدی سے اس کے پاس جاتا ہوں۔ اور دس روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتا ہوں۔

"یہ لو!"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک انجانا خوف کانپ رہا ہے۔

"اسے لے لو۔" میں پھر کہتا ہوں۔ لیکن وہ پیچھے ہٹنے لگتی ہے۔

"رکھ لو نا!"

"نہیں، مجھے یہ نہیں چاہیے!"

"کیوں ۔۔ ؟"

"میں اس بچے ہی کو نہیں پال سکتی، دوسرے کو کہاں سے پالوں گی؟"

"میں تو ایک مسافر ہوں جو دیر سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔" پھر بھی شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اسے یقین نہیں آ رہا ہے ۔۔۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے اب بھی دیکھ رہی ہے۔

گاڑی چلنے کی سیٹی ہو چکی ہے۔ میں جلدی سے اسے نوٹ تھما کر اپنے ڈبے کی طرف بڑھ جاتا ہوں ۔۔ اور سوچ رہا ہوں ۔۔ جلدی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤں ۔۔!! ●

—— شیدا انبالوی

ہریانے کی خاک

کتنی پاکیزہ ہے نزوانے[1] کی ملانے[2] کی خاک
ہم سرِ خلدِ بریں ہے اپنے ہریانے کی خاک
رشکِ جنت گو ہے اسرانے[3] کی توہانے[4] کی خاک
لیکن اس سے بھی سوا ہے سارے ہریانے کی خاک
شامِ ہریانہ پہ ہے صبحِ بنارس بھی نثار
اللہ اللہ کیا ضیاء پرور ہے ہریانے کی خاک
اس کے آگے گلشنِ فردوس بھی ہے آب آب
کس قدر سرسبز ہے شاداب ہریانے کی خاک
واہ کیا کیا ہے میرے پائے نظر کے واسطے
پرنیان و اطلس و کمخواب ہریانے کی خاک
کیوں نہ شیدا کے دل و جاں ہوں فدا اس خاک پر
دلربا ہے، جاں فزا ہے سارے ہریانے کی خاک

۱ ۲ ۳ ۴ ہریانہ کے مشہور قصبوں کے نام

قطعات

صابرؔ دت

خدشہ

یوں اتارو نہ ناؤ پانی میں
موجِ طوفاں ہے سر اٹھائے ہوئے
زندگی کے حسین کوچوں میں
موت پھرتی ہے منہ چھپائے ہوئے

پشیماں

ہر ایک موج میں شامل روانیاں تیری
سنا رہی ہے ہر اک شئے کہانیاں تیری
میں تجھ سے روٹھ کے اٹھ تو گیا ہوں محفل سے
رُلا رہی ہیں مجھے مہربانیاں تیری

اسیرِ دل

بدنصیبی ہے اس کی آزادی
زلفِ جاناں کا جو اسیر نہیں
میرے دل میں ہے آپکی چاہت
مجھ سے بڑھکر کوئی امیر نہیں

لمس

شیشۂ دل میں شب تنہائی
یوں ترا چہرہ اُتر آتا ہے
چاندنی رات میں جیسے صابرؔ
سانپ صندل سے لپٹ جاتا ہے

آرزو

دل میں لے کر ہم آس پھرتے رہے
ہم خوشی میں اداس پھرتے رہے
تو رہی دور دور ہم سے مگر
ہم ترے آس پاس پھرتے رہے

ظہورالدین

بیدی کی ڈرامہ نگاری

کیچڑ میں دھنسے پہیے کا احتجاج

بیدی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کے افسانے اور ناولٹ تو نقادوں کی توجہ کا مرکز بنے ہی ہیں، ان کی زندگی کے نجی پہلوؤں اور ان کی فلمی زندگی کے بارے میں بھی بہت سا لٹریچر ہمارے ادبی اور غیرادبی صحیفوں میں محفوظ ہو گیا ہے۔ ان کی شخصیت کا صرف ایک پہلو مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جس پر اتنی توجہ نہیں دی گئی ہے جتنی کہ دی جانی چاہئے تھی اور ان کی شخصیت کا یہ پہلو ہے ان کی ڈرامہ نگاری۔ ان کے ڈراموں کے اس طرح نظر انداز ہو جانے سے اگر کوئی یہ نتیجہ اخذ کرے کہ ان میں کچھ ہے ہی نہیں تو میرا خیال ہے یہ بیدی اور اردو ڈرامے کے ساتھ زیادتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم اردو والے شروع سے ہی ڈرامے کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کرتے آئے ہیں۔ اس سردمہری کی وجہ چاہے کچھ بھی رہی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے اس رویے کی وجہ سے اردو ڈرامہ اور مجموعی اعتبار سے اردو ادب بیش قیمت سرمائے سے محروم ہو گیا ہے۔

اردو ڈرامے کی عمر کوئی زیادہ نہیں ہے۔ سو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ کسی صنف کے ارتقاء کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا، خصوصاً جب وہ عرصہ تاریخ کا سب سے پُرآشوب دور بھی رہا ہو۔ یہ بات دوسری ہے کہ اردو کا بیشتر ادب آگ اور دھوئیں کی قوس قزح کے سائے میں ہی پل کر جوان ہوا ہے۔ واجد علی شاہ سے لے کر اب تک کی ہماری تاریخ کا نقشہ آپ کے سامنے ہے۔ میں اس خوں آشام دور کی یاد تازہ کر کے آپ کے اور اپنے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا لیکن اتنا کہہ دینا بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ اردو ڈرامہ اس مختصر سی مدت میں خون اور آگ کے ان گنت دریاؤں سے ہو کے ہم تک پہنچا ہے۔ شاید اسی لئے اس کے ہر پہلو اور ہر ادا میں ہمیں خون کے ایسے چھینٹے دکھائی دیتے ہیں جو اصحاب بصیرت

کے لئے تاریخ کے گمشدہ اوراق سے کم درجہ نہیں رکھتے۔ کیچڑ میں دھنسا ہوا پہیا جب آگے نہیں بڑھ پاتا تو وہ اپنے ہی محور پر گھومنا شروع کرتا ہے۔ اور اگر کیچڑ کی گرفت زیادہ مضبوط ہو تو وہ گھومتے گھومتے بالآخر دم توڑ دیتا ہے۔ پہیے کا اپنے ہی محور پر گھومنا اور پھر ٹوٹ کر ناکارہ ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ وہ احتجاج ہے جو وہ کیچڑ کی سنگینی کے خلاف آخری دم تک بلند کرتا رہتا ہے۔ اردو ڈرامہ واجد علی شاہ اور امانت سے لے کر جدید ڈرامہ نگاروں تک کیچڑ میں دھنسے ایسے ہی پہیوں کی روداد ہے۔ میں نے ان دھنسے ہوئے پہیوں کی دل دوز، دل سوز اور دل فگار چیخیں سنی ہیں۔ ان کے دل کے نہاں خانوں میں سلگتی ہوئی اس چنگاری کو دیکھا ہے جو کبھی سنگلاخ سے سنگلاخ کوہِ طور کو بھی خاکستر کرنے کی قدرت رکھتی ہے یہاں اس بحث سے میرا مقصد ایسی چنگاری کو فروزاں رکھنا اور اگر ممکن ہو تو اسے ہوا دینا بھی ہے۔

بیدی نے جو ڈرامے لکھے وہ "بے جان چیزیں" اور "سات کھیل" کے عنوان سے شائع شدہ دو مجموعوں کی صورت میں ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انہوں نے ڈرامے لکھے ہوں گے جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ بہرحال میں ان کے دوسرے مجموعے یعنی "سات کھیل" کے کچھ ڈراموں کے ذکر و فکر پر ہی اکتفا کروں گا۔

بیدی کے ڈراموں کا سرسری جائزہ لینے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نظریاتی اعتبار سے ڈرامے کی اس روایت سے منسلک ہیں جسے حقیقت نگاری یا پھر سماجی، اشتراکی اور نفسیاتی حقیقت نگاری کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اپنے اسی دبستانِ فکر کی روایت کے عین مطابق وہ بھی اپنے موضوعات یا تو تاریخ سے حاصل کرتے ہیں یا پھر عصری سیاسی، سماجی اور نفسیاتی حقیقتوں سے۔ مثال کے طور پر "سات کھیل" کے پہلے دو ڈرامے یعنی "خواجہ سرا" اور "چانکیہ" تاریخ سے لیے گئے ہیں جب کہ باقی کے پانچ یعنی "تلچھٹ" "نقل مکانی" "آج" "درخشندہ" اور "ایک عورت کی نہ" عصرِ حاضر کی سیاسی، سماجی یا نفسیاتی حقیقتوں سے متعلق ہیں۔ موضوع تاریخی ہو یا عصری حقائق سے متعلق وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان کی سماجی معنویت برقرار رہے۔ اسی لئے ان کے وہ ڈرامے بھی کہ جو خالص تاریخی موضوعات کے حامل ہیں کسی نہ کسی عصری حقیقت کا علامیہ بن کر اسی عمل سے گزرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے کیچڑ میں دھنسے پہیے کے احتجاج کا نام دیا ہے۔

ان کے موضوعات سے اس تاریخی، سائنسی اور طبقاتی شعور کی بھی بھرپور عکاسی ہو جاتی ہے کہ جس کے تحت وہ مادی قوتوں کو ہی سماج کی حرکی قوتیں تصور کرتے ہوئے ان کی اثر پذیری کی حیرت انگیز صورتیں دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ مادے ہی میں انہیں وہ قوت نظر آتی ہے جو انسان کو قادر بنا دیتی ہے۔ مادے کے اپنے ضابطے اور اصول ہوتے ہیں۔ وہ اپنی الگ اخلاقیات رکھتا ہے اور ہر وہ شئے جو اس کے ترازو پہ پوری نہیں اترتی وہ اسے رد کر دیتا ہے۔ جو لوگ مادے کی اس قوت کو تسلیم

نہیں کرتے یا اس سے استفادہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ مادہ شعور کو جنم دیتا ہے اور شعور کی دنیا ایک مسلسل رزمگاہ حیات ہے۔ جس میں صرف ایک اصول کام آسکتا ہے۔ اور وہ ہے ڈارون کا SURVIVAL OF THE FITTEST لوگوں لنگڑوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ کوئی دوسرا رشتہ اس دنیا میں کام نہیں آسکتا۔ اسی اصول کے تحت اس کائنات کا ارتقاء ہوا ہے۔ اور اسی اصول نے انسانی بقا کے نئے باب کھولے ہیں۔ ان مادی قوتوں کی لگام جب صالح لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو عدل وانصاف کی اقدار پروان چڑھتی ہیں اور جب یہی منہ زور قوت شیاطین کی حاشیہ بردار ہو جاتی ہے تو استحصال اور ظلم فروغ پاتے ہیں۔ بیدی کے پہلے دونوں ڈرامے اسی سنگین حقیقت کو پیش کرتے ہیں۔ "خواجہ سرا" میں اگرچہ قباد کی شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلی کی وجہ کاشفہ کی محبت بتائی جاتی ہے، یعنی اس کا کاشفہ کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد صرف اس لئے خواجہ سرا بن کر حویلی میں آجانا کہ وہاں رہ کر اسے کاشفہ سے، جو خود بھی حویلی میں ملازم ہے، قریب رہنے کا موقع ملے گا، لیکن غور کرنے پر یہاں بھی اس تبدیلی کی بنیادی وجہ مادی قوتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی قرار پاتی ہے — نواب کی حویلی اور نواب کے خاندان سے متعلق لوگ یہاں اسی مادی قوت کا علامیہ ہیں۔ قباد جانتا ہے کہ نوچک کے ہاتھ میں جو طاقت ہے وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اسی لئے وہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر کے نہ صرف خواجہ سرا بن جاتا ہے بلکہ

آخر میں جب کاشفہ حویلی سے بھاگ کر سردار قریش سے شادی کرلیتی ہے تو وہ اس حادثے کو بھی خاموشی سے برداشت کرلیتا ہے کاشفہ بھی جانتی ہے کہ مادی قوت کا مقابلہ متبادل مادی قوت سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کا محبوب قباد ہتھیار ڈال چکا ہے تو وہ متبادل مادی قوت تلاش کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتی اور خلجی سردار قریش سے ناتا جوڑ کر اس کے ساتھ چلی جاتی ہے "چانکیہ" میں پر دیمک کی خودکشی بھی مادی قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے ہی کی علامت ہے۔ یہاں چندر گپت اور چانکیہ مادی قوتوں کی ہی نمائندگی کرتے ہیں۔

بیدی اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ انسان اپنے ارادے، فیصلے اور عمل سے اپنا مستقبل بنا سکتا ہے۔ وہ اپنے مقدر کا خود مالک ہے اور جس طرح چاہے اپنے فیصلے، ارادے اور عمل سے اسے سنوار سکتا ہے۔ اپنے اسی یقین کے تحت وہ "خواجہ سرا" میں کاشفہ کو پہلے تو اس بات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے دکھاتے ہیں کہ اس کے محبوب قباد نے بہادر اور نڈر ہوتے ہوئے خواجہ سرا بن کر نواب کوچک کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور پھر بجائے نواب کوچک سے شادی کرنے کے خلجی سردار قریش سے شادی کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ بیدی کے اس یقین کی سب سے اعلیٰ تجسیم چانکیہ کے کردار میں ہوئی ہے جو اپنے ارادے، فیصلے اور عمل سے نہ صرف چندر گپت کو ملک کا سب سے بڑا سمراٹ بنا دیتا ہے بلکہ اس کی سلطنت کو بھی سب سے طاقتور سلطنت کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بیدی کے ڈراموں میں اگرچہ بظاہر نچلے اور درمیانی طبقوں سے

تعلق رکھنے والے کردار ہتھیار ڈالتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں لیکن ان کی اس تسلیم و رضا میں احتجاج کا پہلو صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شکست میں احتجاج کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔ کیچڑ میں دھنسے پہیے کے احتجاج کی طرح۔ مثلاً خواجہ سرا کے آخر میں کاشفہ کے فرار ہونے کی اطلاع ملنے پر جب نواب ثالث زمانی قباد سے پوچھتی ہیں کہ یہ خبر سن کر بھی اس نے کچھ نہیں کیا تو وہ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔ "اتنی سی بات کے پیچھے اب مر تھوڑے ہی جائے ہے آدمی ـــ جینا بھی تو مقدم ہے۔" تو اس جملے میں احتجاج و بغاوت کی لے صاف محسوس ہو جاتی ہے۔ اسی طرح چانکیہ کے آخر میں جب پردیپک کی قربانی پر چندر گپت اور مہارانی دُردھرہ پردیپک کی جے جے کار کرتے ہوئے دکھائی جاتے ہیں تو اس میں بھی یہی لے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہاں پردیپک سرِ تسلیم خم کرنے کے باوجود احتجاج کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔

"تلچھٹ" اور "نقل مکانی" میں احتجاج کی یہ لے کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی ہے۔ "تلچھٹ" میں ایک بیوہ جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے بڑی محنت مزدوری سے ایک یتیم بچے یوگ کو پالتی ہے۔ کافی عرصے کے بعد اس کا باپ کہ جس کا فوج کی ملازمت کے دوران کسی جنگ میں کام آنا تسلیم کر لیا گیا ہے اچانک لوٹ آتا ہے۔ وہ اب چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا اس کے ساتھ چلا جائے۔ بیوہ کہ جو اب یوگ کی ماں ہے پہلے تو ایسا کرنے سے انکار کرتی ہے۔ یوگ بھی ماں کو چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن باپ جب بیٹے کی پرورش کی خاطر اٹھائی مصیبتوں کی قیمت روپے سے چکانے کی بات کرتا ہے تو ماں بپھر جاتی ہے اور احتجاج کے طور پر وہ نہ صرف ان دونوں کو وہاں سے فوراً چلے جانے کے لیے کہتی ہے بلکہ بطور احتجاج ہی وہ روپے بھی لے لیتی ہے کہ جو باپ نے اسے پیش کیے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر بیدی اس کے منہ سے جو الفاظ کہلواتے ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔

"ٹھہرو ..... تم نے استری کی بھاڑ ناؤں کا مول ڈالا ہے۔ ماتا کی قیمت لگائی ہے ـــ تو میں تمہارا مول نہیں لگا سکتی؟ لاؤ روپے ادھر پھینکو تاکہ میں تم جیسے کمینے رذیل انسان کو کبھی بھولے سے نہ دیکھ پاؤں ـــ شاید کہیں پشچاتاپ پھر تمہارے نیچ قدم میرے دروازے پر ڈال دے۔"

اسی طرح "نقلِ مکانی" کے آخر میں جب نفیس حالات سے مجبور ہو کر اپنی بیوی عذرا کو ایک عیاش رئیس شیو برت کے سامنے گانے کے لئے مجبور کر دیتا ہے تو یہ محسوس ہوئے بنا نہیں رہتا کہ اس کا یہ عمل بھی حالات کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف نہیں بلکہ ان کے خلاف ایک خاموش احتجاج کی صورت رکھتا ہے۔

عصری حقائق کو پیش کرتے ہوئے بیدی نے اپنے اکثر ڈراموں میں نچلے اور درمیانی طبقوں کے مسائل ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں طبقوں کی زندگی کی مصوری کرتے ہوئے انہوں نے ان کے اعتقادات و نظریات، ان کی محرومیوں اور مجبوریوں، ان کی تمناؤں اور حسرتوں اور ان کی خوشیوں اور غموں کی دلچسپ تصویریں اتاری ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے دو ڈرامے "تلچھٹ" اور "نقل مکانی" نہایت ہی اہم ہیں۔ نقل مکانی میں وہ خصوصاً درمیانے درجے سے تعلق رکھنے والے ایک کنبے کے ان مسائل کو پیش کرتے ہیں جو بڑھتی ہوئی آبادی کے آسمان کو چھوتی ہوئی مہنگائی

اور مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی مالی مجبوریاں بالآخر نفیس کو وہ سمجھوتہ بھی کرنے کے لئے تیار کرتی ہیں جس پر بیدی اس ڈرامے کو ختم کرتے ہیں۔ وہی نفیس جو طوائف کے نام سے بھی بدکتا ہے بالآخر مجبور ہو کر اپنی بیوی عذرا کو شمشاد بائی کی طرح، چاہے ایک بار کے لئے ہی کیوں نہ ہو، رئیس شیو برت کے سامنے گانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ہمارے ملک میں ٹیکنالوجی کے ارتقاء کے ساتھ ہی ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی، بے کاری اور ناقابل برداشت مہنگائی نے نچلے اور درمیانی طبقوں کا جو حشر کیا ہے اس سے کون واقف نہیں ہے۔ اسی لئے ان کی زندگی احتجاجات کا ایک لامتناہی سلسلہ دکھائی دیتی ہے۔

سیاسی وسماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ہی ساتھ بیدی نے ایسے ڈرامے بھی تخلیق کئے ہیں جو نفسیاتی حقیقت نگاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس نوعیت کے ڈراموں میں وہ انسانی نفس کی ایسی بے لاگ تصویریں اتارتے ہیں کہ ان کے مشاہدے کی گہرائی اور نفسیاتی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے مثال کے طور پر "تُھپٹ" میں جب ماں کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ یوگ کا باپ لوٹ آیا ہے تو اس کے دل میں یہ خدشہ بار بار سر ابھارنے لگتا ہے کہ کہیں یوگ اس کے ہاتھ سے چھن نہ جائے۔ یوگ اس کی عمر بھر کی کمائی ہے چنانچہ اس کے چھن جانے کے احساس کے تحت وہ جس طرح کی حرکات وسکنات کا مظاہرہ کرتی ہے ان سے اس کے نفس میں ہو رہی کشمکش کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ بار بار اس کا اطمینان کر لینا چاہتی ہے کہ کہیں یوگ بھی اسے دھوکا دینے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ چنانچہ وہ نہ صرف اس سے اس بارے میں پوچھتی ہے بلکہ اس کی یقین دہانی بھی حاصل کرتی ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا۔ یہاں بیدی نے اس کے نفس میں ہو رہی جنگ کی عکاسی کرنے کے لئے جن اعمال کا سہارا لیا ہے اور اس سے جن اعمال کا مظاہرہ کرایا ہے ان سے مشاہدے کی گہرائی اور نفسیاتی بصیرت کا بین ثبوت فراہم ہو جاتا ہے۔

"رخشندہ" میں بھی بیدی نے اسی نفسیاتی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ اس ڈرامے میں رخشندہ ایک ایسی اعصاب زدہ لڑکی ہے جو ہر وقت عجیب قسم کے وسوسوں میں گھری رہتی ہے۔ وہ طرح طرح کے واہموں سے دوچار ہوتی ہے اور اس طرح نہ صرف اپنی بلکہ اپنے کنبے کے دوسرے افراد کی زندگی بھی اجیرن کر دیتی ہے۔ گھر لوٹنے میں اگر اس کے خاوند کو ذرا سی بھی دیر ہو جاتی ہے تو وہ کہرام بپا کر دیتی ہے ایک اعصاب زدہ لڑکی کے کردار کو ابھارنے کے لئے بیدی کو نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ اس مقصد میں وہ کامیاب ہو گئے۔ رخشندہ کا کردار کسی سچ مچ کی اعصاب زدہ لڑکی کے کردار کی ہو بہو تصویر لگتا ہے۔

بیدی کی نفسیاتی بصیرت کا بھرپور مظاہرہ "ایک عورت کی نہ" میں ہوا ہے۔ اس ڈرامے میں بیدی کا بنیادی مقصد یہ بتانا ہے کہ عورت بظاہر جو کچھ کہتی ہے اس کے معنی اس کے برعکس ہوتے ہیں مثلاً اگر وہ نہ کہتی ہے تو اس سے اس کی مراد ہاں ہوتی ہے۔ بیدی نے یہاں عورت کی نفسیات کے جن پہلوؤں کو ابھارا ہے اس کا اندازہ آپ کو ان چند مکالموں سے بخوبی ہو جائے گا۔

"ہر ایک عورت دوسرے مرد کی باتوں کو پسند

کرتی ہے۔"

"اکثر عورتوں کا اپنی نئی ساری دکھانے، نئی سینڈل کی نمائش کرنے اور چند تحسین کی نگاہیں حاصل کرنے کے سوا اور کچھ مطلب نہیں ہوتا۔"

"عورتیں فطرتاً ہی سانٹھ گانٹھ پسند کرتی ہیں۔"

فنی اعتبار سے بھی بیدی نے حقیقت نگاری کی روایت کا ہی تتبع کیا ہے۔ ان کے ڈراموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کرداروں کے مقابلے میں پلاٹ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی توجہ زیادہ تر واقعات کے انتخاب پر مرکوز رہتی ہے۔ اور پھر ان کی ترتیب و تشکیل اس طرح عمل میں لاتے ہیں کہ ہر آنے والا واقعہ ہمیں کسی نئے انکشاف سے دوچار کر دیتا ہے۔ واقعاتی ترتیب کا یہ انکشافی لب و لہجہ ہی ان کے ڈراموں کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ اس ترتیب و تشکیل کو وہ واقعاتی یا تاثراتی ارتقاء کے لئے استعمال کرنے کی بجائے اسے شعور کو متحرک کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر انکشاف ہمیں متحیر کرنے کی بجائے بصیرت عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ انکشافات زلزلے کے جھٹکوں کی طرح ہمارے شعور کے خلیوں کو بیدار کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چانکیہ میں وہ ڈرامے کا آغاز چندرگپت کی خواب گاہ سے کرتے ہیں۔ اور پہلے ہی مکالمہ میں کہ جو خودکلامی ہے، وہ چندرگپت سے یہ جملہ کہلواتے ہیں۔

"یہ راج سمراٹ کا کرم نہیں کہ وہ تین گھڑی سے زیادہ سوئے۔"

چندرگپت کا یہ جملہ اس ڈرامہ کا پہلا انکشاف ہے جو نہ صرف اس کے کردار کے ایک اہم پہلو سے ہمیں روشناس کرتا ہے بلکہ ہماری فکر کے لئے تحریک کا کام بھی کرتا ہے۔ مہارانی دُردھر چندرگپت کے پہلو میں سوئی ہوئی ہے۔ چندرگپت کی خودکلامی اسے بھی بیدار کر دیتی ہے جس سے دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ اب یہاں یکے بعد دیگرے بیدی ان دونوں کی گفتگو کے ذریعے چند اور ایسے انکشافات کرتے ہیں کہ جو نہ صرف ان دونوں کے کرداروں کے متعدد پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں بلکہ ملک کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کو بھی پیش کرتے ہیں مثلاً شروع میں ہی چند ایک مکالموں کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مہارانی دُردھر کو یہ شک ہے کہ چندرگپت اپنے دربار کی ایک دوسری حسینہ الورادھا میں دلچسپی لیتا ہے۔ رشک کو دور کرنے کے لئے چندرگپت جو جملہ ادا کرتا ہے اس سے اس کے متعدد سیاسی و سماجی نظریات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چندرگپت کا یہ کہنا کہ "جس سمراٹ نے اپنے آپ کو بھاوناؤں میں کھویا اس نے اپنے پاؤں پر پرشا چلایا۔" اس سیاسی بصیرت کا پتہ دیتا ہے جس کے بل بوتے پر چندرگپت نے ایک بڑی سلطنت کو تشکیل دیا۔ یہیں پر ہمیں ایک طرف تو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ چندرگپت کی زندگی بنانے میں چانکیہ کی دانش وری کا کس قدر ہاتھ ہے اور دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دُردھر اس سے کس حد تک نفرت کرتی ہے۔ وہ یہ بھی کہنے سے گریز نہیں کرتی کہ چانکیہ نے اسے انسان کے مرتبہ سے گرا دیا ہے۔ اسے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ موقع ملنے کے باوجود چندرگپت چانکیہ کو موت کی سزا نہ دے سکا۔ دراصل دُردھر کو اس بات کا

اندیشہ ہے کہ چانکیہ ضرور کسی نہ کسی دن انہیں دھوکا دے گا۔ اس لئے وہ اب بھی اسے قتل کر کے نجات حاصل کرنا ضروری سمجھتی ہے۔

ڈرامے کے پہلے ہی منظر میں ہونے والے ان انکشافات کی ترتیب میں بھی بیدی کسی اصول کی پیروی نہیں کرتے۔ وہ ان انکشافات کو فطری انداز میں سامنے آنے کا موقع دیتے ہیں۔ جس سے اس بات کا صاف پتہ چل جاتا ہے کہ بیدی مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ کہیں ان انکشافات میں تسلسل یا واقعاتی و تاثراتی ارتقاء کی شان پیدا نہ ہو جائے۔ کیوں کہ اس صورت میں التباس حقیقت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جو ہمیں متحیر تو کر سکتا ہے بصیرت تک نہیں پہنچا سکتا۔

پہلے منظر میں ہی ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ چندر گپت تین گھڑیوں سے زیادہ نہیں سوتا اور یہ وہ رات کے پچھلے پہر ہی بیدار ہو کر امور سلطنت نمٹانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ لیکن آج اس کے بیدار ہونے کی وجہ دوسری ہے۔ آج وہ بیلوں کی دوڑ کا ایک مقابلہ دیکھنے جا رہا ہے کہ جس میں اس کا اپنا نندی بھی شریک ہے اور اسے پورا یقین ہے کہ اس کا دوست راجا پروتک جس کی مدد سے چندر گپت نے فتح حاصل کی ہے، اس کے نندی کو ہرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

دوسرے منظر میں اگرچہ بیلوں کی دوڑ کے مقابلے کو پیش کیا گیا ہے لیکن یہ مقابلہ محض پس منظر کا کام کرتا ہے۔ انکشافات کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہتا ہے اور چندر گپت اور چانکیہ کی گفتگو سے ہمیں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ چندر گپت اپنے دوست راجا پروتک کا بہت احترام کرتا ہے جب کہ چانکیہ اس کی بہادری اور عوام میں اس کی مقبولیت سے سخت خائف ہے۔ اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ وہ زندہ نہ رہے۔ چنانچہ اب وہ چندر گپت کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اسے قتل کرا دے۔ چندر گپت چانکیہ کی بات سن کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ اپنے محسن کو قتل کر کے وہ گناہ عظیم کا مرتکب ہو۔ لیکن چانکیہ کسی نہ کسی طرح اسے ورغلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے قتل کرنے کا جو منصوبہ وہ تیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی شادی الوزادھا سے کر دی جائے جسے چانکیہ نے عرصے سے بس پر پال کر وِش کنیا بنا دیا ہے۔ الوزادھا اور پروتک ایک دوسرے سے پیار بھی کرتے ہیں۔

تیسرے اور آخری منظر میں سب سے پہلے تو مہارانی دُردھر الوزادھا کو اس سازش سے مطلع کرتی ہے کہ جو ان کے خلاف تیار کی گئی ہے اور پھر شادی کے منڈپ پر جب الوزادھا پروتک کو حقیقت سے آگاہ کرتی ہے تو اس کی حیرانی کی حد نہیں رہتی جب پروتک مسکراتے ہوئے اسے بتاتا ہے کہ اسے تو یہ راز پہلے ہی سے معلوم ہے۔ آخر میں ہم پروتک کو ہنستے ہنستے جان دیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کی قربانی ایک عاشق کی موت نہیں بلکہ ایک پرخلوص انسان کا المیہ بن جاتی ہے۔

ان تینوں مناظر کی ترتیب میں اگرچہ تسلسل موجود ہے لیکن تینوں میں ابھرتے والے تاثرات متضاد ہیں۔ تینوں مناظر اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں اور جس طرح کسی بھی منظر میں کوئی مجموعی

تاثر نہیں اُبھر پاتا۔ اسی طرح تینوں بھی مجموعی اعتبار سے کوئی منفرد تاثر پیدا نہیں کرتے۔ کلاسیکی ڈرامے کی روایت کی روشنی میں پلاٹ کا یہ بحران ڈرامے کی سب سے بڑی خامی قرار پاتا ہے لیکن جدید ڈراما اس کے برعکس اسے اپنے لئے اہم تصور کرتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسا ضروری بھی ہے کیونکہ ڈرامے کے پلاٹ میں اگر واقعاتی اور تاثراتی دونوں طرح کے ارتقا کا اہتمام کیا گیا ہو تو انکشاف کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ان کی عدم موجودگی میں تاثر ایک شدید ضرب کی طرح ہمارے شعور کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔

جدید ڈرامہ کلاسیکی یا ارسطا طالیسی ڈرامے کی طرح وحدتوں کی بھی سختی سے پابندی نہیں کرتا۔ اسی لئے بیدی بھی اپنے ڈراموں میں ان تینوں کی پابندی کی کوئی شعوری کوشش کرتے نظر نہیں آتے۔ "خواجہ سرا" "چانکیہ" اور "نقل مکانی" میں تینوں وحدتوں کی سختی سے پابندی نہیں کی گئی ہے۔ "خواجہ سرا" کا پلاٹ نہ تو ایک دن کے واقعات پہ مبنی ہے اور نہ اس میں صرف ایک ہی کہانی پیش کی گئی ہے۔ تیاد اور کاشفہ کی مرکزی کہانی کے ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی دوسری کہانیاں بھی جاری رہتی ہیں۔ مثلاً دوسرا منظر کلیتاً نواب کوچک کی فتح بنگلہ کے لئے وقف ہے۔ تیسرے منظر میں کاشفہ کے فرار ہونے اور ایک خلجی سردار قویش سے شادی کرنے کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ وحدت مکاں کا اہتمام البتہ اس میں ہے۔ اسی لئے "چانکیہ" میں تینوں وحدتوں سے اور نقل مکانی میں وحدتِ زماں سے انحراف کیا گیا ہے۔

کردار نگاری کا جہاں تک تعلق ہے بیدی اپنے اکثر ڈراموں میں ایسے کردار پیش کرتے ہیں جو نچلے یا درمیانی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ــــ خواجہ سرا میں اگرچہ ماحول طبقہ بالا سے تعلق ہے لیکن اس کے دونوں مرکزی کردار نچلے طبقے سے لئے گئے ہیں۔ اسی طرح چانکیہ میں الذ رادھا نچلے ہی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ "تلچھٹ" میں ماں سے لوگ، جوتن کی ماں اور شری پت رائے سبھی کردار نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح بقیہ ڈراموں میں بھی بیدی انہیں طبقوں سے کردار لے کر ان کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں سے ڈرامے کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ یہ کردار ایک مخصوص ماحول کے پیداوار ہونے کے باوجود اس کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ "خواجہ سرا" میں کاشفہ، "تلچھٹ" میں ماں اور یوگ، "نقل مکانی" میں عذرا اور نفیس اور "آج" میں شنکر، صفدر اور بلا نوش اسی جہد مسلسل کے علامیے ہیں۔ وہ اپنے ارادے، فیصلے اور عمل سے ماحول کی سنگینی اور جمود کو توڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اسی لئے ان کے اعمال غیر منطقی نہیں بلکہ عقل و ادراک کی کسوٹی پر کسے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بیدی کے کرداروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نئی اور پرانی قدروں کے تصادم پیش کرتے ہیں۔ ان میں ہمیں نہ صرف نئی اور پرانی قدروں کی نمائندگی کرنے والے کردار مل جاتے ہیں بلکہ ہر کردار کے نفس میں ہونے والی کشمکش کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں بیدی کا ڈرامہ "آج" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس میں پروفیسر ٹھاکر اگر

پرانی قدروں کی علمبرداری کرتا ہے تو امرت، اشنکر اور صفدر نئی قدروں کی۔ ان اقدار کی آویزش کو بیدی کرداروں کی آپسی گفتگو کے ذریعے بڑی خوب صورتی سے ابھارتے ہیں۔ چند مکالموں سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔ ملاحظہ کیجئے:

پروفیسر ٹھاکر:۔ ہم انگریزی اوپیرا کو پسند کرتے ہیں لیکن ہم کرشن یاترا کو بھول گئے ہیں جنہیں کرشن پجاری اپنے مذہبی تہواروں میں کھیلا کرتے تھے جن میں جے دیو، چنڈی داس اور ودیا پتی کے گیتوں کو گایا جاتا تھا۔ جن میں رادھا اور کرشن کے روح اور اس کا سوامی مدھر وچنوں میں نہ مرنے والا پریم جتایا کرتے تھے آہ جے دیو کا گیت:

گووند ے کنو بنا گت نہیں.....

شنکر:۔ ہم پرانی روایتوں کے کندھوں پر ضرور آئے ہیں۔ لیکن ہم لکڑ بگڑ نہیں ہیں، جو گڑے مردوں کو اکھاڑتے پھریں۔ تمہارا باپ سلطان تھا تو تمہیں کیا؟

آگے چل کر شنکر پھر کہتا ہے۔

شنکر:۔ ہم اپنے ماضی کے وارث ضرور ہیں لیکن ماضی پرست نہیں ہیں۔

بیدی نے زبان و بیان کو بھی پر تکلف بنانے سے گریز کیا ہے۔ ان کی توجہ مقصد پر مرکوز رہتی ہے۔ یعنی جو کچھ کہنا ہے اسے سیدھے سادے اور غیر مبہم لب ولہجے میں بیان کرتے ہیں۔ حقائق کی صحیح عکاسی اور شعور کو متحرک کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ زبان کا پر تکلف استعمال مبالغے کو جنم دیتا ہے جس سے حقائق پر خواب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ صورت حال مسرت تو دے سکتی ہے

غزل

جمیل عزیز

بجھ گیا کس کی امیدوں کا دیا جلتا ہوا
ایک سناٹا ہے سارے شہر میں پھیلا ہوا
کس بھروسے پر نشیمن کی بنا رکھے کوئی
ایک پل میں جب اجڑ جاتا ہے گھر بستا ہوا
چل دیئے محفل سے چپکے سے وہ آنے پر مرے
آبرو رکھ لی ستمگر نے چلو اچھا ہوا
دیکھتا رہتا ہوں حیرانی میں تا حدِ نظر
جا کے رکتا ہے کہاں سیلابِ غم بہتا ہوا
حادثے بھی دم بخود ہیں میری جرأت پر عزیز
دیکھ کر پیہم مجھے ہر حال میں ہنستا ہوا

بصیرت عطا نہیں کر سکتی۔ بیدی اس نکتے کو سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اپنے ڈراموں میں وہ خاص طور پر اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ جو کچھ کہنا ہے اسے پیچیدہ یا گنجلک بنائے بغیر کہہ دیا جائے۔ جدید ڈرامہ جو حقیقت کی بے لاگ عکاسی کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اسے ایسی ہی زبان راس آتی ہے۔ پر تکلف زبان و بیان اس کے لئے سم قاتل کے مترادف ہیں

اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ناولٹ اور افسانے کی طرح ڈرامے کے میدان میں بھی بیدی اپنے ہم عصروں سے پیچھے نہیں ہیں۔ انہوں نے اگرچہ بہت تھوڑے ڈرامے لکھے ہیں لیکن ان میں ایسے ڈراموں کی کمی نہیں جنہیں اردو ڈرامے کی جدید روایت کا کوئی بھی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا کاش! انہوں نے اردو ڈرامے کی طرف بھی اتنی ہی توجہ دی ہوتی کہ جتنی انہوں نے افسانے کے لئے وقف کی۔ ●●●

ساحل احمد

غزلیں

آئینہ رکھنا ضروری تو نہیں
خط انہیں لکھنا ضروری تو نہیں
اب سفر بھی سخت مشکل ہو گیا
یوں سفر کرنا ضروری تو نہیں
ہر دیے کا آنسوؤں کی نوک پر
ہر طرح جلنا ضروری تو نہیں
ماتمی پوشاک پہنے تھی ہوا
شش جہت رکنا ضروری تو نہیں
اب تو ساحل ہر خوشی کا ذائقہ
آپ کو چکھنا ضروری تو نہیں
درد کا ساحل بنے گا آئینہ
برف کا گھلنا ضروری تو نہیں

اس کے دامن میں چھپا تھا خنجر
کتنی نظروں میں ٹنگا تھا خنجر
کس تفاخر سے ہنسا تھا خنجر
خود مجسم وہ بنا تھا خنجر
ہے وہ محفوظ ابھی تک گھر میں
جو کہ آباء کو ملا تھا خنجر
میں کہاں اس کا تعاقب کرتا
اس قدر تیز چلا تھا خنجر
مصلحت اس میں چھپی تھی اس کی
ٹانگ اس نے جو رکھا تھا خنجر
میں کسے دوش یہ دیتا ساحل
گھر کے آنگن میں دبا تھا خنجر



ایس۔ایس۔ چاولہ

ظاہر اور باطن

اکثر ہم ظاہر کو ہی سچ مان لیتے ہیں۔ ہم جو دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں اسی پر ہی یقین کر لیتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں یہ بات شاید نہیں آتی ہے کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے یا سنا ہے۔ کیا وہ حقیقت ہے۔ ڈرامہ ہے یا دھوکہ ہے؟ اور ایسے ظاہر پر یقین کرنیوالے عموماً دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ظاہر کو دیکھ باطن کی تہہ تک پہنچ سکنا کسی بہت سمجھدار انسان کا کام ہے۔

اور ظاہر کی بات ایسے شروع ہوئی تھی۔

ان کے کمرے کے فون کی گھنٹی بجی تھی۔ رام لال کی بیوی نے ریسور ہاتھ میں لیا۔ ہیلو کیا۔ رام لال نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

دوسری طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ بیوی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ بات چیت سنتی رہی تھی۔ پہلے اس کے چہرے کا رنگ لال سے گلابی ہوا اور پھر گلابی سے پیلا پڑ گیا تھا۔ بات چیت غالباً ختم ہوئی تو وہ منہ سے کچھ نہ بول سکی تھی۔ وہ اپنا ماتھا پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے پانی کا گلاس پیا۔ اور بڑی مشکل سے وہ بولی تھی۔ "سب ستیاناس ہو گیا ہے۔ کیا سوچا تھا مگر کیا ہو گیا ہے۔ جس لڑکی رادھیکا کو ہم اپنے بیٹے کے لئے دیکھنے آئے ہیں وہ اپنے عاشق ونود سے بات چیت کر رہی تھی۔ شاید لائن کراس کر گئی تھی۔ میں نے کچھ ایسا سنا تھا۔

"ہیلو رادھیکا۔ ڈارلنگ۔ تم تین دنوں سے نہیں ملی ہو۔ تمہیں دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئی ہیں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ رادھیکا نے کہا۔ ونود۔ ڈارلنگ۔ ویسے تو سب ٹھیک ہے۔ پر گھر سے نکل ہی نہیں سکی۔ شادی کے لئے ایک جگہ میری بات چیت چلی تھی۔ سو لڑکے کے ماں باپ آج کل یہاں پر آئے ہوئے ہیں۔ ان کی حاضری میں رہنا ضروری ہے۔ ان کے جاتے ہی فون کر دوں گی۔ ہاں۔ ونود۔ میں نے تمہیں ایک بہت ضروری بات بتانی تھی۔ وہ فون پر نہ بتا پاؤں گی۔ جب ملوں گی، تب ہی بتا سکوں گی۔ ونود نے اصرار کیا۔ قسمیں دیں تو رادھیکا نے اتنا ہی کہا کہ اسے دو روز سے صبح و شام قے آ رہی ہے۔ ونود نے کہا۔ جب بھی فرصت ملے تو مجھے فون کر دینا۔ بیٹھ کر بات کریں گے ویسے میری زندگی میں تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

رام لال کی بیوی نے کہا۔ "دیکھنے میں یہ لڑکی کتنی بھولی بھالی، معصوم لگتی ہے مگر اس کے کرتوت

تو دیکھو۔ پرماتما کا لاکھ لاکھ شکر کرو کہ بروقت پتہ
چل گیا ورنہ معلوم نہیں کہ آگے چل کر یہ لڑکی کیا گل
کھلاتی۔ رام رام پتہ نہیں اس دنیا کو اور اس کے لوگوں
کو، خاص کر نوجوان طبقہ کو کون سی آگ لگ گئی ہے کہ
جوانی بعد میں آتی ہے اور گل پہلے کھلنے شروع ہو جاتے
ہیں۔ اور ہاں۔ آپ نے آج صبح ناشتہ کے وقت
نوٹ نہیں کیا تھا کہ رادھیکا نے ناشتہ کے درمیان
پہلے ابکائیاں لی تھیں اور پھر شاید قے کرنے چلی گئی
تھی۔ خیر اب تو یہ کہانی ہی ختم ہے۔ بس کل ان لوگوں
سے اجازت لو اور گھر چلو۔ باقی کی جو دو تین لڑکیاں
ہماری نظر میں ہیں اب وہاں پر بات چیت شروع کرتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد رام لال کی بیوی تو سو گئی مگر اسے
نیند نہیں آئی تھی۔ وہ یہی سوچتا رہا کہ آخر آج کل کے
زمانہ میں ایک اچھے لڑکے یا لڑکی کی پہچان کیا ہے؟
کیا ہندوستان میں بے شرمی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ
لڑکیاں بے شرمی سے اپنے عاشقوں سے اپنی کرتوتوں
کا ذکر کرتی ہیں۔ دراصل رادھیکا کے متعلق بات چیت
ان کے کسی جاننے والے کے ذریعہ ہوئی تھی۔ پہلے تو
خط و کتابت ہوئی تھی۔ جب تمام باتیں پسند آگئیں تو
لڑکی والوں کے بار بار اصرار پر وہ دونوں ان کے گھر
چلے آئے تھے۔ پتہ لگا تھا کہ وہ خاندانی لوگ ہیں اچھی
شہرت اور دولت کے مالک ہیں۔ ان لوگوں نے
رام لال اور اس کی بیوی کی بے حد خاطر و مدارات کی
تھی۔ ان کو گھر اور لڑکی دونوں پسند آئے تھے بس
باقی بات یہ رہ گئی تھی کہ ان کا لڑکا امریکہ سے آئے۔
لڑکا، لڑکی ایک دوسرے کو دیکھیں اور اگر وہ ایک
دوسرے کو پسند کریں تو شادی کی بات چیت آگے چلے۔
مگر ــــ اب تو یہ حالت تھی کہ جان بوجھ کر مکھی
کو کون نگلے۔ اور کالی کرتوت والی لڑکی کو کون اپنے
گھر کی بہو بنائے گا۔

اب سوچنے کو اب کچھ نہ رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ
نیند غالب آگئی اور رام لال نیند کی آغوش میں سما گیا۔

صبح ہوئی سب لوگ ناشتہ کی میز پر جمع ہوئے
رام لال اور اس کی بیوی کے دل کے اندر کی خوشی تو
غائب ہو گئی تھی، اصل ہنسی تو باہر نہیں آرہی تھی، سو
اب وہ مصنوعی ہنسی سے کام چلا رہے تھے۔

مصنوعی قے کرنے کی عادت رادھا کو اسکول کے
زمانے سے تھی اور وہ ایسے کئی بار چھٹیاں لے لیا
کرتی تھی۔ اس نے آج بھی پیڑے کا ایک بڑا سا ٹکڑا اپنے
منہ میں ڈالا۔ پھر کافی پانی پی لیا۔ اور پانی اور پیڑا معدہ
میں گھلتا رہا۔ اور کچھ دیر بعد رادھیکا نے دو تین بار
ابکائیاں لیں اور سب کے سامنے بالکنی میں پڑے گملے
میں جا کر قے کر دی۔ رادھیکا پھر بڑے مزے سے آکر
بیٹھ گئی اور کہہ دیا کہ رات کو کھانے میں کوئی بد پرہیزی
ہو گئی تھی اسی لئے اسے قے آگئی تھی۔ مگر رام لال
اور اس کی بیوی کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا تھا کہ رات
کو جو انہوں نے فون پر بات سنی تھی وہ بالکل سچ تھی۔

رام لال اور اس کی بیوی نے جانے کی اجازت
لی اور کہا کہ وہ انہیں جلد ہی اپنے فیصلہ کے بارے میں
اطلاع دے دیں گے۔ کچھ عرصہ بعد رام لال نے انہیں
خط لکھ دیا کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہ لوگ اس
رشتہ کو آگے بڑھا نہ سکیں گے۔ انہوں نے ان
لوگوں کی خاطر و مدارات کا بہت شکریہ ادا کیا تھا۔

اس خط کے موصول ہونے کے بعد رادھیکا نے
اپنی ممی پاپا کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ بزازی کی
دکان پر پڑا کپڑے کا تھان نہیں ہے جسے ہر گاہک

کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اب وہ ونود سے ہی شادی کرے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ونود کا خاندان ان کے مقابل امیر نہیں ہے مگر ونود الیکٹرونکس انجینئر ہے اس کی اچھی نوکری لگ گئی ہے وہ بھی نوکری کرے گی اور ان کا گزارہ اچھی طرح سے ہو جائے گا۔ آپ اپنی رضامندی دے دیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں نے تو پکّا ارادہ کر لیا ہے کہ میں اس سے سول میرج کر لوں گی ۔۔۔ ماں باپ نے دھمکی دی۔ منت سماجت کی اور پھر وہ شادی کے لئے رضامند ہو گئے۔ ایک ماہ بعد ان کی شادی ہو گئی تھی ۔ رام لال کے جانے کے بعد رادھیکا اور ونود مل نہ پائے تھے ۔ بس فون پر ہی بات چیت ہوتی رہی تھی ۔

ظاہر کے بعد اب باطن کی کہانی شروع ہوتی ہے.

پہلی رات ہی رادھیکا اپنے اشتیاق کو دبا نہ سکی اس نے پوچھا۔ "ونود! جو بات چیت کرنے کی ہم نے پہلے سے طے کر رکھی تھی وہ بات چیت تم نے مسٹر اور مسز رام لال کو فون پر کیسے سنوائی تھی؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے اندازے کے مطابق وہ ہماری بات چیت سن کر اس رشتہ سے بدظن ہو گئے تھے مگر یہ ہوا کیسے؟"

ونود نے کہا۔ "رادھیکا آج کے زمانے میں سائنس نے ترقی کر لی ہے کہ خلا میں تیر رہے راکٹ یا ہمارے چھوڑے سیارے خلا سے زمین کے ہر مقام کی فوٹو لے سکتے ہیں اور لوگوں کی بات چیت تک ریکارڈ کر سکتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں میرا کام کوئی بڑا معرکہ تو نہیں ہے اور اگر جیتنا ضروری ہو تو محبت اور جنگ میں ہر کام جائز ہے۔ ہم دو اب ایک ہیں کیونکہ رام لال اور اس کی بیوی ظاہر کو دیکھ کر چلے گئے اور باطن کی تہ کو نہ پا سکے تھے۔"

• • •

مہیش پٹیالوی



کسی سراب کا منظر مری نظر میں رہا
تمام عمر تجسس کے میں سفر میں رہا

کسی نگر میں لیا دم نہ اپنے گھر میں رہا
غبار و گرد کی صورت میں رہگذر میں رہا

افق افق کبھی اڑتا رہا خلاؤں میں
کبھی نگار کی صورت میں اپنے گھر میں رہا

جہاں کی فکر تھی مجھکو نہ کچھ خبر اپنی
تمام عمر میں آسیب کے اثر میں رہا

ہوا ہوئے وہ خلاؤں کے خوشنما منظر
اڑان بھرنے کا دم اب نہ بال و پر میں رہا

نکل کے باغ سے ٹھہرے کہیں نہ میرے قدم
میں بوئے گل کی طرح جانے کس سفر میں رہا

ہم ایک بار ملے تھے کسی ڈگر پہ مہیش
ہمارے پیار کا چرچا نگر نگر میں رہا

آزاد غزلیں

مجھکو اس طرح حوادث نے تراشا کہ مرے اپنے ہی پتھر سے سنور کر مرے کردار کا پیکر نکلا
وقت ہی میرے لئے تیشۂ آذر نکلا
لوگ بے چہرگیوں میں ہی چھپا لیتے ہیں اپنی پہچان
میں ہی نا فہم تھا جو بھیس بدل کر نکلا
زندگی بھر مجھے احساس کی دوزخ میں جلاتا رہا میرا ہی گنہگار وجود
میں تو خود اپنے لئے داورِ محشر نکلا
رات کے جشن میں شامل تو سبھی لوگ ہوئے اور کیا رقص کی صورت میں الاؤ کا بھی ہر اک نے طواف
راکھ میں دفن مگر صبح فقط ایک مرا گھر نکلا
سنگساری مری ناکردہ گناہی کی سزا تھی شاید
ہر گنہ گار لئے ہاتھ میں پتھر نکلا
بھیڑ میں سب یہی کہتے نظر آئے کوئی بیمار ہے دم توڑ رہا ہے کب سے
میں نے دیکھا تو وہاں قتل کا منظر نکلا

زندگی بھر میں فردا کے اندھے کنوئیں میں اترتا رہا
اور ڈرتا رہا
دور تک روز و شب کی صلیبوں پہ لٹکی ہوئی ایک ہی لاش ہے
لمحہ لمحہ یہاں کون مرتا رہا
میں رہا بن کے آسیب اپنے سے کمزور ہر شخص کی زندگی کے لئے
اور مجھ سے توانا مرا قتل کرتا رہا
کس طرح بن گئے راہِ تہذیب پر خون سے نقشِ پا
کون اس راستے سے گزرتا رہا
لوگ تو آ کے شہروں میں سمٹے مگر پر نہ جانے یہ شیرازۂ زندگی
کیوں بکھرتا رہا
میری حسِ سماعت پہ الفاظ کا زہر کچھ اس طرح سے انڈیلا گیا
میرا پیمانۂ صبر بھرتا رہا
سوز پر جس قدر وقت کی اور حالات کی دھول پڑتی رہی
اس کا چہرہ بھی اتنا نکھرتا رہا



ہیرانند سوز

منوہر لال گپتا

ہریانہ میں رامائن کال کے تیرتھ استھان

ہریانہ کو بھارتی سنسکرتی اور سبھیتا کا گہوارہ ہونے کا گورو حاصل ہے۔ آریہ سنسکرتی کا جنم اس بھومی پر ہوا اور یہاں ہی وہ پھلی پھولی۔ ہریانہ کا اتہاس بھارت کا اتہاس ہے۔ ہریانہ کا نام رشی، منیوں اور پکشی راج گورو ڈ کی تپو بھومی، ویدوں، اُپنشدوں اور گیتا کی جنم استھلی اندر، وشنو اور بھگوان شوجی کی یگیہ دھرا اور فیصلہ کن جنگوں کی رن بھومی کے روپ میں دنیا بھر میں مشہور ہے۔

ہریانہ میں ویدک کال سے لے کر تریتا اور دواپر یگ کے تیرتھوں کے ہونے سے اس کے سندر پراچین اتہاس پر پرکاش پڑتا ہے۔ ہریانہ کی بھومی کو بھارت کے اونچے درجے کے رشیوں اور منیوں تتھا سادھو سنتوں نے اپنے امولیہ پروچنوں اور گھور تپ سے متبرک کیا ہے۔ ان مہا پرشوں کے درشن کرنے کے لیے دیش کے بہت راجہ مہاراجہ وقت وقت پر یہاں آتے رہے ہیں۔ بھگوان شری رام اور شری کرشن کے یہاں آنے کے پرمان ملتے ہیں۔ ہریانہ کی پوتر دھرتی پر واقع زیادہ تر تیرتھ ست یگ یا مہابھارت کال کے ہی ہیں۔ جن کا شاعروں اور ادیبوں نے ذکر کیا ہے لیکن حال ہی کی کھوج اور ادھین سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ جہاں بھگوان کرشن اپنے رشتہ داروں کے ساتھ سورج گرہن اور مہابھارت یدھ وغیرہ کے موقعوں پر ہریانہ آئے وہاں دوسری طرف بھگوان شری رام بھی بن واس کے دنوں میں لکشمن سیتا کے ساتھ رشی منیوں کے درشن کرنے اور آشیرباد حاصل کرنے ہریانہ کی پوتر دھرا پر آئے تھے۔ شرون ناتھ کے یہاں آنے کا ثبوت ملتا ہے۔ شری رام کے بھگت پون پتر ہنومان کا جنم بھی ہریانہ میں ہی ہوا۔ لنکا پتی راجہ راون کے ہریانہ آنے کا ذکر ملتا ہے۔ رشی منیوں کے زیادہ آشرم سرسوتی کے کنارے پر واقع تھے جو دھرم کشیتر کوروکشیتر کی بھومی سے بہہ کر جاتی تھی۔

رام ہرد تیرتھ

ہریانہ کی پوتر بھومی پر جو رامائن کال کے دھرم استھان ہیں ان میں رام ہرد تیرتھ کا نام مشہور ہے — کوروکشیتر نگر سے بارہ کلومیٹر دور کوروکشیتر کیتھل سڑک پر پونا وا نام کا ایک پرانا گاؤں ہے جس کا تعلق ہنومان اور اس کے پتا پون رشی سے ہے۔ ایک کتھا کے انوسار جب ہنومان نے سورج کو اپنے مکھ میں ڈال لیا تھا اور دیوتاؤں کے پرتینوں سے سورج کے گولے کو چھڑا لیا تو ہنومان بھاگ کر اسی گاؤں کے رام ہرد تیرتھ میں چھپ گئے تھے۔ دیوتاؤں کی پرارتھنا اور آشیرباد سے ہنومان کو بہت شکتی مل گئی اور یہیں پر اس کا نام بجرنگ بلی پڑ گیا۔ اب اس تیرتھ کے نام

کا کام کوروکشیتر وکاس بورڈ اور لوگوں کے سہیوگ سے ہو رہا ہے۔ کہتے ہیں یہ سدھ استھان ہے۔ یہاں لوگوں کی مُرادیں پوری ہوتی ہیں۔

رام تھلی تیرتھ:

کوروکشیتر، شہر سے تقریباً ۵۷ کلومیٹر دور گوہلہ سب ڈویژن میں کھرکھا سڑک پر واقع دھرم استھان رام تھلی ہے جو "سادھوؤں والے ڈیرے" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ بھگوان رام چودہ سال کے بن واس کے دوران اترا کھنڈ کی یاترا کرتے وقت ہریانہ کی بھومی پر آئے تو وہ رام تھلی میں واقع گورو وششٹھ جی کے آشرم میں آئے تھے جن شروتی کے مطابق بھگوان شری رام لکشمن اور ماتا سیتا کے ساتھ بن واس کے چوتھے سال میں آئے تھے اور وہ یہاں کچھ سمے ٹھہرے تھے۔ اب یہاں وششٹھ گپھا اور وششٹھ سروور دیکھے جا سکتے ہیں۔

سیابن:

کوروکشیتر بھومی میں سات بن مشہور تھے۔ جن میں کیتھل سے ۲۰ کلومیٹر دور سیابن تھا جو اب سیون کے نام سے مشہور رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بھگوان رام نے دھوبی کے کہنے پر سیتا ماتا کا تیاگ کر دیا تو وہ بالمیکی کے آشرم میں آگئیں۔ من کو شانت کرنے کے لیے وہ مہرشی بالمیکی جی کے ساتھ کوروکشیتر بھومی میں مہاتماؤں کے درشن کرنے آئیں۔ وہ اس استھان پر آٹھ مہینے رہی تھیں۔ اب یہاں ماتا سیتا کا پراچین مندر، مائی سر تالاب اور وشنو کا مندر ہے۔

پولرٹھ تیرتھ:

یہ استھان سرسوتی ندی کے بائیں کنارے پر سیون سے آٹھ کلومیٹر اور کیتھل سے ۱۷ کلومیٹر دوری پر واقع ہے۔ اس استھان کی حال ہی کی کھدائی سے ملی پرانی چیزوں کو دیکھنے سے یہ پتہ لگتا ہے کہ یہ استھان پراچین کال میں بہت گورو شالی تھا۔ کہتے ہیں پولرٹھ میں راون کے دادا پلستیہ رشی کا آشرم تھا۔ اسی آشرم میں بالمیکی رشی کے ساتھ ماتا جانکی آئی تھیں۔ رشی سے اپنے پتی رام دوارا لنکا میں ہوئے یُدھ کے لیے پراشچت کیا۔ وہ یہاں چار مہینے ٹھہری تھیں۔ تھیہہ سے کے نزدیک سرسوتی پر مسلمان کال کا ایک پُل بنا ہوا تھا۔ کہتے ہیں تیمور نے اسی پُل کو پار کر کے حملہ کیا تھا۔ بعد میں مراٹھوں نے اس پُل کو تباہ کیا تھا۔ اور ۱۹۰۷ء میں یہاں پولرٹھ رگولیٹری کا نرمان ہوا تھا۔

پرشورام کا مندر:

جیند شہر سے تقریباً سات کلومیٹر دور رام رائے گاؤں میں راماین کال کا پرشو رام کا مشہور مندر ہے۔ یہاں ایک وشال تالاب ہے اور یہ استھان سمنت پنچک کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ بھگوان پرشورام نے خون سے پانچ تالاب بھرے تھے اور انھیں میں خون سے بھری انجلی دوارہ اپنے پتروں کا ترپن کیا تھا۔ یہ استھان رام ہردیا رامنش کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ایک اور کتھا پرچلت ہے کہ جب جنک پوری میں بھگوان شری رام نے پرشورام کا دھنش توڑا تو پرشورام سماچار ملتے ہی غصہ میں ہاتھ میں پھرسا لیے رام رائے میں واقع اپنے پتا کے آشرم سے جنک پوری آئے تھے جسے رام جی نے ٹھنڈا کیا تھا۔

کلیشور مہادیو:

کوروکشیتر نگر میں راماین کال کا ایک اور مشہور کلیشور مہادیو نام کا تیرتھ ہے۔ کہتے ہیں کہ لنکیشور مہاراجہ راون نے بھگوان رودر کی ستھاپنا یہاں کی تھی۔ پورانوں کے مطابق کل گیارہ رودر ہیں جن میں سے ایک یہاں ہے۔ یہاں پاپ ناشک لنگ کے پوجن کی پراچین کال سے مہما بتائی جاتی ہے۔

چکوادین کی راجدھانی:

سونی پت ضلع میں گنور کے نزدیک بلند پور

کھیڑی ایک پراچین ستھان ہے جو راماین کال میں راجہ چکرا وین کی راجدھانی تھی۔ لنکاپتی کا اپنی پتنی سوپوچنا کے ساتھ یہاں آنے کا ورنن ملتا ہے۔ چلکا رشی کے شراپ سے یہ تباہ ہوگئی تھی۔ اسی جگہ ایک تالاب ہے جس کا پانی کبھی نہیں سوکھتا۔

شرون کمار کا آنا:

یہ کتھا ملتی ہے کہ جب بھگت شرون کمار اپنے اندھے ماں باپ کو تیرتھ یاترا کے لیے کوروکشیتر بھومی میں لے جا رہے تھے تو وہ سونی پت کے نزدیک ست کبنھا نام کے ستھان پر کچھ وقت تک ٹھہرے تھے۔ اس جگہ پر شرون نے اپنے ماتا پتا سے مزدوری مانگی تھی۔ یہ سن کر وہ جان گئے کہ یہ سخت زمین ہے۔ جب شرون کمار اپنے ماتا پتا کو کندھے پر اٹھا کر کوروکشیتر بھومی کی حد میں داخل ہوا تو کہتے ہیں شرون کمار نے مزدوری مانگنی بند کر دی۔ پہیوہ میں شرون کمار کے آنے کا ذکر ملتا ہے۔

لو۔کش تیرتھ:

کیتھل پونڈری روڈ پر منڈری نام کا ایک گاؤں ہے جہاں لو۔کش کا پوتر ستھان ہے۔ کہتے ہیں کہ جب ماتا سیتا کرنال ضلع کے سیتا مڑھی ستھان پر زمین میں سما گئیں تو اس کا بالمیکی رشی کو بہت دکھ ہوا۔ وہ منڈری گاؤں میں ۲۴ دن تک مون رہے۔ ساتھ میں ان کے ساتھ لو۔کش تھے جن کے نام پر یہ تیرتھ مشہور ہوا۔

بالمیکی آشرم:

تھانیسر ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایک اونچے ٹیلے پر پراچین بالمیکی آشرم ہے۔ کہتے ہیں کہ مہرشی بالمیکی منڈری گاؤں چھوڑ کر اسی استھان پر آتے تھے اور یہاں جیوت حالت میں سورگ سدھار گئے تھے۔ انھیں کے شاگرد وابھریک رشی نے مہابھارت یدھ میں اپنی شکتی کو دکھایا تھا۔

انجلی مائی کا ٹیلہ:

کیتھل نگر میں نگر پالیکا کے نزدیک انجلی مائی (ہنومان جی کی ماتا) کا ٹیلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ہنومان جی کا جنم اسی استھان پر ہوا تھا۔ کیتھل اتری بھارت کی مشہور منڈی ہے۔

ارونائے کا مندر:

ضلع کوروکشیتر میں ارونائے راماین کال کا دھرم ستھان ہے جس کا تعلق راج رشی وشوامتر اور منی وششٹھ سے ہے۔ کہتے ہیں کہ جب دونوں رشیوں میں تپ کے معاملے میں جھگڑا ہوا تو دیوتاؤں نے بڑی مشکل سے ان میں صلح کروائی۔ وہاں آدی دیو مہادیو کی استھاپنا ہوئی جو اب سنگیشور مہادیو کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ارونا اور سرسوتی ندیوں کا سنگم ہے۔ ارونائے گاؤں میں درور سر رشی کا ستھان ہے۔ یہاں پر ہزاروں سال پہلے انھوں نے تپ کیا تھا۔ پنچایتی اکھاڑہ مہا نرمان نے ان تیرتھوں کو سندر بنانے میں اچھا کام کیا ہے۔

تریتا یگ کے مہاراجہ وین کے لڑکے مہاراجہ پرتھو نے پہیوہ کا نرمان کیا تھا۔ وامن پوران کے مطابق وشوامتر کو اسی جگہ پر براہمنتو پراپت ہوا تھا۔ اب بھگوان شیو کے تین مندر وششٹھ کی گپھا اور کوپ ہے۔

اگروہا تیرتھ:

حصار ضلع میں اگروہا قصبہ میں ایک وشال تھیہ ہے جو کبھی اگروال جاتی کے بانی مہاراجہ اگرسین کی راجدھانی تھا۔ وہ سورج بنسی راجہ تھے جو تریتا یگ کے انتم چرن میں ہوئے بتلائے جاتے ہیں۔ وہ مہالکشمی کے پجاری تھے اور شکتی کی پوجا کرتے تھے۔ اب ہریانہ سرکار نے بھی اس تیرتھ کے سدھار کے لیے کافی مدد دی

بقیہ ص۴۲ پر

خمار جیندوی

ہریانہ کی دھرتی

فضاؤں میں بہاریں ناچتی پھرتی ہیں گاتی ہیں
اُفق کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہیں
جہاں دن رات مستی میں گھٹائیں گھر کے آتی ہیں
جہاں پہ ہر طرف فصلیں ہی فصلیں لہلہاتی ہیں
اسے ہریانہ کہتے ہیں، یہ ہریانہ کی دھرتی ہے

جہاں بھگوان نے اُپدیش گیتا کا سنایا تھا
مٹو اِحق کے لیے مٹ جاؤ، دُنیا کو سکھایا تھا
زمیں کو امنِ ایماں کی بہاروں سے سجایا تھا
جہاں سے ہستیٔ باطل کو یکسر ہی مٹایا تھا
اسے ہریانہ کہتے ہیں، یہ ہریانہ کی دھرتی ہے

جہاں آزاد پنچھی پیار کے نغمے سناتے ہیں
جہاں کی وادیوں میں جنتوں کے خواب آتے ہیں
جہاں کے لوگ اکثر غیر کو اپنا بناتے ہیں
محبت سے محبت کے خزانے کو لُٹاتے ہیں
اسے ہریانہ کہتے ہیں، یہ ہریانہ کی دھرتی ہے

جہاں دلکش نظارے ہیں جہاں رنگت ہی رنگت ہے
بہ تعمیر و ترقی رات دن محنت کی برکت ہے
جہاں کی زندگی میں بھی بہشتوں کی لطافت ہے
جہاں صدق و صفا مہر و محبت کی حکومت ہے
اسے ہریانہ کہتے ہیں، یہ ہریانہ کی دھرتی ہے

اختر آزاد

رُو بہ زوال

نئی نسل پرانی نسل کو نگل رہی تھی....
صدیوں کا سفر، صدیوں کی اور سفر کر رہا تھا کہ جڑواں بچے کی پہلی آمد نے تاریخِ آدم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا — ایک بچے کی ایک آنکھ نہیں تھی تو دوسرے کا ایک پیر کمر سے ہی الگ۔

زمین و آسماں حیراں
ذرہ ذرہ پریشاں

دونوں بچوں پہ جس شخص کی پہلی نظر پڑی تھی وہ دیکھتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اور پاس کا ہجوم بھی آہستہ آہستہ منتشر ہو گیا تھا۔ لوگ بچے کی پرچھائیں سے خوفزدہ تھے صرف اس لئے کہ اس کی پرچھائیں اس عورت پر پڑ گئی جو خود کو قید کئے بیٹھی ہے تو وہ بھی ویسے ہی بچے جنے گی۔ اندھے — لنگڑے —

"یہ بچے اپنے ہمراہ مصیبتوں کا سمندر لیکر اس دھرتی پر وارد ہوئے ہیں۔ اس گاؤں کو مصیبتوں سے نجات دلانے کے لئے دونوں بچوں کو زندہ دفن کرنا ضروری ہے۔" ایک سفید بال والے نے کہا۔
باپ تو جیسے تیسے مان گیا۔ لیکن وہ عورت جو نو ماہ تک اپنی کوکھ کا درد برداشت کرتی رہی تھی، سسک پڑی اور سسکتی رہی.....

وقت کب، کیسے گزرا کسی کو پتہ نہیں چلا۔ اور جب پتہ چلا تو اس وقت تک گاؤں والوں کو دونوں بچوں سے کچھ نہ کچھ انسیت ہو ہی گئی تھی۔
وقت کے پیچھے پیچھے دونوں دوڑتے رہے....
دوڑتے دوڑتے چار ہو گئے —

اندھے، لنگڑے، گونگے، بہرے۔۔۔۔

پھر چاروں دنیا کی چار سمت پھیل گئے —

پورب، پچھم، اتر اور دکھن — !

صدیوں کا سفر، صدیوں کی اور سفر کرتے کرتے تھم گیا۔

نئی نسل — اکسی کی ایک آنکھ نہیں تھی تو کوئی دونوں ٹانگوں سے معذور۔ کسی کے دونوں پاؤں سلامت تھے تو کوئی سن اور بول نہیں سکتا تھا، اور کسی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا — ہاتھ نہ پاؤں، آنکھ نہ کان، سر نہ دھڑ۔۔۔۔۔

لوگ مضطرب و پریشان عیبوں کی پوٹلی لیے نجات کا ذریعہ ڈھونڈتے رہے۔ پریشانی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ڈاکٹر اور حکیم کے گھر تک بھول گئے تھے — بالآخر بھول کے اس سلسلے کو ایک عقلمند نے ختم کیا۔ جب گاؤں والے اپنی اپنی عیبوں کی پوٹلی لیے ڈاکٹر اور حکیم کے گھر پہنچے تو لوگوں کے سر سے آسمان سرک گیا۔۔۔ ڈاکٹر کے چشمے کا ایک گلاس سیاہ تھا اور حکیم بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔

دروازے کھلتے اور بند ہوتے رہے — مگر سب بے سود — !

"آج لولے، لنگڑے، گونگے اور بہرے، اندھے اور کانے بچے کثیر تعداد میں پیدا کیوں ہو رہے ہیں۔ ہزاروں سال قبل تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کیوں نہ ہم نسبندی کروالیں کہ نہ ہی ایسے بچے جنم لیں اور نہ ہی ہماری نسل کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے —"

مکھیا کی باتوں پر گاؤں والے ردّ وکد پر اتر آئے۔

"نہیں یہ بھگوان کی دین ہے۔"

"ہمارے مذہب میں ایسے بچوں کا قتل جرم ہے۔"

"اس طرح ہماری نسل دم توڑ دے گی اور ہم بے منزل، بے نشاں ہو کر رہ جائیں گے۔"

گاؤں کے ایک شخص نے، ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک دیو قامت شخص (جس کے ناخن سے لے کر بال، جسم کا چمڑے اور کپڑے بھی سفید تھے) اسے جھنجوڑ کر کہہ رہا تھا۔ "یہ لولے، لنگڑے، گونگے بہرے، اندھے اور کانے، سارے کے سارے تمہارے اپنے ہیں۔ تمہاری اپنی نسل ہے۔ اور جب تمہاری نسل، تمہارے بچے جوان ہو کر تمہیں نگل رہے ہیں تو تم ....." وہ شخص گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ہاں! اب میرے بچے میرے لیے عذاب بن چکے ہیں۔ اب ہمیں نجات چاہیے۔ نجات — نجات — نجات۔"

دیو قامت شخص نے عجیب نظروں سے اس شخص کو دیکھا۔ اور اپنے چہرے پر گہری مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ "ان بچوں سے واقعی تمہاری زندگی.... ہاں اب تمہیں ان مصیبتوں سے نجات ملنا ہی چاہیے۔"

ادھر سورج نکلا اور ادھر بات روشنی کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ بھوکے پیاسے دیو قامت شخص کی تلاش میں نکل پڑے۔

ایک شب سارے لوگ ایک وسیع میدان میں جمع ہوئے تھے۔ اس شب بھی وہی ساری باتیں دہرائی جا رہی تھیں اور اس شب بھی لوگ وہی سن رہے تھے۔ یکایک دیو قامت شخص (جس کے ناخن سے لے کر بال، جسم کا چمڑے اور کپڑے بھی سفید تھے)، ہجوم کے بیچ نمودار ہوا۔ جس کے دائیں ہاتھ میں ایک مشعل تھی۔ لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ لیکن جب آنکھوں میں ماضی کے خواب اتر آئے تو لوگ اس کے قدموں پر گر پڑے۔ اپنے اپنے

آنسوؤں سے اس کے قدموں کو دھونے لگے ۔۔ "کیا تمہاری اولادیں واقعی تمہارے اوپر مصیبت بن گئی ہیں ؟ اور تم سب ان مصیبتوں سے اپنے آپ کو پاک کرنا چاہتے ہو ۔۔ ؟" دیو قامت شخص نے پوچھا۔ سہمے ہوئے لوگوں کے اندر زندگی دوڑنے لگی۔ آنکھوں میں سورج اتر آیا۔ ہونٹ متحرک ہوئے اور درد میں لپٹی ہوئی آوازیں باہر نکلیں ۔۔ "ہاں ! ہمیں نجات چاہیئے ۔ نجات ۔۔ نجات ۔۔ نجات ۔۔"

دیو قامت شخص نے اپنا دایاں ہاتھ فضاؤں میں لہرایا ۔ مشعل کی لو بھڑک اٹھی ۔ دیو قامت شخص نے مشعل کی لو کو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رکھ کر پوچھا ۔ "تمہیں ان شعلوں میں کچھ نظر آرہا ہے ؟" سب نے عالم تذبذب میں اپنی اپنی آنکھیں شعلوں میں ڈال دیں ۔ ساری آنکھیں کچھ پانے کی تمنا میں جھلستی رہیں ... کئی ایک آنکھیں گنوانے کے بعد لوگوں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا ۔

" اے عالم رہبر ! ان شعلوں میں ایک وسیع پہاڑ ، کھائی ۔۔ کھائی کے سینے سے گزرتا ہوا خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں کا ایک پُر اسرار راستہ ... اور پہاڑ کی چوٹی پر ایک فقیر بیٹھا ہوا نظر آرہا ہے ۔"

" اگر تمہیں ان مصیبتوں سے سدا کے لئے نجات چاہیئے تو تم سب کل اس پہاڑ پر سورج کے طلوع ہونے سے قبل پہنچ جاؤ ..... تمہاری ساری مصیبتیں آپ ختم ہو جائیں گی ۔" دیو قامت شخص یہ کہکر روپوش ہو گیا ۔

لوگوں کے چہرے خوشیوں کی لالی سے بھیگ گئے ....

رات کے جنم لیتے ہی لوگ اپنی اپنی عیبوں کی پوٹلی لئے ہوئے پہاڑ کی ترائی میں جمع ہونے لگے ۔ لوگوں کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں ۔

پہاڑ کے درمیان کھائی کے قریب پہنچ کر لوگ رک گئے کیونکہ آگے بڑھنے کے لئے کوئی سبیل نہیں تھی ۔ ایک سبیل تھی جو کھائی کے درمیان تھی جس کے وجود سے لمبی لمبی خاردار جھاڑیاں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹے سر نکالے ہوئے تھے ۔ لمبی لمبی خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے لوگ دوسری سبیل کی تلاش میں ادھر ادھر پاگلوں کی طرح دوڑ رہے تھے ۔ وقت کا بہاؤ تیز سے تیز ہوتا جا رہا تھا ۔ ادھر سورج اپنی آنکھیں مل رہا تھا ۔ اور ادھر ایک آواز گونج رہی تھی ۔ "جلدی آؤ" جس کی لپیٹ میں سارا پہاڑ چلا گیا ۔ خوفزدہ لوگوں کی نظریں چوٹی پہ بیٹھے ہوئے فقیر پر پڑیں ۔ لوگ اب دوسری سبیل کی تلاش کرتے کرتے تھک گئے تھے ۔ لیکن تلاش کا سفر جاری تھا ۔ لوگ اب بھی دوڑتے تھے ۔ گر رہے تھے پھر دوڑ رہے تھے ۔ اس آس میں کہ کوئی دوسری سبیل نجات کا ذریعہ بن جائے اور ان کا وجود چھلنی ہونے سے بچ جائے ۔

سورج اب اپنا بستر چھوڑ چکا تھا ۔۔ لیکن اس کی پلکیں نیند کے خمار سے اب بھی بوجھل تھیں ۔۔ وہی آوازیں ایک بار پھر پہاڑوں کے سینے میں اتر گئیں ۔ پہاڑ لرز کر رہ گیا ۔ "جلدی آؤ ۔۔ جلدی ۔۔ ورنہ وقت تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے گا ۔ اور تم .... تم اسی طرح سسکتے ، تڑپتے رہ جاؤ گے ۔" فقیر کے ہاتھ اس سمت اٹھے ہوئے تھے ، جہاں ہلکی ہلکی سرخیاں تیر رہی تھیں ۔

لوگوں نے اپنی اپنی مشعلیں کھائی میں پھینک دیں ۔ کھائی سرخ سمندر بن گئی ۔

سورج کے خوف سے خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں کی سیبل پر لوگ اپنے اپنے وجود کو گھسیٹتے رہے کہ کہیں "وہ" نکل گیا تو کیا ہوگا ؟

کھائی میں کسی چیز کے گرنے کی آواز رک رک کر مگر مسلسل آ رہی تھی ۔ فضاؤں میں جلے ہوئے گوشت کی بو رچی بسی ہوئی تھی ۔۔۔ آسمان دھواں دھواں تھا ۔

"کہانی ختم ہو گئی ۔۔۔" راوی نے کہا ۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی ۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھر جانے کے لئے جیسے ہی کھڑے ہوئے ، راوی نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا ۔

"بھائیو ! کہانی ختم تو ہوئی ۔ لیکن کہانی اب بھی جاری ہے ۔"

لوگ دائرے میں سمٹ کر بیٹھ گئے تو راوی نے کہانی جاری رکھی ....

"وقت کے پَر لمبے ہوئے تو میں بھی جواں ہو گیا اور جب صدیوں بعد اپنی بند آنکھیں کھولیں تو میری چیخ نکل گئی کہ میرے چاروں بچے ... اندھے لنگڑے گونگے اور بہرے ہیں ۔ یہ کہتے کہتے راوی کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔ بھیگی آنکھوں سے اس نے لوگوں کو دیکھا ۔ لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے ۔ راوی نے رکیک آواز میں سوال کیا ۔

کیا نئی نسل ، پرانی نسل کو نگل رہی ہے ۔ ؟

۔۔۔ اور صدیوں کا سفر ، صدیوں کی طرف سفر کرتے کرتے تھک گیا ہے ۔ ؟"

راوی کے سوال پر سب خاموش تھے ●

بقیہ : ہریانہ میں راماین کال کے تیرتھ استھان

صہ ۳۲ سے آگے

ہے ۔ سرسہ نگر کا نام رامائین کال میں سرسوتی نگر تھا جو ندی کے کنارے پر واقع تھا ۔ اسی نگر میں بھگت نرسی بھات بھرنے آیا تھا اور بھگوان نے ہنڈی تاری تھی یہ بیوپار کی اچھی منڈی ہے ۔ شہر کے باہر ہنومان کا ایک پراچین مندر ہے ۔

بان گنگا :

کوروکشیتر سے ۶ کلومیٹر دور نرکا تاری کا وہ مشہور استھان ہے جو بھیشم کنڈ کے نام سے بھی مشہور ہے ۔ اس جگہ پر ارجن نے بھیشم پتاما کی پیاس بجھائی تھی یہ پون پت ہنومان کا پریہ استھان رہا ہے ۔ اب یہاں ۲۶ فٹ اونچی ہنومان کی مورتی کا نرمان ہوا ہے اور ست سنگ بھون کا نرمان شروع ہے ۔

اس طرح ہریانہ بھومی میں اوپر لکھے رامائین کال کے تیرتھوں کے علاوہ اور بھی استھان ہوں گے جن کی کھوج ہونی ضروری ہے ۔ ●●

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ارجن داس ملک ۔
نے ہریانہ سرکار کے لئے محکمہ تعلقات عامہ
ہریانہ ۔ ایس سی ۔ او نمبر ۱۸۹ - ۱۹۱ سیکٹر ۱۷ سی
چنڈی گڑھ سے نومبر ۱۹۸۸ء کے لئے شایع کیا ۔
طابع ۔ کنٹرولر گورنمنٹ پریس یو ٹی چنڈی گڑھ



عزت مآب ہری آنند براری گورنر ہریانہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ہریانہ راج بھون میں جناب اوتار سنگھ بھدانہ کو سٹیٹ منسٹر کے عہدے اور رازداری کا حلف دلاتے ہوئے۔

وزیراعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال کی خدمت میں "چیف منسٹرز فلڈ ریلیف فنڈ" کے لئے تین لاکھ روپے کا چیک پیش کرتے ہوئے سابق سپیکر پنجاب سردار رویندر سنگھ۔





چودھری دیوی لال وزیرِ اعلیٰ ہریانہ ضلع مہندرگڑھ کے موضع مادھوگڑھ میں "ممکن دوار پرشاسن کیمپ" کے موقع پر دیہی عوام کی شکایات سنتے ہوئے۔

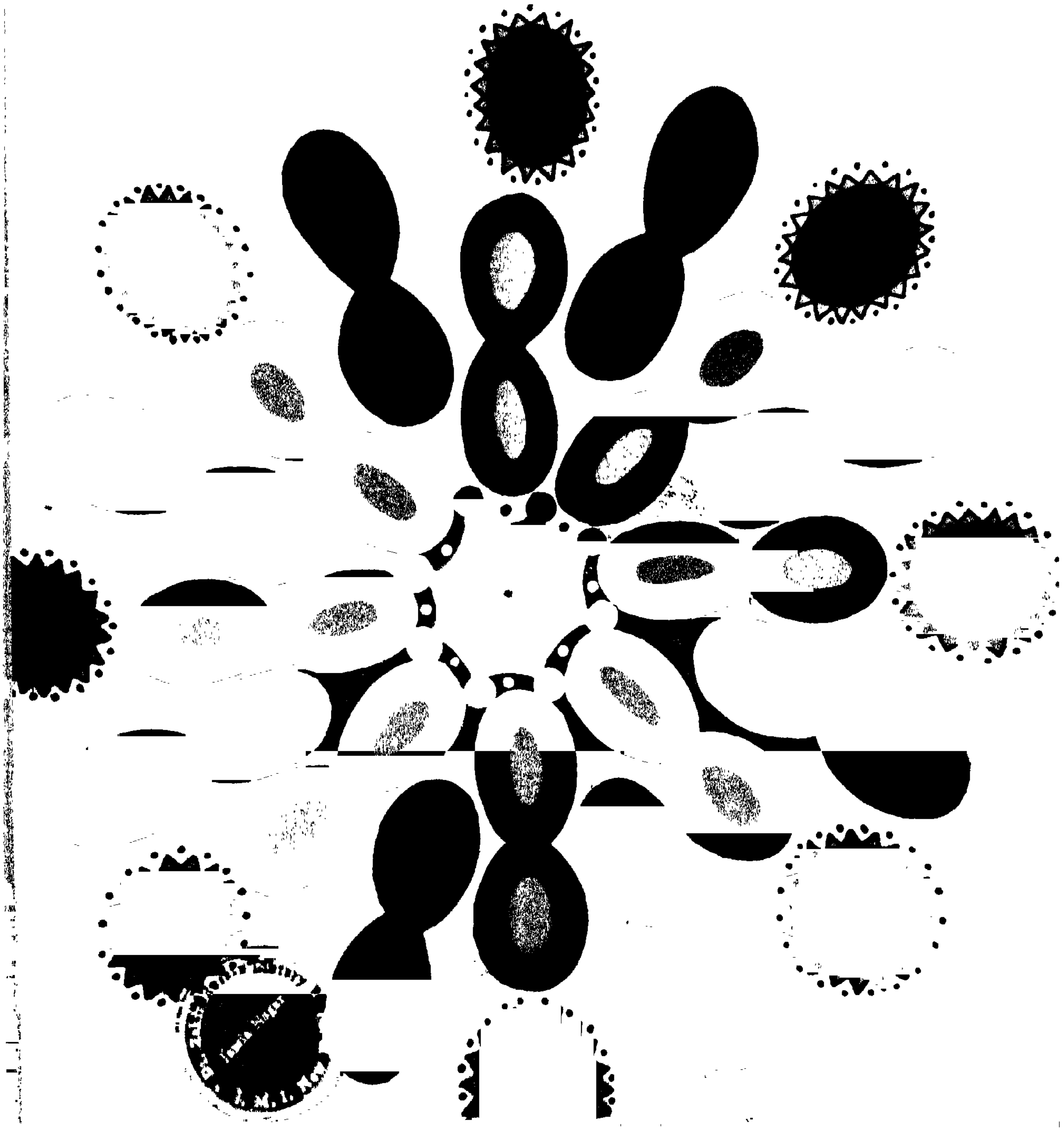
وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال اپنے چار روزہ دورۂ راجستھان کے دوران ایک گاؤں میں عوام سے خطاب فرماتے ہوئے۔



تعمیر ہریانہ

دسمبر ۱۹۸۸ء

6/1/89





گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند براری ۲ نومبر ۱۹۸۸ء کو ہریانہ راج بھون میں جناب ہری سنگھ سینی کو سٹیٹ منسٹر کے عہدے اور رازداری کا حلف دلاتے ہوئے۔

ہندوستان کی آزادی کی ۴۰ ویں سالگرہ اور پنڈت جواہر لال نہرو جنم شتابدی تقریبات منانے کے سلسلے میں گزشتہ دنوں ۲ نومبر ۱۹۸۸ء کو ہریانہ راج بھون میں عزت مآب ہری آنند براری، گورنر ہریانہ کی زیرِ صدارت ہریانہ سٹیٹ لیول کمیٹی کی چوتھی میٹنگ ہوئی۔ وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال اور نائب وزیرِ اعلیٰ ہریانہ جناب بنارسی داس گپتا نے بھی اس میٹنگ میں شرکت فرمائی۔



آپ کا محبوب مصور ماہنامہ

تعمیر ہریانہ

مدیر اعلیٰ

ارجن داس ملک

آئی۔اے۔ایس

مدیر

سلطان انجم

سرورق: اے۔پی۔بادشاہ

دسمبر ۱۹۸۸ء شمارہ ۱۲ جلد ۱۶

فی شمارہ ۵۰ پیسے

زر سالانہ ۵ روپے

خط و کتابت کا پتہ:

مدیر تعمیر ہریانہ، ایس سی او ۱۹۱-۱۸۹

سیکٹر ۱۷-سی چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۷

ترتیب



اپیل

اہلِ ہریانہ کو گذشتہ سال اس صدی کی بدترین خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے قحط کی سی حالت پیدا ہوگئی۔ خشک سالی سے متاثرہ لوگوں کو راحت پہنچانے کے لیے ہر ممکن امداد مہیا کی گئی۔ خاص طور پر چھوٹے کسانوں، بے زمین مزدوروں اور سماج کے دیگر کمزور طبقات کو فوراً امداد دی گئی۔ اس کام میں عوام نے جس فراخ دِلی اور بلند حوصلگی سے معاونت کی، میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔

اس سال مونسون اگرچہ جوش دمسرت کی نئی امنگیں لے کر آیا تاہم یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی کیونکہ جولائی کی بے پناہ برسات نے گذشتہ برس خشک سالی سے ہوئی تباہی سے نجات کی سبھی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ لگاتار بارش کی وجہ سے ریاست کے بیشتر ضلعوں میں سیلاب آگیا جس سے نہ صرف مال و اسباب کو ہی نقصان پہنچا بلکہ کسانوں کی کھڑی فصلیں بھی تباہ ہوگئیں۔ سیلاب سے متاثرہ لوگوں، خصوصاً غریبوں کو فوری راحت اور امداد پہنچائی جاتی ہے۔ آپ کی سرکار اپنے محدود وسائل کے باوجود اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے سبھی ممکنہ اقدامات کر رہی ہے۔ لیکن اتنے بڑے کام میں آپ تمام شہریوں کے سرگرم تعاون اور حمایت کی اشد ضرورت ہے۔

حکومتِ ہریانہ نے "ہریانہ چیف منسٹر ریلیف فنڈ" قائم کیا ہے۔ اس فنڈ میں دی جانے والی رقوم کمشنر، انکم ٹیکس، پٹیالہ کے خط محررہ ای۔سی۔آئی/۸۰۔جی/۱۸/۱۹۶۰۷، مورخہ ۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے مطابق انکم ٹیکس ایکٹ، ۱۹۶۱ء کی دفعہ ۸۰۔جی (۲) (اے) (۷) کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس فنڈ میں خود بھی فراخ دلی سے تعاون دیں، ساتھ ہی سیلاب سے متاثرہ لوگوں کو راحت پہنچانے کے لیے اپنے دوست، احباب کو بھی تحریک دیں کہ وہ بھی زیادہ سے زیادہ امداد اور بھرپور تعاون دیں۔

مجھے پورا یقین ہے کہ مصیبت کے اس وقت میں آپ اس کارِ خیر میں فراخ دلی سے تعاون دیں گے۔ آپ عطیہ کی رقم نقد یا چیک کی صورت میں جس پر "ہریانہ چیف منسٹر ریلیف فنڈ" لکھا گیا ہو، پرائیویٹ سیکریٹری وزیرِ اعلیٰ ہریانہ کے نام سے چنڈی گڑھ کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔

—— دیوی لال
وزیرِ اعلیٰ ہریانہ

سورج تنویر

غزل

جو زخم بیتی رتوں نے بخشے، نہ دل میں ان کا ملال رکھنا
اب آرہا ہے جو اگلا موسم، بخیر گزرے خیال رکھنا

جنوں کا بہروپ بھر کے اکثر، خرد بھی پھرتی ہے دندناتی
فریب میں اس کے آنہ جانا نگاہ میں اس کی چال رکھنا

نکل پڑو رزم گاہِ ہستی میں، عزمِ محکم کی تیغ لے کر
مگر تحفظ کے واسطے ساتھ ضبطِ پیہم کی ڈھال رکھنا

جواب طلبی ہو جب تمہاری تو تم بھی جرأت سے کام لیکر
جواب جس کا نہ بن پڑے، ان کے سامنے وہ سوال رکھنا

یہ ہے اخوت کی شرطِ اوّل یہی ہے اخلاص کا تقاضا
نہ رکھنا سینہ میں گردِ کینہ نہ شیشۂ دل میں بال رکھنا

شجر سے جو شاخ ٹوٹ جائے مقدر اس کا ہے سوکھ جانا
کبھی وہ سرسبز پھر بھی ہوگی، یہ وہم دل سے نکال رکھنا

بفیضِ دوراں شمار انکا، قطارِ اہلِ کمال میں ہے
جنہیں میسر ہے آجکل، بے کمالیوں میں کمال رکھنا

جنابِ تنویر جو چلے تھے، وہ ہو گئے سب شہیدِ منزل
رہِ وفا میں قدم رکھا ہے تو یاد اُن کا مآل رکھنا



عشرت ظہیر

احساسات کا تصادم

بجری کی لمبی شاہراہ کے آخری سرے پر ایک خوب صورت حویلی کھڑی ہے۔ جو بزرگوں کی عنایت اور رواداری کی امین ہے۔ تعمیر نو اور تازہ رنگ و روغن کے باوجود حویلی کے دیوار اور محراب، لمبے چوڑے برآمدے اور صحن دھندلکوں میں لپٹے ہوئے روایات اور پچھلی کہانی دہراتے ہوئے معلوم پڑتے ہیں۔

حویلی کے تنہا وارث مرزا نے حویلی پر ہزاروں روپے خرچ کیے۔ محض اس خیال سے کہ حویلی کے ساتھ جڑی ہوئی بدنامی کا تدارک ہو جائے۔ یہ حویلی جناتوں والی حویلی کے نام سے مشہور تھی۔ مرزا نے سوچا تھا کہ اس کی بناوٹ میں تبدیلی اور رنگ و روغن کے ساتھ اس کی بدنامی بھی نیک نامی میں بدل جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ شاید اس حویلی کے پس منظر میں گیلی گیلی لکڑیاں جل رہی ہوں۔ جس سے ساری فضا دھواں دھواں ہو رہی ہے۔

بڑی پری حویلی تھی۔ آمدنی کی کوئی فکر نہ تھی زمین، جائیداد، سنبھالے نہیں سنبھلتے تھا۔ مرزا کو کرنے کے لیے کچھ کام نہ تھا۔ سارا سارا دن گپیں ہانکنے، سیر و تفریح میں نکل جاتا، شطرنج کھیلتے یا سوئے رہتے۔ زندگی تھی لیکن اس کی کوئی پیچیدگی نہ تھی۔ نہ موت کا کھٹکا نہ اس کی پرواہ۔ کوئی جستجو نہ تھی، کوئی مقصد نہ تھا۔ ایک بے مزہ حلاوت تھی۔ پھیکے شب و روز تھے۔ لگتا تھا یہ اس دھرتی کے لوگ نہیں تھے۔

حالات نے ایک نیا موڑ لیا اور مرزا کا ایک دوست وہاں پہنچا۔ اس علاقے میں اس کی پہلی پوسٹنگ جنگلات کے محکمہ میں ہوئی تھی۔ لہٰذا مرزا نے اس کی رہائش کا بندوبست حویلی میں کر دیا، لیکن اسے مہمانوں کی طرح رہنا منظور نہ تھا، وہ PAYING GUEST کے روپ میں رہنے لگا۔

پے انگ گیسٹ وسیم، مرزا کی بیوی فاخرہ اور خود مرزا ایک مثلث کے تین اضلاع کی طرح ابھرنے لگے۔ مرزا کی غیر متحرک زندگی میں کچھ ہلچل آ گئی جیسے جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں

یک بیک اخلاص، محبت اور رشک وحسد کی
زیریں لہریں نظر آنے لگیں۔ لیکن یہ تبدیلی اندوہ گیں
بھی تھی اور مسرت آگیں بھی۔

مرزا سیمابی آدمی تھے۔ کبھی خوش گپی پر اُتر آتے، اور کبھی دوسرے لمحے ہی اچانک درمیان میں باتیں ادھوری چھوڑ کر اٹھ جاتے۔ شطرنج کے کھیل میں بھی ایسا ہی کرتے۔ کھیل کا فیصلہ بس ہونے ہی والا ہے کہ کہتے، بند کرو۔ اور کھیل بند۔ کسی پروگرام کے تحت نکلنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ سامان گاڑی پر لوڈ کیا جا رہا ہے کہ اچانک موڈ بدل گیا۔ پروگرام منسوخ۔ بیڈ روم میں جاکر سو رہے۔ نیند ان کو بہت پیاری تھی۔ سوتے بھی تو گھوڑے بیچ کر سوتے۔ جب دیکھئے مرزا وقت بے وقت سوئے ہیں۔ خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی فاخرہ بھی ڈھل گئی۔ ایسے ہی خالی لمحوں میں وسیم کی صحبت اسے انبساط اور شاد کام کرتی۔ دھیرے دھیرے وہ ایک دوسرے کے آرام و آسائش کا خیال رکھنے لگے۔

شام کے وقت جب سورج اپنا سفر پورا کر کے مغرب میں چھپ جاتا۔ کھلے میں گھومنے کے لیے دونوں دور تک نکل آتے۔ راستہ چلتے چلتے جب تھک جاتے، کسی پلیا پر یا زمین کے ایسے ٹکڑے پر، جہاں گھاس کی چادر بچھی ہو، وہ بیٹھ جاتے۔

اکثر وہ بالکل خاموش ہو جاتے، کیوں کہ دلوں میں ابلنے والی جوالا مکھی کو لفظوں کے سانچے میں ڈھال کر مطمئن نہ ہوتے۔ لیکن خاموشی بھی بڑی تکلیف دہ اور پریشان کن ہوتی ہے۔ جب خاموشی کی یہ چادر بہت گھنی ہو جاتی۔ فاخرہ دھیرے سے منمناتی۔۔۔

"تم نے کچھ کہا" اقبال باتوں کی ڈور کو دوبارا تھامنے کی کوشش کرتا۔

"نہیں تو۔۔۔"

"لگتا ہے۔ ہم دلوں کے گہرے اور اندھے کنوئیں میں قید ہیں۔ خاموشی بہت بے رحم ہوتی ہے اور پریشان کن بھی۔۔!"

"کلام، بسا اوقات اس سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ بھری ہوئی تشنگی کو خاموشی سے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔"

"بھری ہوئی تشنگی۔۔؟ جذبات کی بات کر رہی ہو تم؟ جذبات! یہ آگ ہے۔ اس کے شعلے بڑھتے اور پھیلتے ہی جاتے ہیں۔ انھیں وسیلوں کی حاجت نہیں۔ یہ اپنا راستہ، اپنی منزل خود تلاش کرتے ہیں۔۔ خود۔"

جذبات کی تپش کو مرزا نے بھی بہت قریب سے محسوس کیا۔ پھر دھیرے دھیرے مثلث کے تینوں ضلعوں کو خوف اور سراسیمگی کے سائے گھیرنے لگے۔ جذبات کے لپکتے لپکتے شعلوں کی دہشت۔ آگ کا دریا پار کرنے کی موہوم سی آرزو۔۔ یا ڈوب جانے کا خدشہ! کون جانے کیا کچھ تھا، ان کے دلوں میں اور چہرے پر۔۔!

غیر یقینی صورتِ حال میں ایک شام لان میں کرسیوں پر بیٹھے وہ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اچانک مرزا نے وسیم سے پوچھا۔

"فاخرہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں دراصل اس کے حسن کے بارے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔"

"تم خوش قسمت آدمی ہو، تم پر رشک کیا جا سکتا ہے۔"

"یعنی ؟"

"تمہاری بیوی یقیناً خوب صورت ترین عورت ہے اور بہترین ساتھی۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن سچائی اکثر الجھنوں کو اور بھی الجھا دیتی ہے۔"

وسیم خاموش رہا۔ اس نے پیالی سے چائے کا آخری گھونٹ لے کر برا سا منہ بنایا اور پیالی رکھ دی۔ پھر ماچس نکالی اور سگریٹ سلگانے لگا۔ اس نے سگریٹ جلانے میں کئی تیلیاں صرف کیں۔ دراصل ماچس کی تیلیوں سے کھیلنے کی اس کی پرانی عادت تھی۔

اچانک مرزا نے کہا۔

"یہ ایک بیہودہ حرکت ہے۔"

"جی۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں..." فاخرہ نے سرگوشی کی۔

مرزا نے بیوی کی طرف دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے، اس گھر کے نیچے بارود کی سرنگ بچھی ہوئی ہے۔ تمہارا ماچس کی تیلیوں سے اس طرح کھیلنا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

وسیم نے حیرت سے مرزا کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

فاخرہ نے دہشت اور سراسیمگی کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور نظروں کو جھکا لیا۔

اچانک مرزا نے اپنی کرسی کھسکائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں لائبریری جا رہا ہوں۔" پھر اس نے فاخرہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تم چل رہی ہو، میرے ساتھ۔ یا تمہارا وسیم کے ساتھ آؤٹنگ کا کوئی پروگرام ہے۔"

"میں چل رہی ہوں۔" فاخرہ کو ایسا محسوس ہوا، اس کی قوت گویائی اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔

وہ اچانک خود کو بیمار اور کمزور محسوس کرنے لگی۔

لائبریری میں دونوں ساتھ ساتھ پہنچے۔

مرزا کرسی پر بیٹھا اور پھر فوراً ہی ٹیبل پر سر ٹکا دیا۔

فاخرہ مسحور کھڑی رہی۔

کچھ بے رحم اور تکلیف دہ لمحے گزر گئے۔

بالآخر فاخرہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی مرزا کے پاس پہنچی اور اس کے بالوں میں اپنے ہاتھوں کی لمبی لمبی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔

اچانک لگا۔ وہ چکر لگا رہے ہیں، گھوم رہے ہیں۔ لائبریری کتابوں کی الماریاں، مرزا اور فاخرہ سب کچھ گردش کر رہے ہیں۔ لیکن صدیاں بیت گئیں یا وقت رک گیا، اس کی تخصیص کرنا مشکل تھا۔

بالآخر فاخرہ نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟"

مرزا نے سر اٹھایا، فاخرہ کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا۔

"کوئی کتاب نکال سکتی ہو، ان الماریوں سے جو ہمیں راستہ دکھلائے۔ کتاب مذہبی تعلیم کی ہو،

یا ناول، جس میں دلوں کی داستان رقم کی گئی ہو۔ یا تاریخ کا کوئی عہد ڈھونڈ لو، جو فیصلے تک پہنچنے میں سہل ہو۔ تم جو بہتر سمجھو۔ تمہیں جو اچھا معلوم ہو۔"

"میں کچھ نہیں سمجھ سکتی، کچھ نہیں۔ آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں اپنی اور تمہاری دونوں کی خوشی کو، بحال رکھنا چاہتا ہوں۔ خوشی کو۔ خواہ وہ پرسکوت شب و روز اور خاموشی میں ہو۔"

"خوشی۔ ہماری خوشی کو کیا ہوا؟"

"دیمک لگ رہا ہے۔ تم دیکھ نہیں رہی ہو۔ احساس مر گیا ہے کیا؟ سنو فاخرہ! میں جھوٹ اور بے وفائی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے دکھ جھیلنے کی عادت نہیں۔ میں کشادہ دل آدمی ہوں۔ کیا تم سچ نہیں بول سکتی۔ تم چاہو، تو میں تم سے دستبردار ہو جاؤں۔ مگر مجھے فریب نہ دو۔ کیا میں تمہیں باندھ کر رکھ سکتا ہوں؟ پھر جھوٹی اور مصنوعی زندگی جینے سے حاصل؟ جھوٹی زندگی جینے والے، ہر پل مرتے ہیں، ہر پل۔!"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ فاخرہ بھی خاموش تھی، بالکل ساکت، جیسے وہ اسٹیچو ہو۔!

کچھ اذیت ناک لمحوں کے بعد اس نے پھر کہا۔

"کیا تم وسیم سے محبت کرتی ہو؟ کیا وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے؟ فوراً نہیں سوچ لو، پھر مجھے جواب دینا۔" پھر وہ اٹھا اور تیزی سے لائبریری سے باہر چلا گیا۔

رات گئے تک مرزا کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں نیند کا کوئی سراغ نہ تھا۔

نیند کا رسیا مرزا، آج پارے کی طرح بے چین تھا۔ اس نے فاخرہ کی طرف دیکھا اور محسوس کیا، وہ بھی جاگ رہی ہے، وہ بیڈ سے اٹھا اور ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رکا اور پھر بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔ وسیم کے کمرے کے قریب جا کر وہ ٹھہر گیا۔ اسے محسوس ہوا، کمرے کے اندر وہ بھی جاگ رہا ہے۔

دفعتاً اندر سے آواز آئی۔

"کون ۔۔ ؟"

"میں ہوں، دروازہ کھولو۔"

"خیریت؟ آپ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں؟" وسیم نے دروازہ کھولنے کے بعد اسے دیکھ کر کہا۔

"ہاں، شاید ہم سبھی پریشان ہیں۔ کہانی ایسے موڑ پر ہے۔ جہاں سانسیں رکتی سی معلوم پڑتی ہیں۔ جانے آگے کیا ہو؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم مل کر، سوچ سمجھ کر کوئی راستہ نکالیں۔ فلاح اور بھلائی کا راستہ۔"

"فلاح؟ کس کے لیے۔ کہاں ہے، فلاح؟"

"ہمارے لیے۔ فلاح سچائی میں ہے یعنی دل میں ہے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ میں سچائی کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر شاید تم نے کہا تھا، سچائی سے الجھنیں اکثر بڑھ جاتی ہیں۔"

"فلاح پیش نظر ہوگی، تو الجھن نہیں ہوگی۔ چلو میرے بیڈ روم میں چلو۔ فاخرہ موجود ہوگی تو شاید آسان ہو کچھ سوچنا۔!"

"تم جیسا سمجھو۔"

چند لمحوں کے بعد وہ بیڈ روم میں تھے۔

مرزا نے دھیرے سے پکارا۔
"فاخرہ۔" جانے آواز میں کیا بات تھی کہ آج وہ فوراً اٹھ گئی۔
میں نے سوچا گھلتے رہنے سے بہتر ہے، راستہ جلد طے کرلیں۔ اور تمہاری موجودگی کو بھی ضروری سمجھا۔ کیوں کہ ..."
"کیا آپ مجھے رسوا کریں گے؟"
"نہیں۔" مرزا کی آواز سپاٹ تھی۔ پھر اس نے وسیم کی طرف مڑکر اچانک پوچھا۔
"کیا تمہیں فاخرہ سے محبت ہے؟"
"شاید۔"
"کیا تم دونوں ساتھ رہنا چاہتے ہو۔ سوچ لو۔ اگر ایسا ہے تو میں رکاوٹ نہ بنوں گا" مرزا کی آواز میں درد بھی تھا اور بے مروتی بھی۔
"اس میں شک نہیں کہ میں ... مجھے فاخرہ کی محبت نے اسیر کیا۔ تاہم اس کا اظہار میں نے اب تک فاخرہ سے نہیں کیا تھا۔ میں سوچتا ہوں محبت کی سچائیوں کے باوجود، میں زیادہ دور تک فاخرہ کا ساتھ نہیں دے پاؤں گا۔ کیوں کہ اگر میں اسے بھگا کر لے جاتا تو شاید یہ ممکن تھا مگر تمہاری صاف گوئی اور کشادہ دلی نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں اس اذیت کو جھیل نہیں پاؤں گا۔ کبھی نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ جو چیز جہاں اور جیسے تھی اسے اسی طرح قائم رہنے دینا ہے، میں نے ۔"
پھر کوئی کچھ نہیں بولا۔
دوسری صبح وسیم کو کوٹھی میں نہیں دیکھا گیا۔

●●

سید قیصر قلندر

غزل

★

طاقِ امید پہ یادوں کو سجانا چاہوں
نت نئے روپ سے پھر دل کو لبھانا چاہوں

آرزو توڑ کے نکلے جو حقیقت کے حصار
تجھ سے ملنے کا کوئی خواب سہانا چاہوں

وہ مصور ہے بنا دی ہے مری ایسی شبیہ
لاکھ کوشش کروں کچھ اور بنانا چاہوں

ان گنت خواہشیں ہو جاتی ہیں ہم پر نازل
ناتواں دل کو بعد عزم بچانا چاہوں

رات کیوں روح کی تنویر سے خالی سی ہے
کون سنتا ہے یہاں کس کو سنانا چاہوں

آس کے شہر میں اتری ہے دھنک رنگ پری
کون سا رنگ نئیں شعروں میں چھپانا چاہوں

اب تو بکتے ہیں سرِعام یہاں بھی چہرے
شہر گلرنگ کے بدلے میں ٹھکانا چاہوں

وہ قلندر ہے کہ ہے جبر و رضا کا عادی
کس طرح شرحِ تمنائیں سنانا چاہوں

★

بساطِ شورشِ امکاں شگاف ہوں کوئی
میں کربلا سے ہنر کا مصاف ہوں کوئی

تجھے تلاشِ گہر ہے تو چاک کر مجھ کو
میں حرف حرف، صدف کا غلاف ہوں کوئی

یہ حادثات کی ٹھوکر، یہ میرا سنگِ وجود
حرم میں وقت کے گویا مطاف ہوں کوئی

شکار کر مجھے، اس بات کا لحاظ نہ کر
کہ میں کبوترِ شہرِ طواف ہوں کوئی

فشارِ جاں کا مرقع ہوں سربسر، لیکن
تجھے گماں، کہ پری زادِ قاف ہوں کوئی

جو لوگ پھول ہیں، سوتے ہیں اوڑھ کر مجھ کو
میں خوشبوؤں کے بدن کا لحاف ہوں کوئی



غزل

خود اپنے ذہن پہ اترا ہوں وحی کی صورت
جہت جہت سے نیا انکشاف ہوں کوئی

روایتوں کے مقابل رہا سفر میرا
کہ تجربوں کا خطِ انحراف ہوں کوئی

وقوعِ مصرعِ ہستی کے صدر میں ہے مرا
میں رکنِ ذات کا پہلا زحاف ہوں کوئی

یہ میری ذات ہے آشوبِ لفظ و معنی کا
غلط کہ مصدرِ لاف و گزاف ہوں کوئی

فضاؔ میں نصف صدی کی کتاب ہوتے ہوئے
ہنوز نقطۂ صد اختلاف ہوں کوئی

ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی

مولانا آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت

ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

دنیا کبھی بھی ناموران اور مشاہیر سے خالی نہیں رہی۔ ہر عہد میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو ایک مخصوص گوشۂ حیات میں اپنی خدمات کی بدولت عمر جاوداں حاصل کر لیتے ہیں مگر بعض شخصیتیں بڑی پہلودار ہوتی ہیں۔ اور جب بھی ان کے کوائفِ حیات یا کارناموں کے ہیرے پر تحقیق کی روشنی پڑتی ہے تو ایک نیا منور پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ ایسی ہی نادرِ روزگار شخصیت محی الدین احمد یا مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے۔ وہ ایک عظیم دانشور، روشن خیال عالم دین، کامیاب مقرر، فقید المثال ادیب جادو بیان انشا پرداز، نڈر صحافی، فلاسفر، ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی اور جنگِ آزادی کے بے باک سپاہی تھے۔

ہم ہندوستانیوں کی یادداشت ذرا کمزور واقع ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے محسنوں اور ان کے کارناموں کو فراموش کر دیا۔ ہماری نئی نسل آزادی کے بعض متوالوں کے نام سے بھی آشنا نہیں۔ مسلم رہنماؤں اور جنگِ آزادی کے جیالوں کی طویل فہرست میں سے شاید چند ہی نام کبھی کبھار سننے کو ملتے ہیں حالانکہ سید احمد دہلوی، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد، محمد علی جوہر، شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسرت موہانی، بدرالدین طیب جی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر ذاکر حسین، شمس بلگرامی، اشفاق اللہ خاں، ڈاکٹر سید محمود، آصف علی جیسے بھی لیڈر گزرے ہیں جنہوں نے اپنا سب کچھ مادرِ وطن کے لئے قربان کر دیا۔

مولانا آزاد نہ صرف کانگریس اور ملک کی قیادت بخوبی کرتے رہے بلکہ آزادی سے قبل کے نازک دور میں اپنے تدبر، اپنی فراست اور دور اندیشی کی بدولت ملک کو

آزادی کی منزل تک لے گئے، اتنا ہی نہیں بلکہ آزاد بھارت کی تعمیر میں اپنی صلاحیتیں، اپنی طاقت صرف کر دی۔ حق گوئی ان کا شیوہ تھا اور کوئی لالچ، کوئی خوف کوئی مصلحت ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔ احمد نگر کی جیل میں انہوں نے انگریز حکام کی کسی بھی سہولت یا مراعات سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ اسی دوران ایک اندوہناک حادثہ ظہور پذیر ہوا، ان کی رفیقہ حیات ایک طویل رفاقت کے بعد انتقال کر گئیں مگر اس غیور اور خوددار وطن کے سپاہی نے کسی بھی قسم کی کمزوری کا اظہار نہیں کیا اور اس غم کو برداشت کر گئے۔ کم عمری سے ہی انہوں نے صحافت کے توسط سے ملک کی خدمت کا کام شروع کیا اور اپنی ساری جوانی بلکہ ساری عمر اس کار عظیم کے لئے وقف کر دی۔ بدلے میں انگریزی حکومت سے کیا ملا؟ عمر عزیز کے کئی سال جیل خانہ کی تاریک کوٹھری میں گزارنے پڑے اور انتقال کے بعد ہم ہندوستانیوں کا کیا رویہ رہا؟ ہم نے ان کی کتنی قدر کی؟ ان کی کون سی تعلیمات پر عمل پیرا ہوئے؟ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

مولانا آزاد ایک بڑے علمی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ علم سے لگاؤ، گہری مذہبیت خدمت دین اور حق گوئی انہیں ورثہ میں ملے تھے۔ شہنشاہ اکبر کے عہد کے مولانا جمال الدین عرف شیخ بہلول تو ایک ایسی تاریخی شخصیت ہیں جنہوں نے تنہا اکبر کے محضر پر دستخط سے انکار کر کے عتاب اکبری کو گلے لگا لیا تھا۔ مولانا کے والد مولانا خیر الدین کا شمار کلکتہ کی برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا تھا۔ اور ان کے معتقدین کی تعداد تو بے شمار تھی۔ مولانا بچپن سے ہی حد درجہ ذہین اور زیرک تھے۔ ان کے ساتھی طالب علم اور اساتذہ ان کی ذہانت سے حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں ہی تحصیل علوم سے فارغ ہو کر خود تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ عربی تو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ فارسی پر بھی عبور رکھتے تھے اور اردو تو ان کے گھر کی باندی تھی۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم کا موقع تو نہیں ملا۔ مگر آج کے بہت سے ڈگری یافتہ حضرات سے کہیں زیادہ انگریزی جانتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں انہوں نے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا اور پھر اپنے پرچہ "الہلال" کے توسط سے ملک کی آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس سے قبل الصباح، لسان الصدق وغیرہ کے ذریعہ بھی یہی کام لینا چاہا تھا مگر الہلال اور پھر البلاغ کی سی کامیابی کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی اخبار تھا جس میں مولانا کی قلم کی ساری جولانیاں اور سحر آفرینی گویا دلوں کو جھنجھوڑنے والا پیغام سنا دیا کرتی تھی۔ انہوں نے صحافت اور ادب کا ایک ایسا انوکھا امتزاج پیش کیا جس کا تجربہ کسی بھی صحافی یا ادیب نے نہیں کیا تھا۔ اس اخبار میں دینیات، ادب، شعر و شاعری، انتقاد، تفسیر، تاریخ، تبصرہ، سیاست اور حالات حاضرہ پر مضامین ہوا کرتے تھے۔ حکومت کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اس اخبار کے لئے عوام کس قدر بے چین رہا کرتے ہیں اور اس کے مشمولات پر دل و جان سے یقین کیا کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے اس اخبار کو بند کر کے اس کے ایڈیٹر کو بھی جیل میں بند کر دیا۔ حکومت کا عتاب مختلف صورتوں میں نازل ہوتا رہا، کبھی اخبار بند کر دیا جاتا، کبھی ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا جاتا، کبھی زر ضمانت ضبط کر لیا جاتا اور کبھی مولانا کو شہر بدر کر دیا جاتا مگر مولانا ان تکالیف کو کبھی خاطر میں نہ لائے اور اپنا مشن برابر جاری رکھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مولانا کی سیاسی سرگرمیاں بڑھتی چلی گئیں اور انہوں نے ان کی صحت، فرصت، چین و سکون، ازدواجی زندگی سبھی کو متاثر کیا۔ ان کی سیاسی خدمات کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے گاندھی جی، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے ساتھ مل کر کانگریس اور ملک

کی وہ خدمات انجام دیں کہ ان کے تذکرہ کے بغیر ہندوستان
کی جدوجہد آزادی کی تحریک نامکمل سمجھی جائے گی۔ محض ۳۴
برس کی عمر میں کانگریس کی صدارت انہیں سونپی گئی۔ ان کی
سوجھ بوجھ، حکمت عملی، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور انتظامی
صلاحیت کو دیکھتے ہوئے قوم نے یہ ذمہ داری ان کے کاندھوں
پر کئی بار ڈالی اور مولانا نے ان کے اعتماد کو مجروح ہونے نہیں
دیا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے
خلافت تحریک کے ذریعہ علی برادران کی مدد سے گاندھی جی
کے ساتھ ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ماحول پیدا کر دیا
تھا مگر افسوس کہ بعض پالیسیوں کی بدولت یہ فضا قائم نہ رہ
سکی اور ملک کی تقسیم ناگزیر ہو گئی حالانکہ مولانا ملک کے
بٹوارہ کے سخت خلاف تھے اور تمام عمر اس کے خلاف لڑنے
میں گزار دی۔ گو کہ وہ قومی یکجہتی کو اولیت کا درجہ دیتے تھے
مگر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کے حق میں خاموش رہ
کر پارٹی ڈسپلن کا مظاہرہ کیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے
اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے
ہو کر اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے
اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو
مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں
سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس
سے دستبردار نہ ہوں گا کیونکہ اگر سوراج
ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان
ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم
انسانیت کا نقصان ہے۔"

انہوں نے مذہب اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ عربی سے تو قدرتی
مناسبت رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے "ترجمان القرآن" کے
نام سے قرآن مجید کے اٹھارہ پاروں کی تفسیر ایک انوکھے
انداز میں لکھی۔ کہنے کو وہ مذہبی ماحول کے پروردہ تھے اور
ان کے گھرانے میں روایت اور اپنے عقائد سے انحراف گناہ
تصور کیا جاتا تھا مگر مولانا بڑے روشن خیال تھے۔ ان کی
روشن خیالی اور کشادہ قلبی کی جھلک ان کی تفسیر قرآن میں
نظر آتی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ گہرا اور حافظہ
غضب کا تھا۔ وہ تذکرہ، غبار خاطر، انڈیا ونز فریڈم، کاروان
خیال، قول فیصل، البیرونی اور جغرافیہ عالم جیسی تصانیف
کے لئے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان کتابوں کا اسلوب،
طرز تحریر اور زبان کی لطافت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حسرت
نے اس بات کو بڑے عمدہ پیرائے میں یوں بیان کر دیا ہے ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

اسی طرح مولانا آزاد کی خطیبانہ گھن گرج، مزاحیہ طرزِ نگارش
فلسفیانہ طرز تحریر اور پُر وقار علمی انداز بیان کی بھی بیشمار
مثالیں موجود ہیں جنہیں بخوف طوالت بیان کرنا ممکن نہیں۔

اکثر بڑے لوگوں میں ایک بات دیکھنے کو ملتی ہے
کہ وہ عام لوگوں سے ہر معاملہ میں مختلف واقع ہوتے ہیں
غالب کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ عام لوگوں کی تنقید سے
بچنے کے لئے ناچار انہوں نے داڑھی بھی چھوڑ دی تھی اور رستی
بھی۔ وہ وبائے عام میں مرجانا بھی کسر شان سمجھتے تھے۔
مولانا بھی ایک نابغہ [illegible] تھے اور ان کی طبیعت
بہت سے معاملات میں عام ڈگر سے ہٹ کر واقع ہوئی تھی
سب سے اہم تو یہ کہ لوگ عموماً جلوت پسند اور نام و نمود
کے پیچھے بھاگنے والے ہوتے ہیں مگر مولانا خلوت کے
دلدادہ تھے۔ اگر وہ چاہتے تو سیاست کے بجائے صحافت
کا پیشہ اختیار کرکے ہزاروں لاکھوں کما سکتے تھے یا پھر اپنے
والد کی طرح اپنے گرد معتقدین کا جم غفیر جمع کرکے مذہب
کے سہارے پیری مریدی کے سلسلے کو جاری رکھتے اور

اس طرح بے انتہا عزت و شہرت اور دولت کے مالک
بن بیٹھتے مگر انہوں نے نام و نمود اور ستائش و صلہ
سے بے پرواہ ہو کر سیاست اور ملک کی خدمت کے
راستہ کو منتخب کیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ
ڈھونڈ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ
لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی
جگہ ڈھونڈ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گزر
ہو سکے۔"

مولانا کی مٹھاس سے ناپسندیدگی اور نمکینی سے
پیار کا واقعہ "غبار خاطر" میں موجود ہے کہ بچپن سے وہ
اس معاملہ میں مختلف واقع ہوئے تھے یہاں تک کہ ان کے
دوستوں نے ایک مرتبہ پسی ہوئی نیم کی پتیاں کھلادی تھیں
اور یہ عادت ساری عمر برقرار رہی۔ سحر خیزی کے معاملے میں
بھی وہ اوروں سے الگ تھے۔ عموماً صبح ۴ بجے اٹھ جاتے
اپنے ہاتھوں سے چائے تیار کرتے اور پھر لکھنے پڑھنے
میں مشغول ہو جاتے۔ اس وقت کو وہ صبح کا جانفزا وقت
کہا کرتے۔ یہ میٹھی نیند کا وقت ہوتا ہے مگر مولانا اس وقت
بیدار ہو کر پوری یکسوئی کے ساتھ کام کرنا پسند کرتے تاکہ
ان کی تنہائی میں کوئی مخل نہ ہو۔ ان کی چائے کی پسند بھی
دوسروں سے مختلف تھی۔ وہ چین کی "گوری چنبیلی" پیا کرتے
اور اس کے لئے چھوٹے چھوٹے روسی فنجان استعمال کرتے
اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر اس کے کیف و سرور کو رگ
و پے میں اتر جانے دیا کرتے اور ساتھ ہی اپنا کام جاری
شکر کی نوعیت اور مقدار کے معاملہ میں بھی وہ بالکل
الگ نظریہ رکھتے تھے۔ عام لوگوں کی چائے ان کے نزدیک
"گرم سیال حلوہ" ہوتی ہے جسے کھانے کے بجائے پیا جاتا
ہے۔ ایک طرف انہیں بھڑکتے شعلوں سے پیار تھا تو دوسری
طرف سخت سردی، سمندر اور تیراکی سے بڑا لگاؤ تھا۔ لوگ
گرمیاں گزارنے پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں مگر مولانا سردیوں
میں پہاڑوں پر جانا پسند کرتے تھے۔ عام روش سے مختلف
ہونے کا احساس مولانا کو نہ ہو، ایسا بھی نہیں تھا۔ لکھتے ہیں

"چوبیس برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرتِ شباب
کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں، میں اپنی دشت
نوردیاں ختم کرکے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا۔
گویا اس معاملے میں بھی اپنی چال زمانے سے الٹی
ہی رہی۔"

اپنے ساتھیوں کے بیحد اصرار پر انہوں نے ۱۹۴۷ء
میں وزیر تعلیم کا قلمدان سنبھالا اور تاحیات اس پر فائز
رہے۔ وہ معلم انسانیت و اخلاق تھے اور سمجھتے تھے کہ آزاد
ہندوستان میں نوجوانوں کی تربیت اہم ترین مسئلہ ہے۔
چنانچہ انہوں نے اپنی وزارت کے زمانے میں وہ کارہائے
نمایاں انجام دیئے۔ جن کے ثمرات آج ہم کو مل رہے ہیں۔
انہوں نے تعلیم کو عام کرنے، اخلاق و کردار کی تشکیل میں اور
تعلیم و ذہنی تربیت کو ترقی سے ہم آہنگ کرنے میں ایک
موثر رول ادا کیا ہے۔ ان کے دورِ حکومت میں مختلف ادارے
بورڈ یا کمیشن قائم ہوئے۔ ان میں تکنیکی تعلیم کے ادارے،
قومی تجربہ گاہوں کا جال، ساہتیہ اکیڈمی، سنگیت
ناٹک اکیڈمی، للت کلا اکیڈمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان
سب کے مجموعی اثرات ملک کی تعلیمی حالت خصوصاً سائنسی
و تکنیکی تعلیم اور ثقافتی معاشی و صنعتی ترقی پر پڑے۔ اس
طرح مولانا کو جدید ہندوستان کے بانیوں میں سے ایک کہا
جا سکتا ہے۔ ابھی ان کی خدمات کا مکمل جائزہ نہیں لیا گیا
ہے۔ ان کے کارناموں کو روشنی میں لانا ضروری ہے تاکہ
ہماری نئی نسل ان کی قربانیوں سے واقف ہو سکے اور انہیں
وہ عزت و مقام حاصل ہو سکے جس کے وہ مستحق ہیں۔ ●

آمو صدیقی

رباعیات

★

صد شکر کر گونگے کی کہانی نہ ہوئے
آسودۂ محتاجِ بیانی نہ ہوئے
نکلے جو مرے خانۂ فن سے الفاظ
شرمندۂ آشوبِ معانی نہ ہوئے

★

دروازہ ہے وا میرا بلاؤں کے لئے
تیار ہوں دنیا کی جفاؤں کے لئے
اس درجہ مشیت پہ یقیں ہے مجھکو
اٹھتے ہی نہیں ہاتھ دعاؤں کے لئے

★

ورثے میں ملا روگ نہ پالوں کیسے
ہستی سے الگ جان کے ٹالوں کیسے
باقی ہے ابھی جاں سے گزرنے کا ہنر
دلدل میں پھنسے پاؤں نکالوں کیسے

★

بے چہرہ ارادوں کے جہاں سے نکلا
یوں بھی میں حدِ وہم و گماں سے نکلا
یاروں نے کیا حسبِ مراتب تقسیم
ساماں جو کرائے کے مکاں سے نکلا

★

دل میں ہے عجب سوزِ نہانی کا عذاب
شعلہ سا بھڑک اٹھا ہے پانی کا عذاب
اے ابر! ترے سائے میں نازل کیوں ہے
سوکھی ہوئی ندیوں پہ روانی کا عذاب

★

احساس کے خیمے کو اجڑنے سے بچا
کمزور طنابوں کو اکھڑنے سے بچا
کس کس کے بچھڑنے کا کرے گا ماتم
بہتر ہے کہ اب خود کو بچھڑنے سے بچا

★

ہونے نہ دیا کوئی کمی کا احساس
کیا شئے تھا تری ہمقدمی کا احساس
ملتے ہیں شجر راہ میں اب بھی لیکن
ہوتا ہے کہاں تازہ دمی کا احساس

ڈاکٹر اشفاق حسین

فیض کی نظموں میں

سوشلسٹ حقیقت نگاری

فیض احمد فیض کی شاعری کا جائزہ لینے سے پہلے ملکی اور غیر ملکی سیاسی و سماجی حالات کا بھی جائزہ لے لینا ضروری جان پڑتا ہے کیونکہ یہ عناصر شعر و ادب پر دانستہ اور نادانستہ طور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں سامراجیت کو عروج ملتا ہے اور پھر اس کے بعد اس کا زوال بھی شروع ہو جاتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں روس میں وہاں کے عوام نے زار شاہی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اس کا تختہ پلٹ کر محنت کش طبقہ کی آمریت قائم کرنا چاہی مگر وہ اس جدوجہد میں ناکام رہے اور پھر دوبارہ ۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں ایک کامیاب انقلاب برپا کر دیا۔ زار شاہی کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ محنت کش طبقہ کی حکومت قائم ہو گئی اس سے دنیا کے غلام اور مظلوم عوام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کے دل و دماغ میں آزادی اور خوشحالی کی ایک نئی روشنی پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کے عوام بھی اس سے بیحد متاثر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء سے ملک میں تحریکوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اب اس میں ایک نئی جان پڑ گئی تھی۔ اب عوام ان تحریکوں میں زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ برطانوی سامراجیت کے خلاف چلائی جانے والی سودیشی تحریک اب ترکِ موالات کی تحریک تک پہنچ گئی تھی۔ پہلی عالمی جنگ میں ہندوستان کے عوام نے گاندھی جی کے مشورے پر برطانیہ کا ساتھ دیا تھا۔ اس کی وجہ سے عوام کا خیال تھا کہ حکومت ان کو تمام حقوق دیدیگی لہٰذا ہوم رول کا مطالبہ پیش کیا گیا مگر حکومت نے

یہ مطالبہ مسترد کردیا اور اس کے عوض مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کا اعلان کر دیا۔ اس اسکیم کے تحت چند رعائتیں دے دی گئیں۔ اس سے عوام برانگیختہ ہو گئے اور ان کے غم و غصہ کی آگ مزید تیز ہو گئی۔ ہندوستان کے مسلمان ترکی کو خلافت کا درجہ دیتے تھے۔ انگریزوں نے ترکی کو پامال کر دیا تھا۔ اس کے ردعمل میں ملک میں تحریکِ خلافت کا آغاز کیا گیا اور کانگریس نے بھی تحریکِ ترکِ موالات کا آغاز کیا۔ ان دونوں تحریکوں کی وجہ سے پورے ملک میں ایک نئی رو بہنے لگی اور سنہ ۱۹۲۰ء میں دونوں تحریکوں کا سنگم ہو گیا۔

دوسری طرف ملک کا محنت کش طبقہ بیدار ہو گیا تھا۔ اور اس کے اندر طبقاتی شعور پیدا ہو گیا تھا۔ محنت کش طبقہ نے ملکی سیاست کو ایک نیا موڑ دیا۔ اور سیاسی تحریک کو ایک نئی شکل دے دی — ملکی آزادی اور سوشلسٹ نظام قائم کرنے کے لئے مارکس اور لینن کے خیالات و نظریات کی اشاعت کی جانے لگی۔ عوام نے اور خصوصاً محنت کش طبقہ نے ان کے اثرات قبول کئے۔ ان اثرات کو بے اثر کرنے کے لئے حکومت نے جارحانہ طریقے ایجاد کئے۔ ان کے رہنماؤں کو قید کر لیا گیا ان پر جھوٹا مقدمہ چلایا گیا جو "میرٹھ سازش مقدمہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ کسان بھی اس جد و جہد میں پیش پیش تھے۔ کسان سبھاؤں کی تشکیل کی گئی۔ اور کسانوں کے مطالبے حکومت کے سامنے پیش کئے گئے۔ محنت کش طبقہ کی رہنمائی کیمونسٹ پارٹی موثر طریقے سے کر رہی تھی۔ یکم ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء کو کانپور میں ستیہ بھگت نے کیمونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اس جماعت کا اولین مقصد سنہ ۱۹۱۷ء کے روسی طرز کا انقلاب برپا کرنا ملک کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانا، پیداوار اور تقسیم کے طریقوں میں اصلاح لا کر محنت کش طبقہ کی حکومت قائم کرنا تھا۔ حالانکہ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو تاشقند کے فوجی اسکول میں اونی ناتھ مکرجی اور ایم۔ این رائے نے ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ایم۔ این رائے پہلے مفکر تھے جنہوں نے سائنٹفک سوشلزم پر باقاعدگی سے مضامین لکھے۔ بیرونِ ملک میں بسنے والے بعض ہندوستانیوں نے بھی ملک کی آزادی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ یورپ میں رہ کر ان لوگوں نے مارکسی اور لینینی خیالات و نظریات کا مطالعہ کیا۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک کی آزادی اور سوشلسٹ نظام قائم کرنے کے لئے یہی ایک مناسب طریق کار ہے۔ بھوپندر ناتھ دت اور چٹوپادھیا نے بالشویکوں سے رابطہ قائم کیا۔ بالشویکوں نے ان کے موقف کی تائید کی۔ کابل میں ایک عارضی حکومت بھی قائم کر لی گئی۔ مہندر پرتاپ سنگھ اس کے صدر ہوئے۔ تیری برادران اور دوسرے رہنماؤں نے لینن سے بھی ملاقات کی تھی اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ان کا تعاون بھی حاصل کرنا چاہا تھا۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں ہجرت کی تحریک کی وجہ سے ہزاروں مسلمان ہندوستان چھوڑ کر دوسرے ملک میں پہنچ گئے تھے۔ ان کی ایک بڑی تعداد افغانستان پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی حکومت نے ان کا استقبال کیا۔ ان میں سے بعض لوگوں نے روس کا بھی سفر کیا۔ وہ جب ہندوستان واپس آئے تو مارکسی و لینینی خیالات و نظریات اور انقلابِ روس کے اثرات بھی اپنے ساتھ لائے۔ انہوں نے کیمونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کر لی حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا اور ایک مقدمہ چلایا جو

"پشاور سازش مقدمہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں جواہر لال نہرو نے روس کا سفر کیا۔ انہوں نے انقلاب روس کا بغور مطالعہ کیا اور اس سے متاثر بھی ہوئے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد سوشلزم کے فوائد سے عوام کو روشناس کرایا۔ اور اس کی حمایت میں کانگریس کے اجلاس میں ایک قرار داد بھی منظور کرائی۔ سوشلزم کا اتنا اثر ہوا کہ کانگریس میں ایک گروہ "سوشلسٹ کانگریس" کے نام سے وجود میں آگیا۔

۱۹۳۵ء میں لندن میں سید سجاد ظہیر اور ان کے دوسرے رفقار کی کوششوں سے ترقی پسند ادیبوں کی ایک انجمن قائم کی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں اس کا کل ہند اجلاس ہوا۔ اور منشی پریم چند نے صدارت کی۔ اس انجمن کا مقصد ادب کے ذریعہ ہندوستان میں تبدیلی لانا تھا۔ ملک کو آزاد کرا کر سوشلسٹ نظام قائم کرنا تھا۔ مارکس اور لینن کے خیالات و نظریات اس کا نصب العین تھے۔ اس تحریک سے اردو شعرار کی ایک بڑی تعداد متاثر ہوئی۔ ان میں فیض کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی زندگی نے ایک نیا موڑ اختیار کیا اور وہ اس تحریک سے منسلک ہو گئے۔ بعض ترقی پسندوں اور خصوصاً ڈاکٹر رشید جہاں کی معیت میں اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو سمجھا اور اس پر غور و فکر کیا۔ اس سے وابستہ ادب کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے کو ترقی پسند شاعری کے لئے وقف کر دیا اور تا عمر اس موقف پر قائم رہے۔ لاہور اور دوسری جگہوں پر انجمنیں قائم کرنے میں اپنے رفقار کے ساتھ پیش پیش رہے۔ اب ان کی شاعری میں سوشلسٹ حقیقت نگاری شعوری طور پر نظر آنے لگی۔ اور وہ موثر طریقے سے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کی ترجمانی کرنے لگے۔ انہوں نے سماج میں موجود استحصال پسند قوتوں کا پردہ فاش کیا۔ نہ صرف ان قوتوں کی نشان دہی کی بلکہ ان کو نابود کر کے ایک بہتر سماج کی تصویر کشی کی۔ نادار اور کمزور طبقوں کو برابری کا درجہ دلانا چاہا چنانچہ طبقۂ نسواں کو سب سے پہلے شاعری کا موضوع بنایا۔ اس طبقہ کو اس کے فرائض سے آگاہ کیا اور مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی تلقین کی۔ محبوب کے لب و رخسار اور کاکل و ابرو کی تعریف کرنے کے بجائے وہ وقت اور ماحول کا جائزہ لیتے ہیں۔ محبوب سے معذرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اپنے فرض کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وقت تو فرسودہ سماج کو بدل ڈالنے کا ہے۔ چنانچہ اپنی ایک نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" میں فرماتے ہیں

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
ترا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے

سامراجی اور فسطائی ذہنیت عوام کے شہری حقوق کو پامال کر دیتی ہے اور یہاں تک کہ ان سے اظہارِ خیال کی آزادی بھی چھین لیتی ہے اور طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دیتی ہے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے جب عوام کی آزادیٔ گفتار کو ختم کرنا چاہا اور اس کے لئے زبان بندی ایکٹ نافذ کیا تو فیض نے اس کی مخالفت کی۔ اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی "بول" نظم میں اس طرح کی ہے ؎

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہیں آہن

بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

غلامی کی وجہ سے عوام زندہ درگور ہو جاتے ہیں — اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر خیالِ آزادی کی قوت بھی باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ فیض نے ایک علامتی نظم "کتے" میں مجبور و بے بس عوام کو لعنت اور ملامت کا نشانہ بنایا ہے۔ حکومت کی حکمتِ عملی سے آگاہ کیا ہے اور آخر میں عوام کی پنہاں قوت کو بیدار کرنے کی سعی کی ہے ؎

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں

اپنی ایک نظم "تسلی" میں عوام کو یقین دلاتے ہیں کہ ظلم و ستم کی میعاد تھوڑی ہے اور ان کو بہت جلد غلامی سے نجات مل جائے گی اور سوشلسٹ نظام قائم ہو جائے گا ؎

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

حصولِ آزادی کے موقع پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار ایک نظم "صبحِ آزادی" میں کیا ہے۔ ترقی پسندوں اور دوسرے ہم خیال افراد نے آزادی کا خیر مقدم نہیں کیا۔ ان کے خیال کے مطابق یہ آزادی ان کے خوابوں کے مطابق نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ اقتصادی آزادی بھی ملنی چاہئے تھی ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیضؔ کو ان کے انقلابی خیالات اور نظریات کی بنا پر قید و بند کی زندگی گزارنی پڑی۔ آزادی کے بعد حکومتِ

وقت کے خلاف خیالات اور نظریات میں نہ تو کوئی تبدیلی ہی واقع ہوئی اور نہ ہی جذبات کی شدت میں ہی کمی آئی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اسیرانہ زندگی نے ان کی شاعری کو مزید جلا بخشی ہے

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں
(نثار میں تری گلیوں کے ...)

اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے

وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں
(زنداں کی ایک شام)

اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے
(ترانہ)

آزادی، امن، جمہوریت، مساویانہ درجہ اور دوسرے شہری حقوق عوام کو ملنے چاہئے کیوں کہ ان سب پر ان کا حق ہے۔ چنانچہ جب ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک میں وہاں کے محکوم عوام نے آزادی کی جدوجہد شروع کی تو دوسرے انصاف پسند افراد اور ترقی پسندوں کی طرح فیض نے بھی ان کے اقدام کو سراہا اور لبیک کہا۔ اس کے علاوہ حکومت کے ظلم و ستم کی مذمت بھی کی ہے

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں چھن چھن، چھن چھن
دھرتی کی پیہم پیاسی
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم

× × ×

جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!
(ایرانی طلبا کے نام)

آجاؤ میں نے سن لی تیرے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ مست ہو گئی میرے لہو کی تال
آجاؤ افریقہ

میں افریقہ ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال
آجاؤ افریقہ
آؤ ببر کی چال
آجاؤ افریقہ
(آجاؤ افریقہ)

فیض کی بعض نظموں سے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کر دیئے ہیں۔ ان کی نظموں میں رجائیت ہے اس کے علاوہ انسان دوستی، آزادی، امن، مساوات اور جبر و استبداد سے نفرت کے جذبات موجزن ہیں۔ یہ سارے عناصر سوشلسٹ اصولوں کے عین مطابق ہیں۔ ●●

روفق شہوی

غزلیں

★

سیاہ مردہ رُتوں کا نزول کس کے لئے
اڑا رہی ہے ہوا خاک دھول کس کے لئے

قلم کی کاشت ہے محتاجِ خوشبوئے معنی
اُگے ہیں لفظوں کے ہر سو ببول کس کے لئے

میں خود پہ قرض کی صورت ادا تو ہو جاؤں
پر اہتمام سے کارِ فضول کس کے لئے

افق پہ کون وہ سیندور گھول دیتا ہے
خود اپنے خون میں ہو کر حلول کس کے لئے

یہ بیٹھے بیٹھے ہُوا کیسے قہقہوں میں شگاف
میں آج پھر رہا دن بھر ملول کس کے لئے

★

سلوکِ ناروا سے ایک دن بذلن کیا ہم کو
تو جسم و روح سے پھر اس نے زیبِ تن کیا ہم کو

طبیعت کا تضاد اس کو بھی لے آیا قریب اپنے
کشش نے بھی قریبِ سرحدِ دشمن کیا ہم کو

دہکتے ہیں مگر سورج کی شہرت ہم نہیں رکھتے
کہاں آنکھیں بجھی تھیں اور کہاں روشن کیا ہم کو

کھُلا کر خوفناکی کا تصور خود بھی لرزاں ہے
اور ایسے وقت میں حالات کا درپن کیا ہم کو

سلگ کر ہم ہوئے خاکسترِ جاں کیا یہی کم تھا
دھواں ہوتے ہوئے لمحوں کا کیوں ایندھن کیا ہم کو



شاکر پرشارتھی

کلاسیکی موسیقی کا ارتقاء: ایک جائزہ

"پالنے میں پڑا ہوا بچہ، ابھی تک دنیاوی
محسوسات کی لذت سے نا آشنا ہے
لیکن سنگیت کے امرت کو پی کر مسحور ہو
اٹھتا ہے۔" (سنگیت رتناکر)

اس ایک شلوک میں سنگیت رتناکر کے مصنف شارنگ دیو پنڈت نے موسیقی کے ہمہ گیر تاثر کو قلم بند کر دیا ہے۔ موسیقی کی تاریخ میں ہندوستانی موسیقی کی قدیم کلاسیکی روایات کو بنیادی اور مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ سنسکرت کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں موسیقی کی ابتدار ویدوں کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ اس دور میں غروبِ آفتاب کے وقت ویدک رشی کنارِ آب بیٹھ کر سام وید کے منتروں کو مقررہ اصولوں کے تحت گایا کرتے تھے.... ویدوں میں اس زمانہ میں مستعمل سازوں کا بھی ذکر ملتا ہے جن کے نام ہیں ــ ڈُندبھی۔ آڈمبر۔ آگھاٹی کانڈ وینا۔ وینا وغیرہ وغیرہ۔

روایت ہے کہ موسیقی کی باقاعدہ تدریس و تفہیم کی ابتدا بھرت منی سے ہوئی۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "ناٹیہ شاستر" کو علم موسیقی میں بلند ترین مقام حاصل ہے۔ "ناٹیہ شاستر" کے بعد ایک ہزار سال کی مدت ایسی ہے جسے بعض مورخین نے ہندو سنگیت کا زریں دور مانا ہے۔ مگر بعد ازاں سنسکرت ادب میں کالیداس اور بھوبھوتی کی لاثانی تخلیقات کے عظیم الشان دور میں اس وقت کے سنگیت کے اصول و ہیئت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس عہد میں سنگیت پر لکھی گئی کوئی کتاب ابھی دستیاب نہیں ہوئی۔ تاریخی اعتبار سے کالیداس کا عہد "موسیقی کا تاریک دور" سمجھنا چاہیے۔

لوچن کوی کی "کادیہ ترنگنی" وہ پہلا گرنتھ ہے جو سنگیت کے اس تاریک دور کے بعد ہمیں روشنی دکھاتا ہے۔ کادیہ ترنگنی کب لکھی گئی؟ اس کے متعلق ناقدین میں ابھی تک اختلاف رائے موجود ہے۔ خود مصنف نے اس کا سنِ تصنیف ۱۱۹۲ عیسوی درج کیا ہے مگر اس پر بھی محققین میں اتفاق نہیں ہے۔ بارہویں صدی میں 'جے دیو' نامی موسیقار اور شاعر کی لکھی ہوئی "گیتی گووند" کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ "گیتی گووند" کی ہر نظم کے آغاز میں شاعر نے ہدایات درج کی ہیں کہ اسے فلاں راگ اور فلاں تال میں گایا جائے۔ لیکن ان راگوں کی سرگمیں اس نے تحریر نہیں کیں۔ جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ خود جے دیو انہیں کس طرح گایا کرتے تھے۔

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ہی ایک نئی تہذیب اور نئی تمدنی روایات کا آغاز ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے جہاں ہندو دھرم کے عظیم روحانی نظریات کو ایک حد

تک اپنے فکر وعمل میں قبول کیا۔ وہاں ہندوستانی تہذیب و فن بھی اسلامی روایات اور تفکرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ دو تہذیبوں کا یہ ملاپ شاید موسیقی کے فن میں سب سے زیادہ واضح ہے۔

شمالی ہند میں موسیقی کے باب میں چودھویں اور پندرہویں صدی نہایت اہم تصور کی جاتی ہے۔ ان دو صدیوں میں موسیقی پر مسلمان موسیقاروں کا بہت اثر پڑا۔ کئی راگوں کو تبدیل کر دیا گیا اور کئی راگوں کی تو کایا پلٹ ہو گئی۔ نئے تجربوں سے نئے راگ ایجاد کئے گئے۔ کلاسیکی موسیقی کو جو اب تک روایت پرستی کے کہرے میں لپٹی ہوئی تھی مقبول عام بنانے کے لئے سب سے اہم پارٹ سلطان علاءالدین (۱۲۹۵ء — ۱۳۱۶ء) کے دربار کے مشہور شاعر اور موسیقار امیر خسروؔ نے ادا کیا۔ غیر معمولی قابلیت کے اس عالم اور فن کار نے ایرانی موسیقی کے اسلوب و قواعد سے ہندوستانیوں کو متعارف کرایا۔ اس کی کوششوں سے ہندی موسیقی میں ایرانی اسالیب و ہیئت کے تجربات شروع ہوئے۔ نتیجہ کے طور پر ہندوستانی موسیقی اتری اور دکھنی، دو اسکولوں میں بٹ گئی۔ اسلامی اور ایرانی تہذیب کے قرب کے باعث اتری اسکول جلد ہی دکھنی اسکول سے قطعی طور پر الگ ہو گیا۔

امیر خسروؔ ترک نژاد عالم تھے۔ ان کے والد امیر سیف الدین منگولوں کے حملہ کے وقت ترک وطن کر کے پٹیالی میں آباد ہو گئے تھے۔ امیر خسروؔ کی پیدائش ۱۲۵۳ء میں ہوئی۔ ترک قوم کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ خسروؔ کو ہندی ماحول کے اثرات قبول کرنے کا بھی موقع ملا۔ ہندی موسیقی پر انہیں کامل دسترس حاصل تھی اور ایرانی موسیقی کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنی ہمہ گیر قابلیت کی بدولت ہی انہوں نے موسیقی میں راگوں کی نئی اور لطیف اقسام کو رواج دیا... قدیم راگ راگنیوں کے میل سے اور ہندی، ایرانی راگوں کے امتزاج سے نئی راگنیوں کی ایجاد کا تخلیقی رجحان ان کی تصانیف میں نہایت واضح ہے۔ بعض موسیقاروں نے خسروؔ پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے شاستریہ سنگیت کی قدیم روایات کو متغیر کر دیا۔ لیکن یہ محض بہتان ہے۔ کیونکہ ان کا مقصد موسیقی میں مروجہ ہندو روایات کو یکسر بدل دینا ہرگز نہیں رہا۔ انہوں نے بنیادی طور پر راگوں کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ البتہ نئے تجربات کے حسب گنجائش راگوں میں کچھ ترامیم انھوں نے ضرور کی ہیں۔

وہ خود لکھتے ہیں کہ۔ "ہر چند میں ترک نژاد ہوں پھر بھی ہندوستانی ہوں۔ مجھے مصر سے ترغیب نہیں ملتی اس لئے میں عرب کی بات نہیں کرتا... میرے ساز سے ہندوستانی سُر ہی پھوٹتے ہیں...."

ترانہؔ کی ایجاد اور بہارؔ ایسی راگنی تخلیق کرنے کا سہرا امیر خسروؔ کے سر ہے۔ شمالی ہند میں قوالی گانے کا طریقہ امیر خسروؔ نے ہی ایجاد کیا۔ قوالی ہندوستانی اور ایرانی اسلوب کا حسین امتزاج ہے۔ ستار (سہ تار) جو ہندوستانی وینا کی طرز پر بنا ہے کا موجد بھی امیر خسروؔ کو ہی مانا جاتا ہے۔ عالم موسیقی میں خسروؔ کے نام سے بہت سی روایات منسوب کی جاتی ہیں۔ اپنے ہم عصر ہندو موسیقار گوپال نائیک کے ساتھ موسیقی سے متعلق ان کے کئی دلچسپ مناظروں کا ذکر بھی تاریخ میں ملتا ہے۔ خسرو اور دہلی کا ایک شاعر امیر حسن، حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ ۱۳۱۹ء میں حضرت نظام الدین کی وفات کے سات ماہ بعد خسروؔ نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ خسرو کی وفات کے بعد ہندی اور ایرانی اسلوب کی آمیزش سے موسیقی میں نئے تجربات جاری رہے اور ان کی کوششوں کو متاخرین نے آگے بڑھایا۔ قوالی کی مقبولیت اس امر کا بین ثبوت ہے۔

سولہویں صدی کا آغاز تاریخ میں فنی۔ ادبی اور

علمی ارتقاء کے نظریہ سے انقلابی دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں موسیقی کے باب میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی —— ہندوستان ہی نہیں بلکہ سارا عالم اس دور میں موسیقی کی مدھر لَے، تال سے گونج اٹھا۔ ہندوستان میں اس دور میں سوامی ہری داس۔ تان سین۔ بیجو باورا اور باز بہادر وغیرہ موسیقاروں نے اپنے فن سے موسیقی کو مالا مال کر دیا۔ حق تو یہ ہے کہ جدید موسیقی کا آغاز ہی پندرہویں اور سولہویں صدی میں ہوتا ہے۔ اکبر اعظم کے دربار میں بہت سے گویّے موجود تھے۔

ابوالفضل لکھتا ہے۔" بادشاہ کو موسیقی سے بہت شغف تھا۔ وہ خود بھی نقارہ بجانے میں ماہر تھا۔ بلا امتیاز مذہب و ملت اس نے موسیقاروں اور اربابِ ذوق کو مجتمع کیا۔ اس کے دربار میں بہت سے ایرانی۔ ہندی۔ تورانی اور کشمیری موسیقار موجود تھے۔ جن میں عورتیں بھی تھیں .... اس طرح اکبر کے زیر سایہ مختلف علاقوں کے فنکاروں میں باز بہادر۔ میاں تان سین اور کلاونت وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ باز بہادر پہلے مالوہ کا حکمراں تھا۔ بعد میں ایک ہزاری منصب دار ہوا۔ لاثانی گویّے کی حیثیت سے اس کا ذکر مورخین نے کیا ہے۔ تان سین سے متعلق روایات کہتی ہیں کہ ابتداء میں وہ گوالیار کا ایک ہندو تھا۔ گوالیار کے مان سنگھ اسکول میں اس نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد میں وہ پیر محمد غوث کا مرید ہو گیا اور مرنے کے بعد انہیں کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔ واضح رہے کہ زندگی کے آخری ایام میں تان سین گوالیار میں جا بسے تھے۔ گوالیار میں ان کی قبر موجود ہے۔ قبر پر ایک املی کا درخت ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ جو شخص اس درخت کا ایک پتہ چبا لیتا ہے اس کی آواز سریلی ہو جاتی ہے۔ اس روایت کی تصدیق گوالیار کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سابق معتمد مسٹر گردے کے بیان سے ہوتی ہے۔[1]

لال کلاونت بھی ہندو تھا۔ کہتے ہیں کہ اکبر اعظم نے اس سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ حسن خاں خزانی۔ حاجی سبحان اور مہاپاتر بھی دربارِ اکبری کے مشہور گویّے مانے جاتے تھے۔ شہنشاہ کی قدر دانی کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک بار اس نے تان سین کو دو لاکھ روپیہ بطور انعام مرحمت فرمایا۔ اکبر کے عہد میں کلاسیکی موسیقی میں بہت سی ترامیم اور اضافے کئے گئے ہیں اور موسیقی میں نئی وسعتیں پیدا کی گئیں۔ دھرپد کی گائیکی (جو آج کل بھی مقبول ہے) کو تان سین اور ہری داس نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اور اس کے مشکل ترین اسلوب میں آسان راہیں تلاش کر کے 'خیال' کو جنم دیا —— تان سین نے قدیم روایات میں کچھ ترامیم کر کے نئے راگ اور راگنیاں بھی ایجاد کیں۔ بعض قدیم راگنیوں کے اس نے نئے اصول مقرر کئے۔ یہ راگنیاں آج بھی تان سین کے نام سے منسوب ہیں۔ ان میں 'میاں کی ملہار' اور 'میاں کی ٹوڈی' اور 'درباری' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بعض ناقدین کے مطابق ہندی کلاسیکی موسیقی کے زوال کا ذمہ دار تان سین ہے ان کا خیال ہے کہ "ہنڈول" اور "میگھ" جیسے شدھ راگوں میں ترمیم کر کے اس نے انہیں تباہ کر دیا۔ مگر یہ اعتراضات قابلِ توجہ نہیں، محض روایات پر مبنی ہیں۔ ہر چند تان سین کی کاوشوں میں ہندی اور فارسی سروں کو یکجا کرنے کا رجحان صاف جھلکتا ہے لیکن اس سے موسیقی کی اہمیت اور کیفیت میں اضافہ ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "رباب" بھی تان سین کے ہی تخلیقی ذہن کی اپج ہے۔ دھرپد کی گائیکی میں موسیقاروں کے بہت سے تقاضوں کو اس ساز نے پورا کیا۔

تان سین کا ہم عصر "بیجو باورہ" جو ذات کا برہمن تھا اس عہد کے ماہر فن گویّوں میں شمار ہوتا ہے۔ موسیقی کے مشکل

ترین اسلوب و قواعد پر اسے عبور حاصل تھا۔ بیجو کے فنی معرکوں سے وابستہ بہت سی روایات زبان زد عام ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے ان کے ثبوت بہت کم فراہم ہوتے ہیں۔ پنڈت رام چندر شکل کے بقول۔

" بیجو باورا ایک مشہور گویا ہو گزرا ہے
جس کی شہرت تان سین سے بھی پہلے
ملک میں پھیل چکی تھی۔"
(ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص۱۲۵)

بیجو کی زندگی اور کارناموں سے متعلق بہت سے متضاد خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ ایک روایت کے مطابق مان سنگھ کی گوجری رانی۔۔ 'مرگ نینی' کے نام پر بیجو باورا نے "گوجری ٹوڈی" اور "منگل ٹوڈی" راگوں کو ترتیب دیا۔ 'سنگیت درپن' نامی بھارتیہ سنگیت شاستر کا بیجو نے بھارتی میں ترجمہ کیا۔ سنسکرت گرنتھیوں کے غائر مطالعہ کی بنا پر اس نے فارسی میں ایک کتاب 'عقدۂ غوث' بھی مرتب کی، جو اس کی قابلیت اور فن کارانہ صلاحیتوں کا زندہ ثبوت ہے۔ سنہ ۱۶۶۲ء ۱۶۶۳ء میں فقیر اللہ نے سنسکرت کے دوسرے گرنتھ "راگ درپن" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ موسیقی سے متعلق عہد اکبری کی مندرجہ تعمیری روایات اس کے جانشیں جہانگیر کے عہد میں بدستور قائم رہیں۔ جہانگیر کے دربار میں مشہور بین کار "مشاقی" کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جسے جہانگیر نے 'آنند خاں' کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

شاہ جہاں بھی موسیقی کی جادوگری سے متاثر ہوئے نہ رہ سکا۔ روایت ہے کہ سنسکرت کے مشہور عالم اور موسیقار پنڈت راج جگن ناتھ اور دیرنگ خاں کی موسیقی سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ ان دونوں کے وزن کے مطابق سونا بطور انعام مرحمت فرمایا۔ لال خاں اور رام داس نامی دو اور موسیقاروں کے نام بھی تاریخ میں ملتے ہیں جن پر کہ شاہ جہاں کی خاص نظر عنایت تھی۔

مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی ہندی کلاسیکی موسیقی کا بھی زوال شروع ہو گیا۔ اورنگ زیب کے دربار میں کسی موسیقار کا تذکرہ مورخین نے نہیں کیا۔ تاہم عالمگیر کے عہد تک پہنچتے پہنچتے کلاسیکی موسیقی کی قدیم روایات میں نمایاں تغیر واقع ہو چکا تھا۔ معدودے چند گویوں نے خالص ہندو روایات کو قائم رکھنے کی انفرادی کوشش کی اور وہ دھرپد گیت اور بھجن گاتے رہے۔ مگر متاخرین نے عام طور پر خیال۔ ٹپہ۔ ریختہ اور غزل اور ترانہ کو ہی رواج دیا اور اسے مقبول عام بنانے کی ہر ممکن سعی کی۔

دورِ جدید میں بھی فن موسیقی، بیشتر مسلمان گویوں کا منت گزار ہے۔ آنجہانی پنڈت وشنو دگمبر کی جدید تحریک میں پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر۔ ونایک راؤ پٹوردھن۔ پنڈت نارائن راؤ ویاس کے دوش بدوش مسلمان گویوں کی کاوشیں بھی قابلِ ستائش ہیں۔ اس ضمن میں مرحوم عبدالکریم خاں کا اسم گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان کے علاوہ بڑودہ کے استاد فیاض خاں۔ سورت کے استاد چھوماجی۔ آگرہ کے استاد اسد علی اور لاہور والے بڑے غلام علی خاں۔ رام پور کے استاد مشتاق علی اور نورالدین جیسے مسلمہ فنکاروں کو موسیقی کے باب میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ عہدِ وسطیٰ کی ہندو مسلم روایات کے علمبرداران موسیقاروں میں باہمی فرق خواہ کتنا ہو مگر یہ سب موسیقی کے نئے امکانات کی سراغ دہی کر رہے ہیں۔ ان عظیم فنکاروں کے کس بل کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ آج انہیں کی آوازیں موسیقی کے افق پر چھائی ہوئی ہیں۔ انہیں موسیقاروں کے دم سے کلاسیکی موسیقی کی دل پذیری قائم ہے، اور جدید ہلکی پھلکی موسیقی، اپنی ہر دل عزیزی کے باوجود کلاسیکی موسیقی کے سر سے تاج نہیں اتار سکی۔ (حوالہ ۱؎ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

مہندی کے پھول ——— رتن سنگھ

•

مہندی کے کچھ پھول رچے ہیں
اس نے گورے ہاتھوں میں
ساجن کی تو نیند اڑے گی
جب مہکیں گے راتوں میں

•

کالا بھنورا کھا گیا دھوکا
ہاتھوں پر منڈلاتا ہے
ایسے اس نے رنگ بھرے ہیں
کلیوں اور گلابوں میں

•

کتنی پیاری خوشبو آئی
کس کے پھول کھلے ہیں یہ
اک شہزادہ بھاگا آیا
ڈالے پاؤں رکابوں میں

•

بات بات میں کسی نے پوچھا
کس کے لئے ہیں پھول رچے
وہ ہنس دی پھر چپ سی ہو گئی
بات اڑا دی باتوں میں

•

آنکھوں میں وہ بھر کر آنسو
دیکھ رہی ہے پھولوں کو یُوں
کیسی ہو گئی اس سے غلطی
ڈوب جائے حسابوں میں

•

رنگ حنا کچا ہوتا ہے
وہ تو اک دن اترے گا
حرفوں سے جو نقش ہو گئے
مہکیں پھول کتابوں میں

---

1. "CLOSE BY IS THE TOMB OF TANSEN, ONE OF THE NINE GEMS OF AKBAR'S COURT AND THE GREATEST MUSICIAN INDIA HAS EVER PRODUCED. HE WAS A NATIVE OF GWALLIOR AND HAS FOUND HIS LAST RESTING PLACE NEAR THE PLACE OF HIS BIRTH. THERE IS A TAMARIND TREE NEAR THE TOMB, THE LEAVES OF WHICH ARE CHEWED BY THE SINGERS IN BELIEF THAT THEY IMPART A SWEET VOICE....."

(A HAND BOOK OF GWALLIOR - P.42)

ندیم انصاری شاہجہانپوری

سچائی کے زخم

وہ عجیب آدمی تھا۔ کبھی لگتا جیسے وہ بیوقوف پاگل، دیوانہ ہے۔ کبھی شک ہوتا کہ وہ انتہائی ذہین، ہوشیار اور چالاک ہے۔ اسٹیشن کے باہر والے ہوٹل میں اکثر شام کو وہ مجھے نظر آجاتا تھا۔ ویسے تو ہوٹل میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں مگر اس شخص کی کچھ باتوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ تیس بتیس سال کا خوبصورت نوجوان تھا۔ صحت بھی اچھی تھی۔ کئی بار دل میں سوچا کہ اسے مخاطب کروں مگر اس کی محتاط روی نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا وہ جب بھی ہوٹل میں داخل ہوتا تو دروازے کے سامنے کی سیٹ منتخب کرتا۔ اور جب تک ہوٹل میں رہتا اس کی نظریں سڑک کا طواف ہی کرتی رہتیں۔ کبھی کبھی اس کے چہرے پر خوف طاری ہو جاتا، کبھی اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار دکھائی دینے لگتے بسا اوقات وہ کھانا کھاتے کھاتے ایک دم اٹھ جاتا۔ کاؤنٹر پر پیسے دیتا اور کھانا چھوڑ کر چلا جاتا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مگر نہ جانے میں کیوں اس کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھنے پر مجبور تھا۔ میں نے اپنی اس عادت پر لعنت ملامت بھی کی مگر میں لاشعور میں کلبلاتے ہوئے تجسس کو بہلا نہ سکا۔

آخر ایک دن میں اس کے پاس والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ اس نے ایک بار میری طرف دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ اس کا کھانا بھی آچکا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

اچانک میں نے اسے مخاطب کیا۔ "آپ نے اچار نہیں منگوایا۔ اچار سے کھانے کا مزہ دوگنا ہو جاتا ہے۔"

"شکریہ۔ مجھے اچار کا شوق نہیں۔"

کچھ دیر رک کر میں نے پھر پوچھا۔ "آپ اسی شہر میں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں" مختصر جواب دے کر اس نے پانی کا گلاس اٹھالیا۔

"میں کانٹ کا رہنے والا ہوں۔" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "کچہری میں ملازم ہوں۔ دو سال پہلے میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔ میں نے اپنے بچے دادا دادی کے پاس بھیج دیئے۔ مگر روزی روٹی کی بیڑیوں کی وجہ سے یہاں رہنے پر مجبور ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ جس شہر کی گہما گہمی اور رونقوں میں ڈوب کر مجھے انتہائی خوشی کا احساس ہوتا تھا آج یہاں کی ہر چیز سے بیزاری محسوس ہوتی ہے مگر پیٹ بھرنے کے لئے گھر کے بعد یہی ہوٹل میرا سہارا بن کر رہ گیا ہے۔" اتنا کہکر میں خاموش ہوگیا وہ میری باتیں غور سے سنتا رہا مگر اس نے کچھ پوچھا نہ اپنے بارے میں بتایا۔

یہ میری اس کی پہلی ملاقات تھی۔ دوسری بار وہ ہوٹل میں آیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ وہ سیدھا میرے پاس والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور ہم دونوں میں بات چیت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چند ملاقاتوں میں میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ اس کا نام صابر تھا اور وہ شہر کے پورب میں واقع محلہ دلیل گنج کا رہنے والا تھا۔ اس کا کسی سے جھگڑا چل رہا تھا جس کی وجہ سے کبھی وہ خائف نظر آتا تھا تو کبھی خوف کا شائبہ تک اس کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔ ہوٹل کے قریب واقع محلے میں ایک شخص اس کا شناسا تھا جس سے ملنے وہ ہفتے میں ایک دو بار آتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا البتہ اس کی آنکھوں کی بے چینی اس کے سینے میں دبے کسی راز کی غمازی کرتی رہی تھی مگر میں نے اسے زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ جب دو آدمیوں کے درمیان اعتماد قائم ہوجاتا ہے تو کوئی راز، راز نہیں رہتا۔

ایک بار وہ میرے ساتھ میرے گھر بھی گیا ہم دونوں بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اس کو نزدیک سے دیکھنے کے بعد میں نے اتنا اندازہ ضرور کر لیا کہ صابر بیحد حساس ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص اور حوصلہ مند انسان ہے۔ بات کہکر پلٹنا اس کی سرشت میں نہیں ہے۔ اس دن چلتے وقت وہ مجھ سے بولا تھا۔ "اکرم بھائی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میرا اگلی ملاقات میں اپنی پوری کہانی آپ کو سناؤں گا۔ ایک ایسی سچائی کی کہانی جو کرچیاں بن کر میری روح کو لہولہان کر رہی ہے۔ شاید آپ جیسے ہمدرد انسان کے مشورے میرے زخموں کو سکون پہنچا سکیں۔"

اس کے بعد چوتھے دن میں اچانک دفتر کے کام سے لکھنؤ چلا گیا اور وہاں ایک ہفتہ لگ گیا۔ واپس آیا تو مجھے ہوٹل میں عجیب کہانی سننے کو ملی۔ مجھے پتہ چلا کہ ایک رات صابر پرانی چوپال کے پاس رہنے والے اپنے شناسا کے گھر سے باہر نکل کر جیسے ہی گلی میں پہنچا کہ دو آدمیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ایک کے پاس دیسی پستول تھا مگر صابر کی خوش قسمتی کہ فائر مس ہوگیا اور صابر بچ گیا تب ہی اس پر دوسرے آدمی نے چاقو سے حملہ کر دیا۔ معمولی زخم کھانے کے بعد کسی طرح صابر چاقو چھیننے میں کامیاب ہوگیا اور پھر اس نے پستول والے کو ایک دم دبوچ لیا۔ دونوں گلی میں گتھم گتھا ہوگئے۔ پھر صابر پر جیسے پاگلپن سوار ہوگیا اور اس نے پستول والے پر پے درپے چاقو کے کئی وار کر ڈالے۔ اس کا دوسرا ساتھی بھاگ گیا پستول والے کی چیخیں گلی میں گونجیں تو لوگ جمع ہوگئے۔ صابر پستول والے کو چھوڑ کر خون میں لت پت کھڑا ہوگیا مگر بھاگا نہیں۔ پولیس آئی اور صابر کو گرفتار کر کے لے گئی۔ پستول والا دم توڑ چکا تھا۔ ابھی صابر کی ضمانت نہیں ہوئی ہے۔ وہ جیل پہنچ چکا ہے۔

میں یہ کہانی سن کر بہت دیر سکتے کی حالت میں بیٹھا

کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجھے صابر کی شخصیت سے بے انتہا لگاؤ ہو چکا تھا اس لئے اس کہانی نے گویا میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ دوسرے دن میں چھٹی لے کر صابر سے ملنے جیل پہنچ گیا۔ میں اس سے مل کر جلد سے جلد اصلیت جاننا چاہتا تھا۔ تحریری کارروائی کے بعد میں اندر پہنچا تو صابر کٹہرے کے پیچھے کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ سب کیسے ہو گیا صابر؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر وہ تلخی سے مسکرایا اور بولا۔ "اکرم بھائی میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو ان میں ایک تحریر صاف دکھائی دے گی کہ آج کی دنیا میں انسان کے لئے سچائی اور ایمانداری سب سے بڑی لعنت ہے مگر یہ بات میری سمجھ میں اس وقت آئی جب میں اپنی زندگی کی یہ بھیانک غلطی کر چکا تھا۔"

"صابر تم جیسے ایماندار اور باہمت آدمی کے منہ سے ایسی بات مناسب نہیں معلوم ہوتی۔"

"آپ اس کہانی سے لاعلم ہیں نا جو میری زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔ چند لمحے رک کر وہ پھر بولا۔ "میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں گا مگر حالات نے موقع نہیں دیا۔ آج میں اپنا وعدہ پورا کردوں گا حالانکہ وقت کم ہے اس لئے مختصراً سن لیجئے۔" پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ چند ثانیے آنکھیں بند کر کے شاید واقعات کی کڑیاں ملائیں پھر کہنے لگا۔ "تقریباً چھ سال پہلے کی بات ہے ایک دن میں محلہ گلی میں دوپہر کے وقت اپنے دوست ہارون کے گھر پہنچا۔ وہ میرا بچپن کا ساتھی ہے۔ اکثر ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ ہارون اپنی ماں اور جوان بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں نے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اچانک مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ پھر میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا نسوانی چیخوں کی آواز اب بھی میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ دوپہر کے سناٹے کی وجہ سے گلی سنسان پڑی تھی۔ میرے دل و دماغ میں عجیب عجیب خیال آنے لگے۔ یکبارگی دروازہ کھلا اور ایک نوجوان مجھے دھکا دیتا ہوا تیزی سے نکلتا چلا گیا۔ میں بوکھلاہٹ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر جلدی سے گھر میں گھس پڑا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ہارون کی بہن سائرہ تنہا کھڑی تھی۔ لیکن عجیب حالت میں۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کہیں کہیں سے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سسک پڑی اور دروازے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ انور میرے ساتھ ۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ ہانپتی کانپتی پلنگ پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے اتنا اندازہ کر لیا تھا کہ میرے آجانے سے میرے دوست کی بہن کی عزت بچ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم گھبراؤ مت میں نے اسے نکلتے دیکھ لیا تھا اسے اس انسانیت سوز حرکت کا مزہ چکھاؤں گا۔"

"پھر میں ہارون اور اس کی ماں کا انتظار کرنے لگا۔ ہارون کی ماں محلے کے کسی گھر میں گئی ہوئی تھیں اور ہارون بازار گیا ہوا تھا۔ جب وہ دونوں آئے تو میں نے پوری بات بتائی۔ ہارون غصے سے پاگل ہو اٹھا کیونکہ انور پڑوس میں رہتا تھا اور بظاہر بڑا شریف نظر آتا تھا اس لئے اس کے آنے جانے پر کبھی ہارون نے روک ٹوک نہیں کی تھی۔ آج اسی انور نے ہارون کے سینے میں خنجر اتارنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے جذبات سے کام لینے سے منع کیا اور سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ پھر ہم دونوں تھانے پہنچے۔ پولیس نے میرے بیان کے ساتھ ساتھ سائرہ کا بھی بیان لیا۔ اور دوسرے دن انور

کو گرفتار کر لیا گیا۔ کئی مہینے مقدمہ چلا اور جرم ثابت ہو جانے پر اسے پانچ سال کی سزا ہوئی۔ ہم لوگوں نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ ایک مجرم کو اس کے کئے کی سزا مل گئی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ پانچ سال بعد انور جیل سے لوٹا تو وہ مجھ سے انتقام لینے کے لئے پاگل ہوا اٹھا کیونکہ اس کیس کا میں چشم دید گواہ تھا اور میری ہی وجہ سے اسے سزا ہوئی تھی۔ مجھے جب اس بات کا پتہ چلا تو میں اس سے ہوشیار رہنے لگا۔ لیکن ایک دن میں کچہری روڈ سے رکشے پر بازار جا رہا تھا کہ مجھے سامنے سے آتے ہوئے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر انور بیٹھا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میں نے رکشہ رکوانے کی کوشش کی مگر اس نے اپنی بندوق سے میرے اوپر فائر کر دیا۔ رکشہ ایک دم رک گیا کیونکہ گولی میرے سینے پر لگنے کی بجائے رکشہ والے کے داہنے ہاتھ پر لگی تھی۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور بیہوش ہو گیا۔ راہگیر اکٹھے ہو گئے۔ چند ہمدردوں کی مدد سے میں اسے ہسپتال لے گیا اور اس کے علاج پر پانی کی طرح روپیہ بہایا مگر تیسرے دن ڈاکٹروں نے کہنی سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا کیونکہ اس کی ہڈی چور چور ہو چکی تھی۔ اس رکشے والے کا نام رمیش تھا اور وہ ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اپنی بیوی بچوں کو لیکر روزی کمانے شہر آیا تھا۔ اسپتال میں میں اس کی ہر طرح دیکھ بھال کرتا رہا۔ جب اس کا زخم ٹھیک ہو گیا تو میں نے اسے اس کے گھر پہنچا دیا مگر میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ اس کے بیوی بچوں کو زندگی بھر تکلیف نہیں ہونے دوں گا کیونکہ میں جانتا تھا کہ سچائی کے نتیجے میں جو اژدہا مجھے نگلنا چاہتا تھا اسے رمیش نے اپنے داہنے ہاتھ کی بھینٹ چڑھا کر مجھے بچا لیا تھا اور میری زندگی کی ایک ایک سانس گویا رمیش کی قرضدار ہو گئی تھی۔ مگر اتنا سب ہونے کے بعد بھی انور کو تسلی نہیں ہوئی۔ وہ پولیس سے چھپتا پھرا اور میری تلاش میں لگا رہا۔ اس رات میں رمیش کے گھر سے نکل کر گھر آ رہا تھا کہ اس نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے مجھ پر حملہ کر دیا مگر اسے اتفاق کہئے کہ مجھے مارنے کے بجائے وہ کمینہ میرے ہاتھ سے اپنے انجام کو پہنچ گیا۔" اتنا کہکر صابر خاموش ہو گیا۔ میں صابر کی داستان سن کر سوچنے لگا کہ یہاں سزا اسے کیوں ملتی ہے جس کا کوئی جرم نہیں ہوتا چند لمحے کی خاموشی کے بعد صابر پھر بولا۔ "مجھے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں۔ مجھے فکر ہے تو صرف رمیش اور اس کے بچوں کی۔ ہارون میری ضمانت کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ جیل سے باہر آ گیا تو میں رمیش سے اپنا کیا ہوا وعدہ زندگی بھر نبھاتا ہی رہوں گا اور اگر مجھے سزا ہو گئی تو میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔ رمیش کی معذوری مجھے چین نہیں لینے دے گی۔

"خدا پر بھروسہ رکھو۔ آخری لمحے میں بھی اسکی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"خدا پر ہی تو بھروسہ ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اتنے میں ایک آواز گونجی۔ "وقت ختم ہو گیا۔"

یکبارگی نہ جانے کس جذبہ کے تحت میں نے صابر کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ "تم رمیش کی طرف سے فکر مت کرو۔ جب تک تم جیل سے چھوٹ نہیں جاتے میں اس کا ہر طرح خیال رکھوں گا۔"

صابر نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگائے پھر سنجیدگی سے بولا۔ "اب مجھے یہ دیکھنا ہے کہ انصاف کے ترازو کا پلڑا میری ایمانداری اور سچائی کا وزن محسوس کرتا ہے یا نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے بیرک کی طرف گھوم گیا اور میں وہاں سے پلٹ آیا یہ سوچتا ہوا کہ صابر سے کئے گئے اس وعدے کو نبھا بھی پاؤں گا یا۔

•••

سید شکیل دسنوی

★

دل کو بننا ہے صدف تو تیرِ مژگاں کیوں نہ ہو
گر سلاسل ہے مقدر، زلفِ پیچاں کیوں نہ ہو

کیوں نہ دے پستی فلک کی جلوہ ریزی کا جواب
خاک کی انگڑائیوں میں حسنِ عریاں کیوں نہ ہو

چاک کرنا ہی اگر ہے شیوۂ اہلِ جنوں
باعثِ تسکینِ وحشت دل کا داماں کیوں نہ ہو

ہو چکا سیرِ مہ و انجم سے اب سیراب دل
پائے وحشت کے لیے پھر دشتِ امکاں کیوں نہ ہو

کیوں کریں فکرِ مداوا، چارہ گر کی جستجو
دردِ دل ہی خود ہمارے دل کا درماں کیوں نہ ہو

طلعت عرفانی

★

خراب شئے تھی بہت خواہشِ وصال اسکی
بچا نہ کچھ بھی کہ ہم دے سکیں مثال اسکی

وہ نیم خواب سا بیٹھا تھا رات آنگن میں
اتر رہے تھے منڈیروں سے کچھ سوال اسکی

چلو وہ ایک کھنڈر ہی سہی مگر سوچو
اُگے ہیں پیٹھ پہ کتنے ہزار سال اسکی

اب اپنے سائے سے بچ کر نکل چلو طلعت
چمک اٹھی ہے اندھیرے میں پھر سے کھال اسکی



ایاز نظر

سہما ہوا جواب

لکھنؤ میں انٹرویو دینے کے بعد میں نے سوچا چلو کیوں نہ آنٹی کے گھر ہو لیا جائے۔ اس بہانے میری ملاقات اپنے پرانے دوستوں سے بھی ہو جائے گی اور یہی سوچ کر میں ہردوئی جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

بس نے ایک سَو دس کلو میٹر کی دوری کتنے گھنٹوں میں طے کی یہ میں نہیں جان سکا۔ میری آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر آنٹی کا چہرہ گھوم جاتا۔ آنٹی کے چہرے کے ساتھ ساتھ ایک اور چہرہ آ جاتا اور وہ چہرہ تھا میرے خالہ زاد بھائی گڈّو کا چہرہ۔

اب تو گڈّو کافی بڑا ہو گیا ہوگا۔ اور شاید کافی غصیلا بھی... یوں تو گڈّو بچپن ہی سے کافی غصیلا تھا۔ لیکن آنٹی کے اس کے لئے لاپرواہی بھرے رویہ نے اسے اور غصیلا .... بنا دیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں آنٹی کے ساتھ رہتا تھا تو وہ اکثر بات بات پر جھنجھلا جاتا تھا۔ آنٹی کبھی تو گڈّو کے اس رویہ سے تنگ آ کر اسے مار بیٹھتی تھیں اور کبھی ہنس کر ٹال دیتیں۔ اور کبھی خود رونے بیٹھ جاتیں۔ لیکن یہ ڈرامہ تو روز کا تھا۔ گڈّو کو غصہ روز آتا تھا اور اس وقت تو اس کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا جب وہ تھکا ہارا اسکول سے آتا اور آنٹی اسے گھر پر نہیں ملتیں۔ اور جب اس کی نظر کچن میں بکھرے خالی برتنوں پر جاتی تو وہ پھر غصہ سے لال پیلا ہونا شروع کر دیتا۔

ان دنوں گڈّو کے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ رات وہ دیر تک پڑھتا تھا اور سویرے بھی جلدی اٹھ کر پڑھائی میں جٹ جاتا۔ اور آنٹی! وہ تو نیند کی گولی کھا کے دیر تک اپنے بستر پر پڑی رہتیں۔ گڈّو اسکول جانے سے پہلے چائے بناتا۔ کبھی کبھی انڈے ابال لیتا اور کھا پی کر اسکول چلا جاتا۔ لیکن آج جب گڈّو اسکول سے گھر آیا تو آنٹی گھر پر نہیں تھیں۔ کچن میں بکھرے خالی برتنوں کو دیکھ کر وہ جل بھن گیا۔ تھوڑی دیر وہ کچن میں کھڑا چلاتا رہا اور پھر میرے پاس پہنچا اور غصے سے بولا۔ "ممی کہاں ہیں؟"

"شاپنگ کرنے گئی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن کیا وہ کھانا بنا کر شاپنگ کرنے نہیں جا سکتی تھیں؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے اپنے لہجہ میں نرمی لاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کیا کھایا...؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

وہ دیر تک میرے چہرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا پھر بولا — "آپ بھی میری طرح بھوکے رہتے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے۔ جب آپ کے ممی پاپا کو معلوم ہوگا کہ آپ یہاں بھوکے رہتے ہیں تو وہ کیا سوچیں گے۔"

میں نے کہا "گڈّو تم تو جانتے ہو کہ انکل جی عرب جانے سے پہلے میرے گھر گئے تھے۔ اور بہت کہہ سن کر مجھے یہاں لے آئے تھے۔ میں یہاں خود بھی آنا نہیں چاہتا تھا لیکن انکل جی کی بات کو ٹھکرا بھی نہیں سکتا تھا۔ اور اگر اب میں واپس جاتا ہوں تو میری پڑھائی ایک سال پچھڑ جائے گی۔ ویسے بھی اس سال بورڈ کا امتحان ہے۔"

تبھی آنٹی آ گئیں۔ ان کو دیکھ کر تو میں دنگ رہ گیا۔

انہوں نے اپنے لمبے لمبے بالوں کو باب کٹ اسٹائل میں کٹوا رکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں طرح طرح کے بنڈل تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان بنڈلوں میں کیا ہوگا ـــــ ساڑیاں۔ کاسمٹیک یا انہیں جیسی کچھ دوسری چیزیں.... اس سے پہلے کہ وہ بنڈل کھول کر ہمیں دکھاتیں اور بتاتیں کہ کیسے مسز پال ان کو زبردستی باربر کے پاس لے گئیں اور ان کے بال کٹوا دیئے۔ گڈو نے ان سے سوال کر لیا۔

"کہاں سے آرہی ہیں آپ؟"

"دیکھتے نہیں ہو بازار سے آرہی ہوں۔ تمہارے لئے شوز لائی ہوں۔" انہوں نے گڈو کے خراب موڈ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس وقت شوز نہیں کھانا چاہئے۔" گڈو شیر کی طرح دہاڑا۔

"چیختے کیوں ہو۔ ابھی بناتی ہوں کھانا۔" کہتے ہوئے آنٹی کچن میں گھس گئیں۔

آنٹی کے پیچھے پیچھے گڈو بھی کچن میں گھس گیا۔ اس کی زبان اب بھی انگارے اگل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے آنٹی کو بھی غصہ آگیا.... پھر کراکری ٹوٹی.... گڈو پر جھاڑو وں سے مار پڑی.... آنٹی گھنٹوں خود روئیں ـــ اور نتیجہ یہ نکلا کہ دوپہر کا کھانا رات کو کھایا گیا۔

جیسے جیسے انکل کا ڈرافٹ آنے کی رفتار بڑھتی گئی ویسے ویسے آنٹی کا گھر سے باہر رہنے کا وقت بڑھتا گیا۔ وہ اب اپنی ساڑی کی فال خریدنے لکھنؤ چلی جاتیں اور اپنی پسندیدہ نیل پالش خریدنے کے لئے انہیں کانپور جانا پڑتا تھا۔ اب وہ روز ایک ڈانس اسکول میں ڈانس سیکھنے بھی جانے لگی تھیں۔ ڈانس سیکھنے کے بعد اپنی سہیلیوں کی پارٹی میں بھی بڑے اہتمام سے شامل ہوتی تھیں۔ اب وہ کبھی کبھی پی بھی لیتی تھیں۔ روز رات دیر سے کبھی ان کو شیلا کے شوہر گھر چھوڑ جاتے اور کبھی مینا کے بھائی صاحب۔

گڈو اب زیادہ تر چپ ہی رہنے لگا تھا۔ چپ کہنا تو غلط ہوگا بلکہ خون کا گھونٹ پی کر رہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا غصہ بہتے دریا کا رخ نہیں موڑ سکتا۔ وہ اکثر مجھ سے کہتا پاپا کو خط لکھ کر سارے حالات سے آگاہ کر دونگا۔ لیکن میں اسے منع کر دیتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ آنٹی میری ماں کی اکلوتی اور سب سے پیاری بہن ہیں۔

پھر دھیرے دھیرے گڈو بھی بدل گیا کیونکہ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ ایڈجسٹمینٹ کے لئے اپنے کو تھوڑا سا بدلو۔

پھر میرے امتحان شروع ہو گئے۔ امتحان ختم ہونے پر میں واپس رامپور آگیا۔ دھیرے دھیرے میں آنٹی اور گڈو کو بھول سا گیا۔ اکثر آنٹی کے خط ماں کے پاس آتے تھے۔ یا جب کبھی انکل عرب سے آتے تو پاپا سے ملنے آجاتے۔ تبھی ان کی یاد کے کچھ کھٹے میٹھے جھونکے آجاتے تھے۔

کنڈیکٹر کی آواز نے میری سوچ کا سلسلہ توڑا ـــ

"بابو جی ہردوئی آگیا۔" میں بس سے اتر کر پیدل ہی گھر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی آنٹی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئیں اور ڈھیر سی لپسٹک اور تھوک سے میرے گالوں پر جدید آرٹ کے نمونے بنا دیئے۔ گڈو بھی گھر پر تھا۔ اب تو وہ کھجور کے پیڑ سا لمبا ہو گیا تھا۔ انٹر میں پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بات چیت کے بعد آنٹی بولیں۔

"بیٹا تم آئے بہت غلط وقت پر... میں تو اسوقت کانپور جا رہی ہوں... وہاں میری ایک سہیلی ہے میرا ـــ بہت بڑے بزنس مین کی بیوی ہے... آج اس کے لڑکے کا برتھ ڈے ہے... بہت اصرار سے مجھے بلایا ہے... اس لئے جانا بھی ضروری ہے... کل تک آجاؤں گی... تم تو اب آرام کرو سفر سے آئے ہو۔ تھک گئے ہوگے..."

"لیکن آنٹی میں شام والی ٹرین سے چلا جاؤں گا!"

میں نے کہا۔

"ارے کیسی بات کرتے ہو۔ اتنے دنوں بعد آئے ہو اور کہتے ہو ابھی چلا جاؤں گا۔"

"لیکن آنٹی ....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں... رکنا تو تمہیں ہے۔"

آخر مجھے آنٹی کی خواہش کے آگے سر جھکانا ہی پڑا۔

جب آنٹی چلی گئیں تو میں گڈو کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔

"ایک بات بتاؤ۔ آنٹی کے گھومنے پھرنے کی عادت ابھی گئی نہیں؟"

"تم بھی کتنی محدود سوچ کے مالک ہو بھیا۔ سوسائٹی میں تو یہ سب چلتا ہی ہے۔"

میں چونکا... پھر بات کا رخ موڑنے کے لئے میں نے کہا۔ "کھانا کون بناتا ہے۔؟"

"نوکرانی ـــــ بازار گئی ہے اس وقت ـــ گھر پر ہی رہتی ہے۔ اس بار جب پاپا عرب سے آئے تھے تو اپنے گاؤں سے لے آئے تھے۔ بڑے مزے کا کھانا بناتی ہے اور خود بھی....."

میں گڈو کے آخری جملے پر پھر چونکا مگر چپ رہا۔ کچھ دیر بعد گڈو بولا۔

"اچھا بھیا میں ذرا ٹیوشن پڑھنے جا رہا ہوں۔ جب تک آپ بیڈ روم میں بیٹھ کر وی سی آر (V.C.R) دیکھیں۔"

میں وہاں سے اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا۔ اور الماری میں سجی بھڑکیلی چیزوں کا جائزہ لیتا رہا۔ تبھی گڈو کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"بھیا دروازے بند کر لیں جا رہا ہوں۔"

میں نے گڈو کے جانے کے بعد دروازے بند کر لئے۔ اور بیڈ روم میں آکر ویڈیو کیسٹ تلاش کرنے لگا۔ ایک الماری میں مجھے کیسٹ مل گئے۔ میں نے کیسٹ وی سی آر میں لگایا مگر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے وی سی آر بند کرنا پڑا کیونکہ وہ ایک بلو فلم کا کیسٹ تھا تبھی کال بیل بجی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ہاتھ میں ترکاری کی ٹوکری لئے ہوئے دو اجنبی مگر نوجوان آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا یہ کھانا بنانے والی ہے۔ میں دروازے کے ایک طرف ہو گیا۔ وہ اندر آئی اور سیدھے کچن میں چلی گئی۔

میں نے دروازہ بند کیا اور گڈو کے کمرے میں آکر اس کی کتابیں ٹٹولنے لگا لیکن وہاں بھی مجھے مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی کتابوں کے درمیان اجنتا ایلورا کے فوٹوز کے ایلبم اور اسی طرح کی بہت سی قابلِ ذکر کتابیں دیکھنے کو ملیں۔ یہی نہیں وہاں مجھے بڑی تعداد میں نشیلی گولیاں بھی رکھی دکھائی دیں۔ میں چپ چاپ وہاں سے نکل کر اپنے دوستوں سے ملنے چلا گیا۔

رات نو بجے کے قریب میں واپس لوٹا تو گڈو گھر آچکا تھا۔ نوکرانی صوفے پر پسری کوئی فلمی میگزین دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھانا نکالنے اٹھ گئی۔ کپڑے بدلنے کے بعد میں نے کھانا کھایا اور سونے کے لئے گیسٹ روم میں چلا گیا۔

دیر رات گئے میری آنکھ کھلی۔ پیاس نے پریشان کیا تو میں پانی پینے باہر نکلا لیکن آنگن میں پہنچنے کے بعد میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیونکہ گڈو کے کمرے سے پھسپھساہٹ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے "کی ہول" سے جھانک کر دیکھا۔ اندر گڈو اور نوکرانی .... میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آگیا۔ تبھی میرے اندر سے کسی نے سوال کیا "گڈو کیوں بگڑا؟"

اور جواب میں آنٹی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

...

شیدا بگھونوی

سفید گلاب

آخر شام کی شریر باد لطیف سے نہ رہا گیا۔ اور اس نے چمن میں نئی نئی آئی ہوئی یاسمین کو دھیرے سے گدگدایا۔ یاسمین کی نازک کلیاں ایک خاص ادا سے شرما کر اور زیادہ سکڑ گئیں۔ نرگس، بیلا، گلاب اور حوض میں تیرتے ہوئے کنول یاسمین کی اس ادا پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

رات کی رانی نے ان ہنستے ہوئے گلوں پر ایک نظر ڈالی، اور دوبارہ اپنی کلیاں سنوارنے میں مصروف ہو گئی۔ بیلے کو رانی کی یہ بے رخی پسند نہ آئی۔ اس نے گہری نگاہ سے رانی کو دیکھا اور دوبارہ اس دلچسپ محفل میں کھو گیا۔ نرگس سے نہ رہا گیا۔

"افوہ کب تک تمہارے یہ سنگھار ہوتے رہیں گے"

رانی نے اس کو کچھ جواب نہ دیا اور شب کی پھیلتی ہوئی تاریکی دیکھنے لگی۔

دوسرے گلوں کے قہقہوں کے ساتھ اب یاسمین کے لطیف و خوشگوار قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے — ان قہقہوں سے سوتا ہوا سورج مکھی جاگ اٹھا۔ اور بڑبڑاتے گیندے سے مخاطب ہوا۔

"خود تو سارا دن سوتے رہتے ہو اور رات کو جاگ جاگ کر دوسروں کو ستاتے ہو" — نیم خوابی کے عالم میں گیندے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور پھر دونوں خوابوں کی وادی میں پہنچ گئے۔

شور اتنا تیز ہو گیا کہ وظیفہ پڑھتی ہوئی مولسری کو اپنی خوشبو فضا میں بکھرتے ہوئے ان کو ڈانٹنا پڑا۔ شریروں کی یہ ٹولی کچھ دیر خاموش رہی۔ لیکن اپنی عادت سے مجبور ہو کر انہوں نے دوبارہ سرگوشیاں شروع کر دیں۔

چمن کے آخری کونے پر اگا ہوا سفید گلاب ان سب باتوں سے بے پرواہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ کتنا محو تھا وہ .... کہ اس کو اپنی شاخ پر روزانہ بسیرا کرنے والی بلبل کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ بلبل کافی دیر تک منتظر رہی کہ سفید گلاب کچھ بولے .... مگر وہ خاموش چاند کو تکتا رہا۔

"اتنے اداس کیوں ہو ننھے سفید گلاب۔" بلبل نے اس کی خاموشی سے اکتا کر پوچھا۔ وہ چونک پڑا۔ اور جانے کیوں؟ .... اک سوگوار ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ بلبل سوچنے لگی۔ آج سفید گلاب کا دل بہلانے کے لئے کیا کیا جائے — سفید گلاب روزانہ سے کہیں زیادہ غمگین معلوم پڑتا ہے۔ اس نے سفید گلاب کا دل بہلانے کے لئے اسے دن بھر کی نئی نئی باتیں سنائیں۔ چمن کے دوسرے پھولوں کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

آخر بلبل کے بہت اصرار پر اس نے اپنے غمگین ہونے کی وجہ بتائی۔

"کاش میرا رنگ بھی سامنے جھومتے ہوئے سرخ گلاب کی طرح ہوتا۔" "تم ایسے بھی بہت اچھے لگتے ہو۔" بلبل نے اس کی تعریف کی۔

"لیکن ان کو تو نہیں معلوم ہوتا۔" سفید گلاب نے ہنستے ہوئے مغرور گلوں کو دیکھ کر معصومیت سے کہا۔ بلبل کے پاس اس کی اس بات کا جواب نہ تھا۔ شب کی ٹھنڈی ہواؤں نے غمگین گلاب کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔

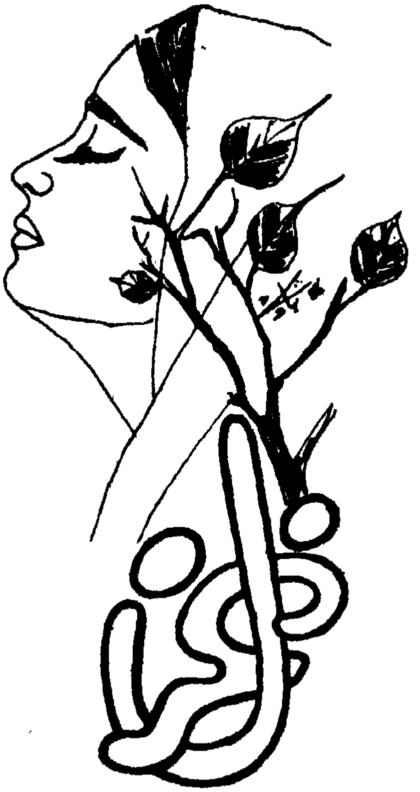
بلبل جاگتی رہی — اور سوچتی رہی کہ کس طرح سفید گلاب کی آرزو پوری کی جاسکے ... سارے چمن میں وہی تو اکیلا اس کا دوست ہے۔ جو اس کے غمگین راگ بڑے شوق سے سنتا ہے۔ ورنہ دوسرے پھولوں کو تو اپنے ہنسی مذاق اور زندہ دل محفلوں ہی سے فرصت نہیں۔ آخر سوچتے سوچتے ... ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آئی ... وہ آہستہ سے سفید گلاب کے پاس آئی۔ اور کچھ تلاش کر کے اسی میں اٹک گئی۔

رات گزرتی گئی۔ اور ... دھیرے دھیرے اک ننھے دل کی آرزو پوری ہوتی گئی ... آفتاب کی پہلی کرن نے جب سفید گلاب کو جگایا تو اس نے آنکھیں ملتے ہوئے چاروں طرف نگاہ ڈالی ....

.... چمن کا ہر پھول اس کو حسرت سے دیکھ رہا تھا اس نے جلدی سے اپنے آپ کو دیکھا — اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا ... اب وہ ایک بڑا سرخ گلاب تھا ... بالکل خون کی طرح سرخ اور چمکدار .... اس نے جھومتے ہوئے نیچے نگاہ ڈالی — اُف ... وہ کانپ گیا۔ اس کا سب سے قریبی کانٹا مردہ بلبل کے دل میں پیوست تھا۔

گلاب کے پھول پر سے شبنم کے چند قطرے اس طرح گرے جیسے آنسو، اور پھر چمن کے ہر پھول نے دیکھا ... کہ شام تک اس پھول کی ہر پتی سوکھ کر مردہ بلبل کے آس پاس زمین پر اس طرح بکھر گئی جیسے اسے آغوش میں چھپا لیا ہو ... اور اس طرح محبت کے دو پھول ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو کر ابدی سکون کی دنیا میں کھو گئے۔ ●●

عبد المتین جامیؔ



تاریکیوں کا سنگ ہر اک رہگذر میں رکھ
پھر عزم کا چراغ مری چشم تر میں رکھ
لینے دے جائزہ انہیں خود اپنی روح کا
تو فکر و فن کا نور نگاہِ بشر میں رکھ
لمحوں کی اڑتی گرد جہاں ڈھونڈلے پناہ
کچھ ایسا نقش وقت کے دیوار و در میں رکھ
دامن کو رات بھر میں سیاہی سے بھر لیا
یادوں کی دھند کو ذرا دستِ سحر میں رکھ
ہے شور و غل میں رونق بزمِ طلب نہاں
تو بحرِ بے کراں کے تموّج کو گھر میں رکھ

نثار انجم

کرب کی آنچ

میرے سامنے بوڑھا برگد زرد پتیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے غمزدہ کھڑا تھا۔ اس کی شاخوں میں گنتی کی مایوس زرد پتیاں تھیں جو خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان پتیوں سے خون ٹپک کر چبوترے پر لہو کا حصار بنا رہا تھا۔ آس پاس مردہ پتے خاک اور کفن میں لپٹے پڑے تھے۔ پانی اور مٹی نہ ملنے کی وجہ سے پیڑ مرجھا گیا تھا اس کی شاخیں سوکھ رہی تھیں۔ برسوں پہلے وہ شاداب تھا۔ اس کی خوشنما شاخیں مستی میں جھومتی تھیں۔ پتوں پہ جوانی کا خمار تھا اور کلیوں کے ہونٹوں پہ تبسم رقصاں تھا۔ پتیوں پر شبنم کے نازک قطرے آبدار موتیوں کی طرح جھلملاتے تھے۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد صرف بوڑھا پیڑ اور لہو کا حصار رہ گیا تھا۔ میں ہاتھوں میں قلم اور کاغذ لئے کھڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھکر لہو کو کاغذ سے صاف کرنا چاہا۔ اور لہو کی تہہ کو کھرچنے لگا جس کا رنگ سیاہ ہو رہا تھا لیکن کوشش کے باوجود لہو کے دھبے کو نہ مٹا سکا۔ دفعتاً ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔ لہو کا حصار گوشت پوشت کا مکمل ڈھانچہ بن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں چونک گیا۔ اس کی آنکھیں حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ گال پچکے ہوئے تھے آنکھوں سے یاسیت ٹپکتی تھی۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ اس کی پسلیاں جسم سے باہر جھانک رہی تھیں۔ سوکھا زرد چہرہ پھیکی مسکراہٹ کا پیکر تھا۔ وہ بوسیدہ سی ساڑی میں ملبوس تھی۔ چہرے سے وحشت ٹپکتی تھی۔ جسم لہولہان تھا۔ بدن پر سیاہ و سفید خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر بے شمار زخم تھے اور ان زخموں سے خون رس رہا تھا۔ سڑے ہوئے زخموں سے بے پناہ تعفن پھوٹ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ زخم برسوں سے یونہی سڑ رہے ہوں۔

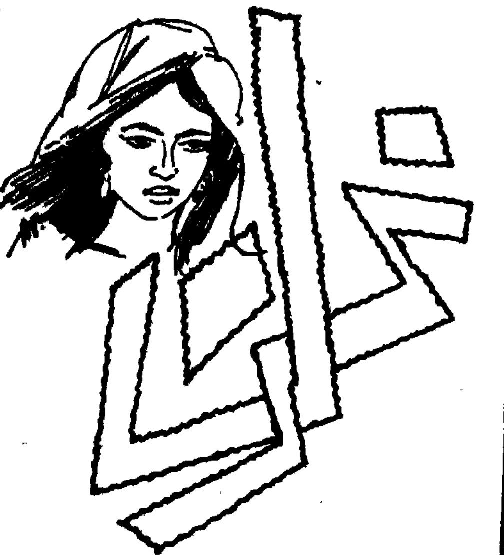
ہاتھوں کی انگلیاں آدھی سڑی ہوئی تھیں۔ ان سے خون اور پیپ ٹپک کر ساڑی کو بھگو رہا تھا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ سے پورا وجود کانپ رہا تھا۔ ایک مریل سی آواز ابھری "عجیب سی ناقابلِ فہم" میں نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟" "میں! میں وہ ہوں جس کے چمن کو لوگوں نے اپنے لہو سے سینچا میری خاطر لوگوں نے قربانیاں دیا۔ لیکن آزادی کے بعد اپنی قربانیوں کی پوری پوری قیمت وصول کرلی اور حقیقت سے چشم پوشی کر کے غیر حقیقت پسندانہ رویوں کے امین بن گئے پہلے ہی انہوں نے شمشیر سے میرے جسم کے دو ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ میری روح ایک تھی۔ اور اس کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھ سے جلنے والے برقی قمقموں کی روشنی

بجھ سی گئی ہے۔ میں خود تاریک ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا پھیلتا گیا۔ خاموش چمکتی ہوئی چاندنی رات میں ایک دم گرجتی ہوئی کالی گھٹا آکر پھیل گئی۔ پھر یکبارگی سکوت چھا گیا۔ جی ہاں! میں وہی ایک پامال شدہ آرزو اور مٹی ہوئی حسرتوں کی ایک پر الم اور خاموش یادگار ہوں جس کے سینے پر ہوس نے لکیر کھینچ دی۔

میں نے ایک بار پھر دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "آخر تم ہو کون کچھ بتاتی کیوں نہیں؟"

"میں بتاتی ہوں۔ میں وہ ہوں جس کے سینے پر ایک طرف انسان خلاؤں کی سیر کر رہا ہے۔ خلائی اسٹیشن قائم کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف میرا سفینہ گرداب میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ میرے دشتِ جاں میں ہر طرف موت کی تجارت ہو رہی ہے۔ میرے اندر لاشوں کا اہرام کھڑا ہو رہا ہے۔ لوگ ہوس کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہے سمندر میں وہ طغیانی نہیں وہ بھی چپ چاپ محو نظارہ رہا ہے۔ ہوا میں وہ خنکی نہیں۔ جو مسرت بخش ہو۔ آج سمندر بھی چپ ہے اور آسمان بھی میرے حال پر قہقہے لگا رہا ہے۔ آخر کیوں آسمان کی بلندیوں پر ہر طرف خون میں ڈوبے ہوئے کبوتر ہی نظر آ رہے ہیں —" اور پھر ایک مریل سا قہقہہ بلند ہوا۔ اب میرے سامنے صرف بوڑھا برگد کا درخت تھا۔ میں نے دیکھا کہ درخت کی شاخوں نے خود اپنے زرد پتوں کو نوچ کر پھینک دیا۔ میں نے بے چین ہو کر کہا۔ "آخر تم کون ہو اپنا نام کیوں نہیں بتاتی؟" ایک آہ ابھری اور کائنات میں بکھر گئی۔ اور ایک مریل سی آواز بلند ہوئی۔ وہی عجیب اور ناقابلِ فہم آواز۔ پھر گوشت پوشت کا مکمل ڈھانچہ لہو کے حصار میں روپوش ہو گیا۔ اب میرے سامنے صرف نڈھال اور عمر زدہ بوڑھا برگد یتیم سی صورت بنائے خاموش کھڑا تھا۔ اب اس کے دامن میں مایوس پتیاں نہیں تھیں وہ پتیاں خاک و خون میں زمین پر تڑپ رہی تھیں۔ ●●●

منظر سلطان



خاموشی لب کھول رہی ہے
جانے کیا کچھ بول رہی ہے
پنچھی اڑ کر چاند پہ پہنچا
شاخ ابھی تک ڈول رہی ہے
آنکھ گلابوں کے موسم میں
تجھ بن موتی رول رہی ہے
پاگل دنیا — دل کے رشتے
میزانوں میں تول رہی ہے
فرقہ بندی منظر بھائی
امرت میں وِش گھول رہی ہے

مطبوعات

نام کتاب ـــــ بزمِ دانشوراں
نام مصنف ـــــ صالحہ عابد حسین
قیمت ـــــ ۳۰ روپے

زیرِ نظر کتاب میں ۱۵ مضامین ہیں۔ ان میں کچھ قلمی خاکے ہیں۔ یہ مضامین صالحہ عابد حسین (مرحوم) نے لکھے ہیں جو اردو زبان کی مقتدر ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں ـــ

دیباچہ میں مصنفہ لکھتی ہیں کہ یہ مضامین گزشتہ پچیس سال کے مضامین میں سے چنے گئے ہیں لیکن کچھ مضامین نئے بھی ہیں۔

کچھ مضامین ایسے ہیں جن پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہندوستانی عورت سے متعلق مصنفہ نے تین مضامین لکھے ہیں۔ اور یہ مضامین بلند پایہ ہیں۔ یہ مضامین "آج کل" دہلی کے ایما پر تحریر کیے گئے تھے ـــــ لیکن نہیں چھپے۔ ان مضامین میں کوئی پہلو تشنہ نہیں ہے۔ معین الدین حارث۔ علی عباس حسینی۔ نازش پرتاپ گڑھی اور اعجاز صدیقی پر کم لکھا گیا ہے۔ مصنفہ نے یہ کمی بھی پوری کی ہے۔

مصنفہ کی تحریر میں شگفتگی ہے۔ کتاب ہاتھ میں لے کر ختم کرتے ہی بنتی ہے۔ اس مختصر کتاب میں کچھ دانش وروں کا ذکر ہی ہو سکتا تھا۔ مصنفہ کی اپنی پسند رہی۔ بہتر ہوتا اگر وہ ہریانہ کے دانش وروں کا ذکر بھی کرتیں۔

کتابت، طباعت عمدہ ہے۔ قیمت صحیح ہے۔

نام کتاب ـــــ ہریانوی برج کے میگھ ملہار
نام مصنف ـــــ ڈاکٹر جاوید وششٹ
قیمت ـــــ تیس روپے

زیرِ نظر کتاب ہریانہ کے شعرا اور ادبا سے کتابیں لکھوانے کی پہلی کڑی ہے۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ نے "ادب کی دھنک" میں نہایت اہم اور معلوماتی باتیں کہی ہیں۔ انہوں نے ملک بھر کے لوک گیتوں۔ عوامی گیتوں پر ہوئے کام کا مکمل نقشہ پیش کیا ہے "رنگ کی برسات میں" "لوک گیت کیا ہے۔ گیت کے بول کب جنم لیتے ہیں۔ لوک گیت۔ لوک سنگیت۔ لوک ناچ اور لوک کتھا کا اتہاس کیسے ابھرتا ہے ان گیتوں کو گاؤں کی منظوم روایت کیسے کہا جا سکتا ہے۔ شادی بیاہ کے گیت۔ زچہ بچہ کے گیت۔ تہواروں کے گیت ۔ فصلوں کے گیت۔ برہا کے گیت۔ پنگھٹ کے گیت۔ جھولے کے گیت۔ میلوں ٹھیلوں کے گیت۔ چولہے چکی کے گیت۔ دودھ بلونے کے گیت۔ اُپلے تھاپنے کے گیت۔ پیشہ وروں۔ دستکاروں کے گیت۔ دھوبی گھاٹ کے گیت۔ کولہو کے گیت۔ دُھنیے کے گیت ـ پنہاروں کے گیت کے علاوہ بانسری۔ ہنڈولہ پنگھٹ غرضیکہ سب کچھ اس مختصر کتاب میں درج ہوا ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ بیشتر گیت انہوں نے ہریانوی برج (تحصیل بلب گڑھ اور پلول) کے دیہات میں گھوم پھر کر جمع کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک نہایت دلچسپ واقعہ بھی لکھا ہے۔

اردو میں ہریانوی برج کے میگھ ملہار غالباً پہلی کاوش ہے جو نہایت کامیاب ہے۔ ڈاکٹر جاوید

وحشت کی انشا پردازی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔
" لوک گیتوں کا تعلق براہِ راست جذباتِ انسانی سے ہے۔ عین ممکن ہے کہ پتھر اور دھات کے زمانے سے قبل کا انسان بھی کبھی شدتِ جذبات سے چیخ اٹھا ہو اور یقیناً اس کے غم اور مسرت کی چیخوں میں فرق بھی ہوگا۔ جیسے رونے اور ہنسنے میں

میرا خیال ہے۔ انہی چیخوں سے شاعری اور موسیقی کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں یہ چیخیں جذبات اور اظہارِ جذبات دونوں کو محیط ہوں گی اور بعد کو ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی یہی چیخیں بولیوں میں اور بولیاں زبانوں میں تبدیل ہوگئیں۔"
کتابت طباعت عمدہ ہے قیمت صحیح ہے۔

کتاب کا نام ——————— نشیب و فراز
مصنف کا نام ——————— امیر چند بہار
قیمت ——————— تیس روپے

ہریانہ اردو اکادمی نے اکادمی کی اشاعتی سکیموں میں زیر نظر کتاب کو اشاعت کے لئے چنا ہے۔ اس کتاب میں نظمیں۔ غزلیں۔ رباعیات قطعات نظم ہوا ہیں۔

مصنف کے شعری مجموعے "ارمغانِ بہار" "نسیم بہار" چھپ چکے ہیں۔ انگریزی کی چھبیس نظموں کو "نسیم مغرب" کے نام سے شائع کیا۔ ادبی دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

شاعری روح کی آواز ہے۔
جذبوں اور ولولوں کی زبان ہے۔

اردو کی کلاسیکی روایت ہے ..... ہر اچھے شاعر کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ مشکل سے مشکل زمینوں میں اچھا شعر تخلیق کرے۔ کلام ابتذال سے پاک ہو۔ کلام برجستہ تشبیہات۔ استعارات تلمیحات۔ اشارہ و کنایہ سے آراستہ و پیراستہ ہو۔

مصنف کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انگریزی ادب کے معلم ہونے کے ناطے انگریزی ادب پر گہری نظر

ہے۔ ان کے کلام میں کیف و سرور بھی ہے۔ اور درد و سوز بھی۔ شاعر کو لفظوں کی نزاکت اور نغمگی کا بھرپور پتہ ہے۔ زندگی کے روزمرہ کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ مناظر قدرت پر بھی نظمیں ہیں۔ نمونہ دیکھئے۔

آؤ قدرت کے مناظر سے قرینا سیکھیں
بادۂ مہر و مروت کبھی پینا سیکھیں
کیوں نہ میخانۂ فطرت کے سبو چھلکائیں
ساحلِ بحر کی جاں بخش ہوائیں کھائیں

"حبِ وطن" کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

دشمن کے جو ہاتھوں میں وطن بیچنا چاہیں
ایسے بھی ہیں موجود وطن میں کئی غدار

مختصر یوں کہ مجموعہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ کتابت۔ طباعت عمدہ۔ سفید کاغذ اور قیمت صحیح ہے۔

یہ تینوں کتابیں ہریانہ اردو اکادمی، کوٹھی نمبر ۸ ۷ ۹، سیکٹر ۶، پنچکولہ (ہریانہ) سے مل سکتی ہیں۔

(رام لعل نابھوی)

قارئین کی نظر میں

رسالہ پابندی سے مل رہا ہے۔ کئی دنوں پہلے ستمبر ۸۸ء کا شمارہ پہنچا، ممنونِ کرم ہوں۔ جسونت سنگھ راز نے نندلال گویا کی نقاب کشائی کی ہے۔ عہدِ اورنگ زیب کا یہ باکمال شاعر اس قابل ہے کہ تحقیق کی روشنی میں اس پر مزید لکھا جائے۔ قیصر قلندر، فضا ابن فیضی اور ڈاکٹر نریش کی غزلیں "دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" دیگر مشمولات بھی دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔

علقمہ شبلی (کلکتہ)

چند یوم قبل انجمن اردوئے معلّی شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حسبِ ایماء اردو ادب کی خدمت میں مصروف ادبی اور معیاری رسالوں، جریدوں اور مجلّوں کی فہرست مرتب کی گئی۔ جس کے لیے درون و بیرونِ ہند کے تمام رسالوں کے تقابلی مطالعوں اور ان کے مقام کے تعین کا موقع ملا۔ اس رو سے "تعمیر" امتیازی حیثیت کا حامل ادبی جریدہ ہے۔ آپ کی کاوشیں لائقِ ستائش ہیں۔

اشہر فغانی (علی گڑھ)

آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے جس کے سبب رسالے کا معیار قائم ہے۔ پچاس پیسے کی معمولی قیمت میں "تعمیرِ ہریانہ" میں ایسی تخلیقات پڑھنے کو مل جاتی ہیں جو بعض رسالے قارئین کو پانچ روپے میں بھی نہیں دے پاتے۔ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے آج ایسی فراخ دلی کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے حکومتِ ہریانہ کی سعی لائقِ تحسین ہے۔

اس وقت ستمبر ۸۸ء کا شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ فضا ابن فیضی کی غزلیں حاصلِ شمارہ ہیں۔ بدر نظیری کی غزلیں بھی پسند آئیں۔

احترام اسلام (الہ آباد)

"تعمیرِ ہریانہ" بہت ہی پابندی سے مل رہا ہے۔ زیرِ نظر ستمبر ۸۸ء کا شمارہ ہے، اس میں "نندلال گویا" بڑا معلوماتی مضمون ہے، فضا ابن فیضی، باوا کرشن گوپال مغموم کی تخلیقات، عارف خورشید کا "خوشبو کا سفر" اور رؤف خوشتر کا "دیوانے آم" پسند آئے۔ "قارئین کی نظر میں" رونق شہری صاحب نے بہت اچھا خیال پیش کیا ہے۔ لیکن قیمت ایک روپیہ اس وقت کریں جب آپ تعمیرِ ہریانہ ۴۸ صفحوں کے بجائے ۸۰ صفحوں میں نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔ "تعمیرِ ہریانہ" کتابت و طباعت میں بھی دن بہ دن ترقی کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ دعا ہے کہ رسالہ اسی آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہے۔

عبدالاوّل نعمانی (بنارس)

ماہ ستمبر کا تعمیرِ ہریانہ اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بک اسٹال پر نظر آیا۔ مضامین میں نندلعل گویا اور مجنوں بحیثیت افسانہ نگار بہت ہی معلوماتی و معیاری ہیں۔ "تعمیرِ ہریانہ" کے صفحات میں کچھ اضافہ کریں۔ قیمت ایک روپیہ ہو جائے تو بھی مضائقہ نہیں۔

ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد (بھاگلپور)

پبلشر اور چیف ایڈیٹر ارجن داس ملک نے ہریانہ سرکار کے لیے محکمہ تعلقاتِ عامّہ ہریانہ ایس۔ سی۔ او۔ نمبر ۱۹۱-۱۸۹، سیکٹر ۱۷ سی چنڈی گڑھ سے دسمبر ۱۹۸۸ء کے لیے شائع کیا۔ طابع: کنٹرولر گورنمنٹ پریس۔ یو ٹی چنڈی گڑھ



۲ نومبر ۱۹۸۸ء کو ہریانہ راج بھون میں یوم ہریانہ تقریبات کے موقع پر پیش کیے گئے ثقافتی پروگرام سے محظوظ ہوتے ہوئے گورنر ہریانہ عزت مآب ہری آنند براری اور وزیر اعلیٰ ہریانہ عالیجناب چودھری دیوی لال۔

وزیر اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال یکم نومبر ۱۹۸۸ء کو کیتھل (ضلع کوروکشیتر) میں کواپریٹو شوگر مل کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے۔





یکم نومبر ۱۹۸۸ء کو کیتھل (ضلع کوروکشیتر) میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو
بے روزگاری بھتہ دیتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ ہریانہ چودھری دیوی لال۔

عالیجناب چودھری دیوی لال، وزیرِ اعلیٰ ہریانہ یکم نومبر ۱۹۸۸ء کو یومِ ہریانہ
کے موقع پر سینٹرل جیل، انبالہ سے قیدیوں کو رہا کرتے ہوئے۔ تصویر میں
وزیرِ داخلہ ہریانہ جناب سمپت سنگھ بھی نظر آرہے ہیں۔

